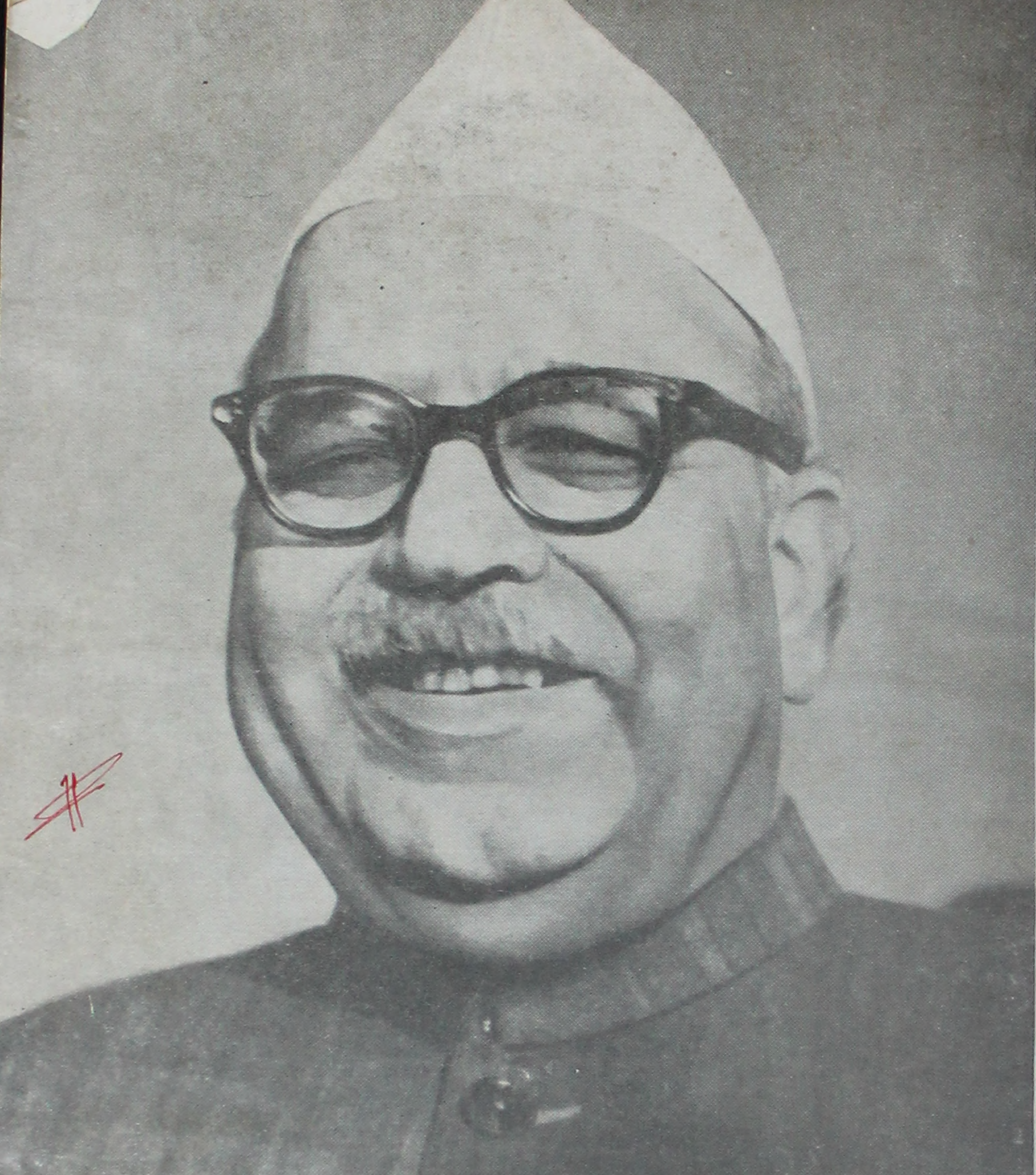
آج کل



جنوری ۱۹۵۵ء

آٹھ آنے

آج کل

اُردو و ادب کے معماروں کی نظر میں

خواجہ غلام السیّدین ایڈیشنل سیکرٹری
وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند

میں آج کل کو ہمیشہ بہت دل چسپی سے پڑھتا ہوں اور اس میں اکثر قابل قدر مضامین اور نظمیں شایع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کی لکھائی چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔

محمد اجمل خاں پرائیویٹ سیکرٹری مولانا ابوالکلام آزاد
وزیرِ تعلیمات حکومتِ ہند

'آج کل' میں نہ صرف اُردو کی بلند پایہ نظم و نثر کا مجموعہ پایا جاتا ہے بلکہ تنوّع مضامین کے باوجود اس کی حسنِ ترتیب اسے ایک گلدستہ بنا دیتی ہے۔ اسی لئے اسے صرف "مقبولِ عوام" کہنا کافی نہیں بلکہ یہ "مقبولِ انام" ہے۔

ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری زور
حیدر آباد دکن

'آج کل' میری نظر میں ہندستان کا واحد علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں ایک معتدل اور سلیقہ مند روش عرصہ سے قائم اور ترقی پذیر ہے۔ اس کے مقالے اور افسانے اور نظمیں تینوں معیاری ہوتے ہیں اور انتخاب کرنے میں خاص ذوق اور جستجو کو دخل رہتا ہے۔

سیّد احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

'آج کل' اردو کا مطالعہ کئی سال سے باقاعدہ کر رہا ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو رسالہ برسوں سے ایک ملکی زبان کے ذریعے سے علم و ادب کی خدمت کر رہا ہو وہ ذہن میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور پڑھنے والے اس کا انتظار بے تابی سے کرتے ہیں۔ 'آج کل' کے لئے بھی میں نے لوگوں کو بیتاب پایا ہے۔



ڈاکٹر عبد السّتار صدّیقی
میور روڈ الہ آباد

پچھلے دس گیارہ برس سے 'آج کل' کو میں برابر پڑھتا رہا ہوں۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ملک کے سارے ماہانہ رسالوں میں 'آج کل' سب سے بہتر اور بالاتر ہے۔ اس کے مقالوں اور اس کی نظم و نثر کا معیار بہت اُونچا ہے۔

پروفیسر عبد القادر سروری
صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

'آج کل' اردو کے موجودہ رسالوں میں سب سے اچھا رسالہ ہے اور اپنے ادبی اور علمی معیار کے لحاظ سے ایک بلند پایہ رسالہ ہے۔ اس رسالے کی جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند ہے، وہ اس کا نہایت سنجیدہ لب و لہجہ ہے۔

پروفیسر آل احمدؔ سرور
صدر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی

'آج کل' اُردو کے اُن چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامّہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے، ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے

کرشن چندر بمبئی

رسالہ 'آج کل' ایک عرصے سے اُردو ادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس ادارے سے جناب جوش ملیح آبادی اور جناب عرش ملسیانی منسلک ہیں جن کی روشن خیالی اور فنّی بلوغت کے سبھی قائل ہیں۔ 'آج کل' کے کئی ایک خاص نمبر اُردو داں طبقے میں شرفِ قبولیت حاصل کر چکے ہیں

نوّاب جعفر علی خاں اثر لکھنوی
کشمیری محلہ لکھنؤ

'آج کل' کا بجا طور پر اُردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامینِ نثر پر مغز اور دل چسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھناؤنے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ نظم کے حصّے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔

فی پرچہ آٹھ آنے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

سالانہ چھ روپے

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر:- —— جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- —— بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۶

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

جنوری ۱۹۵۵ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ترتیب

بچوں کا آجکل

سرورق: شری رفیع احمد قدوائی مرحوم

محمد مصلح الدین احمد

رفیع احمد قدوائی مرحوم

ایسے وقت جبکہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں دیوالی کے دیئے جلائے جا رہے تھے افسوس ہے کہ مسٹر رفیع احمد قدوائی کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ آپ کی موت پر ہر فرد نے سخت افسوس کا اظہار کیا اس لئے کہ مسٹر قدوائی کے پیش نظر صرف ہندوستانیوں کا مفاد تھا اس لئے کہ وہ ہر طبقے میں یکساں ہردل عزیز تھے۔ یو۔پی اور دہلی میں آپ سے عوام کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ بہت سی جگہوں پر دیوالی نہیں منائی گئی۔ رفیع صاحب کی بے وقت موت سے حکومت ایک بہترین وزیر اور ملک ایک سچے محبّ وطن سے اور کانگریس ایک مثالی قاید کی رہنمائی اور عوام ایک بے لوث خادم سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے ہیں۔ آپ کے انتقال سے ایک ایسا خلاء پیدا ہوا ہے جس کا پُر کرنا تقریباً ناممکن ہے اس لئے کہ ان میں اتنی خوبیاں جمع تھیں کہ کسی ایک فرد میں ان تمام چیزوں کا پایا جانا مشکل ہے۔ مسٹر قدوائی کی عظمت و اہمیت کا اصل احساس اس وقت ہوا جبکہ وہ ہم میں نہ رہے لیکن جب تک وہ بقید حیات رہے ہر فرد نے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ غذائی پالیسی کی حیرت انگیز کامیابی کے بعد آپ کی قابلیت کا سکّہ سارے ہندوستان پر بیٹھ گیا۔ ساری دُنیا دنگ رہ گئی کہ روس جیسا ملک غذائی مسئلے کو ۱۵ سال تک حل نہ کر سکا لیکن قدوائی صاحب نے اسے صرف دو سال میں حل کر دیا۔ آپ ایسے وقت اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے جبکہ وہ اپنی ہردلعزیزی اور شہرت کے معراج پر پہنچ چکے تھے اور قوم کو ان کی قیادت کی شدید ضرورت تھی اس لیئے کہ آزاد ہندوستان کو سیاستدانوں سے زیادہ ماہرین نظم و نسق کی ضرورت ہے۔ مرکزی کابینہ میں ان کا مقام ایک عام وزیر کی طرح نہ تھا بلکہ آپ وزیر اعظم نہرو کے داخلی امور میں بہترین مشیر تھے اسی وجہ سے آپ کی جُدائی کا سب سے زیادہ افسوس مسٹر نہرو کو ہوا۔ کانگریس میں مسٹر نہرو کے بعد آپ ہی سب سے زیادہ ہردل عزیز تھے۔ مسٹر قدوائی ایک اعلیٰ ایڈمنسٹریٹر تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ مرکزی حکومت کے ایک سینیر سیویلین سے جنھوں نے گیارہ وزراء کے تحت کام کیا تھا، جب یہ دریافت کیا گیا کہ بہترین ایڈمنسٹریٹر کون ہے تو انھوں نے بلا تامّل جواب دیا کہ "رفیع صاحب"۔

حالات

مسٹر رفیع احمد قدوائی فروری ۱۸۹۴ء میں یو۔پی کے مقام مسولی (بارہ بنکی) کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایم۔اے۔او کالج علی گڈھ سے بی۔اے پاس کیا۔ اور ۱۹۲۰ء میں ایل ایل بی میں زیر تعلیم تھے کہ تحریک ترک موالات شروع ہوئی۔ تحریک سے غیر معمولی دلچسپی نے ترک تعلیم پر مجبور کیا۔ اس تحریک میں حصہ لینے کے باعث آپ جیل بھی گئے۔ رہائی کے بعد آپ مشہور کانگریسی قاید پنڈت موتی لال نہرو کے سکریٹری بنے۔ جن کا آپ پر کامل اعتماد تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو نے مسٹر قدوائی کو ابتدائی سیاسی ٹریننگ دی جو بعد میں اُن کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔

یو۔پی سیاسیات میں حصّہ

مسٹر قدوائی کو یو۔پی کی سیاسیات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی صوبے میں گذرا۔ آپ نے اُتر پردیش اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک مسٹر نہرو نے مرکزی کابینہ میں شمولیت کے لئے اصرار نہ کیا۔ آپ کی سیاسی قابلیت کا علم پہلی دفعہ ۱۹۲۶ء میں ہوا جب کہ آپ مرکزی مجلس مقننہ کے لئے منتخب ہوئے۔ جہاں آپ نے پہلے سکریٹری اور پھر ۱۹۲۷-۲۹ء تک چیف وہپ کانگریس پارٹی کی حیثیت سے پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں کام کیا۔ ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے حکم کی تعمیل میں اسمبلی سے مستعفی ہوئے۔ لیکن ۱۹۳۱ء میں آپ کو یو۔پی کانگریس کا معتمد عمومی منتخب کیا گیا۔ آپ اس کے چار سال بعد صدر چنے گئے۔ یو۔پی میں مسلسل

کام کے باعث صوبائی سیاسیات پر عبور حاصل ہوا۔ مسٹر قدوائی کو انتخابات کے لئے موزوں امیدواروں کے انتخاب میں ملکہ حاصل تھا۔ آپ کا بہت جلد کانگریس کے سب سے ہردلعزیز لوگوں میں شمار ہونے لگا۔ آپ نے اپنے غیر معمولی اثر کو کبھی ذاتی فائدے کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ آپ کی تمام تر کوششیں صرف ملک و قوم کے لئے تھیں۔ ۱۹۳۷ء میں یوپی میں کانگریس نے جو شاندار کامیابی حاصل کی وہ قدوائی کی تنظیمی صلاحیتوں کا کرشمہ تھی۔ صوبہ یوپی میں آج تک کسی نے وہ مقام پیدا نہیں کیا جو رفیع صاحب کو حاصل تھا۔

یو۔پی میں جب پنڈت گوبند ولبھ پنت نے وزارت کی تشکیل کی تو مسٹر قدوائی کو وزیر مال بنایا گیا کئی دفعہ آپ نے عارضی طور پر وزیر اعظم کی حیثیت سے کام کیا۔ زرعی اصلاحات کے نفاذ کے باعث زیادہ ہردل عزیز بنے۔ دوبارہ تشکیل وزارت میں آپ وزیر داخلہ و مال بنے۔ ۱۹۴۲ء تک آپ اس خدمت پر فائز رہے، "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک کے آغاز پر دیگر کانگریسی قایدین کے ساتھ آپ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے قبل ۱۹۴۰ء میں تحریک سول نافرمانی میں آپ نے حصّہ لیا، اور بریلی کے کسانوں کو مشورہ دیا کہ وہ ٹیکس ادا نہ کریں۔ اس لئے برطانوی حکومت نے آپ کو گرفتار کر کے چھ ماہ کے لئے جیل بھیج دیا۔ مسٹر قدوائی کے صوبائی سیاسیات میں زیادہ حصّہ لینے کے یہ معنی نہ تھے کہ مرکزی کانگریس پارٹی پر آپ کا اثر نہ تھا بلکہ جواہر لال نہرو سے تعلّقات ایسے ہی تھے جیسے کہ موتی لال نہرو سے قبل تھے۔

وزیر مواصلات حکومت ہند

بدقسمتی سے یو۔پی کابینہ میں اختلافات پیدا ہوئے۔ لیکن یہ ہندوستانی عوام اور مرکزی کابینہ کے لئے مفید ثابت ہوئے۔ مسٹر نہرو نے اس مشہور ماہر نظم و نسق کی خدمات حاصل کیں۔ اگست ۱۹۴۷ء میں آپ کو محکمہ مواصلات تفویض کیا گیا۔ وزیر مواصلات کی حیثیت سے آپ نے چند ایسے اہم کارنامے انجام دئے جسے کوئی ہندوستانی فراموش نہیں کر سکتا۔ آپ نے ہوائی ڈاک کے رات میں پہنچانے کا انتظام کیا جس سے عوام کو بڑی سہولت ہوئی۔ دوسرے یہ کہ ملازمین ٹپہ کو اتوار کی تعطیل دی جو ملازمین کی توقّع سے باہر تھا۔ مزید یہ کہ آپ نے ٹیلیفون اپنانے کی اسکیم بنائی جس سے حکومت کو کروڑوں روپے کا فایدہ ہوا۔ آپ کی کوششوں کے باعث ٹیلیفون بنانے کا ایک کارخانہ کھولا گیا، اور متحرک ڈاک خانے کا انتظام کیا گیا، جو اس وقت صرف چند ترقی یافتہ ممالک میں مروّج ہے۔ اس طرح آپ نے ایسے کام کئے جس سے عوام اور حکومت دونوں کو فائدہ پہنچا۔ مسٹر قدوائی نے اپنے وسیع تجربے، غیر معمولی قابلیت و اختراعی دماغ کے باعث ایسے کام کئے۔ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ اچانک ڈاک خانے جاتے اور عام لوگوں کے ساتھ قطار میں کھڑے ہو جاتے، اور کوئی خیال تک نہ کر سکتا تھا کہ وزیر مواصلات بھی منی آرڈر کرنے والوں میں سے ہے۔ آپ یہ جاننا چاہتے تھے کہ ملازمین اپنے فرائض برابر انجام دیتے ہیں یا نہیں۔ آپ کو سستی شہرت سے سخت نفرت تھی۔ اس لئے آپ نے کوئی نمائشی کام نہیں کیا۔ ہر ایک نے آپ کی جدائی کو ناقابل تلافی تصوّر کیا۔

وزیر اغذیہ

غذائی صورت حال از حد نازک ہو گئی تھی۔ اس لئے مسٹر نہرو نے مسٹر قدوائی کو اغذیہ کا محکمہ حوالہ کیا، جو آپ وفات سے قبل تک سنبھالے رہے۔ غذائی قلت کو دُور کرنے کے لئے مرکزی حکومت کو ہر سال دو ارب روپے کی غیر ملکی کرنسی صرف کرنا پڑتی تھی۔ راتب بندی کے باعث ہر فرد نالاں تھا، چور بازاری حد سے بڑھ گئی تھی اور ملک ایک عجیب غذائی بحران سے دوچار تھا۔ اگر راتب بندی برخاست کی جاتی تو خوف یہ تھا کہ چور بازاریے ذخیرہ کر لیتے اور یہ تمام کوششیں ناکام ہوتیں۔ اس لئے مرکزی کابینہ کے ارکان، ریاستی وزرائے اغذیہ اور خود وزیر اعظم نہرو راتب بندی کے فوری برخاستگی کے خلاف تھے۔ اگر رفیع صاحب کی بجائے کوئی دوسرا ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ وزارت سے ہاتھ دھو بیٹھتا لیکن آپ کی اس تجویز کو وزیر اعظم نے رد نہیں کیا بلکہ خاموش رہے۔ اس لئے کہ اُنھیں یقین تھا کہ قدوائی ہر کام نتائج پر نظر رکھ کر شروع کرتے ہیں۔ مسٹر قدوائی نے اچانک راتب بندی منسوخ کر دی۔ اس سے چند دن قبل آپ نے اہم و با اثر تاجروں سے تعاون کا وعدہ لے لیا، اور سب سے پہلے مدراس میں اس کا تجربہ کیا گیا جو پورے طور پر کامیاب رہا۔ آپ نے دانشمندی یہ کی کہ پہلے ہی کافی اناج ذخیرہ کروایا، تاکہ عوام کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ تعجب اس بات کا ہے کہ آپ نے مدراس جیسے صوبے کا

انتخاب کیا جہاں نہ صرف غذائی قلت زیادہ تھی بلکہ جہاں سخت قحط تھا۔ مدراس میں قدوائی کی غذائی پالیسی کی فتح نے چوربازاریوں کی کمر توڑ دی۔ اور قلیل سے عرصے میں سارے ہندوستان سے راشن بندی اٹھالی گئی۔ آپ نے خلاف توقع شاندار کامیابی حاصل کرکے سارے ہندوستان پر اپنے ماہرانہ نظم ونسق کی دھاک بٹھادی۔ رفیع صاحب کا یہ کارنامہ "غذائی معجزے" سے کم نہیں۔ وزیر اغذیہ بننے کے بعد آپ نے بالکل انوکھے طریقے پر کام شروع کیا۔ یعنی دفتری کام کم کیا اور زیادہ تر وقت مختلف لوگوں خصوصاً تجار وو زراء اغذیہ سے تبادلہ خیال پر صرف کیا، اور ان کے تعاون کا یقین ہونے کے بعد آپ نے فوراً کنٹرول اُٹھا لیا۔ قدوائی کی غذائی پالیسی کی شاندار فتح کے باعث آج ہندوستان خودکفیل بن چکا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں ہمیں (۴۵۰۰۰۰۰) لاکھ ٹن اناج درآمد کرنا پڑا، لیکن اس وقت مسٹر قدوائی کی کوششوں کے باعث (۳۰۰۰۰۰۰) لاکھ ٹن فاضل غلہ موجود ہے، اور حکومت کا ملنا اب روپیہ بچ گیا ہے جو ترقیاتی کاموں پر صرف کرسکتے ہیں۔ آپ کا یہ کارنامہ تاریخ ہند میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آپ شکر کی قلت کو دُور کرنے کے لئے نئے کارخانوں کے قیام میں مصروف تھے۔ آپ ایسے وقت جدا ہوئے ہیں جب کہ قوم کو آپ کی شدید ضرورت تھی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسٹر قدوائی سے قابل وزیر اغذیہ کوئی اور ثابت نہ ہوسکا۔

کسان مزدور پرجا پارٹی میں شرکت

آپ چند اختلافات کے باعث کابینہ و کانگریس دونوں سے مستعفی ہوکر کسان مزدور پرجا پارٹی میں شریک ہوئے۔ جس کے آچاریہ کرپلانی قاید تھے۔ اس وقت کانگریس کی صفوں میں پریشانی پھیل گئی اور مسٹر نہرو خود بہت متفکر رہے۔ کانگریس میں آپ کی دوبارہ شرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرجا سوشلسٹ پارٹی نے بُری طرح انتخابات میں شکست کھائی۔

سچّے کانگریسی

مسٹر قدوائی بے غرض کانگریسی قاید تھے۔ جن کے مسلمان کم ہندو دوست زیادہ تھے۔ آپ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مکان پر ہمیشہ دوست واحباب کا ہجوم رہتا۔ ۱۹۳۵ء گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت عہدے قبول نہ کرنے کے لئے ایجی ٹیشن شروع کیا۔ یو، پی کانگریس پر سب سے زیادہ اثر آپ ہی کا نمایاں تھا جس کا اعتراف پنڈت گوبند ولبھ پنت چیف منسٹر اترپردیش نے کیا۔ پنڈت پنت نے کہا کہ "رفیع صاحب نے غیر معمولی جرأت سخت محنت وانتہائی عقیدت سے آزادی کی جنگ لڑی، اور حصول آزادی کے بعد تمام عوام کی فلاح کے لئے بے لوث خدمت کی۔ وہ ایک بڑے محبِ وطن تھے، اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک انسان تھے"۔

اُترپردیش کی سیاسیات سے آپ کو گہری دلچسپی تھی۔ اس لئے آپ علیحدہ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس کی مرکزی عاملہ کے مسائل پر خصوصی توجہ نہ دے سکے۔ لیکن جب مرکزی کابینہ میں شامل ہوئے تو تمام اہم امور میں آپ کے مشوروں کو خاص دخل حاصل تھا۔ مسٹر قدوائی سنجیدہ فکر اصحاب میں سے تھے۔ آپ کا کہنا تھا کہ "صرف کانگریس ہی ایک ایسی جماعت ہے جس کا پروگرام ہے، اور جس میں قیادت کرنے کی صلاحیت ہے"۔

مسٹر قدوائی کے اچانک انتقال پر ہر فرد نے افسوس کیا۔ مسٹر بی رام کرشنا راؤ سے لے کر مسٹر نہرو تک سبھی کفِ افسوس ملتے رہے۔ ہر جماعت کے قایدین نے تاسف کیا۔ ہند پارلیمان کے خطیب مسٹر ماولنکر نے فرمایا کہ "رفیع صاحب ذہین اور ماہر نظم ونسق تھے۔ ان میں جلد فیصلہ کرنے کی بلا کی صلاحیت موجود تھی"۔ مسٹر پرہم پرکاش نے صحیح فرمایا کہ "اس اعلیٰ درجے کے سیاست داں، بڑے مخلص محبِ وطن اور حد درجہ خلیق انسان کے انتقال سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو ہرگز پورا نہ ہوگا"۔ جن سنگھ کے قائد نے بھی آپ کو صحیح رہنما تسلیم کیا۔ مسٹر دین دیال معتمد عمومی کل ہند جن سنگھ نے آپ کی موت کو ایک عملی انسان کی محرومی قرار دیا۔۔۔ فی الحقیقت یہ ایک عظیم انسان کی محرومی ہے جس کا بدل ناممکن ہے۔

کوثر چاندپوری

راکھی!

سفید لباس پہنے وہ اس طرح نیلے رنگ کی دیواروں والے کمرے میں داخل ہوئی جیسے اساڑھ کے مہینے میں دودھیا بادل کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا آسمان کی نیلگوں سطح پر تیرتا ہوا سامنے آجاتا ہے ان کپڑوں میں اس کا سُرخ و سفید چہرہ یوں دمک رہا تھا جس طرح لٹھے کے تھان پر لال رنگ کی مُورت چپکی ہوئی ہو۔ اس کے ہاتھ میں تھرمامیٹر تھا وہ بیڈ کے قریب آکر ہاتھ کو جھٹکنے کے بعد کانچ کے اس پتلے سے آلے میں پارے کی چمکتی لکیر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

مُنہ کھولو!

گرجیش نے مُنہ کھولنے کی جگہ اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں، اس کے سامنے مرمر کا ایک حسین مجسمہ کھڑا تھا، اور پتلی پتلی انگلیوں میں تھرمامیٹر دبا ہوا تھا گرجیش کو بخار کی شدت میں بھی ایسا لگا جیسے وہ کوئی رنگین خواب دیکھ رہا ہو اور یہ رنگینی اس کے ذہن پر چھائی جا رہی ہو۔

منہ کھولئے! —— وہ گرجیش کی لال لال انگارہ سی آنکھوں میں شعلے ناچتے دیکھ رہی تھی اور ان شعلوں نے ایک دم اس کے احساس کو چھو دیا تھا۔ اس نے اپنے جسم میں ایک خفیف سا جھٹکہ محسوس کیا اور پھر وہ ایک —— کی حیثیت سے یہ سوچنے لگی کہ اس کے بعد اور جھٹکے بھی آئیں گے اس سے بڑے اور شدید جھٹکے، محبت کی آگ سلگتی ہے تو اس کے نیچے دہکتی ہوئی جوالا بھی نظر آنے لگتی ہے۔

گرجیش کی نگاہیں ابر کے درمیان جگمگاتے ہوئے آفتاب پر جمی رہیں اسی حالت میں اس نے منہ کھول دیا اور اس نے اپنی نازک انگلیوں میں دبا ہوا تھرمامیٹر گرجیش کے ہونٹوں میں دے دیا پھر کلائی گھما کر رسٹ واچ دیکھی اور یوں ہی وقت گزارنے کے لئے گرجیش کی نبض پر انگلیاں جما دیں اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے وہ کچھ گن رہی تھی اور گرجیش کو یوں لگ رہا تھا جیسے بخار کی چنگاریاں سارے بدن سے سمٹ کر اس کی انگلیوں کی ٹھنڈک سے بجھتی جا رہی ہیں۔

کتنا ٹمپریچر ہے اس وقت، سسٹر!

اور اس کی زبان سے سسٹر کا لفظ سُن کر وہ چونک گئی وارڈ کے سارے مریض اسے سسٹر ہی کہتے تھے مگر گرجیش کی زبان سے یہ لفظ سُن کر وہ جیسے ایک ہی لمحے کے اندر کسی اور دنیا میں پہنچ گئی ہو اس دنیا میں جہاں صرف دودھ کی لہریں ہوں اور ہر طرف ایسے ہی سفید پھریرے اڑ رہے ہوں نیلے آکاش پر دھولی جیسی گھٹائیں بھاگ رہی ہوں۔

صرف سو ہے! اس نے دھیرے سے کہا اور پین کھول کر چارٹ پر کچھ لکھا اور میز پر رکھی ہوئی بوتل سے اونس میٹر میں ذرا سی دوا انڈیل کر گرجیش کے مُنہ سے لگا دی، وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔

بہت میٹھی ہے کیا؟ اس نے مُسکراتے ہوئے پوچھا

جی ہاں بہت میٹھی، بہت زیادہ میٹھی!

وہ بدستور مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی گرجیش دیر تک اس کی بابت سوچتا رہا، کتنی حسین ہے وہ، حسین اور معصوم، اس کی عمر نوکری کرنے کی تو نہیں تھی، —— ملتا ہی کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو ملتے ہوں گے، مگر ہوتا ہی کیا ہے اتنی سی رقم میں، —— شاید وہ محض خدمت کے لئے یہ کام کرنے لگی ہو اس کے دماغ میں خیالات کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا، وہ تنہا وارڈ میں پڑا تھا۔ آسمان کی پھیلی ہوئی نیلگوں سطح پر ابر کا کوئی ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا اس کی نیلاہٹ میں دُور تک کہیں سفیدی نظر نہ آ رہی تھی، اساڑھ، جیٹھ میں بدل گیا تھا۔ جبھی وہ اتنے کم بخار میں بھی گرمی محسوس کرنے لگا تھا، اسے اپنی جلد پر جگہ جگہ چنگاریاں رکھی معلوم ہو رہی تھیں۔ چار پانچ گھنٹے کے بعد پھر

وارڈ کا دروازہ کھلا اور باہر کا دھیٹی ٹکڑا کمرے کی نیلی دیواروں کے درمیان تیرنے لگا۔ ذہن پر چھائی ہوئی نیلی سطح پر سیکڑوں ستارے اُبل پڑے اس مرتبہ وہ گرجیش کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی اس نے بیمار کی جلتی ہوئی پیشانی پر اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھا پھر ایک ہاتھ میں اس کی کلائی سنبھال کر دوسرے ہاتھ کی مرمریں انگلیاں تڑپتی ہوئی رگ پر رکھ دیں۔ گرجیش کے خون کی روانی میں اعتدال پیدا ہونے لگا۔ آنکھوں کی جلن ذرا کم ہو گئی۔ اس کی نگاہیں سنہری رسٹ واچ پر جمی ہوئی تھیں اور گرجیش اس کے چہرے کو دیکھے جا رہا تھا، کتنا دلفریب اور معصوم تھا اس کا چہرہ، رخساروں پر خفیف سی تمتماہٹ تھی۔ جو بار بار زیادہ ہو جاتی تھی جیسے ایک دم بجلی چمک گئی ہو۔ بجلی کی یہ چمک ابھرتی اور پھر غائب ہو جاتی۔

آپ بالکل اچھے ہیں

نہیں سسٹر میں بالکل اچھا نہیں ہوں۔

سسٹر کے اس لفظ پر وہ پھر چونک گئی، اس نے اپنے جسم میں پھر ایک جھٹکا لگتا محسوس کیا۔

آپ کیسا فیل (Feel) کرتے ہیں اپنے آپ کو ؟

بہت بُرا

وہ ہنس پڑی اور اسی طرح ہنستے ہوئے بولی۔ بُرا تو آپ کو پہلے بھی نہیں کہا جا سکتا تھا اور اس وقت تو آپ سچ مچ بہت اچھے معلوم ہو رہے ہیں۔

شاید! گرجیش عجیب انداز سے اسے دیکھتا رہا۔

اس نے گرجیش کے بازو میں انجکشن لگایا اور چارٹ پر کچھ لکھ کر چلی گئی اس کے بعد وہ نہیں آئی اور اگلے دن جب بڑے ڈاکٹر کے راؤنڈ سے ذرا دیر پہلے آئی تو گرجیش بالکل اچھا تھا اس کا بخار چار روز کے بعد اتر چکا تھا، درد بھی باقی نہ رہا تھا بس دل میں ذرا سی کھٹک تھی جو اس کے آتے ہی دور ہو گئی۔

کہیے مسٹر گرجیش آپ کیسے ہیں ؟

آپ خود ہی دیکھ لیجئے، گرجیش نے اس کے ہاتھ میں تھرمامیٹر دیکھ کر منہ کھول دیا۔

اور اس نے بدستور ہاتھ جھٹک کر پارے کی لکیر کو دیکھا اور تھرمامیٹر گرجیش کے منہ میں دے دیا۔

ٹمپریچر اب نہیں ہے اور بھی کچھ نہیں معلوم ہوتا اس نے اپنی نیلی سی آنکھیں جن میں سفید گھٹائیں دوڑتی نظر آ رہی تھیں گرجیش کے چہرے پر جا دیں۔ گرجیش بھی غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

صاحب آ رہے ہیں راؤنڈ میں

پھر ؟

مجھے اگلے وارڈ میں جانا ہے

وہاں کون ہے

ایک اور بابو ہیں۔

گرجیش نے مضمحل انداز سے تکیے پر سر رکھ دیا اور وہ احتیاط سے کواڑ کھول کر باہر چلی گئی اس کے جاتے ہی بڑا ڈاکٹر آ گیا اس نے گرجیش کو دیکھ کر کہا۔

آپ بالکل فٹ ہیں مسٹر گرجیش! ابھی ویک نس (Weakness) بہت ہے چوتھے دن ڈسچارج کر دیا جائے گا۔

چوتھے دن ؟ --- گرجیش نے احتجاج کے انداز میں پوچھا۔

جی ہاں چوتھے دن کیا پہلے جانا چاہتے ہیں آپ ؟

نہیں میں ابھی رہنا چاہتا ہوں۔

چوتھے دن ۹ بجے گرجیش ہسپتال چھوڑ رہا تھا، آبی رنگ کی کار ہارن بجاتی آہنی گیٹ کو پار کر کے وارڈ کے سامنے آ کر ٹھہری تو گرجیش آرام کرسی پر بیٹھا تھا اور وہ اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھی تھی۔

مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ اچھے ہو کر جا رہے ہیں!

نہیں، میں بیمار ہو کر جا رہا ہوں سسٹر، ایک نئی بیماری کا زہر اپنی رگوں میں لے کر۔

وقت آنے پر اس کا بھی علاج ہو جائے گا لیکن مجھے آپ کی اس بات پر بھروسہ نہیں صاحب اچھی طرح آپ کا اگزامینیشن کر چکے ہیں

صاحب ساری بیماریوں کو نہیں پہچانتے۔

ایسا مت بولو مسٹر گرجیش وہ ایف، آر، سی، ایس ہیں انگلینڈ کے۔

اور ضروری نہیں کہ ہر ایف، آر، سی، ایس آدمی کے دل کے پردوں میں الجھی ہوئی بیماریوں کو دیکھ لیا کرے۔

ڈاکٹر سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔

1 مجھے یقین نہیں سسٹر وہ دل کی دھڑکنیں تو کان میں آلہ لگا کر سُن سکتا ہے مگر ان میں گونجتی ہوئی آوازیں نہیں سُن سکتا۔

وہ آوازیں آپ اپنے منہ سے نکال سکتے ہیں۔

گرجیش لاجواب ہو کر اسے دیکھنے لگا اور دیر تک دیکھتا رہا اس کا سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا ادھر وہ بھی دوسرے وارڈ میں جانے والی تھی گرجیش دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پھر وہیں کھڑا ہو گیا کمرے کی نیلی دیواریں مسکراتی محسوس ہو رہی تھیں ان پر جگہ جگہ ابر کے ٹکڑے ناچ رہے تھے، ستارے جھلملا رہے تھے وہ اندر آ گیا اور قریب سے دیواروں کو دیکھنے لگا، جیسے وہ ان سے جانے کی اجازت مانگ رہا ہو۔

کیا دیکھ رہے ہیں آپ ؟

کچھ نہیں، ان دیواروں پر ابھی ابھی کچھ گھٹائیں دوڑ رہی تھیں۔

کیسی گھٹائیں ؟

بالکل سفید، دودھ کی مانند سفید۔

ایسی باتیں تو بیماری میں بھی نہیں کیں آپ نے

اور میں کہتا ہوں میری بیماری اب شروع ہو رہی ہے، ——

گرجیش وارڈ سے نکل گیا اور موٹر میں جا بیٹھا وہ آپ ہی موٹر ڈرائیو کر کے آہنی گیٹ کے اُدھر جا پہنچا پھر اس کی کار سڑک پر دوڑتی دکھائی دی اس کے بعد غائب ہو گئی اور وہ وہیں کھڑی سڑک کو دیکھتی رہی جیسے گرجیش کی موٹر میں اس کی بھی کوئی چیز چلی گئی ہو، تھرمامیٹر —— ٹرے —— سرنج یا ایسی ہی کوئی اور ضروری اور قیمتی چیز، نہ جانے وہ کیا ہو گی، اسی دن سے ہسپتال اُجاڑ سا نظر آنے لگا، ہر وقت اس کا جی اُلجھتا رہا مریضوں کی باتیں اسے بُری معلوم ہوتیں وہ انجکشن لگاتے وقت ان بانہوں میں گرجیش کے بازوؤں کا سا گداز ڈھونڈتی، اسے بار بار یہ آرزو ہوتی کہ گرجیش کے انداز میں کوئی باتیں کرے، باتیں تو دوسرے وارڈ کا بابو بھی کرتا تھا مگر وہ اس کے کانوں میں گرم سیسہ اونڈیلنے لگتی تھیں، مریض آتے اور چلے جاتے جب سے وہ یہاں آئی تھی یہی ہوتا آیا تھا لیکن وہ کسی سے اتنی مانوس نہ ہوئی تھی نہ ان میں سے کسی کے جانے پر خالی وارڈ کو دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے زندگی میں ویرانی سی اُبھری ہو، وہ ایک بار کسی عزیز ترین ہستی سے چھوٹ گئی ہو، کمار پھر ایک مرتبہ اس سے جدا ہو گیا ہو، وہ بار بار خالی وارڈ میں گئی اور کرسی پر بیٹھ کر خالی پلنگ کو دیکھا، چند سال پہلے کمار کا خالی پلنگ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جس قسم کے گرم گرم آنسو بھر گئے تھے وہ آج بھی چھاتی میں اُبلتے اور کھولتے معلوم ہو رہے تھے ان کی سنسناہٹ اس کے کانوں میں گونج رہی تھی، مگر وہ اُنھیں ٹھنڈا کر کے پی جانا چاہتی تھی —— آنسوؤں کا بہہ جانا اچھا نہیں ہوتا، وہ دل کی آگ کو بھی اپنے ساتھ بہا لے جاتے ہیں، وہ ضبط کرتی رہی پھر بھی اس کی دونوں آنکھوں سے دو آبشار چھوٹ نکلے اس نے جلدی سے انھیں رومال میں جذب کر لیا لیکن پتہ چلا کہ وہ سُوکھ نہیں سکتے، کبھی نہیں سوکھ سکتے، اس نے تھرمامیٹر نکال لیا اور بالکل اسی انداز سے جھٹکا دے کر بولی۔

منہ کھولئے !

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی بھی دیکھی اور پھر تھرمامیٹر کو کیسی میں رکھ کر چارٹ پر کچھ لکھ بھی دیا اس کے بعد وہ چلی گئی، وارڈ بہت دنوں تک خالی نہیں رہا۔ وہاں ایک اور بیمار آ گیا، اور اس کو ایسا لگا جیسے اس مریض نے آتے ہی دیواروں کا سارا نیلا رنگ کھُرچ دیا ہو اور اس میں ناچتے ہوئے ابر کے ٹکڑے کہیں غائب ہو گئے ہوں،

دو ہفتے کے بعد گرجیش ایک دن موٹر لے کر آیا وہ ڈیوٹی سے واپس جا رہی تھی سڑک پر ہی گرجیش کو روک کر اس نے دو چار باتیں کیں، گرجیش بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا بخار کی گرمی نے اس کے رخساروں کی سُرخی بالکل چوس لی تھی، لیکن اس کے گالوں پر گلاب کی شاداب پنکھڑیاں لرز رہی تھیں۔

کہاں جا رہی ہیں آپ ؟

مجھے اپنے گھر تک جانا ہے

میں پہنچائے دیتا ہوں

نہیں میں تو روز ہی پیدل جاتی ہوں۔

یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں روز ہی اس وقت گاڑی لے آیا کروں اور آپ کو گھر پہنچا دیا کروں

شاید کبھی یہ بات ناممکن بھی ہو جائے۔

ایسا نہیں ہو سکتا —— گرجیش نے موٹر کی کھڑکی کھول دی اور

وہ اس کے برابر بیٹھ گئی ۔ گاڑی شہر کے باہر کی کھلی سڑک پر دوڑتے دوڑتے اس کے کوارٹر پر جا کھڑی ہوئی ۔

بہت اچھی جگہ ہے کیا تنہا رہتی ہیں آپ ؟

نہیں میری ماں بھی ساتھ رہتی ہیں

کوئی اور نہیں

ایک بہن ہے

اور کوئی نہیں ! —— اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔

گرجیش کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی خالی جگہ کو پُر کرنے کی التجا کر رہی ہو وہ پوچھ رہی ہو کیا تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتے تاکہ آیندہ میں پوچھنے والوں سے کہہ دیا کروں گرجیش بھی رہتے ہیں میرے ساتھ اور وہ میرے ..... گرجیش اسے چھوڑ کر جلد ہی چلا گیا اور اگلے دن حسب وعدہ جب وہ آیا تو وہ سفید کپڑوں میں نہ تھی اس نے نیلی ساڑی باندھ رکھی تھی اس کا چہرہ ٹھیک اس ستارے کی مانند دمک رہا تھا جو سورج ڈوبتے ہی اُفق پر چمکنے لگتا ہے گرجیش نے اسے پہلی مرتبہ ان نیلے کپڑوں میں دیکھا وہ دیر تک بیٹھا رہا گرجیش نے اس سے زیادہ اس کی بوڑھی ماں میں دلچسپی لی جو ہر دو منٹ کے بعد کمار کا ذکر چھیڑ کر رو پڑتی تھی ۔

دن بھر اکیلی رہتی ہوں بیٹا ! رملا ہسپتال چلی جاتی ہے بملا کو اسکول پہنچا آتی ہوں اور پھر ..... دن گزرتے رہے گرجیش رملا کے یہاں آتا رہا جب وہ آجاتا اس کی ماں اسے گھیر لیتی اور دنیا بھر کی باتیں کرتی، ان باتوں میں سب سے زیادہ باتیں کمار کے بارے میں ہوتیں کبھی کبھی رملا کے بیاہ کا ذکر بھی آجاتا اور تب ماں کا لہجہ دھیما ہو جاتا وہ دھیرے دھیرے گرجیش سے بولنے لگی ۔

کتنا دُکھ اٹھایا ہے اس نے میری اور بملا کی خاطر !

سچ کہتی ہوں گرجیش رملا بڑی اچھی لڑکی ہے ۔

گرجیش کی آنکھیں چمک اُٹھتیں، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اس کا جی چاہتا بڑھیا آگے کچھ اور بھی کہہ دے، رملا کو وہ اس سے بھی اچھا سمجھتا تھا وہ چاہتا تھا کسی طرح ماں کو یہ بات بتا دے، ماں کو نہیں تو رملا ہی کو ۔

ساون پر ماں نے بڑے اصرار سے گرجیش کو کھانے پر بلایا وہ طے کر چکی تھی آج سب کچھ اس سے کہہ دیگی، وہ اسے اپنا بنا لینا چاہتی ہے وہ بہت اچھا ہے بڑا خوبصورت ہے رملا بھی بہت پسند کرتی ہے، گرجیش کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں، ایسی چمک بہت دنوں کے بعد اس کی آنکھوں میں آتی تھی ۔

رملا نے اپنے ہاتھ سے بہت سی چیزیں پکائی تھیں گرجیش آیا تو ماں نے بڑی محبت سے اسے اپنے پاس بٹھا لیا وہ اس سے رملا ہی کی باتیں کرنے لگی ۔

کیا بتاؤں گرجیش رملا کتنی اچھی ہے، آج کل تو ایسی لڑکیاں دیکھنے ہی میں نہیں آتیں، ماں کی باتیں سن کر گرجیش نہ جانے کیا سوچنے لگتا کئی بار اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں گیا، اور اس نے جیب میں پڑی ہوئی انگشتری کو انگلیوں سے چھوا پھر سوچا یہ رملا کی انگلی میں ڈھیلی تو نہ ہوگی آخری بار انگوٹھی کو چھو کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ رملا کی انگلی میں یہ انگشتری پہنانے کا آج سے اچھا موقعہ کبھی نہ آئے گا، اس کا چہرہ ایک دم تمتما اٹھا، ماں برابر رملا کی تعریفیں کرتی رہی، جب گرجیش کو بیٹھے بہت دیر ہو گئی اور کھانے کا وقت قریب آگیا تو وہ کمرے میں داخل ہوئی اور گرجیش کے پاس کھڑے ہو کر بولی،

ہاتھ لائیے اپنا !

کیوں ؟

میں آپ کے راکھی باندھ رہی ہوں

راکھی ؟ —— ماں کی آنکھیں پھیل گئیں ۔

ہاں راکھی، ماں بہت دنوں سے میں "کمار" کو ڈھونڈھ رہی تھی اور اس دن وہ مجھے ہسپتال میں ہاتھ آگیا جمنا میں ڈوبا ہوا کمار کہاں آکر اُبھرا ہے ماں ! —— ——

—— ہاتھ لاؤ گرجیش تم کئی بار مجھے "بہن" کہہ چکے ہو، آج میں تمہیں بھائی بنا رہی ہوں، میرے بیرن کا خالی پلنگ کتنے دنوں کے بعد آباد ہو گا آج ماں ؟

ماں کی آنکھوں سے نیر بہنے لگا اور بھیگی ہوئی آنکھوں نے دیکھا کہ وہ جمنا کی لہروں پر بہتا ہوا کمار اس کی طرف آرہا ہے، اس کی چھاتی میں ممتا کی گھٹائیں اُمنڈنے لگیں، اس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر بے اختیار گرجیش کا منہ چوم لیا اور گرجیش نے دیکھا کہ حد نظر تک سفید، دودھ کی مانند سفید بادل چھا گئے ہیں آج سارا آسمان روئی کے ان گالوں میں چھپ گیا تھا ۔

شوکت سبزواری

اقبال کا نظریۂ شعر

آج تک شعر کی جامع و مانع تعریف نہ ہو سکی۔ کسی نے شعر کو موزوں اور مقفیٰ کلام بتایا۔ کسی نے کہا کہ مناسب الفاظ، نقوش اور اوزان میں احساس و توازن کو ڈھال دینا شعر ہے۔ کسی نے شعر کو لفظی صنعت گری قرار دیتے ہوئے لکھا۔ جب بہترین لفظوں کو بہترین ترتیب کے ساتھ رکھ دیا جائے تو شعر وجود میں آتا ہے۔ ان میں سے کوئی تعریف بھی جامع نہیں۔ خیال شعر کا ایک اہم جزو ہے جسے سرے سے یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ دراصل شعر کی تعریف اس وقت تک جامع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی حقیقت کی پوری پوری نقاب کشائی نہ ہو۔ تعریف کے معنی ہیں کسی چیز کی حقیقت بتانا اس لئے شعر کی تعریف کا مسئلہ شعر کی حقیقت سے وابستہ ہے۔ اصل سوال شعر کی حقیقت کا ہے۔ اس کی ماہیت اور غرض و غایت کا ہے۔ شعر کسے کہتے ہیں؟ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اور وہ کن ترکیبی عناصر سے مل کر بنتی ہے؟ شعر کی تخلیق کس طرح ہوتی ہے اور کس مقصد سے؟ شعر کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ان تمام سوالات کا واضح اور صاف صاف جواب ہونا چاہئے۔ اقبال نے اپنے کلام نیز مضامین و مکاتیب میں ان کا جواب دیا ہے۔

اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ شعر لفظوں کا آرٹ ہے جس طرح موسیقی آوازوں کا۔ الفاظ با معنی ہوتے ہیں اس لئے شعر کا تعلق معانی سے بھی ہے۔ ویسے تو ہر لفظ کے ایک معنی ہیں چاہے وہ نثر میں استعمال ہو یا نظم میں یا روزانہ بات چیت میں۔ لیکن شعر میں استعمال ہونے والے الفاظ کا عام اور معمولی مفہوم کے علاوہ ایک اور گہرا ایمائی مفہوم بھی ہوتا ہے۔ یہ ایمائی مفہوم آرٹ کی جان ہے جو آرٹ کی ہر قسم میں پایا جاتا ہے تصویر ہو یا مجسمہ، شعر ہو یا نغمہ۔ لیکن شاعر کا تعلق الفاظ سے ہے اور لفظ کے عام معنی بھی ہوتے ہیں اس لئے یہاں کبھی کبھی عام معنی اور ایمائی مفہوم میں خلط ملط کر دینے کی وجہ سے لفظوں کے اس مجموعے کو بھی شعر کہہ دیا جاتا ہے جو درحقیقت شعر نہیں ہوتا۔ بے جان لفظوں کا ڈھیر ہوتا ہے۔

اقبال کے خیال میں شعر ایمائی مفہوم کا نام ہے جو خیال بھی ہو سکتا ہے اور جذبہ بھی سوچی ہوئی رائے بھی ہو سکتی ہے اور باطن میں محسوس کیا ہوا احساس بھی۔ شعر آرٹ کا ایک شعبہ ہے جس کا روئے سخن دل کی طرف ہے۔ شعر کا تعلق دماغ سے زیادہ دل سے ہے۔ دل کی دنیا میں پیدا ہونے والا ہر جذبہ شعر کا موضوع ہو سکتا ہے۔ ہر نکھرے ہوئے احساس اور وجدانی کیفیت کو شعر کے قالب میں ڈھالا جا سکتا ہے، لیکن خالص دماغی پیداوار کو شعر بنا کر پیش کرنا مشکل ہے جب تک دل کی گرمی سے تپا کر سوزِ دل کی سی کیفیت اس میں پیدا نہ کی جائے۔ ہربرٹ ریڈ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ خیالات یا جذبات شعر کے تعمیری اجزا نہیں ہوتے۔ وہ صرف شعر کے لب و لہجہ کی اصلاح و ترمیم کرتے ہیں[1]۔ اقبال کے نزدیک خیالات و جذبات شعر کے اصلی اجزا ہیں۔ لیکن خیالات میں انھوں نے فرق کیا ہے۔ خیالاتِ محض جو صرف دماغ کی پیداوار اور فکر کے تربیت یافتہ ہیں۔ دل کی کٹھالی میں تپائے ہوئے خیالات جو سوزِ دل کی کیفیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک دوسری قسم کے خیالات شعر کی حقیقت میں داخل ہیں۔

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

اس لحاظ سے شعر اور حکمت (فلسفہ) میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ دونوں کی حقیقت حق و راستی کا بیان ہے۔ حکمت میں یہ بیان بے رنگ اور سادہ طریقہ سے فکر کی مدد سے ہوتا ہے اور شعر میں جذبات کا رنگ دے کر وجدان کی مدد سے۔ فکر دماغ کا عمل ہے اور وجدان دل کا۔ دماغ فلسفہ

---

[1] "Phases of English poetry" صفحہ ۵۷

کا عمل گاہ ہے اور شعر دل کی ۔ اس لئے فلسفے کا خطاب دماغ سے ہے اور شعر کا دل سے ۔ علامہ اقبال نے شعر کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے اسرارِ خودی کے دیباچے میں لکھا تھا ۔

"ہندو حکماء نے مسئلہ وحدۃ الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریقہ اختیار کیا ۔ یعنی انھوں نے دل کو اپنا آماجگاہ بنایا [1] ۔

جدید تنقید کے بہت سے دبستان ہیں جو بعض اہم بنیادی مسئلوں میں باہم اختلاف رکھتے ہیں ۔ اقبال جدید نقادوں میں سے کسی کے مقلد نہ تھے ۔ انھوں نے شعر کے بعض پہلوؤں پر جس فیصلہ کن انداز سے بحث کی ہے اس سے اس فن میں ان کی مجتہدانہ شان کا اظہار ہوتا ہے ۔ مغرب کے جدید نقادوں کی اس رائے سے انھیں اتفاق نہ تھا کہ شعر الفاظ اور طرزِ ادا کا نام ہے ۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ کوئی نیا خیال بھی نہ تھا ۔ عرب کے نقادوں میں سے ابن قدامہ اسی خیال کے تھے ۔ وہ کہتے تھے کہ خیال ہر شخص کے ذہن میں آسکتا ہے ۔ شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ اسے خوبصورت الفاظ اور انوکھے انداز میں ڈھال کر پیش کرے ۔ اقبال نے زبان و بیان سے زیادہ خیال کو اہمیت دی ۔ اور تاثراتی نقادوں کے خلاف خیال اور طرزِ ادا میں فرق کیا ۔ امریکہ کا مشہور نقاد اسپنگارن جو اطالوی نقاد کروچے کا مقلد سمجھا جاتا ہے ۔ اقبال کا معاصر تھا ۔ اس کا مشہور مقالہ "تنقید جدید" ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا ۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ تاثراتی نقاد خیال اور اظہار میں فرق نہیں کرتے ۔ ہر خیال کا ایک خاص اسلوب ہوتا ہے جس میں اسے ادا کیا جاتا ہے [2] ۔ اقبال اس کے برعکس ایک خیال کو مختلف طریقوں سے ادا کرنے کے قائل ہیں ۔ اظہار خیال کے بعد بھی وہ زبان و بیان کی اصلاح و تہذیب کی فکر میں رہتے تھے اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس کے لئے اچھا اور مناسب اسلوب نکالیں "پیامِ مشرق" میں "بوئے گل" کے عنوان سے ایک شعر تھا ۔

زندانی کہ بند ز پایش کشادہ اند   آہے گزاشت است کہ بو نام دادہ اند

اس پر مولانا اسلم جیراجپوری نے اعتراض کیا کہ "آہے گزاشت است"

بھدی ترکیب ہے ۔ یہ مطلب کسی اور طرح ادا کرنا چاہیئے [1] ۔ آخر اقبال نے اس شعر میں اس طرح ترمیم کی ۔

زاں نازنیں کہ بند ز پایش کشادہ اند   آہے است یادگار کہ بو نام دادہ اند

اپنے بعض خطوط میں اقبال نے اس خیال کی وضاحت کی ہے ۔ ایک خط میں مثنوی "اسرارِ خودی" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"اگر مجھے فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی اس کا دوسرا حصہ بھی ہوگا ۔ جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اس حصے سے زیادہ لطیف ہوگا ۔ کم از کم مطالب کے اعتبار سے گو زبان اور تخیل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا ۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے جو اپنے اختیار کی بات نہیں" [2]

تخیل سے غالباً شاعرانہ طرزِ اظہار مراد ہے جسے اقبال مطالب سے الگ قرار دے کر لکھتے ہیں کہ یہ طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے ۔ اقبال کے کلام اور ان کی تحریروں کے عمیق مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اقبال شعر میں طرزِ اظہار کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے ۔ لیکن وہ اسے شعر کا ایک جزو سمجھتے ہیں ۔ شعر ان کے نزدیک خیال اور طرزِ اظہار کے مجموعے کا نام ہے خیال کو اظہار کے مقابلے میں وہی درجہ حاصل ہے جو جان کو جسم کے مقابلے میں ہے ۔ ع

ارتباط لفظ و معنی ارتباط جان و تن

اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں طرزِ اظہار پر زور بھی دیا اور کاوش کر کے خود بھی شاعرانہ انداز کے شعر کہے لیکن یہ ان کی طبیعت کا ابتدائی رنگ تھا اور جیسے جیسے یہ پھیکا پڑتا گیا ان کے کلام میں سادگی آتی گئی اور آخر شوخ و شنگ طرزِ ادا کی جگہ واضح اور عمیق اسلوب نے لے لی ۔ خود انھیں اپنے سادہ اور حکیمانہ طرزِ بیان کا احساس تھا اور شاید اسی لئے وہ اپنے کو شاعر کہتے ہوئے جھجکتے تھے ۔

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی   کہ بانگ صور سرافیل دل نواز نہیں

آب و رنگ شاعری از ما مجو

---

[1] مقدمہ اسرار خودی صفحہ مر

[2] "The New criticism" صفحہ ۳۰

[1] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۲۳۶

[2] " " " ۲۳

ذیل کا خط مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ہے۔ اس میں انھوں نے شاعری سے بے تعلقی کا اظہار اسی خیال سے کیا ہے۔

"فن شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست[1]
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

بالکل یہی بات ایک اور خط میں بھی ہے جو عشرت رحمانی کے نام ہے۔ فرماتے ہیں۔

"حقیقت میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی نسبت دنیائے شاعری سے کچھ بھی نہیں اور نہ کبھی میں نے Seriously اس کی طرف توجہ کی ہے[2]"

اقبال نے شاعری سے برات کا اظہار اس کے جمالیاتی پہلو کو سامنے رکھ کر کیا اور اسے آرٹ کا ایک شعبہ سمجھ کر اس سے بے تعلقی دکھائی اقبال کے یہاں شعر اور شاعری کے بھی جدا جدا مفہوم ہیں۔ شعر اور چیز ہے اور شاعر اور چیز۔ شعر کے متعلق ان کے نقطہ نظر کی وضاحت میں اوپر کر چکا ہوں۔ شاعری سے انھوں نے غالباً اس کے عام اور متعارف معنی مراد لئے۔ ویسے تو اس کے کئی قرینے ہیں لیکن میری نگاہ میں ذیل کے الفاظ زیادہ اہم ہیں جو انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھے ہیں۔

"شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجے کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات میرے حالات میں میرے لئے ممکن نہیں[3]"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک شاعری کی دو حیثیتیں ہیں ایک فنی اور ادبی۔ اس لحاظ سے وہ تخلیق حسن (توازن) ہے۔ اس کے سوا اس کا کوئی مقصد نہیں۔ دوسری افادی اور حکمیاتی۔ اس لحاظ سے وہ ملی و اخلاقی حقائق کا بیان ہے "مفید اور انقلاب آفریں خیالات و جذبات" کی ترجمانی ہے۔ حیات و کائنات کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی ہے۔ اقبال شاعری کے اس دوسرے پہلو کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں تخلیق حسن کم سے کم ان کی شاعری کے آخری دور میں کوئی بڑی چیز نہ تھی۔ یا اس کو وہ درجہ حاصل نہ تھا جو اصلاح، افادہ اور انقلاب کو حاصل ہے۔ اول اول وہ "دیدۂ بلبل" سے گل رنگین کا نظارہ کرتے تھے اور "دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں" سے انھیں کچھ سروکار نہ تھا لیکن آخر آخر ان کا نقطہ نگاہ بدلا اور انھیں یہ کہنا پڑا

جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا ؏

اقبال کے خیال میں حسن زندگی کی قدر نہیں۔ زندگی کی تہذیب زندگی کی قدر ہے۔ وہ اس حسن کو حسن نہیں سمجھتے جس میں زندگی کو سنوارنے اور اس کی الجھنوں کو سلجھانے کی صلاحیت نہ ہو۔ جو چارۂ دل بیمار نہ کرسکے کیٹس نے راستی کو حسن کا معیار قرار دیا تھا۔ اقبال کے یہاں راست بازی حسن کی کسوٹی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر تو خواجہ (حافظ) دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں[1]"

شعر کی ظاہری شیفتگی اقبال کے پیش رو اردو شعراء کے یہاں بھی تھی اور لکھنؤ میں اس کی لے اتنی بڑھی کہ بقول آتش "بندش الفاظ" نگوں کا جڑنا ہوا اور شاعری مرصع سازی۔ لیکن اس کو کیا کہیے گا کہ میر تقی میر جیسا شاعر بھی اس کے لئے تیار نہ تھا کہ اس کو شاعر کہا جائے

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے   درد و دل کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

اس کی دو ہی وجہ ہو سکتی ہیں۔ یا تو میر کے زمانے میں بھی شاعری مینا کاری تھی اور درد دل یا جذب دروں کی اس کے مقابلے میں چنداں اہمیت نہ تھی یا مسائل تصوف اور عارفانہ مضامین شعر کے لوازم میں سے تھے۔ میر عام انسانی جذبات اور ابن آدم کی قلبی کیفیات کے ترجمان تھے اس لئے انھیں اپنے کلام کو شاعری کہنے میں تامل ہوا۔ بہرحال جو وجہ بھی ہو میر اور اقبال

۱؎ اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۱۹۶   ۲؎ اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۴۲۷
۳؎ " " " ۱۰۸

۱؎ اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۵۲

میں اس لحاظ سے مشابہت ہے کہ میر کی طرح اقبال نے بھی شعر کی بارگاہ میں باریابی کو سرمایۂ شرف نہ سمجھا اور اپنے کو شاعر کہلانا پسند نہ کیا۔ میر نے درد دل جمع کر کے دیوان ترتیب دیا۔ اقبال نے "رازِ درونِ مے خانہ" بیان کر کے معارف پروری کا حق ادا کیا۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

اردو میں فارسی شاعری کے زیر اثر شعر کے لئے ظاہری محاسن اور فنی لوازم ضروری قرار دے لئے گئے تھے جو شعر کے لئے معیار کی حیثیت رکھتے تھے۔ جو اس پر پورا اترتا اسے شعر کہا جاتا۔ ذیل کی عبارت میں اقبال نے اس خیال کو بے نقاب کیا ہے۔

"قوالی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا بالکل بجا ہے۔ مگر چونکہ شاعری اس مثنوی سے مقصود نہ تھی اس واسطے بعض باتوں میں میں نے عمداً تساہل برتنا[1]۔"

ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"میرے زیر نظر حقائق اخلاقی و ملّی ہیں۔۔۔ فن شعر سے بھی میں بحیثیت فن کے نابلد ہوں[2]"

"شعریت" اور "معنویت" اقبال نے دو لفظ استعمال کئے ہیں۔ "شعریت" سے ان کی مراد فن کے اصول و لوازم مثلاً حسن بیان، لطف زبان، وزن، موسیقی، قافیہ وغیرہ کی مراعات ہے۔ اور "معنویت" انھوں نے جذبات انسانی اور کیفیت قلبی کی ترجمانی کو کہا ہے۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں۔

"میں نے آپ کا کلام دیکھا ہے اور تازہ نظمیں بھی۔ مجھے شعریت سے زیادہ معنویت نظر آئی اور میں بے حد متاثر ہوا[3]۔"

لیکن جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا اقبال کے نزدیک شعر کی جان معنویت ہے۔ اس کی تشریح خود انھوں نے اپنے ایک دوست کے خط میں کی ہے۔

"شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں[4]"

---

[1] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۸۵　[2] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۲۱۶
[3] " " " ۲۸۲　[4] " " " ۲۸۰

نئی نسل نے شعر کے فنی لوازم اور قدیم عروضی روایات کی خلاف ورزی کو نیا شعری تجربہ قرار دیا۔ اقبال کے خیال میں نئے تجربات کا میدان شعر کے موضوعات یعنی انسانی جذبات ہیں جو ماحول کے تابع ہوتے ہیں جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر ہیں وہ جدید رنگ کا حامل ہے۔ اصناف نظم اور فن و عروض کی بابت اقبال کی رائے ہے۔

"نظم کے اصناف کی تقسیم جو قدیم سے ہے ہمیشہ رہے گی۔۔۔۔ اگر ہم نے پابندئ عروض کی خلاف ورزی کی تو شاعری کا قلعہ ہی منہدم ہو جائے گا اور اس نقطۂ خیال سے یہ کہنا پڑے گا۔ اور یہ کہنا درست ہے کہ موجودہ شعراء کا کام تعمیری ہونا چاہئے نہ کہ تخریبی[1]"

اقبال کو اس کا احساس بھی تھا کہ قدیم عروضی روایات کی خلاف ورزی کسی ذاتی اپج یا طبعی جوش کا نتیجہ نہیں بلکہ انگریزی نظموں کی تقلید کا اثر ہے۔ اس لئے انھوں نے آج سے بیس برس پہلے پیشین گوئی کی تھی۔

"اب کچھ عرصے سے بلا ردیف و قافیہ نظمیں لکھی جاتی ہیں۔ اور یہ انگریزی نظموں کی تقلید ہے۔۔۔۔ اگرچہ پبلک مذاق کچھ ایسا ہو چلا ہے مگر میرے خیال میں یہ روش آیندہ مقبول نہ ہوگی[2]"

اقبال کے نزدیک تخلیق شعر ایک شعوری عمل ہے۔ شاعر پورے احساس ذمہ داری کے بعد شعر کہتا ہے۔ خود لفظ شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لاشعور کی پیداوار نہیں۔ اس نے شعور کی گہرائیوں سے جنم لیا ہے لیکن وہ بچّوں کا کھیل بھی نہیں۔ شعر بڑی جانکاہی چاہتا ہے۔ بقول غالب دل گداختہ پیدا کرنے کے بعد ہی "حسن فروغ شمع سخن" کا جلوہ نظر آتا ہے۔ شعر کے لئے خاص صلاحیتوں کی ضرورت ہے جو زیادہ تر فطری ہوتی ہیں۔ اس میں انسان کے کسب و کوشش کو اتنا ہی دخل ہے جتنا ماں کی چھاتی سے دودھ کی دھاریں بہانے میں بچّے کی گریہ و زاری کو۔ اقبال نے شعر کے ظاہر و باطن دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ شعر ڈھالا نہیں جاتا ڈھل کر آتا ہے کہا نہیں جاتا نازل ہوتا ہے۔ غالب نے صرف مقیاس کی حد تک شعر کو الہامی کہا تھا۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

---

[1] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۲۸۰　[2] اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۲۸۰

اقبال نے شعر کے تانے بانے اور اس کے در و بست کو کیفیت منجانب اللہ بتایا۔

" زبان کی سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کہہ جاتے ہیں بلا قصد کہہ جاتے ہیں۔ اسی کا نام آمد ہے۔ یہ کیفیت منجانب اللہ ہے کوشش سے حاصل نہیں ہوتی "

اور خیالات و جذبات یعنی شعری موضوعات کو خدا کی دین ٹھہرایا۔

" جذبات انسانی اور کیفیات قلبی اللہ کی دین ہے "

اردو کے جدید نقاد شاید اس پر ناک بھوں چڑھائیں لیکن مغرب کے نئے نقادوں میں سے ہربرٹ ریڈ نے بھی اپنی تنقیدی کتاب "ورڈسورتھ" میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے اور غیر مبہم الفاظ میں شاعری کو ایک الہامی کیفیت بتایا ہے۔

وارث کرمانی

رازِ سخن

کیا خبر تجھ کو نہیں سادہ ملاقات تری
کتنے مشکوک خیالوں کو جگا دیتی ہے
کتنے طوفان مرے سینے میں اٹھا دیتی ہے
کوئی نقطہ ہے جہاں تجھ سے ہراساں ہوں میں
بے دل و بے نظر و بے سر و ساماں ہوں میں
میرے آنے پہ وہ پُر کیف تبسم تیرا
جس میں مجھ کو نظر آتے ہیں ہزاروں پہلو
جس میں اخلاق ترحم نظر آتا ہے مجھے
فاتحانہ سا تکلم نظر آتا ہے مجھے
نرم و شیریں سے تقاضائے غزلخوانی پر
میں بہت دور بہت دور پہنچ جاتا ہوں
کہ مرے شعر کا مخزن تجھے معلوم نہ ہو
کہ مری فکر کی اُلجھن تجھے معلوم نہ ہو
میری بہکی ہوئی آواز نہ غمّاز بنے
میرا انداز نظر تجھ سے نہ سازش کر لے
تو یقیں حق سماعت کو ادا کرتی ہے
تجھ سے میں دادِ سخن پا کے تڑپ جاتا ہوں

ایسے چبھتے ہوئے ہوتے ہیں سوالات ترے
روح تخلیق کے سینے میں لرز جاتی ہے
تیرے بیتاب تجسّس کی ضیا پاش کرن
خلوت غم کے قریب آ کے گزر جاتی ہے
اور پھر تیرے خیالات بھٹک جاتے ہیں
میری تخئیل کی پرواز میں کھو جاتے ہیں
وجد آتا ہے تجھے ذہن کی نقّاشی پر
جھوم جھوم اٹھتی ہے تو میری جگر کاوی پر
تیری آنکھوں کی خطابت ترے لہجے کی مٹھاس
میری آواز کو نغموں میں سمو دیتی ہے
میرے الفاظ ترنّم میں پرو دیتی ہے
جوئے تسنیم میں ہر شعر ڈبو دیتی ہے

سالہا سال رہا ربط مسلسل تجھ سے
تو مگر آج تلک رازِ سخن پا نہ سکی
لاکھ مشاطگیٔ نقد و نظر کی تو نے
میرے افکار کے گیسو کبھی سلجھا نہ سکی

مغیث الدّین فریدی

نظیر اکبر آبادی

یہ ارضِ تاج تجھ پر نازاں ہے اے سخنور
اے بزمِ شاعری کے شیریں نوا قلندر
اے بے نظیر شاعر! تیری نظیر کیا ہے
تو زندگی کی دھڑکن شعروں میں بھر گیا ہے
اپنی زباں میں تو نے اک ایسا گیت گایا
اُردو کے شاعروں کو سچ بولنا سکھایا
جنتا کی سیدھی سادی ستھری زباں میں گا کر
احسان کر گیا ہے اُردو زباں کے اُوپر
ہر زاویے سے تو نے دیکھا ہے زندگی کو
پرکھا ہے زندگی کو، برتا ہے زندگی کو
عنوانِ زندگی سے نظموں کے لے کے آیا
"انجام" "تندرستی" "زر" "مفلسی" "بڑھاپا"
تو کیفِ آرزو کو درمانِ درد سمجھا
زہرِ حیات پی کر آبِ حیات چکھا
ظلماتِ زندگی میں پیدا کیا اُجالا
کانٹوں کو جب نچوڑا پھولوں کا رس نکالا
احساسِ زندگی کی تہہ تک پہنچ گیا ہے
رازِ حیات پا کر یہ بات کہہ رہا ہے
"من کی خوشی کی خاطر کچھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو"

نشور واحدی

غزل

گناہگار تو رحمت کو مُنہ دکھا نہ سکا
جو بے گناہ تھا وہ بھی نظر ملا نہ سکا
طرب ہے شیوۂ رندانِ عاقبت نشناس
جو گُل نہ تھا وہ گلستاں میں مُسکرا نہ سکا
بہت خفیف ہے کون و مکاں کی جلوہ گری
مری نگاہ کا گوشہ بھی جگمگا نہ سکا
سکونِ غم میں میسّر تھے چار تنکے بھی
جو شاخ چھوٹ گئی آشیاں بنا نہ سکا
گلوں کا کام ہے ایجادِ رنگ و بوئے چمن
یہ دل حجابِ گلستاں کی تاب لا نہ سکا
حوالۂ نگہِ شرمگیں ہوئیں آخر
وہ بجلیاں جو کہیں آسماں گرا نہ سکا
بدیعہ کار ہے ذہنِ خرد پسند مگر
تصوّرات سے تصویرِ غم بنا نہ سکا
عجب نہیں کہ گلستاں میں پا بہ گِل رہ جائے
وہ بدنصیب جو رمزِ خرام پا نہ سکا
جیا وہ پاک جو رکھتا تھا خارِ پیراہن
جو گل بجیب تھا دامن کبھی بچا نہ سکا
نشور نازکیِ طبع شعر کیا کہیئے
جہاں میں رہ کے زمانے کے ناز اُٹھا نہ سکا

عرش ملسیانی

فردوسی

(ایک ریڈیائی فیچر)

راوی۔ آج سے قریب قریب ایک ہزار سال پہلے ایران کے قدیم شہر طُوس میں وُہ نامور شاعر پیدا ہُوا جس کی ٹکر کے شاعر دنیا میں بہت کم ملتے ہیں۔ ایران کی قدیم تاریخ کو منظم کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی کا یہ کارنامہ تاریخِ عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ فارسی میں شاعری کے تین پیغمبر مانے گئے ہیں۔ قصیدے کے لئے انوری، غزل کے لیے سعدی اور بیت یا مثنوی کے لئے فردوسی۔ شاہ نامے کے باب میں خود فردوسی نے فخریہ انداز میں کہا ہے:۔

فردوسی۔ "میں نے تیس سال کی مدّت میں بہت رنج اُٹھائے ہیں لیکن میں نے فارسی شاعری سے ایران کو زندہ کر دیا ہے۔"

راوی۔ شاہ نامے کی عظیم تصنیف کا آغاز ایک دل چسپ واقعے سے ہُوا۔ ایک بھیانک رات تھی۔ خود اُس کے لفظوں میں

فردوسی "رات نے تاریکی میں اپنا منہ دھو لیا تھا۔ آسمان پہ نہ مرّیخ و عطارد تھے نہ زحل۔ نئے چاند نے انوکھی وضع کی آرائش پیش کی۔ ابتداء شب ہی سے رخصت کی تیاریاں کر لیں۔ اس کی کمر باریک تھی اور تاج سنہری تا جو ردی ہوا میں گرد کے زنگار پھیل چکے تھے۔ تاریک رات نے جنگل اور صحرا پہ سیاہ فرش بچھا دیا تھا۔ وہم نے کالے ناگ کی طرح منہ کھولے ہوئے شیطان آنکھوں کے روبرو کھڑے کر دئے۔ ہوا کی سنسناہٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ زنگی کوئلوں کی گرد اُچھال رہا ہے۔ آفتاب بے دست و پا اور زمین سیاہ چادر میں مُنہ چھپائے سرگرمِ خواب تھی۔ دنیا کے دل پر ہراس غالب گھڑیالی وقت سے بے خبر سنسانی اور ہُو کا عالم۔ نہ پرندوں کی چیخ اور نہ درندوں کی للکار۔"

راوی۔ ایسی اندھیری رات میں فردوسی تنہا باغ میں سو رہا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

فردوسی۔ (جماہیاں لینے کی آواز) کمبخت نیند کہاں چلی گئی (گھبراہٹ سے اُٹھتا ہے اور بیوی کو آواز دیتا ہے) جانِ من! ذرا ادھر تو آؤ۔ چراغ لاؤ۔

بیوی۔ (ملحقہ مکان سے آواز دیتی ہے) حاضر ہوتی ہوں (آتی ہے) یہ کیا ہو گیا تمھیں سو کیوں نہیں جاتے۔

فردوسی۔ نیند کہاں سے لاؤں۔ ذرا کوئی ساز ہی چھیڑو۔

بیوی۔ لیجئے۔

(ساز کی آواز......)

بیوی۔ اگر تمھاری خوشی ہو تو دفترِ پاستان سے میں تم کو ایک ایسی داستان سناؤں جو رزم، بزم، فریب اور محبّت کے واقعات سے بھری ہے جس کے سننے سے تم کو آسمان کی نیرنگیوں پر حیرت ہو گی۔

فردوسی۔ واہ واہ! یہ داستان میں ضرور سنوں گا۔

بیوی۔ لیکن ایک شرط ہے۔ تمھیں اس داستان کو نظم کرنا ہو گا۔

فردوسی۔ مجھے منظور ہے۔

راوی۔ یہ خوش قسمت داستان جو اُس رات فردوسی کو سنائی گئی داستان بیژن تھی۔ اس کے واقعات کچھ ایسے ہیں کہ جنسِ لطیف کی پسند کے سامان اس میں بہت ہیں۔ فردوسی کی بیوی نے کہانی شروع کی۔

بیوی۔ نوجوان بیژن جنگلی سوروں کو ختم کرنے کے لئے کیخسرو کے دربار سے رخصت ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ گرگین ایساہ غایانہ اور کینہ پرور ساتھی ہے۔ بیژن اس مہم میں کامیاب ہو کر سوروں کی دو انتیاں جمع کر لیتا ہے تو گرگین اس پر حسد کرتا ہے۔ وہ بیژن کی شہرت خاک میں ملانے کے لئے فریب کا جال گانٹھتا ہے اور ایک خوشنما مرغزار میں لے جاتا ہے جہاں

تورانی لڑکیاں سیر و تفریح کے لئے آتی ہیں۔ افراسیاب کی بیٹی منیژہ بیژن پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور اُسے خیمے میں بلواتی ہے۔

فردوسی - یہ قصّہ تو بہت دل چسپ ہے۔ اس سے پہلے کبھی مجھے سنایا ہوتا۔ تو پھر کیا انجام ہُوا منیژہ اور بیژن کی محبّت کا۔

بیوی - منیژہ بیژن کو اپنے محل میں لے گئی۔ افراسیاب کو خبر ملی تو اس نے بیژن کو ایک کنوئیں میں قید کر دیا اور منیژہ کی جائداد ضبط اور محل لٹا دیا گیا جوگن کے لباس میں شاہی محل سے نکال دی گئی۔ وہ زبانِ حال سے کہہ رہی تھی :-

منیژہ - جوگن پھرے اداس ، بیا بن جوگن پھرے اداس

تن پہ بھبھوت گلے میں مالا

انگ انگ یوون متوالا - لوگ کریں اُپہاس

بیا بن جوگن پھرے اُداس

آنسو پی کر گاتی جائے

من کا بھید چھپاتی جائے

تجھے نہ من کی پیاس

بیا بن جوگن پھرے اُداس

بیوی - روٹی جو در در بھیک مانگ کر لاتی ہے اس سے اپنا اور قیدی کا پیٹ پالتی ہے۔ رستم سات پہلوانوں کو ساتھ لے کر تاجرانہ بھیس میں توران بغرضِ رہائی بیژن پہنچتا ہے۔ منیژہ رستم کو پہچان کر اُس سے بیژن کی رہائی کی درخواست کرتی ہے۔ رستم اس خیال سے کہ راز فاش نہ ہو جائے اُسے ڈانٹتا ہے۔ اس ڈانٹ کے جواب میں منیژہ رستم سے کہتی ہے :-

کہوں تجھ سے اپنا میں کیا حالِ زار

کہ روتی ہے خوں چشمِ خوں نابہ بار

سن اے فخرِ ایران و تاجِ کیاں

دکھائی نہیں تیرے شایانِ شاں

یہ زیبا نہیں ہے کہ یوں آئے پیش

مرا دل مصیبت سے ہے ریش ریش

نہیں ہے یہ دستورِ ایرانیاں

کہ ڈانٹو اُسے جو ہو ناشادماں

نہ دھمکا مجھے مثلِ جنگ آوراں

کہ سر پہ ہے وہ داورِ داوراں

منیژہ ہوں میں دُختِ افراسیاب

برہنہ نہ دیکھے جسے آفتاب

پئے اُلفتِ بیژنِ شور بخت

کئے ترک سب میں نے تاج اور تخت

بیوی - رُستم منیژہ کی نشان دہی کے بعد ایک شب اس کنوئیں سے بیژن کو نکال لیتا ہے۔ رستم افراسیاب کے محل میں داخل ہوتا ہے۔ افراسیاب اُس کی آواز سُن کر بھاگ جاتا ہے۔ رستم اور اُس کے ساتھی پہلوان ایران کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ افراسیاب لشکر لے کر آ پہنچتا ہے۔ سخت معرکے کے بعد رستم فتح یاب ہوتا ہے۔ اور منیژہ اور بیژن کو ساتھ لے کر ایران واپس آتا ہے۔

فردوسی - سبحان اللہ۔ یہ داستان تو واقعی نظم کرنے کے قابل ہے۔ میں ابھی فکرِ سخن میں ڈوبتا ہوں۔ تم سو جاؤ۔

(بیوی کے جانے کی آواز)

راوی - فردوسی نے اس طرح شاہ نامے کی ابتدا کی۔ ابو منصور نے جو طوس کا صوبہ دار تھا اس کی سرپرستی کی۔ ابو منصور کے مرنے کے بعد طوس کا عامل سلان خاں مقرر ہُوا۔ چونکہ شاہ نامے کا اب چرچا پھیلتا جاتا تھا سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی۔ فردوسی کو بلوا بھیجا۔ فردوسی نے غزنین کا عزم کیا۔ ہرات پہنچا تو اسے غزنین جانے سے روکا بھی گیا۔ لیکن اس نے سوچا کہ قسمت آزمائی کرنی ہی چاہیئے۔ غرض ہرات سے چل کر غزنین میں آیا اور ایک باغ کے قریب ٹھہرا۔ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی شہر میں جن لوگوں سے رسم و راہ تھی ان کو اپنے آنے کی اطلاع کی۔ چلتا پھرتا باغ میں جا نکلا۔ حُسنِ اتّفاق سے دربار کے ممتاز شعراء یعنی عنصری، فرّخی، عسجدی باغ میں سیر کو آئے تھے اور ناؤ نوش میں معروف تھے۔

فردوسی بھی ادھر جا نکلا۔ انھوں نے اس کو مخلِ صحبت سمجھا۔ طے پایا کہ رباعی کا ایک ایک مصرع ہم کہیں۔ اگر یہ چوتھا مصرع کہہ دے تو شریکِ صحبت کر لیا جائے۔

راوی - عنصری نے کہا

عنصری۔ عارض سا تیرے ماہ نہیں ہے روشن

راوی۔ فرخی نے کہا:۔

فرخی ۔ خالی ہے گلِ رُخ سے ترے ہر گلشن

راوی ۔عسجدی نے کہا:۔

عسجدی۔ پلکیں تری کر دیتی ہیں چھلنی جوشن

راوی ۔ فردوسی نے بڑی بے ساختگی سے کہا:۔

فردوسی جس طرح کہ ہو گیو کے نیزے سے پشن

راوی۔ روشن، گلشن اور جوشن کا ہم قافیہ لفظ جو شن اور نَ پر ختم ہو، فارسی زبان میں موجود نہیں تھا۔ یہی کمال ان تینوں شاعروں نے کیا کہ اگر شاعر بھی ہو گا تو کیا کرے گا۔ لیکن فردوسی نے شاہ نامہ نظم کرنے کی ٹھانی تھی اور داستانِ پاستان میں گیو اور پشن کی لڑائی کا حال پڑھا تھا۔ عنصری اور اس کے ساتھیوں کے اصرار پر فردوسی نے یہ قصّہ انھیں سنایا۔ اس کے بعد بہت سی روائتیں ہیں۔ فردوسی کو دربار تک پہنچنے میں بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سلطان محمود نے اپنے ایک دوست ماہک کی سفارش پر فردوسی کو دربار میں طلب کیا۔ کلام سُنا اور بہت خوش ہُوا

محمود۔ میں بہت محظوظ ہُوا۔ شاہ نامے کی تصنیف تمہارے سپرد کی جاتی ہے۔

فردوسی بہت شکریہ جہاں پناہ کا۔

محمود ۔ اور دیکھو۔ وزیرِ باتدبیر۔ فردوسی کو ایوانِ شاہی کے قریب ایک مکان دیا جائے جو تمام ضروری ساز و سامان سے آراستہ ہو اور آلاتِ جنگ، اسلحۂ حرب، شاہانِ عجم اور پہلوانوں کی تصویروں سے سجا دیا جائے۔ اور ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی دی جائے۔

راوی۔ فردوسی نے چار سال تک غزنیں میں قیام کیا اور شاہ نامے کی تصنیف میں مصروف رہا۔ پھر وطن گیا اور کئی برس رہ کر واپس آیا۔ اس اثنا میں جو حصّہ تیار ہو چکا تھا محمود کے حضور میں پیش کیا اور تحسین و آفرین کے صلے حاصل کئے۔ علمی تاریخ کا یہ نہایت ناگوار واقع ہے کہ فردوسی کو اس کی اعجاز بیانی کی داد نہیں ملی۔ جب شاہ نامہ تیار ہُوا تو اس کو اشرفیوں کے عوض روپے دلوائے گئے۔

فردوسی حمام میں نہا رہا تھا کہ شاہ نامے کا صلہ پہنچا۔ فردوسی حمام سے نکلا تو ایاز نے روپے کی تھیلیاں پیش کیں۔ فردوسی نے بڑی بیتابی سے دستِ شوق بڑھایا۔ لیکن سونے کے پھل کے بجائے چاندی کے پھول نکلے۔ فردوسی کے دل سے آہ نکلی اور تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹا دیں۔ اور ایاز سے کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ میں نے یہ خونِ جگر ان سفید دانوں کے لیئے نہیں کھایا تھا۔

فردوسی نے غزنیں کو چھوڑ دیا۔ ایک سر بمہر لفافہ ایاز کو دیا کہ میرے جانے کے بیس دن بعد بادشاہ کو دینا۔ فردوسی ہرات کو روانہ ہُوا۔ لفافے کی مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے۔

بہت بندگی میں نے کی شہریار کہ تجھ سے جہاں میں رہے یادگار
بنا نظم سے میری کاخِ بلند نہ ہو باد و باراں سے جس کو گزند
بسے رنج بُردم دریں سال سی عجم زندہ کردم بدیں پارسی
بنائی سخن سے یہ سرسبز کشت سخن سے جہاں کو بنایا بہشت
نہ تھی عقل پر شاہ کو دسترس گاہ دگرنہ مجھے بخشتا تخت گاہ
جو ہوں ناپدید ان کو کرنا پدید اور ان سے بھلائی کی کرنا امید
یہ خود کو مٹانے کی ہے اک رَوِش یہ ہے جیب میں سانپ کی پرورش
اگر شاہ کا شاہ ہوتا پدر مرے سر پہ رکھ دیتا وہ تاجِ زر
اگر شاہ بیگم کا ہوتا پسر مرے زانو تک ہوتے سیم اور زر
وہ بوٹا کہ ہو تلخ اس کی سرشت لگائے اسے گر یہ باغِ بہشت
اسے خلد کی نہر سے دے کے آب جڑوں تک بھی پہنچائے گر شہد ناب
وہی میوۂ تلخ پھل لائے گا وہ فطرت سے اپنی نہ پھر پائے گا
جو بد ہیں نہ چھوڑیں گے بد گوہری سیاہی سے راتیں نہ ہونگی بری
نہ ناپاک زادے سے رکھو امید کہ دُھلنے سے زنگی نہ ہو گا سفید
نہیں آتا لونڈی بچہ کوئی کام اگرچہ پدر ہو شہ نیک نام
کہیں میں نے یہ بیت ہائے بلند کہ تا شاہ لے ان سے کچھ کار پند
کہ رنجیدہ شاعر کہے گا ہجا رہے گی ہجا تا قیامت بجا

راوی۔ کلام کی جہاں گیری دیکھئے۔ محمود نے دنیا کی بڑی سلطنتیں مٹا دیں ملک کے ملک غارت کر دئے۔ عالم کو زیر و زبر کر دیا۔ لیکن فردوسی کی زبان سے جو بول نکل گئے وہ آج تک قائم ہیں اور قیامت تک مٹ نہیں سکتے۔

وہی فردوسی جس نے ایک ہزار سال پہلے جدید ایران کی بنیاد رکھی۔ جو اپنی عظمت اور اپنے بزرگوں کی عظمت کا اس قدر شیدائی تھا کہ عربوں کے

خلاف یہاں تک کہہ گیا۔

اونٹ[1] کا دودھ اور گوہ کا گوشت کھانے والے عرب اب یہاں تک آ پہنچے کہ تختِ کیانی کی آرزو کریں۔ اس گھومنے والے آسمان پر لعنت اور ہزار لعنت

یہ وہی فردوسی ہے جس کے متعلق ایک فارسی شاعر کے قول کا ترجمہ یہ ہے۔

پہلی آواز —— قدرشناسی[2] اچھی ہے کہ جب اس جھکے ہوئے آسمان نے حادثے کا تیر چلایا محمود کی شان و شوکت ختم ہو گئی اور زمانے میں اس افسانے کے سوا کچھ نہ رہا کہ اس نے فردوسی کی قدر نہ پہچانی۔

یہ وہی فردوسی ہے جس نے اتنی بڑی تصنیف میں تیس پینتیس سال اپنا خونِ جگر صرف کیا اور فخریہ انداز میں کہا۔

دوسری آواز —— مشہور[3] پہلوان رستم کو میں نے تخلیق کیا ہے ورنہ وہ سیستان کا ایک معمولی پہلوان تھا۔

راوی ۔ یورپ کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے۔ اس کا کارنامۂ فخر رزمیہ شاعری یا ایپک پوئم ہی ہے۔ مہا بھارت بھی مشہور رزمیہ نظم ہے۔ اگر دونوں کے پہلو میں کسی کو جگہ دی جا سکتی ہے تو وہ شاہ نامہ ہی ہے۔

لڑائی کے ذکر میں فردوسی کا کوئی جواب نہیں۔ آج سے دو ہزار برس کے پرانے ہتھیاروں کا ذکر عام ہے۔ اس زمانے کے باجے یہ تھے۔

بتیرہ، گاؤ دم، خرمہرہ، کوس، طبل، نقارہ، کرنائے، سرغنیں۔

آلاتِ جنگ میں گرز، تیغ، سپر، خنجر، ژوپین، ناوک، کمند، سناں نیزہ، پرتاب، مراتب، علم وغیرہ۔

لڑائی کے جتنے طریقے تھے یعنی کشتی لڑنا، تلوار چلانا، تیر مارنا، کمند پھینکنا، برچھی چلانا وغیرہ سب کی تفصیل شاہ نامے میں ملتی ہے۔

فردوسی نے پند و نصیحت کے موتی بھی لٹائے ہیں۔ اُن میں سے چند یہ ہیں:۔

پہلی آواز — توانا بود ہر کہ دانا بود یعنی جو شخص عقل رکھتا ہے وہ طاقت رکھتا ہے۔

دوسری آواز — میں نے عاقل سے سنا ہے کہ دنیا میں عقل بہت ہے لیکن کسی ایک شخص کے پاس جمع نہیں بلکہ تھوڑی تھوڑی سب کے پاس ہے۔

پہلی آواز ۔ اگر دوست کا نٹا ہے تو خود تمہارا بویا ہوا ہے
اور اگر کمخواب ہے تو خود تمہارا بُنا ہُوا ہے

دوسری آواز —— رستم کا قول ہے کہ اگر نام چاہتے ہو تو سخاوت اختیار کرو لیکن نہ اس قدر کہ نادار بن جاؤ۔ دنیا کے لوگ مفلسی سے عار رکھتے ہیں۔

پہلی آواز —— کھاؤ پہنو، دو اور دلاؤ۔ لیکن کل کے لیے بھی کچھ رکھ چھوڑو

دوسری آواز ۔ سینکڑوں باتیں آدھے عمل کے برابر نہیں۔

پہلی آواز ۔ تم کو جہاں تک زمین ملے۔ دوست بوتے جاؤ۔

دوسری آواز ۔ آسمان کے دو دل ہیں۔ ایک دشمنی سے بھرا ہُوا اور ایک محبّت سے۔

پہلی آواز ۔ عزیز کا عتاب دشمن کی محبّت سے اچھا ہے۔

راوی ۔ ایشیا کی نسبت عام شکایت ہے کہ یہاں نامور پرستی کا جوش نہیں۔ ان ملکوں میں ہزاروں نامور گزرے لیکن کسی شاعر نے یہ نہیں لکھا کہ قوم نے اس کے کمال کی کیا قدر کی۔ اس کے مرنے کا ملک پر کیا اثر ہُوا۔ لوگوں نے کیونکر اس کا ماتم کیا۔ لیکن فردوسی نے متعدد موقعوں پر مؤثر طریقے سے اس کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً رستم

ع۱ ز شیرِ شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

ع۲ خوش است قدرشناسی کہ چوں خمیدہ سپہر
سہامِ حادثہ را کرد عاقبت قوسی
گزشت شوکتِ محمود و در زمانہ نماند
جز ایں فسانہ کہ نشناخت قدرِ فردوسی

ع۳ منم ساختم رستمِ داستاں
دگرنہ یلے بود در سیستاں

پنڈت جواہر لعل نہرو
کا
دورۂ چین



پنڈت جی مسٹر یونو وزیر اعظم برما
سے رنگون میں مصروف گفتگو ہیں

ہنوئی میں ڈاکٹر ہوچی منہہ ویٹ نام ڈیموکریٹک ریپبلک کے صدر
اور پنڈت جی کے درمیان پہلی ملاقات ہوئی





پنڈت جی شاہ کمبوڈیا کے ساتھ



۲۳ اکتوبر کو چلا

شنگھائی میں ۲۸ اکتوبر کو پنڈت جی ینگ پاؤنیر پیلیس میں بچوں کے ساتھ



پنڈت جی



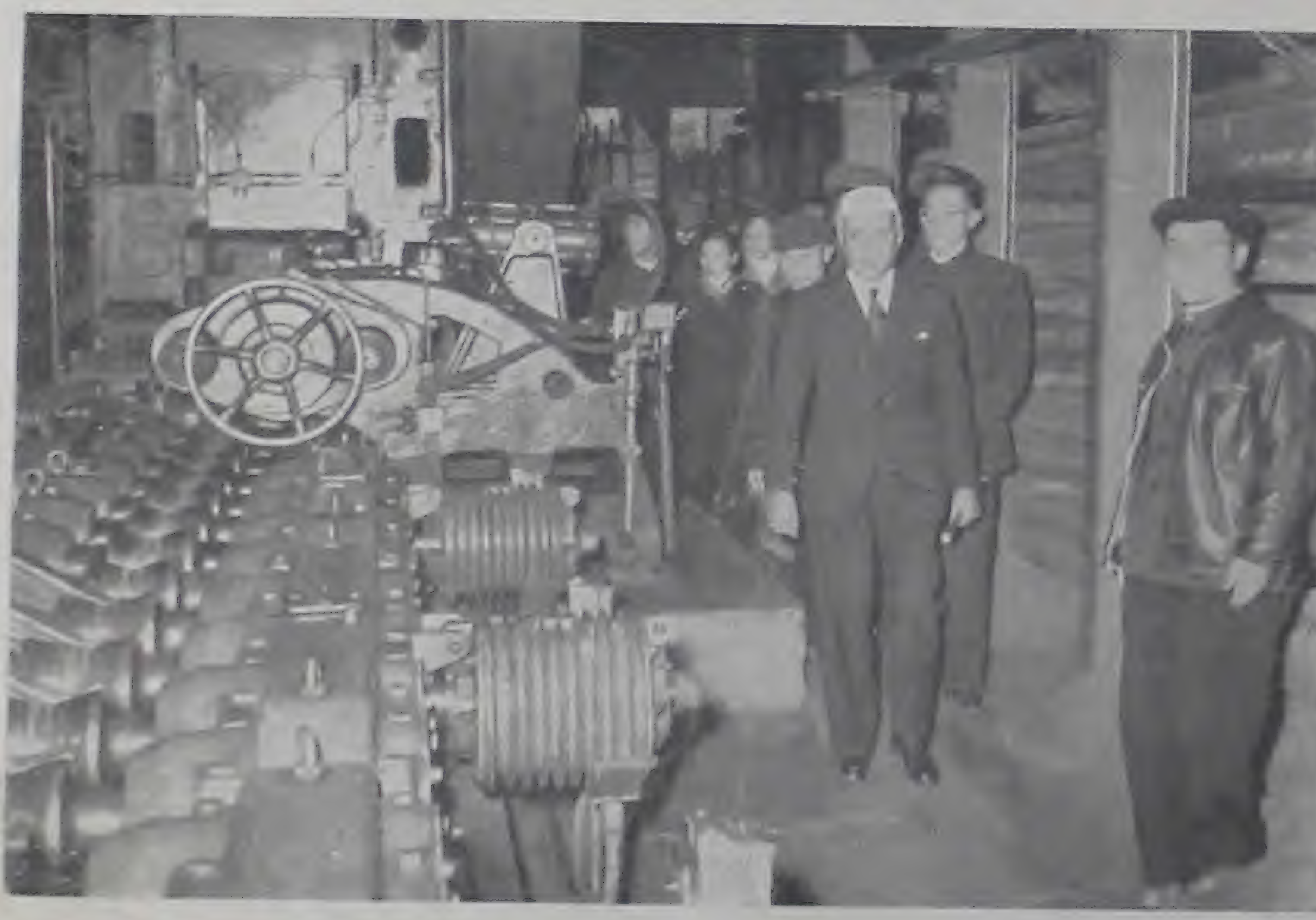




پیکنگ میں چینی عوام کو خطاب کر رہے ہیں

پنڈت جی پیکنگ میں ٹمپل آف ہیون میں
شریمتی اندرا گاندھی بھی ساتھ ہیں

پنڈت جواہر لال نہرو انشن اسٹیل فیکٹری میں



کے صدر ماؤ سی تنگ





پنڈت جی
صدر ویت نام نوڈن ڈیم کے ساتھ

واپسی پر پالم کے ہوائی اڈے پر
راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد مولانا آزاد اور سفیر مصر استقبال کنندگان میں



غزلیں

ابو محمد سحرؔ

اک نگاہِ آشنا اور زندگی بھر کا ملال!
دل میں ایسی دھڑکنیں اُٹھیں کہ پیہم ہو گئیں

آپ نے سعیٔ کرم کی آپ گھبرائیں نہیں
میری آنکھیں تو وفورِ شوق سے نم ہو گئیں

اُلجھنوں میں مہلتِ احساسِ بربادی نہ تھی
اُلجھنیں جب کم ہوئیں تمہیدِ ماتم ہو گئیں

دُوریٔ جنّت میں تھا جنّت کا حسن دل فریب
کتنی تصویریں قریب آنے سے مبہم ہو گئیں

کچھ غمِ جاناں کی زُلفیں خود بھی تھیں بکھری ہوئیں
کچھ غمِ دوراں کے ہاتھوں اور برہم ہو گئیں

کارواں بڑھتا گیا ذوقِ سفر میں دمبدم
منزلیں گرد و غبارِ راہِ آدم ہو گئیں

وہ بہارِ صد بہاراں سامنے کیا آ گیا
فکر کی رنگینیاں گویا مجسّم ہو گئیں

زندگانی کا مزاج ان شورشوں کے دم سے تھا
وائے ناکامی کہ اب وہ شورشیں کم ہو گئیں

اُن کی یادوں نے بھی کیا کیا کھیل کھیلے دل کے ساتھ
بن گئیں کچھ غم سحرؔ کچھ حاصلِ غم ہو گئیں

ساحرؔ ہوشیارپوری

ہم نے مانا ابتدائے بے رُخی ہم سے ہوئی
آپ بھی مانیں، وفاؤں میں کمی ہم سے ہوئی

دشمنِ دل کو بھی آنکھوں میں جگہ دی شوق سے
دہر میں تکمیلِ رسمِ دوستی ہم سے ہوئی

اذنِ خوش گوئی لبِ خاموش سے ہم کو ملا
رُوحِ افسردہ میں پیدا تازگی ہم سے ہوئی

سادگی کو ہم نے بخشا اک جمالِ دل فروز
حُسن میں رخشندگی، تابندگی ہم سے ہوئی

ہر گماں کو غازۂ حسنِ یقیں ہم نے دیا
سیم تن، زر پوش، گل رخ زندگی ہم سے ہوئی

اک نئی سج دھج ملی رعنائیٔ افکار کو
گلشنِ لفظ و بیاں میں دل کشی ہم سے ہوئی

ہر تصوّر کو عطا حُسنِ نظر ہم نے کیا
غیب کے ظلمت کدوں میں روشنی ہم سے ہوئی

آپ سے ملنے کی خاطر ہم سے سب ملنے لگے
آپ کو بھی کس قدر دلبستگی ہم سے ہوئی

کیا غلط ہے یہ کہ خونِ آرزو تم سے ہوا
اور اس پر بھی نہ اُلفت میں کمی ہم سے ہوئی

صالحہ عابد حسین

کچھ دن المانیہ میں

جرمنی کو عربی و فارسی میں المانیہ کے نام سے پکارا جاتا ہے اور ایک زمانے تک اردو میں بھی اس کو المانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ پچھلے سال مجھے اس دیس میں جانے اور رہنے کا موقع ملا جو کئی لحاظ سے دنیا کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔

۷ جون ۱۹۵۳ء کو میں اپنے شوہر کے ساتھ اطالوی جہاز "وکٹوریہ" سے جرمنی کے لئے روانہ ہوئی۔ یہ بہت خوبصورت، آرام دہ اور ایرکنڈیشنڈ جہاز ہے جس میں گرمی کی تکلیف بالکل نہیں ہوتی۔ البتہ ہر طرف سے بند۔ کیبنوں میں اور کمروں میں طبیعت ضرور الجھتی ہے۔ ہاں عرشے پر جا کر تازہ ہوا کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ کھانا بہت عمدہ، بہت سادہ اور اطالوی و ہندوستانی "ویجی ٹیرین" اور "نان ویجی ٹیرین" دونوں طرح کا ملتا ہے۔ تین چار دن عدن تک جہاز میں تلاطم رہا اور طبیعت بہت بے کیف رہی مگر عدن کے بعد سے موسم بہت خوشگوار ہو گیا۔ دن کا زیادہ وقت ہم لوگ عرشے پر گزارتے تھے۔ ہمارے عرشے سے ملا ہوا کوئی قد آدم اونچا فرسٹ کلاس کا وسیع و شاندار عرشہ تھا اور یہ اونچے درجے کے لوگ اوپر سے اپنے سے "کمتر" مسافروں کا نظارہ کر سکتے تھے۔ لوگ آپس میں اشارے اور بات چیت بھی کر لیتے۔ جب جہاز کسی مقام پر پہنچتا تو طبقے و درجے کے اس مقفل دروازے کو کھول دیا جاتا تھا اور دونوں طرف سے مسافر ایک دوسرے کے ہاں جا سکتے تھے یا عید کے دن نماز عید کے لئے خاص طور پر یہ مقفل دروازہ کھولا گیا تھا اور فرسٹ کلاس کے سب مسلمان مسافر ہمارے درجے میں آ گئے تھے اور عرشے کے پچھلے حصے میں نماز عید ادا کی تھی۔ ہمارے عرشے پر ایک چھوٹا سا نہانے کا تالاب تھا۔ کسی پورٹ پر پہنچ کر سامان اتارنے کے لئے اس تالاب کے تختے وغیرہ نکال کر سب سے نچلی منزل کے "بیگج روم" سے سامان نکالنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور پھر تختے لگا کر اور پانی بھر کر تالاب بنا دیا جاتا تھا۔ یہ تالاب تھا تو چھوٹے بچوں کے تیرنے کے لئے جس میں دن بھر پیارے پیارے یوروپین اور امریکن بچے مچھلی کی طرح تیرا کرتے تھے مگر پانچ چھ دن بعد بڑوں کو بھی شوق اٹھا۔ اور اکثر امریکن اور یوروپین عورتیں برائے نام (تیراکی کا) لباس پہن کر اور بعض من چلے ہندوستانی سر پر اونچا جوڑا باندھ کر اور نیلے کچھے پہن کر اس ننھے سے تالاب میں کود پڑتے اور ان مہاشیروں کی وجہ سے بچارے بچوں کو اپنی یہ دل پسند تفریح بند کرنی پڑتی۔ مجھے بڑا برا معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹے بچوں کی خوشی اور ورزش کا خیال کئے بغیر یہ بڑے حضرات ان کے حق پر کیوں قبضہ جما لیتے ہیں۔ اور بھی انڈور قسم کے دوسرے کھیل مرد اور عورتیں کھیلتے رہتے تھے۔

ہم عدن، سوئز، پورٹ سعید ہوتے اور ان عربی و مصری بندرگاہوں کی سیر کرتے ہوئے ۱۱ جون کو اٹلی کی بندرگاہ نیپلز پہنچے جس کا اطالوی نام نیپولی ہے۔ یہاں آدھے دن جہاز ٹھہرتا تھا۔ چنانچہ ہم سب مسافر بسوں میں بیٹھ کر نیپلز سے کچھ دور پوم کے مشہور تاریخی شہر کے کھنڈرات دیکھنے گئے۔ دو ہزار برس پہلے یہ شہر ۱۲ فٹ اونچی پتھروں کی قبر میں دفن ہو گیا تھا جو ہزاروں برس بعد کھود کر نکالا گیا۔ یہ ایسا خوبصورت، شاندار اور خوبی سے بنا ہوا شہر ہے جس کی پائداری اور ترتیب و خوبصورتی دو ہزار برس بعد تک بڑی حد تک باقی ہے۔ اگلے دن دوپہر کو ہم جنیوا پہنچ گئے۔ اب ہمارا جہاز کا سفر ختم ہوا۔ کسٹم وغیرہ کے جھگڑوں سے نپٹ کر اور جہاز والوں اور قلیوں وغیرہ کی بد انتظامی اور بے پروائی کو جھیل کر آخر شام کو اسٹیشن پہنچے اور آٹھ بجے انٹرنیشنل ٹرین میں بیٹھ کر جرمنی کی طرف روانہ ہوئے۔ صبح بہت

سویرے اٹلی کی سرحد سے گزر کر ہماری گاڑی سوئیٹزرلینڈ میں داخل ہوگئی گرمی کا زمانہ تھا جب یورپ میں دن بہت بڑے ہوتے ہیں۔ صبح کے تین بجے سے پو پھٹنے لگتی ہے اور چار بجے ہی سے سورج کے سندر مکھ کے درشن ہو سکتے ہیں۔ صبح کے اس سہانے سمے میں ہم نے دنیا کے اس حسین ترین دیس کی جھلک دیکھی اور اس خواب آلود فضا میں واقعی وہ اس دنیا کی کوئی بستی معلوم ہونے کی جگہ سپنوں کا دیس یا پرستان کا کوئی ملک معلوم ہو رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر بے اختیار کشمیر کے مناظر یاد آرہے تھے اگرچہ یہ اس سے کہیں زیادہ صاف ستھرا با ترتیب اور زیادہ شاداب و سرسبز تھا۔

"زورش" سے جو سوئٹزرلینڈ کا ایک بہت بڑا اور بہت خوبصورت شہر ہے ہم نے جرمنی کے لئے ریل بدلی اور اب بجلی کی صبا رفتار ٹرین کی جگہ کوئلے سے چلنے والے انجن کی معمولی ریل میں جو اسی طرح اٹک اٹک اور جھٹک جھٹک کر چلتی ہے ہم آگے کی طرف روانہ ہوئے۔

جرمنی یورپ کے خاصے بڑے ملکوں میں شمار ہوتا ہے (مگر ہمارے دیس کے ایک بڑے صوبے سے شاید ہی کچھ بڑا ہو) اس کا بڑا حصہ پہاڑی ہے اور جنوبی جرمنی کا یہ علاقہ جس میں سے ہم اب گزر رہے تھے خاص طور پر سرسبز و شاداب اور خوشنما ہے۔ اگرچہ نہ یہاں ہمالیہ یا الپس جیسے فلک بوس پہاڑ ہیں اور نہ گنگا و برہم پتر جیسے وسیع دریا اور نہ ڈل اور زورش جیسی لمبی چوڑی جھیلیں مگر اس کا حسن بھی اپنی ایک خصوصیت اور شان رکھتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سبزے سے ڈھکی پہاڑیوں کی گود میں بہتی ہوئی ندیاں، لالہ و گلاب کے پھولوں کی بہتات، سفیدے چنار، بید کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ، سیب، چیری، خوبانی، آڑو وغیرہ پھل دار درختوں کے میلوں پھیلے ہوئے باغ، گھاس کے سنہرے اور مکئی کے ہرے ہرے لہراتے ہوئے کھیت، دوب کے مخملی ڈھلوان نیلے آسمان پر چمکتا ہوا سورج اور جگہ جگہ سفید بادل کے بھاگتے ہوئے ٹکڑے چھوٹے چھوٹے رنگین مکان اور ان میں کام کرتے ہوئے محنت کش عورتیں اور مرد اور گلاب کی طرح کھلے ہوئے پھول سے بچے، حسن و رنگینی کا ایسا سندر سین تھا جس پر سے نظر ہٹائے نہ ہٹتی تھی۔

گیارہ بجے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ جرمنی کا ایک چھوٹا سا شہر ہے جس کو ٹیوبنگن کہتے ہیں۔ یہ اپنی پانچ سو سالہ یونیورسٹی کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور یونیورسٹی ٹاؤن کہلاتا ہے۔ اس کی تقریباً پچاس ہزار کی آبادی ہے جس میں یونیورسٹی کے پانچ ہزار طالب علموں، ان کے استادوں اور دوسرے اسٹاف کے علاوہ زیادہ تر کسانوں، کاشتکاروں وغیرہ کی آبادی ہے۔ یہ شہر دریائے نیکار کے کنارے اونچی نیچی پہاڑیوں پر بسا ہوا ہے۔ پرانے شہر کی گلیاں اور سڑکیں اینٹوں اور پتھر کی ہیں۔ جیسی ہمارے ہاں کے قصبوں میں ہوتی ہے۔ یہاں کا شاندار گرجا، ایک بہت پرانا اور وسیع قلعہ اور کچھ اور قدیم زمانے کی عمارتیں ہیں۔ اور اس کے علاوہ یونیورسٹی کی چھوٹی بڑی، نئی پرانی پچاس بلڈنگیں آٹھ دس بڑی بڑی عمارتیں تو مختلف امراض کے اسپتالوں کی ہیں جن میں طبی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور دوا علاج بھی ہوتا ہے۔ اس یونیورسٹی میں دنیا بھر کے علوم کی اور بہت سی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں سنسکرت، فارسی اور عربی بھی شامل ہیں اور حال ہی میں کچھ ہندی پڑھانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

میں اگرچہ جرمنی میں کئی مہینے رہی لیکن وہاں کی زیادہ سیر نہیں کر سکی۔ دو تین بڑے شہر، دو چار قصبے اور کچھ گاؤں ہی دیکھ پائی۔ البتہ وہاں کے لوگوں کو زیادہ قریب سے دیکھنے، ان کی سیرت اور اخلاق کا مطالعہ کرنے اور ان کی گھریلو زندگی کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع ضرور ملا۔

"اشٹٹ گارٹ" پہاڑوں کی گود میں آباد پانچ چھ لاکھ کی آبادی کا بڑا خوبصورت شہر ہے۔ اس کے چاروں طرف پہاڑیوں کا گھیرا ہے جس نے اس شہر کو زمردین پیالے کی صورت بخش دی ہے۔ یہاں اونچی اونچی عمارتیں شاندار گرجا، قدیم زمانے کی عمارتیں، عالی شان دکانیں بھی ہیں اور جگہ جگہ بم باری سے تباہ شدہ عمارتیں بھی نظر آتی ہیں جن کی دوبارہ مرمت کی جا رہی ہے۔ باغوں، پھولوں، سرسبز لانوں، فواروں اور چھوٹے بڑے پارکوں کی ہر جگہ کثرت ہے۔ خوبصورت دریائے نیکر یہاں بھی بہتا ہے اور اس کی خوبصورتی کو بڑھاتا ہے۔ اس شہر میں کارخانے اور فیکٹریاں بھی بہت سی ہیں۔ جن میں کچھ ہندوستانی مزدور بھی کام کرتے ہیں۔ یہاں چالیس کے قریب ہندوستانی طالب علم بھی ہیں۔

فرانک فورٹ وسط جرمنی میں بہت بڑا اور اہم شہر ہے۔ یہ

جرمنی سے دوسرے شہروں کی طرح زیادہ خوبصورت نہیں۔ کالی کالی عمارتیں ہر جگہ نظر آتی ہیں اور پھر بم باری کے اثرات بھی ہر جگہ ملتے ہیں (سوائے ٹیوبنگن اور اس جیسے دو چار خوش قسمت قصبوں کے جو اس مصیبت سے اتفاق سے بچ گئے۔ جہاں جائیے وہاں بم باری کے خوفناک اثرات اب برسوں بعد بھی نظر آتے ہیں) یہاں کا راتھ ہاؤس (ٹاؤن ہال) اور پالمن گارڈن (کھجور باغ) البتہ خوبصورت ہیں۔ یہاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دنیا کے مشہور ترین شاعر گوئٹے کا وطن ہے۔ اس کا آبائی مکان اسٹیشن سے قریب ہی ہے جس میں اس کے گھر کا ساز و سامان، آبائی یادگاری چیزیں، کتابیں ہر چیز نہایت احتیاط اور خوبی سے جوں کی توں سجی ہوئی ہیں۔ بم باری میں یہ گھر بھی مسمار ہو گیا تھا لیکن یہ قوم کی خصوصیت ہے کہ اس نے سب سے پہلے اپنے فخر قوم شاعر کے گھر کو بالکل ویسا ہی دوبارہ تعمیر کرایا۔ اور اس کا سامان (جو پہلے ہی حفاظت کے مقام پر پہنچا دیا گیا تھا) پھر لا کر اسی طرح سے سجا دیا ہے۔

یہاں بسوں، کاروں، ٹراموں وغیرہ کی اس قدر کثرت ہے کہ شور و غُل سے سر چکرانے لگتا ہے۔ جرمنی کی قابل دید مشہور سڑک "او ٹو مان" جو جنگ کے زمانے میں ہٹلر نے جنگی ضروریات کے تحت بڑی تیزی سے بنوائی تھی اس شہر سے بھی گزرتی ہے۔ یہ سڑک اپنی مثال آپ ہی ہے۔ اس قدر چوڑی، ہموار اور شاندار ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ جرمنی کے سب بڑے بڑے شہروں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔

فرانک فورٹ سے چند میل کے فاصلے پر باڈ ہمبرگ (Bad Hamburg) کا پرسکون اور حسین قصبہ ہے۔ اس ملک میں جگہ جگہ ایسے قدرتی چشمے موجود ہیں جن میں نہانا صحت کے لئے بڑا مفید سمجھا جاتا ہے۔ ایسے چشموں کے گرد تالاب اور عمارتیں وغیرہ بنا دی گئی ہیں اور یہاں چھوٹے چھوٹے بہت حسین، پر رونق اور دل فضا بستیاں آباد ہو گئی ہیں جن کے نام باڈ (مقام غسل) پر ہیں۔ اسی قسم کا ایک قصبہ باڈ ہمبرگ بھی ہے۔ عیش پرست اور دولت مند لوگ نہانے کے بہانے ان مقاموں پر رنگ رلیاں منانے اور داد عیش دینے کے لئے جمع ہوتے ہیں اور پیرس کی زندگی کی ایک جھلک یہاں آسانی سے نظر آ سکتی ہے۔

یوں تو یورپ کے سب ملکوں نے عموماً اور جرمنی نے خصوصاً بہت سی باتوں میں اس قدر ترقی کی ہے جسے دیکھ کر اچنبھا ہوتا ہے۔ طرح طرح کی چھوٹی بڑی مشینیں جن کے باعث زندگی بہت آسان ہو گئی ہے اور گھریلو استعمال کا لاتعداد سامان جنھوں نے گھرداری کو بڑا آسان، دلکش اور بہت کم وقت لینے والا بنا دیا ہے، ہر ملک میں عام ہے۔ لیکن اس مادی ترقی نے مجھے زیادہ مرعوب نہیں کیا۔ ہم بھی کچھ عرصہ کوشش کریں تو زندگی کی یہ حاجتیں فراہم ہو جائیں گی لیکن جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا وہ جرمن لوگوں کا اخلاق اور ان کی انتھک محنت کی عادت ہے۔

ان کا ظاہری رکھ رکھاؤ اور اخلاق یورپ کے دوسرے ملکوں کے لوگوں سے کچھ مختلف ہے۔ مذہب اسلام میں ایک حدیث ہے کہ ہر شخص کو دوسرے کو سلام کرنا چاہئے۔ بلکہ ایک ستون سے دوسرے ستون کی طرف آئے تو ملنے والے سے سلام علیک کرے۔ لیکن "ترقی" اور "روشنی" کے اس زمانے میں مذہب کے بڑے بڑے بنیادی احکام کی لوگ پابندی نہیں کرتے تو بھلا چھوٹی چھوٹی باتوں کا کیا ذکر ہے۔ لیکن یورپ کے اس کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب ملک میں سلام کا یہ رواج میں نے عام دیکھا۔ علاوہ صبح، دوپہر، شام اور رات کے سلاموں کے جرمنی والوں کا مخصوص و محبوب سلام "گروس گاٹ" ہے جس کا قریب قریب مطلب ہے السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ بس میں، ریل میں، عمارتوں کے زینوں پر، دکانوں میں ہر جگہ نیا داخل ہونے والا دوسروں سے "گروس گاٹ" ضرور کرتا ہے اور وہ اس کا جواب دیتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی جگہ سے رخصت ہوں تو "آؤف ویدر زیہن" (یعنی خدا حافظ یا پھر ملیں گے) کہا جاتا ہے۔ میل ملاقات، جان پہچان کی اس میں کوئی شرط نہیں۔ ہر آدمی کا یہ اخلاقی فرض سمجھا جاتا ہے کہ دوسروں سے وہ اتنا اخلاق ضرور برتے۔ چاہے وہ بالکل اجنبی ہوں یا پردیسی۔

اسٹیشن، کسٹم ہاؤس، ریلوے، دکانوں، اسپتالوں غرض ہر جگہ چھوٹے سے چھوٹے ملازم سے لے کر بڑے سے بڑے افسر تک کام پڑنے والے لوگوں سے انسانیت، اخلاق اور احترام سے پیش آتا ہے۔ ریل میں دو ملکوں کی سرحد پر جو افسران کسٹم کی دیکھ بھال کرنے، یا پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ چیک کرنے آتے ہیں وہ لوگوں کا سامان دیکھتے وقت نہ ان کے ساتھ بیعزتی سے پیش آتے ہیں نہ شان اور غرور سے۔ اسی طرح لوگ بھی ایمان داری سے جو چیزیں ساتھ ہوتی ہیں ان کو بتا دیتے ہیں۔ ایک دو دفعہ سفر میں میرا ایسی عورتوں سے سابقہ ضرور

پڑا جنھوں نے سگرٹ، چوکلیٹ یا اور کچھ قیمتی کسٹم کا سامان چھپا لیا تھا ۔ یا اس کا کچھ حصہ چھپا یا کچھ دکھا دیا ۔ مگر یہ غیر معمولی بات تھی اور اسی لئے کسٹم والوں کو ہر ایک پر شبہ بھی نہیں ہوتا) یہ لوگ ریل میں داخل ہو کر مسافروں سے سلام علیک کرتے ہیں، پھر سوالات وغیرہ پوچھنے کے بعد چلتے ہوئے "یہ سفر مبارک ہو" کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں ۔ ہر مرد، طالب علم، پروفیسر، مزدور کسان ہر طبقے کے لوگ انھیں سے ہمدردی کرنے اور مسافر کی مدد کے لئے تیار رہتے ہیں ۔ آپ کسی سے راستہ پوچھیے تو آپ سے زیادہ اسے فکر ہو جائے گی اور کوئی تعجب نہیں کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر آپ کو اس مقام پر پہنچا آئے ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہمدردی اور اخلاق کا زیادہ مظاہرہ قصبوں اور گاؤں میں ہوتا ہے ۔ بڑے شہروں کی مصروف اور گہما گہمی کی زندگی نے ان لوگوں سے اس صفت کو چھینا تو نہیں مگر کچھ کم ضرور کر دیا ہے ۔

ہندوستانیوں سے اس قوم کو کچھ خاص لگاؤ اور محبت ہے قدیم ہندو فلسفہ بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے ۔ اور آزاد ہندوستان کی قدر و قیمت تو بہت بڑھ گئی ہے ہندی عورت ان لوگوں کی دلچسپی اور قدر کی خاص مرکز ہے اور اس سے بے حد اخلاق سے پیش آتے ہیں ۔ ریل اور بس میں عام طور پر یہاں یہ قاعدہ نہیں کہ مرد کھڑے ہو جائیں اور عورتوں کو جگہ دے دیں ۔ البتہ بوڑھی یا بیمار عورتوں کے لئے مرد بھی اور جوان عورتیں بھی فوراً جگہ خالی کرتی ہیں ۔ لیکن ہندوستانی عورت کے ساتھ یہ اخلاق ضرور کیا جاتا تھا کہ کوئی نہ کوئی شخص کھڑا ہو کر مجھے جگہ دے دیتا ۔ ریل کے سفر میں اگر سامان آسانی سے نہ اٹھ رہا ہو (جس کا مجھے اکثر اتفاق ہوتا تھا ۔ اس لئے کہ اپنے ملک میں یہ خراب عادت پڑی ہوئی تھی کہ سامان زیادہ ساتھ لے جاتی تھی اور بوجھ اٹھانے کی عادت نہ تھی) تو چھوٹے سے چھوٹے ملازم سے لے کر اسٹیشن ماسٹر تک مدد کے لئے آموجود ہوتے تھے ۔ ہمدردی اور خصوصیت کے مارے بے جانے پوچھے غلط ڈبوں میں بٹھا دیتے اور غلط گاڑیوں کے نام بتا دیتے تھے مگر مدد کرنا بہر حال اپنا فرض سمجھتے تھے ۔ ہندوستانی عورت کا لباس جرمنی میں بہت دلچسپی، پسندیدگی اور حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔ مگر عورت غریب ایک تماشہ بن جاتی ہے ۔ بڑے شہروں کے رہنے والوں نے تو خیر کبھی شاید کوئی ساڑھی دیکھی بھی ہو لیکن چھوٹے شہروں اور قصبوں میں تو شاید ہاتھی پہنچ جائے تو ایسا عجیب و غریب جانور نہ سمجھا جائے جیسے بچاری ہندوستانی عورت ۔ ریل اور بس میں لوگ بس بھول کر اس حصے کی طرف آ آکر جھانکتے ہیں جہاں وہ بیٹھی ہے ۔ سڑک پر چل رہی ہے تو بعض وقت ٹریفک رُک جاتا ہے ۔ ننھے ننھے بچے انگلی سے اشارہ کر کے ماؤں سے پوچھتے ہیں کہ یہ کون مخلوق ہے ۔ یقین کیجیے یا نہ کیجیے کتے اپنے مالکوں کا ساتھ چھوڑ کر اس کے ساتھ چلتے اور بڑے دوستانہ انداز میں بھونکتے ہیں کہ گویا پوچھ رہے ہوں کہ آخر تم ہو کون ؟ لیکن اس تجسس اور حیرت کے باوجود ان کے دیکھنے میں بدتمیزی یا بدتہذیبی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا جس کے مظاہرے ہمارے ملک میں ہر جگہ، ہر وقت اپنے دیس کی عورت کے ساتھ بھی اور دوسرے ملکوں کی عورتوں کو گھورنے میں بھی نظر آتے ہیں ۔ مرد دیکھتے ہیں مگر فوراً نظریں پھیر لیتے ہیں گویا سمجھتے ہیں کہ بُری بات ہے ۔ ہمارے کچھ جرمن دوست مرد اور عورتیں، اکثر لوگوں کی طرف سے معذرت کرتے رہتے تھے کہ وہ تمھیں دیکھتے ہیں مگر تم اس کا خیال نہ کرنا ۔ البتہ عورتیں زیادہ بے تکلفی سے دیکھتیں ۔ پاس آکر باتیں کرتیں اور سوالات پوچھتی ہیں ۔ بچے سب سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں ۔ جہاں جائیے دو چار دس پانچ بچوں کا غول ساتھ ہے ۔ اگرچہ دور دور ہیں ظاہر کر رہے ہیں کہ تم سے کوئی واسطہ نہیں ۔ لیکن مقصد اس ہندی عورت کے درشن کرنا ہی ہے ۔ بڈھے مرد اور عورتیں تو خیر اپنا حق سمجھتے تھے کہ چلتے چلاؤ زندگی میں یہ نادر چیز دیکھنے کو ملی ہے تو اچھی طرح کیوں نہ دیکھا جائے ۔ ایک ترکاری فروش بوڑھی عورت تو مجھے دیکھ کر ایک بار اس قدر حیران و ششدر رہ گئی جیسے تصویر ہو ۔ ہوش آیا تو بار بار مجھے اور میرے لباس کو چھو چھو کر دیکھتی تھی ۔ شاید یہ معلوم کرنا چاہتی ہو کہ یہ اصلی ہے یا نقلی ؟ بعض راہ چلتی عورتیں روک کر مسکرا کر پوچھتی تھیں "Sind Sie Indisch" کیا تم ہندوستانی ہو ؟ اور جواب سن کر ایسی خوش ہوتیں اور اس محبت سے باتیں کرتیں جیسے پرانی دوست ہوں ۔ جرمنوں کا اخلاق اور محبت دیکھ کر کسی طرح یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہٹلر نے ایسی مہذب اور با اخلاق قوم کو کس طرح اس قدر وحشت و بربریت سے بھر دیا تھا جس نے

دوران جنگ میں ناقابلِ یقین مظالم ڈھائے اور سچ پوچھئے تو خود اُنھوں نے بھی لڑائی کے دوران میں اور شکست کے بعد کچھ کم دکھ نہیں سہے -

---

جرمنوں کی دوسری اہم صفت ان کی اَن تھک محنت کی عادت ہے۔ یوں تو ہم لوگوں کے مقابلے میں سارے یورپ کے لوگ کہیں زیادہ محنتی ہوتے ہیں لیکن جرمنوں کا جواب تو یورپ میں بھی نہ ملے گا - لڑائی کے دوران میں بھی ان کی صنعت و حرفت و زراعت کو سخت نقصان پہنچا اور پھر شکست کے بعد تو ہر لحاظ سے حالت تباہ ہو چکی تھی - دکھ، ذلت اور بحران جھیلنے کے بعد پچھلے دو تین سال سے پھر اس قوم نے کروٹ لی ہے اور اس تھوڑے عرصے میں اپنے ملک کو سنبھالنے اور بنانے کا حیرت انگیز کرشمہ دکھایا ہے -

صبح منہ اندھیرے اُٹھ کر رات گئے تک ہر شخص اپنا کام جس مستعدی، ذمہ داری، دل سوزی اور سلیقے سے کرتے ہیں اُسے دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی - وہ اس اصول کے پوری طرح پابند معلوم ہوتے ہیں کہ اگر کوئی کام کرنے کے قابل ہے تو اس قابل بھی ہے کہ اسے خوبی سے کیا جائے - کارخانوں میں جاکر دیکھئے تو کاریگر اور مزدور دونوں جی جان سے اس کوشش میں مصروف نظر آئیں گے کہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر سامان بناکر اپنے ملک اور دوسرے ملکوں کو دیں - ہار جانے کے بعد سے چونکہ جرمنی کو سامانِ جنگ بنانے کی اجازت نہیں اس لئے یہاں کے سب کارخانوں میں روزمرہ کے استعمال کی اور معمولی زندگی میں کام آنے والی چھوٹی بڑی ہزاروں قسم کی مشینیں تیار کی جا رہی ہیں موجدوں کے دماغ، کاریگروں کی صنعت، محنت کشوں کی محنت سب اپنے دیس کو اُبھارنے اور مفید کام انجام دینے میں صرف ہو رہی ہے - زمین کا ہر ممکن خطہ زیرِ کاشت آ چکا ہے اور کسان اور کاشتکار کم سے کم زمین میں زیادہ سے زیادہ چیزیں سائنٹفک طریقوں سے پیدا کرتے ہیں - سبزیاں اور پھل دیکھئے تو ان کا سائز دیکھ کر حیرت ہوتی ہے - اسی طرح دودھ دہی، انڈے، مرغی اور مویشیوں کی خاص طور پر دیکھ بھال کی جاتی ہے اور میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتی ہوں کہ اس وقت کھانے پینے کی حد تک جرمنی یورپ کے چند دو تین آسودہ ترین ملکوں میں سے ہے - اور

ہمارے دیس سے زیادہ چیزیں وہاں فراہم ہوتی ہیں اور مہنگی میں بھی دہلی سے کچھ ہی زیادہ ہے - اسکولوں اور کالجوں میں جاکر دیکھئے تو ایک طرف استاد دل و جان سے اپنے طالب علموں کو تعلیم دینے اور ان کے دماغوں کو علم کی شمع سے روشن کرنے میں معروف نظر آتے ہیں - ہر استاد ذاتی طور پر طالب علم سے دلچسپی لیتا اور اپنی شخصیت کا اثر بھی ڈالتا ہے اور اپنے وسیع علم سے بھی مستفید کرتا ہے - پروفیسر کا درجہ یہاں شاید پرائم منسٹر سے بھی زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے اور اس کی جو قدر و عزت ہے وہ تو کسی طرح اس سے کم نہیں اس عزت کو برقرار رکھنے میں خود پروفیسر حضرات اور استادوں کے اعلیٰ کیرکٹر کا بڑا حصہ ہے - کوئی اونچے درجے کا عالم اور استاد آپ کو کسی قسم کی گھٹیا حرکت کرتے ہرگز نظر نہ آئے گا - طالب علم استادوں کی سچے دل سے عزت کرتے ہیں اور رسمی تکلفات کے اگرچہ زیادہ پابند نہیں مگر ان کے انداز اور گفتگو سے آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں - عام لوگوں کو بھی عالموں اور پروفیسروں سے کم عقیدت نہیں - غرض علم اور عالم کی سچی قدر یہاں نظر آتی ہے جس سے بڑی مسرت ہوتی ہے -

یوں تو اس قوم کے مرد اور عورت دونوں محنتی ہیں لیکن عورت اس معاملے میں مرد سے بھی بازی لے گئی ہے - میں نے اکثر لوگوں سے جرمن عورت کی محنت، سلیقے اور صفائی کی تعریف سنی تھی مگر ہمیشہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اس میں مبالغہ ہے - لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھ کر معلوم ہوا کہ مبالغے کا کیا ذکر ہے حقیقت میں جرمن عورت کے سلیقے صفائی اور ان تھک کام کرنے کی عادت کی پوری پوری تعریف ہو نہیں سکتی - جنگ میں لاکھوں آدمیوں کے مرنے سے جرمنی میں مرد اور عورت کا تناسب برابر نہیں رہا اور آج کل عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے اور کچھ بہت بھاری کاموں یا مجرد علمی مسئلوں کی تحقیقات کو چھوڑ کر ہر محکمے میں ہر جگہ عورتیں مردوں سے زیادہ نظر آتی ہیں - کھیتوں میں تو ہمارے ہاں کے کسان خاندانوں کی طرح مرد اور عورتیں ساتھ کام کرتے ہی ہیں - کارخانوں میں بھی عورتوں کی تعداد مردوں سے کم نہیں - اگرچہ ان کو عام طور پر نسبتاً ہلکا کام دیا جاتا ہے - یونیورسٹیوں میں پروفیسر کے درجے کے لوگ زیادہ تر مرد ہیں لیکن کچھ عورتیں بھی پائی جاتی ہیں اور کلارکل اسٹاف میں اور دوسرے کاموں کے لئے تو عورتیں بہت زیادہ ہیں - چھوٹے بچوں کی

تعلیم قریب قریب پوری کی پوری عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں بھی عورتیں بہت نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہوٹلوں، ریستورانوں، دفتروں، بنکوں، ریلوں، دکانوں، بسوں، غرض ہر جگہ آپ جرمن عورت کو پوری ذمہ داری اور خوبی کے ساتھ کام کرتا ہوا پائیں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کاموں کی وجہ سے اُنھوں نے گھریلو زندگی کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس میں نے تو کم سے کم یورپ کے قصباتی اور دیہاتی لوگوں میں، اپنے ہاں سے کہیں زیادہ شوق، دلچسپی اور ذمے داری کے ساتھ ان لوگوں کو گھریلو کام انجام دیتے دیکھا۔ جو عورت Hausfraus صرف گھروالی ہے اس کا تو کہنا ہی کیا ہے کہ وہ صبح چھ بجے سے رات کے دس بجے تک ہر قسم کا گھر کا کام (جس میں کپڑے دھونا، زمین صاف کرنا، باغیچے کا کام اور دوسرے چھوٹے بڑے ہزاروں کام شامل ہیں) کرتی رہتی ہے۔ وہ عورتیں بھی جو ملازمت کرتی ہیں اور جن کی تعداد بہت ہے۔ اپنے گھریلو کام اور خانگی فرائض اس خوبی اور خوش دلی سے پورے کرتی ہیں بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت، شوہر کا خیال، وقت پر اس کو کھانا ناشتہ دینا کون سی چیز ہے جس سے یہ عورتیں غفلت کرتی ہوں۔ البتہ یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ ان کے بچے اور شوہر بھی گھریلو کاموں میں ان کا پورا پورا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ میاں تو دفتر سے آکر آرام کرسی پر پیر پھیلا کر اخبار پڑھنے لگے۔ صاحبزادے کھیلنے نکل گئے اور بیوی اکیلی مرتی کھپتی رہے۔ جی نہیں ان کو بھی پورا پورا تعاون کرنا پڑتا ہے تبھی تو بغیر کسی ایک نوکر یا مہتر، دھوبی، مالی کے بغیر ان کی گھریلو زندگی اس قدر پر آسائش، پرمسرت، اس قدر باسلیقہ و باترتیب ہوتی ہے کہ اگر ہندوستانیوں کے گھروں کو وہ سلیقہ اور صفائی، وہ باقاعدگی اور سکون مل جائے تو سمجھئے کہ اس سے بڑھ کر مسرت ملنا محال ہے۔

جرمنی میں آج کل یہ عام رجحان ہے کہ لوگ ہٹلر سے نفرت کرتے اور جنگ کو بہت برا کہتے ہیں جس کی بدولت آدھی صدی میں انھیں یہ سب مصائب جھیلنے پڑے۔ ظاہر ہے کہ میں صرف مغربی جرمنی اور وہ بھی اس کے جنوبی حصے میں زیادہ تر رہی اور وہیں کے لوگوں سے میل جول اور گفت و شنید ہو سکی۔ مشرقی جرمنی کا الگ ہو جانا ان لوگوں کے لئے بڑا سوہان روح ہے اور وہ ہر قیمت پر جرمنی کے دونوں حصّوں کو ایک کرنا چاہتے ہیں۔ مشرقی جرمنی سے آئے ہوئے لوگ اس قدر بیزار اور تلخ معلوم ہوتے ہیں اور کچھ اس قسم کی کہانیاں سُناتے ہیں جیسے ہمارے ہاں بٹوارے کے بعد مشرقی اور مغربی پنجاب کے رفیوجیز سنایا کرتے تھے۔ خدا جانے اس میں کتنی اصلیت ہوتی ہے اور کتنا تخیل۔ یہاں کے لوگوں کے اعصاب پر ان جنگوں کا اثر بہت خراب پڑا ہے اور بہت سے لوگ تو اعصابی امراض کا شکار ہیں اور باقی بھی تو اس ضرور ہو گئے ہیں۔ بعض خواتین سے میری گفتگو ہوئی تو وہ جنگ کا نام سُن کر لرز اُٹھیں اور جنگ کے امکان کے تصوّر سے رونے کے لئے تیار ہو گئیں۔ مگر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ کہتے نہیں جھجکتے کہ اگر جرمنی کی تقسیم ختم نہ کی گئی تو جنگ ناگزیر ہے۔

چند مہینے جرمنی رہ کر اور وہاں کے لوگوں سے مل جل کر جو اثر مجھ پر پڑا اور ان لوگوں کی سیرت اور خیالات کو جہاں تک میں سمجھ سکی۔ یہ اس کے چند تاثرات ہیں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کئے۔ ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کو اس کے خلاف کچھ اور تجربہ ہوا ہو۔ لیکن میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کو ایمان داری سے بیان کیا ہے۔ میرے نزدیک جرمن قوم بہت سی باتوں میں اس قابل ہے کہ ہم اس سے سبق لیں اور اس کی محنت اور اپنے دیس کو سنبھالنے کی جان توڑ کوشش سے یہ سیکھیں کہ اسی طرح ہمارے ملک کے ہر فرد کو، ہر مرد عورت اور بچے کو اپنے ملک کی حالت سنبھالنے کا اور اُسے اخلاقی اور معاشی لحاظ سے اونچے درجے پر پہنچانے کا ایسا ہی احساس ہونا چاہئے اور اسی طرح اسے اپنا سب سے پہلا اور مقدّس فرض سمجھنا چاہئے۔

محمد بشیر الحق دسنوی عظیم آبادی

آبِ رواں

حضرتِ اکبر الہ آبادی نے انگریزی زبان کے مشہور شاعر "رابرٹ سودے" (۱۷۷۴ء تا ۱۸۴۳ء) کی ایک نظم کا منظوم ترجمہ "پنی ریڈنگ" کے ایک جلسے کے لئے ۱۸۹۹ء میں کیا تھا۔ یہ منظوم ترجمہ "روانیِ آب" کے عنوان سے رسالہ معارف علی گڈھ جلد ۲ شمارہ ۴ بابت اکتوبر ۱۸۹۹ء میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوا تھا۔ اسی زمانے میں حضرتِ شہباز بہاری نے بھی سودے کی اس نظم کا ایک منظوم ترجمہ کیا تھا جو "آبِ رواں" کے عنوان سے کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہوا تھا۔ اور بعد میں مرحوم کی چند نظموں کے مجموعے "خیالاتِ شہبازانہ" میں ۱۹۱۶ء میں چھپا۔ مرحوم شہباز کی اس نظم سے اُردو دانوں کا ذی علم طبقہ بہت کم واقف ہے۔ اسی لئے ناظرینِ "آج کل" کی تفریحِ طبع کے لئے "آبِ رواں" حاضر ہے۔

مولوی سید محمد عبدالغفور شہباز کا مولد سب ڈویژن باڑھ ضلع پٹنہ کی ایک گم نام بستی موضع نسرپھرا تھا۔ لیکن انھوں نے بدوِ شعور سے باڑھ کو جہاں اُن کی ننھیال تھی اپنا وطن کر لیا تھا۔ آپ کے والد کا نام سید طالب علی تھا۔ شہباز نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد سے حاصل کی تھی۔ جب وہ انگریزی پڑھنے کے لئے اسکول میں داخل ہوئے تو اپنے نسبتی بھائی خان بہادر سید عبدالعزیز صدر اعلیٰ کے پاس رہنے لگے۔ یہاں شہباز نے فارسی اور عربی کو دل لگا کر پڑھا، اور انگریزی میں انٹرنس کے درجے تک پہنچ کر کچھ عرصے تک تلاشِ معاش میں مشغول رہے۔ مگر جب کوئی معقول صورت نہ نکلی تو صدر اعلیٰ صاحب نے ان کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس زمانے میں اردوئے معلّیٰ کے فدائی مولوی سید محمد صاحب (جو بعد حصول خطابِ نوابی عہدۂ جلیلہ انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن صوبہ بنگال و بہار سے وظیفہ یاب ہوئے) مظفر پور میں سب رجسٹرار تھے۔ سید محمد عبدالغفور اگرچہ اس زمانے میں کم سن تھے لیکن بہت ہی پیاری اردو لکھتے تھے۔ اسی اردو کی چاٹ نے مولوی سید محمد صاحب اور شہباز کے درمیان رسل و رسائل کی بنیاد ڈالی۔ شہباز کے دل میں شوقِ ملاقات اور حصولِ نیاز کا ذوق پیدا ہوا تو مولوی سید محمد صاحب کے برادرِ بزرگ بھی مظفر پور میں موجود تھے۔ یہ دونوں علم دوست بھائی کم سن شہباز کی ذہانت، لیاقت اور بلند پروازیوں سے اس قدر خوش ہوئے کہ دل سے بہی خواہ اور سرپرست بن گئے۔ اسی زمانے میں کلکتے سے "دار السلطنت" نام کا ایک ہفتہ وار اخبار جاری ہونے والا تھا۔ مالکان اخبار نے نواب بہادر عبداللطیف خاں سی۔ آئی۔ ای اور مولوی سید محمد صاحب سے درخواست کی کہ وہ اخبار کے لئے کوئی لائق ایڈیٹر تجویز فرمائیں۔ چنانچہ ان دونوں صاحبوں نے شہباز کو انتخاب کیا۔ چند سال کے بعد جب اخبار بوجوہ بند کر دیا گیا تو شہباز اپنے وطن چلے آئے۔ کچھ عرصے کے بعد نواب بہادر عبداللطیف خاں نے "مذاکرِ علمیہ" ایک مجلس کے سلسلے میں شہباز کو کلکتے پھر بلا لیا۔ جہاں انھوں نے نہایت عمدہ طرح سے کام کیا۔

۱۸۸۵ء میں جب نواب عبداللطیف خاں وزیر بھوپال ہوئے تو شہباز کو بطور پرسنل اسسٹنٹ اپنے ساتھ لیتے گئے۔ وہاں انھوں نے نہایت دیانت، قابلیت اور لیاقت کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیا۔ بھوپال کی واپسی کے بعد شہباز مولوی سید محمد صاحب کے ساتھ پٹنے میں رہنے لگے۔ مولوی صاحب ان دنوں یہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ شہباز کو اپنی انگریزی تعلیم کی تکمیل کا خیال از سرِ نو پیدا ہوا، اور بہار نیشنل اسکول کے انٹرنس کلاس میں داخل ہو کر تعلیم شروع کر دی، اوّل درجے میں انٹرنس پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ بعد ازاں بہار نیشنل کالج سے دو برس کے بعد ایف، اے پاس کر کے بی، اے میں پڑھنے لگے۔ لیکن عین امتحان کے وقت امراضِ صدر میں مبتلا ہو گئے اور شریکِ امتحان نہ ہو سکے۔

ڈاکٹروں نے رائے دی کہ آئندہ تعلیم روک دی جائے۔ تعلیم کی طرف سے مایوس ہوگئے، تو تلاشِ روزگار کی فکر ریاست حیدرآباد لے گئی، جہاں وہ ہوم ڈیپارٹمنٹ میں مولوی عزیز مرزا کی ماتحتی میں ترجمے وغیرہ کے کام پر مامور ہوگئے۔ کچھ عرصے وہاں کام کرکے اورنگ آباد دکن کالج میں پروفیسری پر بھیج دئے گئے۔ پروفیسری کے بعد ریاست بھوپال کے سررشتۂ تعلیم کے ڈائرکٹر مقرر ہوگئے۔ وہاں ان کی دلّی والی دوسری بی بی کا انتقال ہوگیا۔ وہ من جملہ اور وجوہ کے اس صدمۂ جانکاہ سے بیمار ہوگئے اور نوکری سے مستعفی ہوکر دلی اپنی سسرال چلے گئے۔ نوّاب سیّد محمد صاحب نے ان کی بیماری اور بےکاری کا حال سن کر اپنے پاس کلکتے بلا لیا۔ باوجود باقاعدہ تیمارداری اور علاج معالجے کے شہباز جاں بر نہ ہوسکے۔ یکایک اُن پر فالج گرا اور ۳۰ نومبر ۱۹۰۸ء کو انھوں نے انتقال کیا، اور کلکتے کے سرکاری قبرستان میں سپردِ خاک کردئے گئے۔

تالیفات و تصنیفات شہباز

(۱) فارسی دیباچہ دیوان فارسی و اردو نوّاب سیّد محمد آزاد

(۲) مقدمہ موعظۂ حسنہ (مجموعۂ خطوط ڈپٹی نذیر احمد صاحب) مرتّبۂ شہباز

(۳) مقالاتِ جمالیہ۔ مولانا جمال الدین افغانی کی اسپیچوں اور مضامین کا مجموعہ، مرتبۂ شہباز۔

(۴) مقدمہ خیالات آزاد (یعنی مجموعہ مضامین نوّاب سیّد محمد آزاد) مرتبۂ شہباز

(۵) مقدمہ نوابی دربار مصنّفہ نواب سیّد محمد آزاد

(۶) رباعیات شہباز

(۷) سوانح نظیر اکبرآبادی

(۹) خیالاتِ شہباز } کلام کے مجموعے
(۱۰) محبوب القلوب }

شہباز کے مضامین نثر و نظم اگرچہ مختلف اخباروں اور رسالوں میں نکلا کرتے تھے، مگر خصوصیت کے ساتھ وہ اودھ پنچ لکھنؤ اور اپنچ بانکی پور کے ممتاز نامہ نگاروں میں تھے۔ (تلخیص حالات شہباز نوشتہ سیّد افتخار عالم صاحب)

آبِ رواں

(۱) سرچشمہ

الہ آباد میں خوبی سے آباد — (خدا رکھے ہمیشہ خرّم و شاد)
ہیں میرا اکبر حسین اک دوست میرے — وہ جن کی نظم نے موتی بکھیرے
طبیعت میں بلا کی ہے روانی — غضب جاری ہے اس چشمے کا پانی
رواں ہر چند ہوں یورپ میں نہریں — دکھائیں ہند کی یہ اُن میں لہریں
فرنگی سحر گو آئینے لائیں — یہ ہندی شوخ کے جلوے دکھائیں
سمجھ تو سحر ہے کیسا بیاں میں — لٹا در آیا چلا ہندوستاں میں
ہوئے سودی کے انگلش زبان سے — فصاحت آشنا اردو کے لہجے
کہاں ہیں چشمۂ سودی میں موجیں — یہ اُردوئے معلّےٰ کی ہیں فوجیں
لئے ہاتھوں میں تیغِ موجِ صافی — جمائے ہیں پرے مصدر قوافی
مسلسل نظم میں نے جب یہ دیکھی — اٹھیں موجیں طبیعت میں خوشی کی
اُمنگوں پر بڑھیں دل میں امنگیں — ترنگوں پر ہوئیں پیدا ترنگیں
قلمداں پر سخن کا ہاتھ لپکا — قلم سے بوندیں بن کر شعر ٹپکا
کہاں ہیں تشنہ کامانِ معانی — یہیں حاضر ہے آبِ زندگانی

(۲) بہاؤ

اُڑا طرزِ خرام البیلیوں سے — چلا آبِ رواں اٹکھیلیوں سے
کھلاتا، کھیلتا، ہنستا، ہنساتا — تھرکتا، ناچتا، گاتا، بجاتا
مٹکتا، جھومتا، تنتا، اکڑتا — گرجتا، گونجتا، بنتا، بگڑتا
جھلکتا، جھلملاتا، جگمگاتا — پھسلتا، لڑکھڑاتا، ڈگمگاتا
دکھاتا زور، غُل کرتا، کڑکتا — مچاتا شور، ڈانٹ اٹھتا، جھڑکتا
لپکتا، دوڑتا، پھرتی دکھاتا — اُچھلتا، کودتا، چکّر لگاتا
اُچکتا، پھاندتا، گرتا، لڑھکتا — جھجکتا، روٹھتا، بھڑتا، بھڑکتا
مچلتا، پاؤں پھیلاتا، بلکتا — سہمتا، کانپتا، روتا، سسکتا
لرزتا، تھرتھراتا، تلملاتا — بلکتا، بلبلاتا، گڑگڑاتا
سمٹتا، پھیلتا، مُڑتا، مڑاتا — اُبھرتا، ڈوبتا، اُڑتا، اُڑاتا
کترتا، چھانٹتا، پرزے اُڑاتا — کچلتا، کوٹتا، چھکے چھڑاتا
الف ہوتا، پڑاکا دے لگاتا — دولتی چھانٹتا، پشتک اُڑاتا
کبھی گھوڑ دوڑ میں کف مُنہ پہ لاتا — کبھی فوجوں میں گھُس کر ہنہناتا
گریباں چاک کرتا، سر ٹپکتا — رگڑتا ایڑیاں، دامن جھٹکتا
اُٹھا کر سونڈ فوّارہ اُڑاتا — دھوبی کے زور سے پارہ اُڑاتا
تڑپتا، لوٹتا، چڑھتا، اُترتا — جھپٹتا، باولا ہوتا، بپھرتا

کھسکتا، بھاگتا، رُکتا، ٹھہرتا
جھجکتا، جھاڑتا، بنتا، سنورتا
پلٹنا، چھیڑتا، چھُوتا، خُھلاتا
چھڑکتا، چھینٹتا، دھوتا، دُھلاتا
کبھی ڈنڑ پیلتا، جوڑی ہلاتا
کبھی خم ٹھونکتا، تیوری چڑھاتا
پہاڑوں کا کہیں دامن دباتا
درختوں کی کہیں شاخیں چباتا
صدف میں گوہرِ نایاب بھرتا
گُہر کی شیشیوں میں آب بھرتا
مشبک چھاؤں کا پھن اُبناتا
مسلسل موج کا نقشہ جماتا
زمرد پر کہیں پارہ بچھاتا
کہیں پارے کو فیروزہ اُڑھاتا
ستاری چھیڑتا، ارگن بجاتا
اِدھر حوریں اُدھر پریاں نچاتا
اُلجھتا خار سے، گُل سے اُلکتا
پچکتا، پھولتا، دبتا، سٹکتا
کٹر ہجرے کو مرغابی بناتا
بشر کو مردمِ آبی بناتا
مُکلف میز پر چادر بچھاتا
معلق شہر کو دعوت کھلاتا
شگوفہ چھوڑتا غصہ چڑھاتا
عداوت ڈالتا منہ ڈھے لڑاتا
کبھی کھیتوں میں شاخِ زر لگاتا
کبھی منڈی میں زر کو پر لگاتا
جُھلاتا، جھُولتا، پینگیں بڑھاتا
کڑکتا، چیختا، تانیں لگاتا
بہک پڑتا، سسکتا، سنسناتا
اُچک پڑتا، لپکتا، وندناتا
بڑھاتا ہر طرف موجوں پہ موجیں
چڑھاتا چار سُو موجوں پہ فوجیں
کبھی سیماب سے چاندی بناتا
کبھی چاندی پہ لے سونا چڑھاتا
پنھاتا شمس کو زرتار سائے
بناتا چاند سے چاندی کھلائے
کھلاتا روز و شب سُورج کو غوطے
اُڑاتا عقل کے ہاتھوں کے طوطے
زمین کی گود میں گرداب بھرتا
بھنور کی ناند میں سیماب بھرتا
بناتا مورچے، توپیں چڑھاتا
سجاتا پلٹنیں، فوجیں بڑھاتا
نکلتا سیپیاں، موتی اُگلتا
جماتا قفلیاں سانچے میں ڈھلتا
گراتا، پھینکتا، چنتا، اُٹھاتا
چمٹتا، چُومتا، ہلتا، سمساتا
کبھی ادجوں پہ پھیلاتا تباہی
کبھی موجوں پہ چھبکاتا سیاہی
کبھی پچکاریوں کا ڈالتا ڈھنگ
زباں بن کر کسی جا چاٹتا سنگ
کبھی پتھر سے ٹکراتا ہوا سر
کبھی ذرّوں پہ چمکاتا ہوا زر
نگینے سنگ ریزوں کے بناتا
طلسمی سرمہ آنکھوں سے لگاتا

(۳) سمندر اور اس سے ہم آغوشی

غرض آبِ رواں یوں جہد کرتا
ہر اک کوشش سے سو سو بار کرتا
ہزاروں تازہ دم چشموں سے ملتا
کروڑوں پیارے ہم چشموں سے ملتا
جلو میں ندیوں نالوں کو لیتا
کروڑوں کشتیاں الفت کی کھیتا

سمندر

بڑی ہے اک عظیم الشان شے سے
پڑے جس میں کروڑوں اَن طے سے
ہزاروں جس میں مخفی گنجِ شاہی
کروڑوں جس میں اسرارِ الٰہی
زیادہ جس کی گہرائی خرد سے
عیاں جس کی اُنچائی شدومد سے
خیالوں سے بڑا پھیلاؤ جس کا
سمیٹے خوبیاں سمٹاؤ جس کا
نگاہیں جس کا پایاں پا نہ سکتیں
حدیں جس کا سرا بتلا نہ سکتیں
فلک جس کے قدم لینے کو جھکتا
زمانہ جس پہ دم لینے کو رُکتا
زمانے سے ہوا خواہ ابر جس کا
ہوا اک عاشقِ بے صبر جس کا
ستارے جس پہ شیدا ماہ مفتوں
بلا گردان جس کا چرخِ گردوں
گھٹا چمکی ہوئی جس کی بدولت
شفق پھولی ہوئی جس کی بدولت
پہاڑوں کو جہاں روڑوں کا رتبہ
جہاں موروں سے کم گھوڑوں کا رتبہ
جہازوں کو جہاں قطرے نچاتے
چٹانوں کو جہاں ذرّے پچاتے
جہاں ہر بوند بستی بن بسا چل
جہاں ہر موج جنتی سو ہماچل
جہاں طوفانِ نوح اک موج نوخیز
جہاں خود چشمِ قدرت حیرت آمیز

ہم آغوشی

عبارت مختصر اُٹھ کے سنبھل کے
مطابق فارسی کی اس مثل کے
کُنَد ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز
بنا آبِ رواں اک قلزمِ جوش
ہوا آخر سمندر سے ہم آغوش

دیہات کے لئے مزید ڈاک خانے ڈاک خانوں اور ڈاک کے ذریعے رسل و رسائل کی آسانیوں میں اضافہ کرنے کی غرض سے پانچ سالہ پلان کے تحت ۸۰ کروڑ روپیہ صرف کیا جائے گا جب کہ پہلے پانچ سالہ پلان کے تحت ۴۷ کروڑ روپیہ صرف ہونے کی توقع ہے۔ تجویز کیا گیا ہے کہ ایک ہزار افراد یا زیادہ آبادی والے ہر گاؤں میں ایک ڈاک خانہ کھولا جائے گا۔

سید اختر رضوی تپش

تذکرۂ میر حسن سے چند یادداشتیں

میر حسن ان نادرۂ روزگار لوگوں میں ہیں جنھیں قدرت نے شعر گوئی اور شعر فہمی دونوں نعمتوں سے وافر حصہ عطا کیا تھا۔ ان کی سحر بیانی کا ڈنکا "مثنوی سحر البیان" کی وجہ سے تا قیامت بجتا رہے گا۔

ان کی سخن فہمی اور سچی تنقید کے جوہر "تذکرۂ شعرائے اردو" سے کھلتے ہیں یہ بیش بہا تصنیف مدتِ دراز تک گوشۂ گمنامی کی زینت بنی رہی آخر کار ۱۹۲۲ء میں "انجمنِ ترقی اردو" کی جد و جہد سے یہ انمول جوہر دکانِ ادب میں جلوہ افروز ہوا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اس پر ایک مبسوط عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔

میر حسن نے اپنی اس تصنیف میں ۳۰۴ شعراء کی بزم آراستہ کی ہے۔ اس بزم میں میر و سودا اور مظہر و درد جیسے آئمہ فن بھی ہیں۔ جرأت، مصحفی اور انشاء جیسے اساطین ادب بھی ہیں اور تفریح طبع کے لئے اکرمیں، آشوب اور میر جعفر زٹلی بھی مدعو کر لئے گئے ہیں۔ ان لوگوں کی پرسشِ احوال میر حسن کی شاعرانہ خوش مزاجی کی دلیل ہے۔

اس محفل میں ہمیں ہندوستان کے ہر ہر گوشہ کے اہلِ کمال نظر آتے ہیں۔ جہاں دکن کے شعراء اولیت کا تاج پہنے ہوئے موجود ہیں وہیں شاہ جہاں آباد اور لکھنؤ کے نغمہ سنج بھی تکمیل و اصلاح زبان کے خلعت مرصع میں ملبوس بیٹھے ہیں۔ اور جہاں عظیم آباد اور مرشد آباد کے ادب نواز مسندِ عزت و احترام پر متمکن ہیں وہیں گجرات و پنجاب کے شعراء بھی بصد افتخار تشریف فرما ہیں۔ یہ مجمع بوقلموں دیکھ کر معاً احساس ہوتا ہے کہ اردو اپنی ولادت کے لئے چاہے سرزمینِ ہند کے کسی بھی گوشے کی ممنون ہو لیکن نشو و نما اور جلوہ آرائی کے لئے وہ کسی خطے کی پابند نہیں رہی۔

اس مجمع میں ایک اور امر خصوصیت سے قابل لحاظ ہے یعنی یہاں مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو بھی ہمسرانہ حیثیت سے موجود ہیں اور اس رنگِ محفل کو دیکھ کر نگاہِ اولیں بھی یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ روزِ اول ہی سے ریختہ کی تعمیر میں ہندوؤں کا ہاتھ رہا ہے۔ دیکھو وہ فارسی اور ریختہ کی دوہری خلعتیں پہنے رائے سرب سنگھ دیوانہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ استادوں کے استاد ہیں۔ میر حسن لکھتے ہیں۔ "شاعر زبردست فارسی استاد ریختہ گویاں لکھنؤ۔ چنانچہ میاں حسرت و میر حیدر علی حیراں و اکثر دیگراں شاگرد اوبند" ان کے شاگرد میاں حسرت ایسے زبردست استاد تھے کہ کثرت کی وجہ سے اپنے شاگردوں کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ "کثرت شاگردانش چناں است کہ در صورت شناسی خود ہم حیراں است" ان سے کچھ پہلے ٹیک چند بہار اور انند رام مخلص ہشرت دوام اور عزت و احترام کی مسندوں پر متمکن ہیں۔ ان کے بعد بندرابن راقم کو دیکھو۔ ان سے کچھ فاصلہ پر رائے پریم ناتھ، سنتوکھ رائے بیتاب، رتن ناتھ سنگھ، گھاسی رام خوشدل، آفتاب رائے رسوا، لالا ہلاس رائے زنگیں، لالہ خوش وقت رائے شاداب، رائے سکھ رام عاقل، فارغ، بدھ سنگھ قلندر، لالہ کاشی ناتھ، راجہ رام نرائن موزوں، عجائب رام غنچی اور لالہ تول رائے وفا اپنے اپنے مرتبہ سے تشریف فرما ہیں۔ ان میں بہت سے شعراء ایسے ہیں جو فارسی اور ریختہ دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

ان کے مقابل میں ایسے مسلمان شعراء بھی ہیں جو اردو کے ساتھ ساتھ سنسکرت یا دوسری ہندوستانی بھاشاؤں کو گلے سے لگائے ہوئے تھے۔ مثلاً متقدمین میں احمد گجراتی ہیں جن کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں۔ "در زبان سنسکرت و بھاکا گویند کہ، تصانیف بسیار دارد" اس طرح ایک شاعر میاں سکندر عرف گھسا ہیں علم کتابی سے بے بہرہ۔ قصہ خوانی اور عرق کشی مشغلہ تھا مگر با ایں ہمہ بے علمی کلام میں جائے دم زدن نہیں ہے۔ شاکر ناجی کے شاگرد اور مرثیہ گو تھے۔ اردو کے علاوہ پوربی، پنجابی، بنگالی اور مارواڑی زبانوں میں بھی عمدہ مرثیے کہتے تھے۔ سچ ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ واقعات بتاتے ہیں کہ ہمارے فرنگی آقاؤں سے قبل کم از کم علمی میدان مذہبی تعصب کی جولاں گاہ نہ تھا ع

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اس وقت کے ہندو امراء بھی اردو کی سرپرستی اسی طرح کرتے تھے جیسے مسلمان رؤسا۔

راجہ شتاب رائے صوبہ دار عظیم آباد کا نام محسنین ادب کی فہرست میں ہمیشہ ممتاز رہے گا احمد شاہ کے کوکہ اشرف علی فغاں کے متعلق مرقوم ہے کہ "از مدتے بطرف عظیم آباد پیش راجا شتاب رائے بسری برد"۔ خود میر حسن کے استاد ضیا راجہ موصوف کے فرزند کے دربار سے متوسل تھے۔ عظیم آباد اور مرشد آباد کو اسی زمانے میں ادبی اہمیت حاصل ہو چکی تھی اور ان مقامات کے اہل دول شعراء کی سرپرستی لازمۂ ریاست سمجھتے تھے۔ "تذکرہ" میں ایسے پندرہ سولہ شعراء کا ذکر ملتا ہے جو دہلی اور لکھنؤ چھوڑ کر مرشد آباد اور عظیم آباد چلے گئے تھے۔ فدوی دہلی نیگالہ میں جگت سیٹھ کے پاس رہا کرتے تھے۔

بعض بعض مقامات پر بہت ہی دلچسپ ادبی لطائف ملتے ہیں جن کا تذکرہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔

اوائل سلطنت محمد شاہی میں ایک شاعر بے نوا، دہلی آئے۔ مزاج میں ظرافت کا عنصر غالب تھا۔ ایک روز کسی جگہ میاں آبرو سے ملاقات ہوئی۔ آبرو نے چنداں التفات نہ کیا۔ بے نوا نے کہا کہ "میاں آبرو! آخر آپ مجھ سے "تین چشم" کیوں نہیں ہوتے؟" میاں آبرو واحد العین تھے اس لئے "چار چشم" کے بجائے "تین چشم" کا تصرف بہت ہی پُر لطف تھا۔ اہلِ بزم ہنس پڑے اور میاں آبرو کو متوجہ ہونے ہی بن پڑی۔

ضیا (میر حسن کے استاد) کا ایک قطعہ ہے ؎

تربت ضیا کی دیکھی کل رات دور سے میں — آئے نظر مجھے واں شمع و چراغ کتنے
جا کر جو آج دن کو دیکھا میں کر تفحص — اک دل جلے ہے اس میں حسرت کے داغ کتنے

اس مضمون کو میر ضیا سے سن کر سلام اللہ خاں تسلیم ایک فارسی شاعر نے فارسی میں ترجمہ کر کے اپنے نام سے مشہور کر دیا ؎

دوش رفتم بر مزار کشتۂ تسلیم خویش — می نمود از دور صد شمع و چراغ حسرتے
چوں شدم نزدیک دیدم از تفحص لمبے — یک دلے می سوخت یا دے چند داغ حسرتے

میر حسن انتہائی خفگی کے عالم میں لکھتے ہیں کہ "ایں نہ دانست کہ در نظر صورت شناسانِ معانی متبنی و فرزند پوشیدہ نمی ماند۔ مثلِ ہندی مشہور است "ما تھی پھرے گاؤں گاؤں۔ جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں"

مولانا حبیب الرحمن شروانی کہتے ہیں کہ "میر حسن خفا ہیں (اور خفگی بجا ہے) پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تسلیم کے شعر زبان فارسی کی قوت و صفائی کی بدولت ضیا کے اشعار سے زیادہ تابدار ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں کہ ضیا کی زبان بوجہ قدامت ماند پڑ گئی ہے۔ مصرع اول میں 'کشتۂ تسلیم' نے جان ڈال دی ہے۔

گویا مولانا اسے "سرقۂ ممدوح" سمجھتے ہیں۔

چکبست نے دو تین مقامات پر نسیم کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ واقعہ لکھا ہے کہ کسی مشاعرے میں ایک بزرگ (غالباً ناسخ) نے سرِ بزم نسیم سے کہا کہ "پنڈت جی! ایک مصرعہ ہو گیا ہے لیکن دوسرا مصرعہ نہیں لگتا" نسیم نے کہا کہ "ارشاد ہو!" ناسخ نے یہ مصرعہ پڑھا ع

شیخ نے مسجد بنا، مسمار بت خانہ کیا

ظاہر ہے کہ یہ پنڈت دیا شنکر نسیم پر کھلی ہوئی مذہبی چوٹ تھی مگر نسیم نے فی البدیہہ اتنی خوبصورتی سے شعر کو مکمل کیا کہ وار بالکل الٹ گیا ع

پہلے اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

یہ معرکہ بجائے خود بہت ہی دلچسپ تھا لیکن تذکرہ کے مطالعہ کے اثنا میں "میر اعلیٰ علی دہلوی" کے اشعار کے انتخاب میں یہ شعر نظر سے گذرا ؎

توڑ بت زاہد نے کیوں مسجد یہ بت خانہ کیا
تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

یہ توارد اصل معرکہ سے زیادہ حیرت انگیز ہے کہ ایک شعر کے دو مصرعوں سے علیحدہ علیحدہ دو شاعروں کی دماغی کاوشیں بالترتیب متوارد ہو جائیں۔

راجہ رام نرائن موزوں کا نام اوپر گذر چکا ہے۔ یہ سراج الدولہ کی طرف سے عظیم آباد کے صوبہ دار تھے۔ شیخ علی حزیں کے شاگرد تھے۔ فارسی کہتے تھے اور صاحب دیوان تھے۔ میر حسن کے الفاظ میں "بسیار خوش گو، آشنا پرست، سیاہ دوست" تھے۔ "شعر ریختہ کم گفتہ بلکہ نہ گفتہ" لیکن صرف ایک شعر کی بدولت ریختہ گویوں کی محفل میں بھی تذکرۂ مدام کی کرسی حاصل کر لی۔ جس وقت سراج الدولہ کے شہید ہونے کی خبر شہر میں پہونچی اسی وقت فی البدیہہ شعر کہہ کر روتے جاتے تھے اور خبر لانے والوں سے حال پوچھتے جاتے تھے ؎

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری؟

نہیں شعر از و بہ یادگار ماند"

مولانا شروانی مقدمے میں لکھتے ہیں، ذرا اس شعر کو مکرر پڑھو اور اس کے درد کا اندازہ کرو۔ یہ بھی غور کرو کہ ایک "آشنا پرست" کا ماتمت کے دل کی واردات کا سچا نقشہ ہے۔ کیا اس کے بعد مجھ کو یہ کہنے کی اجازت ملے گی کہ "تاریخ کے سیاہ کار"

٭ "اور خفگی" صحیح نہیں (ادارہ)

بلبک ہیول کے داغدار ، سراج الدولہ ! تیرے دل میں تو محبت وہمسدردی کا چراغ روشن نظر آتا ہے ۔"

راقم الحروف کہتا ہے کہ یہ سارا تبصرہ صرف پہلے مصرعہ تک ہی محدود ہے ۔ دوسرے مصرعہ کو پڑھو اور دیکھو کہ راجہ رام نرائن کو" دوانے کے مرنے کے بعد' اس کی بھی فسکر تھی کہ" ویرانے پہ کیا گزری "؟ محبتِ آقا اور حبِ وطن کا یہ حسین امتزاج ایسے ہی شعر میں ممکن تھا جو پُرخلوص قلب کی گہرائیوں سے بے ساختہ سطحِ زبان پر آگیا ہو اور جو جذباتِ دل کا ترجمان ہو۔

میر حسن کا اندازِ تحسین دیکھو

رئیسا تھ سنگھ خواجہ میر درد کے معتقدین میں سے تھے ۔علمِ تاریخ میں اتنی زبردست مہارت رکھتے تھے کہ قصیدے کے قصیدے ایسے لکھ ڈالے ہیں جن کے ہر مصرعہ سے ممدوح کی تاریخ نکلتی ہے ۔ایک کنوئیں کی تاریخ کہی ہے ع

آب از یں چاہ بے نظیر بر آمد

۳ ۱۱۸۱

" چاہ بے نظیر" کے اعداد میں سے" آب" کے اعداد کا تعمیہ کیا ہے اور اتنے حسین انداز سے کہ میر حسن بے اختیار کہتے ہیں کہ" تعمیہ آب بسیار مناسب افتادہ کہ بہتر از بے تعمیہ گردیدہ ۔"

لالہ خوش وقت رائے شاداب چاند پور کے رہنے والے تھے ۔ان کا ایک شعر ہے

دیکھ اس کے منھ پہ زلف سیہ فام کے تئیں
کیا زیب دی ہے کفر نے اسلام کے تئیں

میر حسن کہتے ہیں" واقعی ایں کافر مضمونے خوب یافتہ است کہ کفر از دمی بارد"

اکثر شعراء کے حالات میں عشق و محبت کی چاشنی موجود ہے اور بعض واقعات تو افسانے کا بہترین پلاٹ بن سکتے ہیں۔

فضائل علی خاں بے قید ایک محمد شاہی جوان تھے ۔خوش خوراک و خوش پوشاک ، شعبدہ بازی اور صحبت داری میں کامل ۔ایک بت ہندی پر عاشق تھے ۔ گردش روزگار سے نواب عمدۃ الملک کی ہمراہی میں الہ آباد جانا پڑا ۔فراقِ محبوب میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے اور آہوئے بے صحرا کی طرح وحشت کھاتے تھے۔ آخرکار نواب عمدۃ الملک کو ان کی دل بستگی کا سامان مہیا کرنا پڑا ۔کچھ اہلِ نشاط بلائے گئے اور ان سے یہ فرمائش کی گئی کہ بے قید کو نازو ادا سے کسی دکسی زلفِ گرہ گیر میں اسیر کرو تاکہ ان کا دل کچھ قرار پکڑے ۔ایک نازنین نے ان کو بہ ہزار عشوہ و فریب رام کر لیا ۔ اس وقت انھوں نے اپنے حسبِ حال ایک مثنوی کہی جو اس زمانے میں مشہور تھی ۔مختصر یہ کہ جب یہ اپنے اس عشقِ تازہ میں کامیاب ہوئے اور زانوئے حبیب پر سر رکھ کر خوابِ نوشیں کے مزے لینے لگے ۔ اس وقت کا حال سنیئے ؎

عجب خواب دیکھا میں اس خواب میں — ہوا جس سے میں پیچ اور تاب میں
ہُوا تھا جنھوں سے میں آدل جدا — سو کیا دیکھتا ہوں وہی دل ربا
کہ جو چاہتی تھی مجھے دل سیتی — جدا بھی ہوا تھا میں مشکل سیتی
سو کہتی ہے یوں میرا دامن پکڑ — کہ چھوٹے ترے غم سے میرا جگر
شب و روز رونا مرا کام ہے — ترا نام لینے سے آرام ہے
یہاں تو جو چاہے سو کر میرے ساتھ — قیامت کو دامن ترا میرے ہاتھ

یہ خواب دیکھ کر نیند سے چونکے تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص ان کی تلاش میں آیا ہے باہر نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اسی پہلی محبوبہ کا قاصد ہے ۔ اس خط کے بعض مضامین یہ ہیں ؎

لکھا بعد یا جامع الفارقین — سلامت رہو قاتل الشاہدین
تمھاری خوشی سے یہاں خیر ہے — سدا ہجر کے باغ کی سیر ہے
نہ پوچھو جو تم اب تلک میری سار — تو جیتی ہوں میں اپنی قسمت سے ہار
لکھو کون ہے وہ جواہر مثال — بسے کس کے ہیرے میں اے میرے لال
جو دیکھا تھا تم رنگ سرخ و سفید — مرے تاج سر اب نہ رکھیو امید
وہ بھویں کہ شمشیر جن کی غلام — برہ کو نہ ٹر کر کریں ہیں سلام
کروں کیا نکلتی نہیں جان ہے — کہ یہ میری غلطی کا تاوان ہے

مثنوی میں تقریباً پانچ سو اشعار ہیں بقول میر حسن ابتدا میں ، جہاں تک معشوق کے غنج و دلال اور حسن و جمال کا تذکرہ ہے ، بہت ہی عمدہ ہے ۔مگر آخر میں جہاں اپنی وحشت و دیوانگی کا حال قلم بند کیا ہے وہاں افکار و پریشاں کا عنصر غالب ہے

آفتاب رائے رسوا کا نام او پر گذر چکا ہے یہ" منو" نامی ایک لڑکے کو دل دے بیٹھے تھے ۔ ہوتے ہوتے عشق کی حد دیوانگی سے مل گئی ۔ایک روز وہ لڑکا ان کی گردن میں رسی باندھ کر کھینچ رہا تھا اتفاقاً ایک اور شخص رستہ میں مل گیا" منو" نے نازِ محبوبانہ سے اس کو بھی گرفتار کر لیا ۔ اس موقع پر رسوا نے یہ شعر کہا ؎ — دیگرے را در گرفتاری شریکِ ما مکن
مدعا گر شہرتِ حسن ست یک رسوا بس ست

لہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے درست نہیں (ادارہ)

"یک رسوا ایں است"، کتنا معنی خیز اور لطف انگیز ٹکڑا ہے۔ اردو کلام کا نمونہ یہ ہے؎

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے
ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

ان دونوں اشعار میں تخلص سے کتنا فائدہ اُٹھایا ہے!

میر ظفر علی آزاد۔ درد مند و عاشق مزاج تھے۔ دہلی کے رہنے والے اور مرشد آباد میں مقیم تھے۔ پنا بیگم کی ایک کنیز، نزاکت نامی، ان پر عاشق ہو گئی۔ ہرچند باہم ملاقات نہیں تھی لیکن عشق کی آتشِ پنہاں نے سینہ کو مثلِ لالہ داغدار کر دیا تھا آخر کار آہِ سحر گاہی نے ان پر بھی اثر کیا۔ جب نزاکت کی حالت بہت نازک ہونے لگی تو پنا بیگم نے استفسارِ حال کیا اور بیتابی کا سبب پوچھا۔ اس نے نڈر ہو کر کہہ دیا کہ "میں فلاں سے محبت کرتی ہوں اب آئندہ آپ مختار ہیں جو چاہیں سو کریں"۔ بیگم صاحبہ نے اسے تختہ بند کر کے قید کر دیا۔ آزاد نے یہ واقعہ سنا تو آتشِ غم کو آنسوؤں سے بجھانے کی کوشش کی اور یہ شعر کہا؎

معشوق ز رسوائی من پردہ نشیں شد | ایں بود سزائے نگہِ بے ادبِ ما

فارسی زیادہ کہتے تھے۔ اردو کے اشعار میں بھی نزاکت پائی جاتی ہے؎

وعدۂ وصل تو کرتے ہو مگر سچ کہیو | دل کو اس وعدے سے میں شاد کروں یا نہ کروں
خانہ اک دم کے لئے سیل پہ مانندِ حباب | متحیر ہوں کہ بنیاد کروں یا نہ کروں
مرغِ دل تیری جدائی سے پڑا تڑپے ہے | اس کو کیا حکم ہے آزاد کروں یا نہ کروں

میر حسن نے سلکِ متقدمین میں "سعدی دکنی" کا بھی تذکرہ کیا ہے جن کا "ہم شکر ہے ہم گیت ہے" والا مقطع مشہور ہے اور اس اختلاف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو شاعر مذکور کی شخصیت کے متعلق پیدا ہو گیا تھا۔ فرماتے ہیں کہ "سعدی دکنی بعضے ایں را سعدی شیرازی قرار دادہ اند و بعضے سعدی دیگر یعنی دکنی۔ واللہ اعلم"

اس کے بعد یہ تین شعر درج کئے ہیں؎

ہم نا متقن کو دل دیا تم نے لیا اور دکھ دیا | تم یہ کیا، ہم وہ کیا، ایسی بھلی یہ ریت ہے
نے تم

دو نین کے کھپر کروں، دو را نجھو اس میں بھروں | بیش سگ کو بیت، دھروں پیا سا دیئے میت،
سفال آنسو دوست

سعدی غزل انگیختہ، شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ دُر ریختہ۔ ہم شکر ہے ہم گیت ہے

اشعار کی فارسیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میر حسن شاعر مذکور کو "سعدی شیرازی" قرار دینے پر مائل نظر آتے ہیں۔ "چوں زبان فارسی دریں شامل است اغلب کہ سعدی شیرازی است"، لیکن اس امر کو مدِ نظر رکھئے کہ یہ اس زمانے کے اشعار ہیں جب فارسی اور بھاشا کی آمیزش سے ایک تیسری زبان عالمِ وجود میں آ رہی تھی اور ابھی یہ آمیزش اتنی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اجزائے ترکیب باہمی تفاعل سے اپنی جداگانہ ہستی کو یکسر فنا کر کے ایک بالکل ہی نئی شکل اختیار کر لیں بلکہ ابھی پانی اور شکر کو الگ الگ پہچانا جا سکتا تھا اور جس طرح ہر ترکیب کے ابتدائی دور میں کچھ اجزاء باہم مل جاتے ہیں اور کچھ اپنی اصلی ہیئت پر باقی رہتے ہیں اسی طرح اگر اس زمانے کے ریختہ کے اشعار میں خالص فارسی ترکیبیں بلکہ بعض صورتوں میں مکمل فارسی جملے نظر آ جائیں تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اسے کسی ایرانی نژاد شاعر نے ہندوستان میں آ کر کہا ہے۔ بہرحال میر حسن کو بھی موردِ الزام قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو،

اجناس خوراک کی پیداوار میں اضافہ

پنج سالہ پلان کے بنیادی سال ۵۰-۱۹۴۹ء میں غلوں کا رقبہ کاشت انیس کروڑ پچپن لاکھ ایکڑ اور کل اجناس خوراک کا رقبہ چوبیس کروڑ ترپن لاکھ ایکڑ تھا۔ پلان کے تحت ۵۶-۱۹۵۵ء کے آخر تک غلوں کے رقبہ میں پندرہ لاکھ ایکڑ کا اور کل اجناس خوراک کے رقبے میں سات لاکھ ایکڑ کا اضافہ مقرر کیا گیا ہے۔ لیکن ۵۳-۱۹۵۲ء میں ہی اجناس خوراک کا مجموعی رقبہ کاشت پچیس کروڑ بیس لاکھ ایکڑ تک جا پہنچا اور ۵۴-۱۹۵۳ء میں اس رقبۂ کاشت میں نوے لاکھ ایکڑ کا مزید اضافہ ہوا اور سال کا کل رقبہ کاشت چھبیس کروڑ دس لاکھ ایکڑ ہو گیا۔ اس سے پیشتر بھارت یونین میں کبھی اتنے وسیع رقبہ پر کاشت نہیں ہوئی۔ پیداوار میں اس زبردست اضافے کی بدولت غیر ملکوں سے اجناسِ خوراک کم مقدار میں درآمد کئے گئے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں دو ارب سولہ کروڑ روپے کی مالیت کے سینتالیس لاکھ ٹن، ۱۹۵۲ء میں انتالیس لاکھ ٹن، ۱۹۵۳ء میں اکیس لاکھ ٹن اور ۱۹۵۴ء میں اب تک اس مقدار کا صرف پانچواں حصہ درآمد کیا گیا ہے۔

خیال فاروقی

گُل کدہ

غزل ــــــ کشمیری

اصل

۱۔ ژہ پرٕ افسانہ نۆ نُتھ ہوشرین مستانہ یارٕ و لو
بۆ چارٕ سے شوقہ سان اَتھ لوٚلہ سازس میچھ تارٕ و لو

۲۔ اژٕ مُتھ سوٗی زاَد چارن منز جیاتچ وگ رٹان آخر
ژٹان یُس پردہ آرا مکھ مشٕت یُس گوٗ قرارٕ و لو

۳۔ طُفانن وُزملن وُنتو فنائی منز شرٕین جل جل
جنوٗنن سأن اونُت سالہ امنکھ نوبہارٕ و لو

۴۔ نۆ نرژامُت چھو ازٕ مالکس نوٚی سرہ پوش پھٕل باغس
بُھکس گیہٕ کالہ تیہٕ ہردس وُزِل گےٚ لالہ زارٕ و لو

۵۔ مژر سونوٗی چھو مغرُورن وُھٹت گردن پتھر بادان
وُزان اکوٗی تژ رُٹ لشیٹ کینوٗ منز آبشارٕ و لو

۶۔ وتن گٹہ آسٕتن پانے صُبح پھٕل پھٕل یوان برونہہ کُن
قدم چھا سرفروش ہند کران زانھ انتظارٕ و لو

۷۔ خیاؔلو! بے اثر چھنہ زُلف و مژگانک سخن وزان
مگر وُلکِ غزل پرنس چھۓ وقتٕچ ئے بکارٕ و لو

ترجمہ

۱۔ اے دوست! تو نئے نئے افسانے سُناتا جا کہ متوالے ہوش میں آجائیں اور میں شوق و ذوق سے اُلفت کے تاروں کو چھیڑتا جاؤں گا۔

۲۔ وہی انسان باریکیوں کو سمجھ کر زندگی پر تصرّف جماتا ہے جس نے آرام کے پردوں کو چاک کیا اور جو سکون و قرار کو ذہن سے بھول ہی بیٹھا۔

۳۔ کوئی بجلیوں اور طوفانوں کو آگاہ کر دے کہ بحرِ فنا میں غرق ہو جائیں کیونکہ ہمارے جنوں نے "امن" کے نوبہار کو مدعو کیا ہے۔

۴۔ بلوہ اور مالکھ کا سینہ چھلنی ہو کر نئے حسن کے ساتھ پھول کھل اُٹھے ہیں اسی لئے خزاں کا چہرہ فق پڑ گیا ہے اور لالہ زار سُرخ ہو کر چمک رہے ہیں۔

۵۔ ہماری ہی دیوانگی بڑے بڑے سفّاکوں کی گردن مروڑ کر انھیں زمین بوس کر دیتی ہے اور ہمارے ہی جوشِ جنوں کے اثر سے سخت پتھروں کی چھاتیوں سے آبشار پھوٹ پڑتے ہیں۔

۶۔ اگرچہ راستوں پر مہیب تاریکی بھی مسلّط ہو لیکن صبح خود ہی آگے آکر خیر مقدم کرتی ہے کیونکہ سرفروشوں کے قدم کبھی انتظار نہیں کرتے۔

۷۔ اے خیال! زلف و مژگان کے سخن تو بغیر اثر کئے نہیں رہتے لیکن ایسی غزلیات بیان کرنے کے لئے "وقت کی آواز" درکار ہے۔

پنچ سالہ پلان

نمبر ۵

گزشتہ سے پیوستہ

زمینوں کے متعلق پالیسی

س - کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ پلان میں زمین کے متعلق جو پالیسی درج کی گئی ہے اس سے ایک نئے سماجی نظام کی بنیاد پڑے گی؟

ج - ہاں - ایک طرف تو بڑے بڑے زمینداروں اور درمیانی لوگوں کے ختم ہو جانے سے یہ پالیسی سارے ملک میں زمین کے کسان مالکوں کا ایک ہم آہنگ ڈھانچہ پیدا کرے گی جو اپنی زمین کی خود کاشت کریں گے - دوسری طرف کوآپریشن پر زور دینے سے یہ ایک نئے نظام کا رستہ دکھلائے گی جس کی بنیاد دیہاتوں کی سطح پر کسانوں کی زمینوں کے مشترکہ انتظام پر ہوگی - اس قسم کے نظام کا قیام ایک لمبی مدت کی پالیسی پر مبنی ہوگا - لیکن کوآپریٹو بنیادوں پر کاشت کے متعدد تجربات کا پلان میں انتظام کر دیا گیا ہے -

س - کوآپریٹو دیہاتی انتظام کیا ہے؟

ج - کوآپریٹو دیہاتی انتظام سے مراد ہے ایک گاؤں کی ساری زمین کا دیہاتی سماج کے ذریعے سے انتظام - اس میں ایک ملکیت کے منافع کی گنجائش کے تحت ان لوگوں کے حقوق ملکیت کا خیال رکھا جائے گا جو اپنی زمین اس نظام کے تحت پیش کر دیں گے - اس طریقے سے دیہاتی سماج گاؤں کی ساری زمین کا انتظام اس طرح کرے گا گویا یہ ایک ہی کھیت ہے -

س - کیا زمینداروں کو معاوضہ دیا جا رہا ہے؟ اور اگر دیا جا رہا ہے تو کس اصول پر؟

ج - ہاں - زمینداروں مالگذاروں اور جاگیرداروں کو معاوضہ دیا جا رہا ہے - اگرچہ معاوضے کے سلسلے کی تفصیلات ہر ریاست میں مختلف ہیں لیکن بنیادی طور پر معاوضے کا فیصلہ زمیندار کی اپنی جاگیر کی ٹھوس آمد کے حاصل ضرب کی بنا پر کیا گیا ہے - لیکن یہ حاصل ضرب تمام حالات میں یکساں نہیں ہے - جاگیر جس قدر چھوٹی ہوگی اس کی آمدنی کا حاصل ضرب اسی تناسب سے زیادہ ہوگا - مثال کے طور پر یو - پی میں اس زمیندار کو جو ملیے کے طور پر ۲۵ روپے یا اس سے کم ادا کرتا ہے ٹھوس آمدنی کا ۲۸ گنا معاوضہ (جس میں دوبارہ آبادکاری کی گرانٹ بھی شامل ہے) ملے گا - جب کہ اس زمیندار کو جو ۵۰۰۰ روپے مالیہ ادا کرتا ہے صرف ۹ گنا معاوضہ ملتا ہے -

بالعموم جہاں تک چھوٹے زمینداروں کا تعلق ہے انھیں معاوضہ نقد روپے کی صورت میں (یک مشت یا قسطوں میں) ملے گا اور دوسروں کو بانڈ کی صورت میں ملے گا جو قابل انتقال ہیں - لیکن سکا رہن رکھنے کے قابل نہیں ہیں - جو روپیہ ابھی تک زمینداروں کو ادا نہیں کیا گیا - اس پر تمام زمینداروں کو ڈھائی فیصدی سود ادا کیا جائے گا -

س - پلاننگ کمیشن اس بات کے حق میں ہے کہ ایک فرد کی ملکیت میں زمین کے لئے ایک زیادہ اونچی حد کا اصول بنایا جائے اس کا حساب کس طرح لگایا جائے گا -

ج - پلاننگ کمیشن نے متعدد معیاروں کا ذکر کیا ہے جس کے پیش نظر ایک حد مقرر کی جا سکتی ہے - اور اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ کسی دئے ہوئے رقبے میں معیار مقرر کرنے کا انحصار اس حق قبضہ اور ملیے کے انتظام پر ہوگا جو وہاں جاری ہوگا - کمیشن نے تجویز کیا ہے کہ اونچی حد مقرر کرنے کا ایک عملی طریقہ یہ ہوگا کہ اس کا انحصار ایک خاندان کی زمین پر کیا جائے گا جسے مختصر طور پر ایک اوسط سائز کے خاندان کے لئے جو زراعت کے میدان میں ایک مروجہ مدد لے کر کام کر رہا ہے - کاشت کا یونٹ یا کام کا یونٹ کہا

جائے گا۔ اگرچہ ہر ریاست میں کوئی نہ کوئی تبدیلی تو ضرور ہوگی۔ لیکن کمیشن کا خیال ہے کہ عام طور پر خاندان کی زمین کی تین گنا حد ایک مناسب حد ہوگی۔

س ۔ کیا زمینوں کے متعلق پالیسی کاشت کاروں (لگان داروں) کے ساتھ بھی انصاف کرتی ہے؟

ج ۔ جی ہاں ۔ زمینوں کے متعلق پالیسی حق قبضہ کے تحفظ کا بھی انتظام کرتی ہے اور لگان کی حدود بھی مقرر کرتی ہے ۔ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ عام طور پر لگان داری کم سے کم پانچ برس کے لئے ہونا چاہیئے ۔ اور کرایہ پیداوار کے ۱/۴ یا ۱/۵ سے نہیں بڑھنا چاہیئے ۔ یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ لگان داروں کو اپنی کاشت کی ہوئی زمین خریدنے کا بھی حق ہونا چاہیئے ۔ اگر یہ زمین اس رقبے سے زیادہ ہے جو زمین کے مالک کو اپنی ذاتی کاشت کے لئے رکھنے کی اجازت ہے ۔ جو روپیہ اس کے لئے ادا کیا جائے گا وہ کرائے (لگان) کی مقدار کا ایک حاصل ضرب ہوگا اور اس بات کا انتظام کیا جائے گا کہ ایک مدت مقرر کرکے اس میں روپیہ قسطوں کے ذریعے سے ادا کر دیا جائے ۔

کمیونٹی کی ترقی

س ۔ کمیونٹی کی ترقی اور کمیونٹی پراجیکٹ سے کیا مراد ہے؟

ج ۔ کمیونٹی کی ترقی سے مراد ہے دیہاتی لوگوں کے مفاد کے پیشِ نظر انھیں کا تعاون حاصل کرکے دیہات کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں ایک بتدریج تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش ۔ یعنی زیادہ سائنٹفک زراعت، بہتر صفائی، رسل و رسائل اور گھریلو صنعتوں میں ترقی پیدا کرکے اور دیہاتی کے پاس پہنچ کر، لیکن افسروں کی ایک بڑی مقدار کے ذریعے سے نہیں جن میں سے ہر ایک دیہاتی زندگی کے ایک پہلو سے تعلق رکھتا ہے بلکہ ایک ایجنٹ کے ذریعے سے (جسے گرام سیوک کہا جاتا ہے) جو دیہاتی ترقی کے کم از کم تمام بڑے بڑے شعبوں کے لئے مشترک حیثیت رکھتا ہو ۔ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ دس برس کی مدت میں ملک بھر میں ایسے کارکنوں کا ایک جال بچھا دیا جائے جو کسان کو اپنے مسائل حل کرنے میں اور دیہاتی زندگی کی بحیثیت مجموعی ترقی کے لئے بھی مدد دیں ۔

اس اثنا میں دیہات کی از سرِ نو تعمیر کے مسئلے کے حل کا طریقہ کمیونٹی پراجیکٹ کے علاقوں میں پوری طرح سے استعمال کیا جا رہا ہے ۔ اس وقت تقریباً ۵۵ ایسے پراجیکٹ ہیں اور سالِ رواں میں مزید ۵۵ ڈیولپمنٹ بلاکوں کا ان میں اضافہ کیا جائے گا ۔ پراجیکٹ کے ایک علاقے کو تین ڈیولپمنٹ بلاکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا ۔ ہر بلاک میں تقریباً سو گاؤں ہوں گے ۔ جن کی آبادی ۶۰۰۰۰ سے ۷۰۰۰۰ تک ہوگی ۔ اس کے بعد ڈیولپمنٹ بلاک کو تقریباً پانچ دیہات کے ایک گروپ میں تقسیم کر دیا گیا ہے ۔ ہر گروپ دیہاتی سطح کے کارکن کا میدانِ عمل قرار دے دیا گیا ہے ۔ ان کمیونٹی پراجیکٹوں کے علاقوں کے لئے بحیثیت مجموعی ملک بھر کے مقابلے میں زیادہ اسٹاف اور زیادہ مالی ذرائع مہیا کئے جا رہے ہیں ۔ لیکن ان علاقوں میں اس شدید ترقی کا جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ بعد میں بڑے پیمانے پر لاگو کرنے کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا ۔

س ۔ یہ واضح طور پر بتایا جائے کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کیا ہے؟

ج ۔ سرگرمیوں کا خاص میدان تو زراعت ہے لیکن رسل و رسائل، تعلیم، صحت، دیہاتی صنعتوں اور کوآپریٹو سوسائٹیوں کی ترقی پر بھی بہت زور دیا گیا ہے ۔ زراعتی پروگرام حاصل ہونے والی بنجر زمینوں کو توڑنے، آب رسانی کے چھوٹے چھوٹے کاموں، زراعت کے لئے بہتر ٹیکنیک اور بہتر بیجوں، مصنوعی کھاد اور قدرتی کھاد کے استعمال اور اعلیٰ نسل کی بدولت مویشیوں کی نسل میں بہتری پیدا کرنے کے پروگرام پر مشتمل ہے ۔

سڑکوں کا پروگرام اس طرح بنایا جائے گا کہ کمیونٹی پراجیکٹ کے علاقے کے ہر گاؤں کو کسی بڑی سڑک سے ملا دیا جائے ۔

پرائمری اور سیکنڈری تعلیم کے لئے بہتر انتظام کیا جائے گا اور صنعت گروں کو بہتر ٹیکنیک کی آسانیاں مہیا کی جائیں گی ۔

جہاں تک صحت کا تعلق ہے ۔ کوششیں پانی کے بچاؤ اور انسانوں اور مویشیوں کے فضلے کو ٹھکانے لگانے اور وباؤں کو قابو میں لانے پر مرکوز کی جائیں گی ۔ دیہاتیوں کو عمارتوں کی تعمیر کی بہتر ٹیکنیک کی تربیت دی جائے گی اور ایک گنجان آباد گاؤں میں یہ ضروری ہوگا کہ نئے مکانات بنانے کے لئے جگہ کا انتظام کیا جائے ۔

پروگرام کے مقاصد میں ایک یہ بھی ہوگا کہ ہر گاؤں یا دیہات کے ایک گروپ میں ایک کثیر المقاصد کوآپریٹو سوسائٹی قائم کی جائے ۔

نئے مطبوعات

نقشہائے رنگ رنگ

پروفیسر رادھے شیام رستوگی احقر کے اُردو اور فارسی کلام کا یہ مجموعہ بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

احقر صاحب لکھنؤ کے ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ انگریزی علم و ادب کے اُستاد ہیں۔ اردو اور فارسی سے موصوف کو والہانہ محبت ہے۔ اسی محبت کا کرشمہ تھا کہ آپ نے دونوں زبانوں کو نوادرِ سخن سے مالا مال کیا ہے۔ آپ کی شاعری بیشتر روایتی شاعری ہے لیکن اس میں بھی ایک سلیقہ مندی، ایک میانہ روی اور ایک متانت کارفرما ہے۔ قدیم رنگِ تغزّل کی پیروی کے ساتھ ساتھ موصوف نے ملکی اور ملّی مسائل و واقعات کو بھی منظم فرمایا ہے۔ کتاب کا تعارف پروفیسر مسعود حسن رضوی نے لکھا ہے اور "حرفے چند" کے عنوان سے دیباچہ پروفیسر آلِ احمدؐ صاحب سرور نے۔ سرور صاحب کے دیباچے کا ایک اقتباس مصنف کے رنگِ سخن، رجحانِ طبعی اور شخصیت کو اچھی طرح نمایاں کر دے گا۔

رستوگی صاحب کے اس 'نقشہائے رنگ رنگ' میں کتنے ہی نقش اپنے حسن و زیبائش کی وجہ سے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس میں ہندی لے بھی ہے اور ایرانی نے بھی۔ . . . . ان کی بعض فارسی نظموں میں بڑی بے ساختگی اور روانی ملتی ہے اور ان سے یہ بات بھی آئینہ ہو جاتی ہے کہ مشرقیت کا یہ فدائی مغربی سامراج کی چیرہ دستیوں سے نالاں ہے . . . . فقیرِ برہنہ بڑی دلکش نظم ہے . . . . اس نظم میں گاندھی جی کے ساتھ عقیدت شعریت کے حسین روپ میں نظر آتی ہے۔ چند اشعار سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

در سیاست انقلابے ایں چنیں آمد پدید   یک فقیرِ برہنہ، در پیشِ خاقاں می رود
آں فقیرِ تارک الدنیا کہ اسمِ پاک او   چوں وظائف بر زبانِ پاکبازاں می رود
صلح جوئے و صلح خوئے و صلح کیش و صلح کوش   از برائے صلح سوئے انگلستاں می رود
یا برائے آبیاری ہائے نخلِ حرّیت   آرے آرے از ریاضِ خلد رضواں می رود
یا سوئے بر براقِ عزم با جبریلِ ہوش   بہرِ دیدارِ جلالِ مطلق یزداں می رود
یا ہزارِ خوش نوا بیتاب در فصلِ بہار   در تلاشِ بوئے گل سوئے گلستاں می رود

کتنی اور قومی و ملّی نظمیں اس مجموعے کی زینت ہیں۔ چند اشعار غزل کے بھی ملاحظہ فرمائیے

پریشاں مجھے دیکھ کر لوگ بولے   صد افسوس یہ مبتلا ہے کسی کا
لشکرِ غم کی ہوئی آمدِ دلبر سے شکست   فوجِ عشرت نے مجھے گھیر لیا ہر سو سے
تمھاری زلف کے چرچے پریشانوں میں بٹتے ہیں   مری دیوانگی کے ذکر دیوانوں میں رہتے ہیں

ادب اور نظریہ

آل احمد سرور صاحب کے ۱۳ تنقیدی مضامین کا مجموعہ قیمت ۲ [illegible] تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۲۹۶ صفحات۔ کتاب مجلد اور جلد پوش سے مزّین ہے۔

سرور صاحب کے تنقیدی مضامین کا یہ چوتھا مجموعہ ہے۔ ان تیرہ مضامین میں سے چار غیر مطبوعہ ہیں۔ سرور صاحب اردو کے ممتاز ترین نقّادوں میں سے ہیں۔ ان کے مزاج کا ایک خاص قسم کا توازن، تنقید میں توازن و اعتدال کا ضامن رہا ہے۔ یہی جوہر انھیں دوسرے تنقید نگاروں سے ممتاز بناتا ہے۔ ان تیرہ مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ نظیر اور عوام، اختر شیرانی، غالب کا ذہنی ارتقاء، اقبال کی عظمت، رشید احمد صدیقی، مولانا سہیل کی شاعری، جوش کا سرود و خروش، ضیائے حیات، روایت اور تجربے اردو شاعری میں، نئے ہندوستان کی تعمیر میں اردو کا حصّہ، ادب اور نظریہ۔

ملنے کا پتہ۔ ادارہ بک ڈپو امین آباد پارک لکھنؤ

ادبی تنقید

ڈاکٹر محمد حسن کے ۹ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ان میں سے کم از کم دو مضامین آج کل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن اردو کے نوجوان ادیبوں اور تنقید نگاروں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اس

مجموعے کے مضامین آپ کے شعور کی بیداری اور ناقدانہ بصیرت کو پوری طرح اُجاگر کرتے ہیں۔ قیمت فی جلد ۴؎ ملنے کا پتہ۔ انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

جوئے رواں

حامد اللہ افسر کے کلام کا مجموعہ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ افسر صاحب جو کبھی میرٹھی تھے اور اب لکھنوی ہو گئے ہیں۔ گو آج کل گوشہ نشین سے ہیں لیکن کسی زمانے میں بڑے "سرگرم" مشاعر ہوا کرتے تھے۔ بر اعتبارِ ذہانت و فطانت اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ بچوں کے لئے آپ کی نظمیں اور کہانیاں ملک بھر میں مشہور رہیں۔ تنقیدی مضامین، شعر و ادب غرضیکہ ہر آسمان کو آپ نے اپنی جولانگاہ بنایا ہے۔ آپ کا یہ مجموعۂ کلام دلدادگانِ شعر کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔

قیمت ۶؎ ملنے کا پتہ انوار بک ڈپو۔ لکھنؤ

مثنوی سرودِ بیخودی

ڈاکٹر عشرت انور مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے استاد ہیں۔ علم و ادب سے آپ کو بڑا شغف ہے۔ قریب قریب چھ سو فارسی اشعار پر مشتمل یہ مثنوی آپ کے پاکیزہ ذوقِ شعر اور بیدار شعور کی مظہر ہے۔ پیش کش سلطان الہند خواجہ غریب نواز خواجۂ اجمیر کے نام ہے۔ بقولِ مصنف یہ مثنوی اقبال کے فلسفۂ خودی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ موصوف نے دیباچے میں لکھا ہے کہ "خودی کے فلسفے کے تحت ایک ملت بحیثیت ملت فکری اعتبار سے دیگر ملل سے در پے تنازعہ اور تضاد ہے۔ چنانچہ ایک قدم آگے بڑھنے کی ضرورت تھی اور اقبال نے شاید مصلحتِ وقت کے تحت آگے بڑھنے سے گریز کیا۔" مصنف کا اسلوبِ بیان مؤثر اور زبان صاف اور پاکیزہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مثنوی قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

روزِ فردا خوش ہمی بینم بے — غم برد بر کس برائے ہر کسے
بہرۂ از عشق گر یا بد کسے — می برد غم از پئے انساں بسے
روزِ فردا چوں نظام دیگر است — ہر کسے را صبح و شام دیگر است
وا شود فردا کتاب بیخودی — ہر کسے مستِ شراب بے خودی
آنکہ می ورزد خودی محروم شد — "وانکہ خدمت کرد او مخدوم شد"

ملنے کا پتہ۔ ڈاکٹر عشرت انور، حالی روڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ قیمت دو روپے۔

زیرِ لب

صفیہ اختر کے خطوط جاں نثار اختر کے نام۔ قیمت چار روپے۔ ضخامت ۳۱۸ صفحے

تین سال کی مدت میں صفیہ مرحوم نے جو ہمت بڑھانے والے اور پُر حوصلہ خطوط جاں نثار اختر کے نام لکھے وہ اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ایک ہندوستانی خاتون کا عزم اور استقلال ان خطوں سے مترشح ہوتا ہے۔ ملنے کا پتہ۔ ادارۂ ادب و زندگی۔ ۱۲۱ آرکیٹریا بلڈنگ بائیکلہ بمبئی ۸

فنِ شاعری

مصنف علامہ اخلاق دہلوی۔ قیمت مجلد ۲؎ غیر مجلد ۱؎۔

عروض اور فنِ شعر پر ایک ایسی کتاب کی اشد ضرورت تھی۔ طلبا اور مبتدیوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ عروض کی مبادیات، زحافات، علم قافیہ اور متعلقہ مضامین پر مفید معلومات اس کتاب میں درج ہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔

ثنائے حبیب

بہزاد لکھنوی کی تازہ نعتوں کا مجموعہ۔ قیمت ۱۲؎ ملنے کا پتہ۔ انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

جہانِ اُردو

داستانِ اُردو منظوم کا مختصر ایڈیشن۔ از کوکب شادانی۔ قیمت دو روپے۔ ناشر جنرل پبلشنگ ہاؤس بندر روڈ کراچی۔

پیغمبرِ اسلام غیر مسلموں کی نظر میں

ادارہ نئی راہ ۹۔ بی بیرجی گوولڈجی بلاکس بمبئی ۸۔ ایڈیٹر ظلِ عباس عباسی

قیمت عام ایڈیشن ۱؎

پتر نیم کش

ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ شاہراہ اردو بازار دہلی۔ فکر تونسوی کے آٹھ طنزیہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت دو روپے۔

غبارِ کارواں

محشر عابدی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ۔ قیمت ۱؎ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ ٹونک

مشاہیرِ ملک کی آراء اس کتابچے میں شامل ہیں۔

بوئے دوست

ندیم مرادآبادی کے کلام کا مجموعہ۔ قیمت ۸۔

ملنے کا پتہ:۔ ضمیر حسین نواب سرائے کشن لال پر غیب مرادآباد یو۔ پی۔

رفتارِ زمانہ

فرانسیسی بستیوں کی بھارت میں شمولیت

اس ماہ کا سب سے اہم واقعہ فرانسیسی بستیوں کی بھارت میں شمولیت ہے۔ ۱۹۴۷ء میں بھارت کے آزاد ہونے کے بعد یہ مطالبہ بھی زور پکڑنے لگا کہ بھارت کی پرتگالی اور فرانسیسی بستیوں کو بھی غیر ملکی پنجے سے چھڑایا جائے۔ بھارت سرکار کافی عرصے سے اس سلسلے میں کوشش کر رہی تھی۔ کئی حلقے تو اس بات پر بھی زور دے رہے تھے کہ پولیس ایکشن کے ذریعے ان بستیوں کو آزاد کرایا جائے لیکن ہمارے پردھان منتری شری نہرو تشدد کو کام میں لانے پر راضی نہیں ہوئے۔ اُنھوں نے حکومت فرانس سے گفت و شنید جاری رکھی اور ان کی دور اندیشانہ پالیسی اور تدبر کی بدولت خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر تمام فرانسیسی مقبوضات اب بھارت کا حصہ بن گئے ہیں اور یکم نومبر کو فرانسیسی حکّام نے باقاعدہ طور پر بستیوں کا چارج بھارتی افسروں کے حوالے کر دیا ہے۔ حکومت پرتگال ابھی تک اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے اور گوا وغیرہ بستیوں کو بھارت سرکار کے حوالے کرنے سے انکار کر رہی ہے لیکن توقع کی جاتی ہے کہ شری نہرو اپنے ناخنِ تدبیر سے بالآخر اس مسئلے کو حل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

آندھرا میں نئے انتخابات

راشٹرپتی نے آندھرا کی اسمبلی کو ختم کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ واضح رہے کہ برسر اقتدار پارٹی اسمبلی میں حزبِ مخالف سے شکست کھا گئی تھی۔ راشٹرپتی نے اس امر کی ہدایات بھی جاری کر دی ہیں کہ آندھرا میں جلد از جلد نئے انتخابات کرائے جانے کے لئے طیاریاں شروع کر دی جائیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۵ر فروری تک صوبے میں عام انتخابات عمل میں آ جائیں گے۔

لوک سبھا میں شری قدوائی کو شردھانجلی

لوک سبھا کا اجلاس شروع ہونے پر ہاؤس کے لیڈر شری نہرو اور سپیکر شری ماؤلنکر نے نہایت دُکھ بھرے الفاظ میں شری رفیع احمد قدوائی کی وفات حسرت آیات پر اپنے رنج اور غم کا اظہار کیا۔ پردھان منتری نے افسوسناک لہجے میں کہا کہ شری قدوائی کے ہم سے جُدا ہو جانے پر ملک میں جو خلیج پیدا ہوئی اس کا پُر ہونا نہایت مشکل ہے۔ ماتمی قرارداد کھڑے ہو کر پاس کی گئی اور اس کے بعد اجلاس اگلے دن پر ملتوی کر دیا گیا۔

مالوٹوف کی مغربی ممالک کو تنبیہہ

روس کے وزیر خارجہ موسیو مالوٹوف نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں مغربی ممالک کو تنبیہہ کی ہے کہ جرمنی کو یکجا کرنے کے سلسلے میں روس اور مغربی دلیشوں کی گفت و شنید کا جبھی کوئی فائدہ ہوگا جب کہ مغربی ممالک مغربی جرمنی کو از سرِ نو مسلح کرنے اور کسی گروہ بندی میں لانے کے خیال کو ترک کر دیں۔ اس کے بغیر کوئی بات چیت کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچ سکے گی۔

بھارتی عوام کی علاقائی فوج میں دلچسپی

۲۰ر نومبر کو بھارت میں یوم علاقائی فوج منایا گیا۔ اس موقعے پر ملک کے مختلف حصوں میں علاقائی فوج کے جوانوں نے پریڈ کی اور فوجی کرتب دکھائے۔ وزیر دفاع شری مہابیر تیاگی نے ریڈیو پر ایک تقریر کے دوران میں بتایا کہ پچھلے کچھ مہینوں سے عوام نے علاقائی فوج میں شمولیت کے سلسلے میں کافی دلچسپی دکھائی ہے اور یہ ہمارے لئے ایک نیک فال ہے۔ شری تیاگی نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ بھارت امن کا متمنی ہے اور ہم سب کے ساتھ دوستی رکھنا چاہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ہمیشہ طیار رہنا چاہیئے۔ حفاظت کا کام صرف فوج کا ہی نہیں بلکہ ملک کے تمام باشندوں کا ہے اور اس کے علاوہ علاقائی فوج کے ہونے سے ملک پر زیادہ مصارف کا بوجھ بھی نہ پڑے گا۔

اٹیمی کانفرنس میں بھارت کو شامل کیا جائے

متحدہ اقوام کی اسمبلی میں برما کے نمائندے شری جیمز دبرنگٹن نے اس امر پر زور دیا کہ اٹیمی طاقت کے سلسلے میں بات چیت کے لئے جن ممالک کو مدعو کیا جا رہا ہے ان میں بھارت کو بھی شامل کیا جائے۔ شری دبرنگٹن نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ اس بات چیت میں انہیں ممالک کو شامل کیا جائے گا جو ایٹمی طاقت کے بارے میں کافی تجربہ رکھنے کے علاوہ خام مال بھی رکھتے ہوں اگر یہی شرط ہے تو کیا اس کا اطلاق صرف آٹھ ممالک یا روس کو شامل کر کے نو ممالک پر ہی ہوتا ہے۔ کیا ایشیا کا کوئی ملک اس قابل نہیں کہ اس کو اس بات چیت میں شامل کیا جائے۔ بھارت ایک بڑا ملک ہے اور اس کے پاس ایٹمی طاقت کے سلسلے میں خام اشیا کی بہتات ہے۔ اس لئے اس گفت وشنید میں بھارت کو ضرور شامل کیا جائے۔

امریکہ میں ایٹمی کارخانوں کی تعمیر

امریکہ اپنی ایٹمی طاقت بڑھانے میں اپنے بہترین ذرائع استعمال کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں تازہ خبر ہے کہ اوکرن کے مقام پر ایٹمی طاقت طیار کرنے کے دو کارخانے پایۂ تکمیل تک پہنچ چکے ہیں۔ ان کارخانوں پر کام شروع ہو جانے پر یورینیم کی پیداوار بہت بڑھ جائے گی۔ ہر دو کارخانوں پر ایک ارب ڈالر کی رقم خرچ آئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک تیسرا کارخانہ بھی پورٹ سماؤتھ کے نزدیک تعمیر ہونا شروع ہو گیا ہے۔

ریلوے کے سفر میں سونے کی سہولتیں

سرکاری طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ ۱۵ نومبر سے ریلوے میں تیسرے درجے کے مسافروں کو رات کو سونے کے لئے سیٹیں ریزرو کرنے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ فی الحال جنتا ایکسپریس، ڈیرہ دون ایکسپریس اور دہلی مدراس جنتا ایکسپریس میں سے ہر ایک میں ۷۵ سیٹوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ مسافروں کے آرام کی دیکھ بھال کے لئے ہر ایک کوچ میں ایک ایک کنڈکٹر ہوگا جو مسافروں کے سونے کا انتظام کرے گا۔ سونے کے لئے سیٹ ریزرو کرانے کے لئے دو روپے زائد کرایہ لیا جائے گا۔

کشمیر شاہراہ ترقی پر

لداخ کے بڑے لاما اور حکومت کشمیر کے نائب وزیر شری کوشک بکل نے جموں میں اس امر کا اعلان کیا ہے کہ لداخ کی قسمت ہمیشہ کے لئے بھارت کے ساتھ وابستہ ہو چکی ہے۔ لداخ کے باشندوں کا مفاد بھی اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ تبت کے ساتھ ملنے کی بجائے بھارت میں شامل ہوں۔ بڑے لاما نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ حکومت کشمیر لداخ کی حالت کو سدھارنے کے لئے کوشاں ہے اور حکومت نے ہماری یہ بات بھی مان لی ہے کہ جموں یا کشمیر میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والے نوجوانوں کو حکومت پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ دے گی۔ شری بکل نے یہ بھی بتایا کہ خرباتانگ کے علاقے میں ۱۲ لاکھ روپے کے خرچ سے ۲۰ میل لمبی نہر کھودی جا رہی ہے۔ اس نہر کے ذریعے ۲۵ ہزار ایکڑ زمین میں آب پاشی ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ گیارہ لاکھ روپے کے خرچ سے زراعت تعلیم صحت اور دیہات کی بہتری کی سکیموں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ لداخ کے صدر مقام لیہ میں ایک ہسپتال بھی مکمل ہو چکا ہے جس میں بیس بستروں کا انتظام ہے۔

بھارت کے پردھان منتری کی سالگرہ

بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو کا پینسٹھواں جنم دن دیش بھر میں بڑی شان کے ساتھ منایا گیا۔ کم وبیش دنیا کے تمام ممالک سے شری نہرو کو مبارکباد کے پیغامات موصول ہوئے۔ جن میں چین سے چاؤ این لائی، روس سے مالنکوف، ہندچینی سے ڈاکٹر ہوچی منہ، برما کے وزیراعظم اور یورپ کے کئی وزراء اعظم کے نام قابل ذکر ہیں۔ چین کے وزیراعظم نے پنڈت نہرو کو ایک نرالی بھینٹ بھجوائی ہے۔ اس بھینٹ میں ایک ہرن، ایک سارس اور ایک صد سنہری مچھلیاں شامل ہیں۔ اس بھینٹ کے ساتھ ایک پیغام بھجواتے ہوئے چین کے پردھان منتری نے کہا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ بھارت کے بچے بھی میری اس بھینٹ کو اسی طرح پسند کریں گے جس طرح آپ کی بھجوائی ہوئی ہتھنی آشا کو چین کے بچوں نے پسند کیا تھا۔

فلسطین کے پناہ گزینوں کو بھارت کی امداد

بھارت سرکار نے فلسطین کے پناہ گزینوں کے لئے ڈھائی سوٹن تیل اقوام متحدہ کے رلیف ادارے کو دیا ہے۔

مفتی فلسطین اور عربوں کی اعلیٰ کمیٹی کے صدر ایم امین الحسینی نے یہ تحفہ قبول کرتے ہوئے قاہرہ میں مقیم بھارتی سفیر کو لکھا ہے کہ فلسطین کے عربوں کی نمائندہ اعلیٰ عرب کمیٹی کی طرف سے میں یور ایکسیلینسی سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بھارت کے پردھان منتری شری نہرو اور بھارت سرکار کو اس کار خیر اور کرم فرمائی کے لئے ہمارا صدق دلانہ شکریہ پیش کریں۔

پاکستان کی نئی ترتیب

پاکستان کے وزیراعظم مسٹر محمد علی نے قوم کے نام اپنی تقریر نشر کرتے ہوئے بتایا کہ پاکستان کی وزارت نے فیصلہ کیا ہے کہ مشرقی بنگال کا نام مشرقی پاکستان کر دیا جائے اور مغربی پاکستان کی تمام اکائیوں کو

ملا کر ایک اکائی بنا دیا جائے۔ مغربی پاکستان کے صوبوں کو ایک اکائی میں شامل کرنے کی تفصیلی سکیم طیار کرنے کے لئے افسران کی ایک چھوٹی کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔

چین سے واپسی پر پردھان منتری کی تقریر

لوک سبھا میں اپنے دورۂ چین پر پہلی بار بولتے ہوئے پردھان منتری شری نہرو نے کہا کہ چینی لیڈروں کے ساتھ میری بات چیت کی بنیاد امن کو قایم رکھنا تھا اور یہ بات چیت دنیا میں کھینچا تانی کم ہونے میں مدد و معاون ثابت ہوئی ہے۔ چینی لیڈروں کے ساتھ جو میری لمبی بات چیت ہوئی ہے اُس میں ہم لوگوں نے کسی عہد نامے کا ذکر نہیں کیا بلکہ ہم نے صرف شانتی کے قیام پر ہی تبادلہ خیالات کیا۔ کیونکہ ہمارا یہ عزم مصمم ہے کہ ویسے تو ساری دنیا میں امن کی ضرورت ہے لیکن ہمارے اپنے ملک کی از سرِ نو تعمیر کے لئے تو امن بنیادی چیز ہے۔

انجمن اقوام متحدہ کی سالگرہ پر راشٹرپتی کا پیغام

" ہر سال اس تنظیم پر نکتہ چینی اور اس کی تعریف دونوں کی آواز ہمارے کانوں میں پڑتی ہے اور اس کے بارے میں امید و مایوسی کی ملی جلی آرا کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ اس ادارے کی بنیادی مضبوطی کا ثبوت ہے کہ مخالف یا موافق رائے زنی کے باوجود اس کا قدم آگے بڑھتا رہا ہے۔

آج یہ امر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اقوام متحدہ کی مانند ایک بین الاقوامی تنظیم کے بغیر دنیا کے معاملات کا طے پانا ناممکن ہو گیا ہے۔ خوش قسمتی سے سائنس اور آلاتِ حرب کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہی یہ تصور بھی مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔ یہی احساسات ان تمام ممالک کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں جو اقوام متحدہ کے ادارے کی تقویت اور بقا کا باعث ہیں۔ بہر حال میں ذاتی طور پر اس نوعیت کے ادارے پر یقین واثق رکھتا ہوں جو ایک رضاکارانہ فضا میں قایم کیا گیا تھا۔

آج کے قابلِ یادگار دن پر ہمیں یہ عہد کرنا چاہیئے کہ جس نصب العین کے لئے ادارۂ اقوام متحدہ کوشاں ہے۔ اس کے حصول میں ہم امداد و تعاون سے کام لیں تاکہ حقیقی معنوں میں دنیا میں انصاف امن اور خوش حالی کی فضا قایم ہو جائے۔

پچھمی بھارت کی تہذیبی نشوونما

ہمارے دیش کے مغربی حصے کی تاریخ اور معاشیات پر سمندر کے قرب کا بہت اثر رہا ہے۔ بودھوں کی کتابوں میں بھاروکاچا اور سوپار انام کی بندرگاہوں کا ذکر آتا ہے۔ جن کے ذریعے وسیع پیمانے پر تجارت کی جاتی تھی اور یہاں سے بھارتی مال سے لدے ہوئے جہاز بحرۂ روم کے ساحل تک پہنچا کرتے تھے۔ اس خطّے کے دلیر باشندے سمندروں کو چیرتے ہوئے دکن پوربی ایشیا کے ساتھ نہ صرف مختلف اقسام کے مال بلکہ خیالات کے تبادلے میں بھی اہم پارٹ ادا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس میدان میں شاندار تاریخی روایات کے حامل اس خطّے میں آج دو بڑی بندرگاہیں (جن میں سے ایک زیرِ تعمیر ہے) ۱۰ درمیانہ درجے کی ۵۰ چھوٹی اور ۲۹ بہت چھوٹی قسم کی بندرگاہیں واقع ہیں۔ ملک کی تجارت درآمد برآمد کا علی الترتیب تقریباً ۴۰ فی صدی اور ۳۳ فی صدی حصہ بمبئی کی بندرگاہ سے گذرتا ہے جہاں کہ تمام جدید سہولتوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس خطّے کی تقریباً ایک لاکھ ۷۰ ہزار اشخاص کی آبادی کا پیشہ مچھلیوں کی تجارت ہے

جس طرح فصل کی کٹائی کے موقعے پر گائے جانے والے گیت ہمارے دیش کے اندرونی حصے کے لوک سنگیت کی روایات کا خصوصی حصہ ہیں اسی طرح اس میدان میں پچھمی بھارت کی روایات میں ملاحوں کے گیتوں کو خاص مقام حاصل ہے۔ مثلاً نئی دولہن کو الوداع کہتے ہوئے اُسے اپنے عظیم تہذیبی ورثے کی یاد دلانے کے لئے اس مطلب کا گیت گایا جاتا ہے:

"گڑیا۔ کھاڑی تمھاری ماں ہے۔ دلدل تمھاری گذرگاہ ہے اور پیاری گڑیا سمندر تمھارا دادا ہے۔"

جب آریہ لوگوں نے پنجاب میں داخل ہونے کے بعد وسط بھارت میں پھیلنا شروع کیا تو اس خطّے کا کسی کو علم تک نہ تھا۔ لیکن بعد ازاں نئے نئے لوگ اس علاقے میں وارد ہوتے رہے اور یہاں نئی نئی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ موریہ، یونانی، شاکا، ستاواہن، گپتا، میترکا، چلوکیہ، بسولنکی، خلجی، تغلق، مغل، پرتگالی اور انگریز حکمراں نوکِ شمشیر سے اس خطّے کی سرزمین پر نئی تاریخ کندہ کرتے رہے۔ اس سرزمین نے فوجی میدان میں شیواجی ایسے بہادر پیدا کئے ہیں۔ لیکن جنگوں کی اس ہلچل کے ساتھ ساتھ مذہبی میدان میں نرسی مہتہ، ہنس دیوجی، سائیں بابا اور اپاسنی بابا ایسے رہنما تہذیبی روایات کو نشوونما دینے میں بھی مصروفِ عمل رہے۔

موجودہ دور میں بھی جبکہ بھارت ترقی کی نئی منازل طے کر رہا ہے۔ پچھمی بھارت کے قدرتی وسائل اور اس علاقے کی ترقی کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا گیا، اور پانچ سالہ پلان کے تحت اس علاقے کے ترقیاتی منصوبوں کے لئے ایک ارب ۹۰ کروڑ ۴۵ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اس طرح پچھمی بھارت میں پانچ سال کے عرصے میں مختلف ترقیاتی منصوبوں پر ۱۹۵۰-۵۱ء کے مقابلے میں آٹھ نو گنا زیادہ رقم صرف کی جائے گی۔

فنِ عمارت سازی، مصوّری اور موسیقی کے میدانوں میں بھی پچھمی بھارت نے عظیم روایات قایم کی ہیں۔ بمبئی سے ۵۰ میل کے فاصلے کے اندر اندر پونہ روڈ کے ساتھ کارلا اور بھاجا کے مقامات پر غاروں میں قایم شدہ مندروں کے قدیم نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ناسک، اورنگ آباد، سسنر کنہری اور بیڈسہ پر بھی گپھائیں ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں اجنٹا اور ایلورا کے غار سب سے زیادہ مشہور ہیں، اور یہ بمبئی سے ۲۵۰ میل سے کچھ زیادہ فاصلے پر واقع ہیں۔ مصوّری کے میدان میں اجنٹا کی صدارتی تصویروں کی روایات کا اثر جاری رہا۔ جس نے بعد ازاں گجرات کی ہاتھ کی مصوّری کو جنم دیا۔ اور مزید کچھ عرصہ گذرنے پر اس فن نے راجپوتی کی شاندار مصوّری کی شکل اختیار کی۔

بھارتی موسیقی کی نشو و نما اور ارتقاء

بھارتی سنگیت کی شاندار روایات کا ڈانڈا زمانۂ قدیم سے ملتا ہے سام وید ایک ایسی کتاب ہے جو غنائیت سے بھرپور ہے۔ موسیقی ہندوستانی زندگی کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی ہے۔ بچہ جب رحم مادر میں ہوتا ہے تبھی سے اس کے کان گیتوں سے آشنا ہو جاتے ہیں کیونکہ آسیب وغیرہ سے اسے محفوظ رکھنے کے خیال سے گیت گائے جاتے ہیں۔ جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف مرحلوں پر موسیقی اس کے قدم بقدم چلتی ہے۔

جیساکہ ویدوں میں ذکر کیا گیا ہے موسیقی مکتی کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ موسیقی میں نہ صرف مذہبی بلکہ غیر مذہبی سنگیت بھی شامل ہے۔ غیر مذہبی موسیقی کی جمالی کیفیت دیرپا قدروں کی حامل ہوتی ہے اور انسان کو اونچا اٹھانے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ بیشنووں کے قول کے مطابق فنون لطیفہ کی ساری تخلیق کا سرچشمہ خدا ہے۔

کمار سوامی نے ناخواندگی اور جہالت میں امتیاز کرنے پر زور دیا ہے۔ عوام کی بہت بڑی تعداد تو ان پڑھ ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ مندروں کے آس پاس بستے ہوں تو رامائن اور مہابھارت جیسی عظیم تصانیف سے روشناس ہو سکتے ہیں اور سنتوں۔ رشیوں اور سورماؤں کے بارے میں بہت سے گیت بھی انھیں یاد ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج کے ایسے شہری کی بہ نسبت ان کا ثقافتی معیار و سطح بلند ہو جو گھٹیا ادب، سنسنی خیز فلموں اور اعصاب پر برا اثر ڈالنے والی موسیقی کا دلدادہ ہے۔

بھارت کے ہر خطے نے بڑے بڑے موسیقی کار پیدا کئے ہیں۔ بنگال میں جے دیو اور گورنگ مہتے تو یو۔پی میں کبیر اور سور داس۔ راجستھان نے میرا بائی کو پیدا کیا تو مہاراشٹر نے رام داس، ایکناتھ، تکارام اور نام دیو کو جنم دیا۔ دکھنی بھارت کو تیاگ راج پر فخر ہے۔ سنگیت نے تمام سماجی رکاوٹوں کو پار کیا ہے۔ کبیر جُلاہا تھا، رام داس موچی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ دھنّا ایک کسان کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ سادھنا ایک بوچڑ تھا تو سینا نائی۔ نام دیو خاندانی طور پر درزی تھا جبکہ میرا بائی ایک راجکماری تھی۔

سنگیت دراصل گیت ناچ اور اظہار جذبات کے امتزاج کا نام ہے گیت اور ناچ کی نشو و نما دو الگ الگ شعبوں کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ لیکن اظہار جذبات اب بھی موسیقی کی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

بھارتی موسیقی میں آٹھ سُر کے بارہ پردے ہوتے ہیں۔ درحقیقت بھارتی سرگم میں بارہ سے زیادہ ضمنی حصے ہوتے ہیں۔ مختلف سروں کو ملا کر گمک پیدا کی جا سکتی ہے۔ سروں کو ملا جلا کر ۲۷ تان بن سکتے ہیں۔

تیرھویں صدی عیسوی تک ہندوستان بھر میں سنگیت کا ایک ہی نظام رائج تھا۔ موسیقی پر سارنگ دیو نے سنسکرت میں "سنگیت رتنا کار" نامی رسالہ لکھا ہے جسے شمالی اور جنوبی ہند کے لوگ مستند مانتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلم اقتدار کے ظہور سے بیرونی ممالک کی موسیقی سے رابطہ پیدا ہوا۔ امیر خسرو نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا ہے۔ اس وقت سے اتری بھارت کی موسیقی کی نشو و نما جدا طریقے پر ہوئی ہے۔ موجودہ دور کی دوسری ربع صدی میں مرحوم پنڈت ڈگمبر پلوسکر اور سورگباشی پنڈت وشنو نارائن بھات کھنڈے نے موسیقی کی روایتی صفائی اور پاکیزگی دوبارہ حاصل کرنے کی جد و جہد کی۔

بھارت میں کئی قسم کے آلات موسیقی کا رواج ہے جن میں تار، سانس اور ضرب سبھی قسم کے باجے شامل ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ سربہار سرود، بانسری، شہنائی، طبلہ، وینا، ستار، سارنگی اور رباب۔ ضرب کے آلات موسیقی کے بارے میں شاید ہندوستان سب سے آگے ہے۔

کلاسیکل راگ راگنی کے علاوہ ہلکے پھلکے گانوں کا رواج بھی ہندوستان میں رہا ہے مسلم فرمانرواؤں نے اس کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں درت، خیال، ٹھمری، غزل اور قوالی وغیرہ نے ترقی پائی دور جدید میں ایسے ہلکے پھلکے گیتوں کو رواج دینے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں جن میں ادب اور موسیقی دونوں خصوصیات پائی جائیں۔ ٹھاکر ٹیگور نے اس سلسلے میں قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ یہ تحریک ہندوستان بھر میں زور پکڑتی جا رہی ہے۔

ہندوستان عوامی سنگیت سے مالامال ہے۔ شاید یہ ترقی موسیقی سے بھی قدیم ہے۔



March of India

An English bi-monthly Per copy Rs. 2/8/- 3 Shs. 6 d. or 55 Cents. Annual Rs 15/-, Shs. 21 or $ 3.

KASHMIR

English monthly projecting Kashmir, its people, their arts and crafts. Per copy As. -/8/-, 9 d. or 10 Cents. Annual Rs. 5/-, Sh. 9 or $ 1.

Ajkal Hindi

Short stories poems, pictorial features. Per copy As. -/8/-, 9 d. or 10 Cents. Annual Rs. 6/-, Shs. 9. or $ 1.

Ajkal Urdu

Cultural monthly. Edited by Hazrat Josh Malahebadi Per copy As. -/8/-, 9 d. or 10 Cents. Annual Rs. 6/-, Shs. 9 or $ 1.

Bal Bharati

Children's Hindi Monthly. Per copy As. -/6/-, 8 d. or 10 Cents. Annual Rs. 4/-, Shs. 7 or $ 1.

KuruKshetra

English monthly devoted to the activities of the Community Project Administration. Per copy As. -/6/-, 10 Cents or 8 d. Annual Rs. 4/-, $ 1. or 7 Shs.

A GROUP OF
MEDIA WITH ALL INDIA CIRCULATION

Available everywhere or direct from:

THE PUBLICATIONS DIVISION,
Old Secretariat, DELHI.

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

No. D—509

فروری ۱۹۵۵ء



آج کل

آٹھ آنے

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

خواجہ غلام السیّدین ایڈیشنل سیکرٹری
وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند

میں 'آج کل' کو ہمیشہ بہت دل چسپی سے پڑھتا ہوں اور اس میں اکثر قابلِ قدر مضامین اور نظمیں شایع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے، یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کی لکھائی چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔

محمد اجمل خاں پرائیویٹ سیکرٹری مولانا ابوالکلام آزاد
وزیرِ تعلیمات حکومتِ ہند

'آج کل' میں نہ صرف اُردو کی بلند پایہ نظم و نثر کا مجموعہ پایا جاتا ہے بلکہ تنوّع مضامین کے باوجود اس کی حسنِ ترتیب اسے ایک گلدستہ بنا دیتی ہے۔ اسی لئے اسے صرف "مقبولِ عوام" کہنا کافی نہیں بلکہ یہ "مقبولِ انام" ہے۔

ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری زور
حیدرآباد دکن

'آج کل' میری نظر میں ہندستان کا واحد علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں ایک معتدل اور سلیقہ مند روش عرصہ سے قائم اور ترقی پذیر ہے۔ اس کے مقالے اور افسانے اور نظمیں تینوں معیاری ہوتے ہیں اور انتخاب کرنے میں خاص ذوق اور جستجو کو دخل رہتا ہے۔

سیّد احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

'آج کل' اردو کا مطالعہ کئی سال سے باقاعدہ کر رہا ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو رسالہ برسوں سے ایک ملکی زبان کے ذریعے سے علم و ادب کی خدمت کر رہا ہو وہ ذہن میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور پڑھنے والے اس کا انتظار بے تابی سے کرتے ہیں۔ 'آج کل' کے لئے بھی میں نے لوگوں کو بیتاب پایا ہے۔



ڈاکٹر عبدالستّار صدّیقی
میور روڈ الہ آباد

پچھلے دس گیارہ برس سے 'آج کل' کو میں برابر پڑھتا رہا ہوں۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ملک کے سارے ماہانہ رسالوں میں 'آج کل' سب سے بہتر اور بالاتر ہے۔ اس کے مقالوں اور اس کی نظم و نثر کا معیار بہت اُونچا ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری
صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

'آج کل' اردو کے موجودہ رسالوں میں سب سے اچھا رسالہ ہے اور اپنے ادبی اور علمی معیار کے لحاظ سے ایک بلند پایہ رسالہ ہے۔ اس رسالے کی جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند ہے، وہ اس کا نہایت سنجیدہ لب و لہجہ ہے۔

پروفیسر آل احمد سُرور
صدر شعبہ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی

'آج کل' اُردو کے اُن چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامّہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے، ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے۔

کرشن چندر بمبئی

رسالہ 'آج کل' ایک عرصے سے اُردو ادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کے ادارے سے جناب جوش ملیح آبادی اور جناب عرش ملسیانی منسلک ہیں جن کی روشن خیالی اور فنّی بلوغت کے سبھی قائل ہیں۔ 'آج کل' کے کئی ایک خاص نمبر اُردو داں طبقے میں شرفِ قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

نوّاب جعفر علی خاں اثر لکھنوی
کشمیری محلہ لکھنؤ

'آج کل' کا بجا طور پر اُردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامینِ نثر پر مغز اور دل چسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھناؤنے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ نظم کے حصّے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔

ترتیب

بچّوں کا آج کل

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر: —— جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر —— بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۷

سالانہ چندہ: —— ہندوستان میں۔ چھ رُوپے / پاکستان میں: چھ رُوپے (پاک)

غیر ممالک سے: —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ: —— ہندوستان میں: آٹھ آنے / پاکستان میں۔ آٹھ آنے (پاک)

فروری ۱۹۵۵ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

امجد حیدرآبادی

کلامِ امجد

غزل

دنیا کی فضا میں ایک نظر میں زیر و زبر ہو جاتی ہے
وُہ دیکھتے ہیں اِن نظروں سے نظروں کو نظر ہو جاتی ہے

وُہ دُنیا سے کھو جاتا ہے اور کیسا سے کیا ہو جاتا ہے
اُس مست نظر کی جس پر بھی اک خاص نظر ہو جاتی ہے

جب آتی ہے رات، وُہ آتے ہیں ساتھ اپنے اُجالا لاتے ہیں
چھا جاتا ہے اندھیر آنکھوں میں جب وقت سحر ہو جاتی ہے

ہر وقت گزرتا رہتا ہے، یہ دریا بہتا رہتا ہے
ہو عید کا دن، یا شامِ الم ہر حال بسر ہو جاتی ہے

تدبیر کوئی چلتی ہی نہیں، تقدیر کبھی ٹلتی ہی نہیں
ہر چند بدی سے بچتا ہوں، اس پر بھی مگر ہو جاتی ہے

موجود جو شے ہو جاتی ہے معدوم نہیں پھر ہو سکتی
دُنیائے وجود میں اے امجد تغیرِ صُور ہو جاتی ہے

قطعات و رُباعیات

آنکھوں میں ہے آنسوؤں سے ٹھنڈک　　دل جل کے کباب ہو رہا ہے
مرقد پہ پڑی ہے چادرِ گُل　　مُردے پہ عذاب ہو رہا ہے

کچھ عجب ہے یہ مادّی دُنیا　　دُور تک اس کا دَور جاتا ہے
شمع پروانے کو جلاتی ہے　　شمع کو بھی کوئی جلاتا ہے

کچھ کیے جاؤ لے کے نامِ خدا　　کچھ نہ کرنا بڑی خرابی ہے
کامیابی کچھ اور چیز نہیں　　کام کرنا ہی کامیابی ہے

بُرہان و دلیل سب معطّل ہو جائیں　　جتنے جھگڑے ہیں ہم میں فیصل ہو جائیں
ہر چند بہت سوال، لاینحل ہیں　　تم سامنے آ جاؤ تو سب حل ہو جائیں

آسائشِ جسم کے لئے جان نہ بیچ　　اور جان بچانے کے لئے آن نہ بیچ
بھولے گاہک کو ٹھگنے والے تاجر!　　سامان کے ساتھ اپنا ایمان نہ بیچ

مختارالدّین احمد آرزو

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

اور

چند اصلاحیں

غالب کے قدر دانوں میں کون ہے جس نے غالب کے خطوط پڑھے ہوں اور وہ چودھری عبدالغفور سرور سے واقف نہ ہو، عودِ ہندی کے بیشتر ابتدائی خطوط انھیں کے نام ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ سرور کا کلام عام طور پر نہیں ملتا۔ اسی لئے جب ایک دن مجھے غیر متوقع طور پر سرور کا ایک قصیدہ اور آٹھ نو قطعات خود اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ملے تو بڑی مسرت ہوئی۔ اور یہ مسرّت اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب ان اشعار پر غالب کے قلم کی اصلاح اور انھیں صفحات کے ایک گوشے پر غالب کا ایک خط سرور کے نام لکھا ہوا پایا۔

قصیدہ نعتیہ ہے اور اُردو میں تعداد اشعار ۲۳۔ ان میں گیارہ شعر غالب کی اصلاح سے مزیّن ہیں۔ بعض مقامات پر غالب نے مصراع کا مصراع بدل دیا ہے۔ شعر ۱۳ تقریباً پورے کا پورا غالب کا کہا ہُوا ہے۔

بعض مقامات پُر منشاءِ حک و اصلاح بھی انھوں نے لکھ دیا ہے۔ سرور نے لکھا تھا 'چشم سرد یکھے' اسے کاٹ کر 'آنکھ سے دیکھوں' بنا دیا ہے اور لکھا ہے: سر کا لفظ زائد اور حشو قبیح تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: این کا لفظ روزمرّۂ اردو میں کہاں مستعمل ہے! سرور کے مصراع " کیا حقیقت ہے مری اے شہِ لولاک لما، میں شہِ تختِ لولاک کر دیا ہے اور وجہِ اصلاح یہ لکھی ہے: صرف لولاک کا لفظ مستعمل ہے اور یہ اشارہ کافی ہے لما لسائدُ محض اور غیر مستعمل۔

قصیدے کے بعد قطعات کی باری آتی ہے، یہ تعداد میں ۹ ہیں۔ ان میں پہلا قطعہ اُردو میں اور بقیہ آٹھ سرور نے فارسی میں لکھے ہیں۔ ابتدائی قطعات پر غالب نے خاص توجہ کی ہے۔ دوسرا قطعہ انھیں پسند نہ آیا اور 'سراسر تکلفات باردہ' لکھ کر انھوں نے پورا قطعہ قلم زد کر دیا۔ لیکن اپنے دوست اور شاگرد کا دل رکھنے کے لئے ایک اردو قطعہ جیب خاص سے مرحمت بھی کر دیا ہے۔

یہ قطعات تاریخ، سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی کے بیٹے کی ولادت پر سرور نے لکھے ہیں۔ صفیر بلگرامی اور غالب کے تعلّقات کی داستان اور ملاقات کا حال احوالِ غالب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے کہ ستمبر ۱۸۶۶ء سے صفیر و غالب کی باقاعدہ خط وکتابت کی ابتدا ہوتی ہے، اس سے پہلے ممکن ہے حضرت صاحب عالم یا سرور کے خطوں میں وہ دعا و سلام بھیج دیتے ہوں یا مارہرہ ایک آدھ خط انھوں نے لکھا ہو۔ لیکن اس وقت تک انھیں آرہ میں صفیر کے مکان کا پتا معلوم نہ تھا۔ قیاس غالب ہے کہ سرور نے پتا لکھ دیا ہوگا اور غالب نے تہنیت میں انھیں خط ضرور لکھا ہوگا۔ لیکن یہ خط غالب کے ہزاروں خطوں کی طرح اب تک لا معلوم ہے۔

حضرت صاحب' سے مراد صاحب عالم مارہروی ہیں جن کے خطوط کی غالب کو ہمیشہ شکایت رہی کہ اُن سے پڑھے نہیں جاتے اور جو صرف چوم کر اور آنکھوں سے لگا کر رکھ دئے جانے کے قابل تھے۔ صاحب عالم کے خطوط کو دیکھ کر غالب کی کیا کیفیت ہوتی تھی اس کا صحیح اندازہ مجھ کو اس وقت ہُوا جب صاحب عالم کے روزنامچے کے چار ضخیم مجلدات کے مطالعے کا اتفاق ہُوا۔ اس کا ایک صفحہ صحیح طور پر پڑھنا مشکل ہے۔ اگر اس روزنامچے کی یہ جلدیں جو ہندستان کے مختلف کتب خانوں میں منتشر ہو گئی ہیں کبھی شائع ہو سکیں تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت مفید علمی خدمت ہوگی۔

اب سب سے پہلے سرور کا قصیدہ، پھر اور قطعات، پھر غالب کا مکتوب اردو ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) قصیدہ

کاوشِ اہلِ وطن سے ہے یہ جی کی حالت   کہ سبک ہے جگر خانۂ زنبور صفت
کیا زمانہ ہے الہیٰ کہ یگانوں کو مرے   نَے سرو برگ عنایت ہے نہ سازِ الفت

آنکھ سے دیکھوں

یارب آفاتِ زمانہ سے مجھے رکھ محفوظ   چشم سر دیکھے نہ پھر صورتِ اہلِ نخوت

"آنکھ سے دیکھوں" بنا کر غالب نے مصرع کیسا رواں کر دیا ہے۔

غالب: سر کا لفظ زائد اور حشو قبیح تھا۔

سمجھے

وہ جو کل کرتے تھے زانوئے سخن خوانی تہ   آج وہ آپ کو سمجھیں ہیں فلاطوں فطنت

غالب: جمع ایک جگہ کافی ہے ۱۲

درپئے افساد پہ مائل ہے طبیعت اُن کی   اب سخن چینی سے دیتے ہیں وہ کیا کیا ذلت
ـــ وجاں کی وہ خواہاں ہیں خدا شاہد ہے   ـ تلک جن کو پڑھایا تھا بیٹھے سبق بے اُجرت
جیتے جی ہیں یہ ارادہ کہ اُتاریں ٹوپی   بعد مردن ہے مگر اخذِ کفن کی نیّت
کون استاد پہ یہ ظلم روا رکھتا ہے   رسم کس شہر کی ہے اور ہے کس کی عادت

عزیزانِ ستم گار وطن   ذفف ×

اے عزیزِ دلِ اُستاد فلاں سلمکم   تا بکے ہو جگر ایں نشترِ کیں و نعمت

غالب: مخاطب مفرد۔ صیغہ جمع کا۔ ایں کا لفظ روزمرۂ اردو میں کہاں مستعمل ہے ۱۲

جورِ احباب نہیں یہ خلشِ گردوں ہے   خفتہ بختی نے دکھایا ہے یہ روزِ نکبت
بخت یاور ہوں گر اپنے تو سبھی خویش قریب   پاؤں سہلائیں ہمارے بہ خلوصِ نیّت
اور بے یاوریِ بخت تو پھر ظاہر ہے   باپ بھی سر سے اُٹھا لیتا ہے دستِ شفقت

بخت ہو جس کا مددگار تو اس میں نا جائے   بھی پائیں تو دیں

مددِ بخت اگر ہو تو بصد آب و تاب   عیب کو بھی تو کریں لوگ ہنر سے نسبت
ہو عرق چہرے پہ گر جوں گلِ شبنم آلود   ـــ سے دیکھلائی دے رنگی صورت
اس میں احباب بھی لاچار ہیں میں بھی مجبور   بخت پھیرے ہیں کسی نے بھی بہ زور و قوت
یاوری بخش ہو اے کاش کہ یہ بخت بلند   دوست دشمن سبھی بٹھلائیں بصد عزت
لاکھ تدبیر کریں کچھ بھی نہیں بن آتی   آگے تقدیر کے کب پیش چلے ہے حکمت
آج کل طالعِ دوراں ہے دلا گردش میں   وہ جگہ ڈھونڈھ کے تو بیٹھ بکنجِ خلوت
کہ جہاں نام کو بھی نام نہ ہو انساں کا   ہم دم و ہم نفس اور کوئی نہ ہو ہم صحبت

نعش پر کوئی نہ رو دے بہ جز

عازمِ ملکِ بقا ہوگا اگر طائرِ روح   نوحہ گر کوئی بھی ہو دے نہ جز ابرِ رحمت

غالب [ابر رونے سے] ہے نہ نوحہ سے ۱۲

آب رواں بھی موجود   اپنی

آئینہ کیا کہ نہ ہو آب کی بھی بوند وہاں   کہ نظر آتی ہے اُس میں بھی تو شکل و صورت

غالب: پانی میں صورت نظر آتی ہے نہ پانی کی بوند میں ۱۲

پستیٔ بخت تو دیکھو کہ عیاذاً باللہ   گنج قاروں سے معنون ہوئی اپنی قسمت
الاماں اے شررِ انداز بہ پیراہن جمع   الحذر الحذر اے تفرقہ سازِ صحبت
بسملِ تفتہ جگر ہوں ـــ ہمّت کا   اے سخن چین غلط کوش خدارا رحمت

دے   فاتحے کی نہ تمنّا نہ تقاضائے دیت

میں شہیدِ ستم بیش آمادب ہوں کہ ہوں   خوں بہا صاف فراموش کیا کہ وہ دیت

کوئی اتنا بھی نہیں ہے کہ کرے غم خواری   مجھ کو

ہائے رفتن بہ گل و روئے بماندن در دل   اپنی تقدیر پہ آپ آئے ہے کیا کیا حسرت
بختِ خفتہ کو ترے کون جگاتا ہے عطا   ہاں مگر وہ شہِ ابرار شفیعِ اُمّت
نقطۂ مرکزِ ایجاد و رسولِ اکرم   ہادیِ راہِ ہدیٰ، حامیِ دین و ملّت
مطلعِ عزّت و شرف منقطعِ تمکین و وقار   منبعِ جود و سخا منہلِ جاہ و مکنت
مظہرِ فیضِ ابد، مصدرِ انوارِ احد   کاشفِ سرِّ خدا، واقفِ رازِ غیبت

تختِ لولاک

کیا حقیقت ہے مری اے شہِ لولاک لما   غیر واجب نہیں ممکن تری ہرگز مدحت

غالب: صرف لولاک کا لفظ مستعمل ہے اور یہ اشارہ کافی ہے 'لما' زائد محض اور غیر مستعمل ۱۲

ہر دو مہ دونوں مرے کاسہ اَفگندہ ہیں   فرش اور عرش پہ ہے تیرا بساطِ نعمت
لبِ جاں بخش کے ہیں تیرے مسیحا بیمار   رہ نمائی کی مگر خضر کو بھی ہے حاجت
صدقہ حسنین کے، اے بادشہِ ہر دو سرا   اپنے بیمار کی بھی اب تو روا کر حاجت
یعنی اس کشمکشِ جور و جفا سے چھوڑو   رہوں مشغولِ عبادت بہ خلوصِ نیّت
نیک اور بد کا کسی کے مجھے کھٹکا نہ رہے   چند روزہ، کی جو ہو زیست تو ہو بے زحمت

تمام شد۔ اصلاح طلب

غالب: حکم بجا لایا ہوں معاف رکھیئے گا۔ منشا حکّ و اصلاح جابجا لکھ دیا ہے ۱۲

---

(۲) قطعات

هوالعليم

مرے فرزند احمد کا وہ فرزند   دعاگو جس کا ہر فرد بشر ہے

الٰہی اس کو تو رکھیو سلامت   کہ باغِ (نخلِ) زندگانی کا ثمر ہے
نوید فرحت میلاد مولود   سرورِ سینہ ہے نورِ نظر ہے
سرور خوش دل شادانی تاریخ   لکھی فی الفور یہ لختِ جگر ہے

۱۲۸۳

(۲) سرور کے ایک پورے فارسی قطعہ کو غالب نے قلم زد کرکے اردو کا یہ قطعہ لکھ دیا ہے:

پور دہ فرزند احمد کو ملا   رحمتِ باری کا جو گنجینہ ہے
سال تاریخ ولادت یوں لکھا   راحتِ جاں ہے' سرورِ سینہ ہے

(۳) زمیلاد پورے مسرّت ظہور   زہے شادمانی زہے تہنیت
ترانہ بتاریخ سنجد سرور   بفرزند احمد زہے تہنیت

غالب نے اس قطعہ میں صرف ایک جگہ معمولی سی اصلاح دی ہے 'پورے' کی "یا" کو قلم زد کرکے 'پورِ مسرّت ظہور' بنا دیا ہے

(۴) چوں خدا داد پورِ فرخ بخت   ماہ رو گفتم و نکو گفتم
ایں گل گلشن تمنّا را   گل خوش رنگ و طرفہ (مشکبو) بو گفتم
سال ایں نو گل مراد سرور   لالۂ باغِ آرزو گفتم

۱۲۸۳

غالب نے 'طرفہ بو' کی جگہ 'مشک بو' بنا کر مصراع چست کر دیا ہے۔

(۵) فرزند احمد سید عالی نسب والاحسب   اورا صفیر آمد تخلّص وہ چہ اشعار صفیر
گوہر فروشاں تختہ از خجلت دکانہا ساختند   ہر جا کہ بہ نارنجیتہ کلکِ گہر بار صفیر
از بس بکام مستمع ریزد حلاوت شعر او   دیوان او رامی تواں گفتن شکر زار صفیر
حق داد چوں او را پسر شد خلق شادان بیشتر   نازم کہ ہر فرد بشر باشد ہوادار صفیر
بلبل بگو شم زد نوا
رفتم بگل گشت چمن از فکر تاریخش سرور   زد بلبلِ رنگیں نوا شمشاد گلزار صفیر

۱۲۵۸۳

' زد بلبلِ رنگیں نوا ' کی جگہ غالب نے ' بلبل بگوشم زد نوا ' کر دیا ہے

(۶) عطوفت گستر ما آنکہ گسترد   فلک در بزم شعرش عمدہ مسند
کشادہ جانب او گوش دارد   کہ تا طبعش چہ فرماید چہ گوید

غالب: اس طرح کا قافیہ ایک سے زیادہ ممنوع ہے۔

× اگر اوصاف اخلاقش نویسم   بصد طومار و صد دفتر نہ گنجد

غالب نے پورا شعر قلم زد کر دیا ہے۔

بکام دوستاں یاد الٰہی   بخیر دائم و عیش مخلّد
کریم بر حق و وہاب مطلق   ولد بخشید فیش از عقد محمد
احبّا و تمامی اقربا را   ....
فدائش دولت و اقبال بخشاد   پس از بخشیدن عمر مؤبّد
بناز و نعمتش پرورش باد   در آغوش بدر ہم جدّ و فرجد
ہمہ وقت و ہمہ حالش ہمہ جا   محمد حامی و آلِ محمد
ز حسنِ صورت و از حسنِ سیرت   معزّز باد در دہر مجدّد
تو اریخ ولادت بہر ایں طفل   سخن سنجاں زبیک گفتند تا صد
سرور مخلص باباتے او ہم   قلم را بہر تاریخش چو قط زد
نوشتہ باد لِ مہر و رخ ماہ   ضیائے دیدۂ فرزند احمد

۵ ۴۰ = ۴۵ ۱۲۳۸ = ۱۲۸۳

(۷) ایضاً سنہ عیسوی

صد شکر خدائے پاک فرزند   دادہ بہ شفیق قدر دانم
زیں مژدۂ دل فزائے جاں بخش   شاداں شد و روح و ہم روانم
ہر صبح دعائے عمر و جاہش   بر ذروۂ عرش مے رسانم
تاریخش یافتم مسیحی   نور نظر و نشاط عالم

۱۸۶۶

(۸) ایضاً سن فصلی

مظہر مہر و وداد مصدر صدق و سداد   از ولد خوش نہاد گشتہ چو سرو دشاد
سال ولادت سرور در سن فصلی زشوق   کردہ رقم در سطور روحہ بہ باغ مراد

۱۲۷۳ ف

(۹) سن سمبت

ز جنابِ حق عطا شد ولدے شفیق مارا
کہ خطِ ولادتِ او شدہ دفترِ مسرّت
بہ سرور گفت ہاتف کہ بگو تو سال سمبت
ز دلم ندا بر آمد زہے اخترِ مسرّت

۱۹۲۳ بکرمی

(۳) مکتوبِ غالب

جنابِ چودھری صاحب

میں تو خدمت بجا لایا۔ مگر اس کے صلے میں تین باتیں چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آرہ میں مولوی سید فرزند احمدؐ کے مکان کا پتا مجھے لکھ بھیجو تاکہ میں اُن کو تہنیت لکھوں۔ دوسرے یہ کہ تمہارا خط تم کو واپس بھیجتا ہوں۔ حضرت صاحب کی دستخطی عبارت کو حرف بہ حرف اپنے ہاتھ سے لکھو اور مجھ کو بھیجو تاکہ میں اُن کو تہنیت میں خط لکھوں۔ واللہ ہرگز مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔ تشویش و تشویر میں ہوں کہ کیا کروں۔ تم یہ بوجھ مجھ پر سے اُٹھا لو۔ تیسری بات یہ کہ معاملہ حضرت صاحب پر ظاہر نہ ہو اور میرے اس خط کا جواب جلد آئے۔

غالب ۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۶ء

یہ تحریریں مجھے خلیل الرحمن اعظمی صاحب کی توجہ سے چودھری عبدالغفور سرور کے ایک عزیز جیب[1] انور زبیری صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل ہوئی ہیں۔ میں اس عنایت کے لئے ان دونوں صاحبوں کا ممنون ہوں۔ اصلاحات اور مکتوبِ غالب کی نقل جو میں نے تیار کی تھی وہ اور دوسرے کاغذات آکسفورڈ میں رہ گئے ہیں۔ اس وقت یہ مضمون اس اوٹوگراف کو سامنے رکھ کر لکھ رہا ہوں جو عرش ملسیانی صاحب نے دہلی سے بھجوایا ہے۔ عکس میں بعض الفاظ واضح نہیں ہیں۔ ان کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔

لائیڈن یونیورسٹی ہالینڈ — ۳ دسمبر ۱۹۵۴ء

[1] اسی مضمون سے متعلق چار عکس اسی شمارے میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ ان کے جملہ حقوق حبیب انور زبیری صاحب کے پاس ہیں۔ انھیں کی اجازت اور شکریے سے یہ عکس شائع کئے جا رہے ہیں۔

(ادارہ)

عبداللہ انتظام
وزیرِ خارجہ ایران

بھارت اور ایران

میرا یہ ہمیشہ سے عقیدہ رہا ہے کہ سائینس اور تکنیک سے پرے اور اقتدار و دولت سے اونچی ایک اور دنیا ہے جسے ہم دل و دماغ اور روح کی دنیا کہتے ہیں۔ دورِ جدید میں ہم اسے حقیر بھی سمجھتے ہیں اور نظر انداز بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ انسان کی حقیقی خوشی کا انحصار قلب و رُوح کی پاکیزگی اور نزاہت پر ہے۔ اقوامِ عالم کی صحیح روحانی مفاہمت اور ثقافتی ارتباط ہی میں اس دنیا کی نجات مضمر ہے۔ درحقیقت بین الاقوامی کشیدگی، شک اور بے اعتمادی کی موجودہ فضا میں انسان کے لئے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے ایسے ذرائع اپنانا جس سے اس دنیا میں معقول مفاہمت، حقیقی خیر خواہی اور مستقل یکجہتی پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایران دنیا کے تمام لوگوں سے دوستی رکھنے کا خواہش مند ہے اور کسی کے خلاف معاندانہ جذبہ نہیں رکھتا۔ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی خاطر باہمی اعانت اور مختلف اقوام کی آزادی اور اہمیت کے لئے باہمی احترام — یہ دونوں چیزیں ہماری پالیسی کے بنیادی اصول ہیں۔ تاریخِ عالم کے سبھی طلباء بخوبی جانتے ہیں کہ بھارت اور ایران کے درمیان کس قدر قریبی تعلقات رہے ہیں۔ ہماری مشترکہ تاریخ کی داستان بہت طویل ہے اور ہم اس پوری مدت میں مخلص دوست اور شریک کار رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ آئندہ بھی ہم باہمی دوستی اور تعاون کا جذبہ بنائے رکھیں گے۔ ایران اور بھارت دنیا کی خیر خواہی اور میل جول کو بڑھاوا دینے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ دونوں ملک آج اور کل کی دنیا میں اپنا فرض اور صحیح پارٹ ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتیں گے۔

سعیدہ ادہمی

مرزا غالب کی خود نوشت سوانح عمری پر ایک نظر

مرزا غالب کا سالِ وفات ۱۸۶۹ء ہے۔ اُس وقت سے آج تک نہیں معلوم کتنے زاویہ ہائے نگاہ سے مرزا کی زندگی پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ حالی، بجنوری، مہر، اکرام، لطیف، مالک رام جیسے صاحبانِ کمال اپنا اپنا کمال دکھا چکے ہیں۔ رسالۂ اُردو کے شاندار تحقیقی مقالے، "نگار" کا غالب نمبر، "آج کل" کے بلند پایہ علمی مضامین اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ مولوی مہیش پرشاد، مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، شوکت حسین سبزواری کی مساعی جمیلہ کبھی رائگاں نہیں جا سکتیں، اسی کے ساتھ سید احتشام حسین رضوی، آلِ احمد سرور، اور ممتاز حسین جیسے ناقدانِ فن کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن باوجود اتنے عظیم کام کے غالب پھر بھی غالب ہیں، اور اس پر تحقیق و تنقید کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ مگر غالب پر کام کی موجودہ رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام اپنی آخری منزل میں ہے۔ اور غالب پر حرفِ آخر لکھنے کے لئے ڈاکٹر مختارالدین آرزو صاحب کا انتخاب ہوا ہے۔ آرزو صاحب کا شاندار کارنامہ علی گڑھ میگزین کا "غالب نمبر" ہے، جو پڑھی لکھی دنیا سے خراجِ شہرت حاصل کر چکا ہے۔ مگر یہ اُن کے کام کا نقشِ اوّل تھا، نقشِ ثانی "احوالِ غالب" ہے۔ جسے انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے بڑے اہتمام سے شائع کرایا ہے۔ اس مجموعے کے تمام مضامین غالب کے طالب علموں کے لئے انتہائی مفید ہیں، اور ان کے لکھنے والے بھی مشاہیر علم و فن ہیں، مگر ایک مضمون خاص طور سے توجہ کا مستحق ہے، جو "غالب کے خود نوشت حالات" کے زیرِ عنوان اظہار الحق صاحب ملک کا لکھا ہوا ہے، اس مضمون کے ساتھ مرزا غالب کے "خود نوشت حالات" کے ایک ورق کا عکس بھی ہے۔ جس پر تذکرہ مظہر العجائب میں غالب کے حالات خود غالب کے قلم سے، تحریر ہے۔ غالب کی اس "خود نوشت سوانح عمری" کا سب سے پہلے علم مولانا غلام رسول مہر کی مشہور عالم تصنیف "غالب"[1] سے ہوا، اور اسی کے مطالعے سے یہ پتہ چلا کہ یہ تحریر رسالہ اُردو میں شائع ہو چکی ہے، کب شائع ہوئی اور ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو کہاں سے ملی۔ اس کے لئے "غالب" خاموش ہے۔ مگر مولانا مہر فرماتے ہیں کہ "یہ تحریر غالباً تذکرہ مظہر العجائب کے لئے لکھی گئی تھی"، لیکن تذکرہ مظہر العجائب کا کسی تذکرے میں تذکرہ نہیں ملتا، اور غالب کا کوئی دوسرا سوانح نگار بھی اس پر روشنی نہیں ڈالتا۔ یہ ایک اُلجھن تھی ہی، کہ ایک تحریر کا تذکرہ "غالب" مصنفہ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب مترجمہ سید معین الدین قریشی میں نظر سے گذرا، اس تذکرے میں رسالہ "اردو" کے نمبر اور جلد کا پتہ بھی تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی تحریر تھا کہ "مذکورہ بالا تحریر پر مدیر "رسالہ اردو" اورنگ آباد نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی ذیل میں درج کی جاتی ہے"[2]۔ مگر مولانا مہر اور ڈاکٹر عبداللطیف کے اقتباسات مختلف تھے۔ اس لئے اس رائے کے قایم کرنے میں بڑی دشواری ہوئی۔ اور میں یہ خیال کرتی رہی کہ شاید یہ دونوں تحریریں الگ الگ ہیں۔ "رسالہ اردو" کے مطالعے نے اس غلط فہمی کو دُور کر دیا، اور اس نے مجھے بتایا کہ تحریر ایک ہے، البتہ دونوں بزرگوں نے اپنے مفید مطلب حصّوں کو اپنی ضرورتوں کے پیشِ نظر نقل فرمایا ہے، اور تذکرہ مظہر العجائب کا ذکر ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے اس نوٹ میں موجود ہے جس کا حوالہ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے دیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی تحریر ایک واضح تحریر ہے۔ اس تحریر سے اس باب کی تمام غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں، اور غالب کے ایک طالب علم کو جن اُلجھنوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کا بھی علاج یہاں موجود ہے۔ ضرورت تھی کہ غالب کی یہ خود نوشت سوانح عمری ڈاکٹر صاحب کے نوٹ کے ساتھ شائع کر دی جاتی، مگر ملک صاحب نے اس کو غیر ضروری سمجھا، اور یہ مناسب جانا کہ سب سے پہلے یہ بتایا جائے کہ اس تحریر کی شانِ نزول

[1] "غالب" مولانا مہر صفحہ ۱۲ طبع چہارم

[2] "غالب" ڈاکٹر عبداللطیف ص ۱۳۸

کیا ہے، اور مرزا غالب نے اپنے حالات کیوں تحریر فرمائے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اظہار الحق صاحب ملک تحریر فرماتے ہیں کہ

" رنگین صاحب جج عدالت خفیفہ دہلی ایک با ذوق انگریز تھے جنھیں فارسی ادبیات اور تاریخ سے دلچسپی تھی۔ قیام ہندوستان کے زمانے میں انھیں فارسی شعرا کا ایک ضخیم تذکرہ مُرتب کرنے کا شوق پیدا ہوا۔۔ ۔۔۔۔ رنگین تذکرہ انگریزی زبان میں لکھ رہے تھے۔ اس میں انتخاب اشعار متروک تھا۔ انھوں نے کوئی چھ سو شاعروں کا ترجمہ لکھ ڈالا تھا۔ لیکن تذکرہ نا تمام رہا، مولوی مظہرِ حق نے اس میں اضافے کیے۔۔۔۔ ۔۔۔۔ مولوی انوار الحق، میر منشی ایجنسی مارواڑ کا بھی اس تذکرے کی ترتیب میں ہاتھ رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔ رنگین صاحب نے تذکرے کا نام کیا رکھا تھا وہ شائع ہوا یا نہیں، اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ بظاہر وہ زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ لیکن بعد میں اضافے کے بعد اس کا نام بہ قیاس غالب "مظہر العجائب" رکھا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس تذکرے کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے کا اب تک پتہ نہیں چلا ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ تذکرہ کس قدر تحقیق اور دقّتِ نظر کے ساتھ لکھا گیا تھا، اور اس کی نوعیت کیا تھی اور کن کن شعرا کے ترجمے اس میں درج تھے۔ لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ اس میں مرزا غالب کے حالات بھی درج کئے گئے تھے اور سچ ہے کہ اگر ان کا ترجمہ درج نہ ہوتا تو یہ بات باعثِ حیرت ہوتی"۔[1]

ملک صاحب کی مندرجہ بالا تحریر کی روشنی میں متعدد سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ان معلومات کا ماخذ کیا ہے۔ میں دوسرے سوالات قایم کرنے کی بجائے یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ ملک صاحب کے اس تحقیقی مضمون میں اس کے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ رنگین صاحب نے شعراء ہند کا انگریزی میں تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا۔ اس میں مشاہیر شعراء کے حالات تھے۔ لیکن ان حالات کی کیفیت یہ تھی کہ ـــــ " صرف شاعر اور اس کے استاد کا نام اور شاعر کے مسکن و وطن کا نام مع تخلص درج ہوگا"۔[2]

[1] "احوالِ غالب" مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو صاحب ص ۲۴ - ۲۵

[2] "اردوئے معلّٰی" خط بنام تفتہ ص ۷۷ - ۹ - دسمبر ۱۸۶۴ء

مرزا غالب کے اس خط میں لفظ "صرف" قابلِ غور ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر سو شاعروں کا حال مسٹر رنگین کو لکھ کر بھیج دیا تھا۔ رنگین صاحب نے وہ حالات کیا کئے اور اس تذکرے کا کیا ہوا، اس کے متعلق مرزا غالب مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

" مرزا تفتہ کیا فرماتے ہو، کیسے رنگین صاحب کہاں رنگین صاحب پنجشنبہ کے دن ۱۵۔ جنوری سنہ حال کو وہ پنجاب کو گئے۔ ملتان یا پشاور کے کے ضلعے میں کہیں کے حاکم ہوئے ہیں، میں اپنی نا توانی کے سبب ان کی ملاقات تو دیکھے کو نہیں گیا"۔[1]

تو اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رنگین صاحب نے تذکرے کی تکمیل نہیں فرمائی۔ میں اس حقیقت پر روشنی ڈالنے سے قبل یہ ضروری سمجھتی ہوں کہ یہ بتا دوں کہ رنگین صاحب کون تھے، تو اس کے لئے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ ملک صاحب نے اپنے مدّعا کو ثابت کرنے کے لئے مرزا غالب کے جس خط کا اقتباس پیش فرمایا ہے۔ اسی خط میں مرزا صاحب فرماتے ہیں ـــــ " ڈکرو صاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے، ان کی جگہ رنگین صاحب مقرر ہوئے، ان سے ناچار ملنا پڑا۔ وہ تذکرہ شعراء ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں"۔[2] یہ خط مرزا غالب نے ۹۔ دسمبر ۱۸۶۴ء کو تحریر فرمایا۔ اس کے دو مہینے کے بعد ۱۲۔ فروری ۱۸۶۵ء کو یہ تحریر فرماتے ہیں کہ ـــــ "۱۵۔ جنوری سنہ حال کو وہ پنجاب کو گئے"۔ لیجئے قصہ تمام ہوا، اور اس خط کے اقتباس نے یہ بتا دیا کہ وہ عارضی طور پر ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر مامور ہوئے تھے، اور مرزا غالب کو ناچار ملنا پڑا تھا، مگر اس ملاقات کی مدت اتنی مختصر تھی کہ دسمبر ۱۸۶۴ء میں مرزا تفتہ کو تذکرہ لکھنے کی خوش خبری سناتے ہیں، اور ۱۲۔ فروری ۱۸۶۵ء کو ان کی روانگی کی خبر دیتے ہیں، اور خود ملاقات تو دیکھنے کو بھی نہیں جا سکتے۔ اس کے بعد مرزا غالب کے کسی دوسرے خط میں اس تذکرے کا تذکرہ نظر نہیں آتا۔ پھر یہ خود نوشت حالات کیسے ہیں؟ یقیناً یہ سوال اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ مگر جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکی ہوں کہ اس خود نوشت سوانح عمری پر ڈاکٹر عبد الحق صاحب کی ایک تحریر شائع ہو چکی ہے، وہ

[1] "اُردوئے مُعلّٰی" خط بنام تفتہ ص ۷۷ - ۹ - دسمبر ۱۸۶۴ء

[2] "اردوئے معلّٰی" خط بنام تفتہ ص ۷۷ - ۹ - دسمبر ۱۸۶۴ء

تحریر واضح تحریر ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ

"جب بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں مرزا غالب کے قدیم کلام کا نسخہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کیا گیا تھا تو اس کی ترتیب وغیرہ کا کام ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کے لئے بہت سی نئی نئی چیزیں جمع کی گئی تھیں، منجملہ ان کے ایک عجیب چیز خود مرزا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے حالات تھے جو اُنھوں نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے۔ یہ ورق کہیں سے سیّد افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا تھا، اور انھوں نے اپنی عنایت سے مرحوم کو بھیج دیا تھا، اگرچہ یہ حالات انھوں نے اس طرح لکھے ہیں جیسے کوئی غیر شخص لکھتا ہے۔ لیکن عبارت کا ڈھنگ صاف بتا رہا ہے کہ اس پردے میں خود مرزا نوشہ باتیں کر رہے ہیں۔ دوسرے ایک دو باتیں جو وہ کہہ گئے ہیں وہ مرزا کے دل کی ہیں۔ وہ دوسرا شخص کیسے لکھ سکتا تھا تیسرے خط اُن کا ہے۔ میرے پاس اُن کے قلمی خط ہیں، ملا کر جو دیکھا تو عین وہی شان پائی۔

ان حالات کے پڑھنے سے کم سے کم ایک بات تو یکی ہو جاتی ہے، اگرچہ اُن کے کلام اور رقعات میں بھی جا بجا ان کا ذکر آچکا ہے، اور ایک صاحب نے جو مرزا صاحب کے حُبِّ وطن اور حُبِّ قوم کی نسبت (جدید خیالات کی رو سے) جو حُسنِ ظن قایم کیا تھا، اس کی تردید خود مرزا صاحب کے الفاظ سے ہو جاتی ہے۔

سیّد افتخار عالم مرحوم نے ان حالات کے ساتھ نیّر راجستان، جلد ۲ نمبر ۱۵ کا بھی ایک مطبوعہ ورق بھیجا تھا جس میں تذکرہ منظہر العجائب کا اشتہار شائع ہوا تھا، اغلب ہے کہ یہ حالات مرزا صاحب نے اسی تذکرے کے لئے تحریر کئے ہوں"[1]

ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی تحریر سے بہت سے پردے نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور چند باتیں خاص طور سے سامنے آتی ہیں۔ اوّل یہ حالات مرزا صاحب نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے، دوسرے یہ ورق سیّد افتخار عالم مارہروی مرحوم کو کہیں سے ہاتھ لگ گیا تھا۔ انھوں نے وہ بجنوری مرحوم کو بھیج دیا تھا تیسرے اس تحریر کے ساتھ "نیّر راجستان" جلد ۲ نمبر ۱۵ کا بھی ایک مطبوعہ ورق تھا، جس میں تذکرہ منظہر العجائب کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ کام کی بات جو میرے نقطۂ نظر سے ہے وہ یہ ہے کہ "یہ ورق سیّد افتخار عالم مرحوم نے بجنوری کو بھیج دیا تھا" اگر یہ بات یاد رکھی جائے اور اس کو نظر انداز نہ کیا جائے تو یہ حالات مرزا غالب نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے" اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ پھر بھی "نیّر راجستان" کی ضرورت پیش آتی ہے کہ جس میں تذکرہ "منظہر العجائب" کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ بڑی تلاش و جستجو کے بعد یہ نمبر دیکھنے کو ملا۔ یہ اخبار مطبع خاور نور جے پور سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے صفحہ ۱۱ پر ایک اشتہار زیر عنوان "اشتہار تذکرہ منظہر العجائب" شائع ہوا ہے جو درجِ ذیل ہے۔

"اشتہار تذکرہ منظہر العجائب"

"خوش مذاقانِ مائدہ سخن اور شیرین کامانِ علم و فن پر واضح و لائح ہو کہ عرصہ چند سال سے ایک تذکرۃ الشعرار فارسی دہلی میں تالیف ہو رہا ہے آج تک ایسا تذکرہ فراہم نہیں ہوا ہے۔ مصنّف اس کتاب کے جس کو ایک دفتر کہنا چاہیئے عالی مرتبت معالی منصبت سند المحققین طراز المدققین بیجمل جلیل عالم نبیل، شاعر کامل۔ ثانی سحبان وائل برگزیدہ ایزد مطلق مولوی منظہر حق صاحب خلف الرشید و فرزند سعید یگانۂ ہمہ داں، فرزند دوراں، ماہین قادر کلامی شیوہ بیانی۔ زندہ کن انوری خاقانی۔ گزیدہ خداوند اقلیم زباندانی مقبول بارگاہ لم یزلی مولوی محمد ظہور علی صاحب ظلہ العالی المتخلص بہ ظہور ہیں۔ اگرچہ یہ تاریخ ۱۲۸۱ھ میں ختم ہو چکی تھی اور تقاریظ و تواریخ جو نجم الدولہ بہادر و مولانائے نظامی و حضرت ظہور وغیرہم نے عنایت کیں، ان سے بھی ۱۲۸۱ھ ہجری مفہوم ہوتے ہیں۔ مگر اب یہ تذکرہ دوبارہ ترقیم ہوا اور قریب دو ہزار شاعروں کے ترجمے سے مزین ہوا، اور اشعار کی تو کچھ حد ہی نہیں۔ حالات جو اس میں لکھے ہیں بڑی تلاش و تجسّس سے بہت ہی صحیح، ایک سو جلد کتب تواریخ سے جمع کی، جن کی فہرست اکثر اخبارات میں چھپ چکی، اور جناب مسٹر ڈیگن صاحب بہادر جج سابق دہلی کے اوّل اس کے بانی ہوئے، اور چھ سو شاعروں کا ترجمہ بزبان انگریزی انھوں نے فرمایا، اور خرچ سے ولایت میں چھپا۔ سوائے ازیں جناب صاحب کمشنر بہادر

---

[1] رسالہ "اردو" اورنگ آباد (دکن)، ماہ جولائی ۱۹۲۹ء جلد ۹ نمبر ۳۵ ص ۳۲۸

دہلی اور نواب محمد ضیاء الدین خاں بہادر رئیس لوہارو و نواب اسد اللہ خاں بہادر و دیگر رؤسا نے عنایت فرما کر اپنے کتب سے بہت مدد دی، اور نیز فضائل و کمالات دستگاہ، گوہر درج شرافت، اختر برج نجابت مولانا مولوی محمد انوار الحق صاحب میر منشی ایجنٹی مارواڑ نے چار سو سے زیادہ شعراء کا حال اضافہ کیا، اور جناب منشی درگا پرشاد صاحب مدرس اوّل ریاضی تعلیم المعلمین دہلی نے بھی ہر ایک طرح کی مدد دی۔ لیکن تا ایں ہمہ جیسا کہ چاہیئے شعراء بمبئی و کلکتہ و ممالک وسط ہند کے کلام فارسی اور حالات سے کچھ آگاہی نہ ہوئی۔ لہٰذا یہ اشتہار دیا جاتا ہے کہ جمیع شعراء فارسی اپنا حال مفصل مع تقریظ و تاریخ و اشعار خدمت میں جناب مؤلف صاحب کے بھیج دیں، اور جن صاحبوں کو خریداری منظور ہو تو وہ درخواست اپنی تعدادی تین روپیہ علاوہ محصول ڈاک خدمت میں جناب ممدوح کے دہلی محلہ بہرام خاں میں بذریعہ خط پیڈ ارسال کریں، اور اہل مطابع اس اشتہار کو اپنے اپنے اخبار میں درج فرمائیں۔ الدال علی الخیر کفاعلہ والسلام۔ فقط

اس اشتہار سے اس تذکرے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ملک صاحب کی تحریر کا ماخذ کیا ہے۔ کیونکہ مقالے کی ابتدائی سطریں بتا رہی ہیں کہ اس کے لکھتے وقت "نیر راجستان"[1] کا یہ شمارہ سامنے تھا۔ مگر ملک صاحب کو اشتہار سے مضمون اخذ کرتے وقت یہ خیال نہیں رہا کہ "تذکرہ مظہر العجائب" کے اصل مرتب مولانا مظہر حق صاحب تھے۔ لیکن اس کے بانی مسٹر رٹنگن صاحب بہادر تھے، اور چند شاعروں کا ترجمہ بزبان انگریزی انھوں نے فرمایا، اور خبر ہے کہ ولایت میں چھپا، لیکن اس سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس تذکرے میں مرزا غالب کے جو حالات دئے گئے تھے وہ یہی حالات ہیں کہ جو "احوال غالب" میں شائع کئے گئے ہیں۔ پھر بھی ملک صاحب کے اعتماد کا یہ حال ہے کہ ـــ

"تذکرہ مظہر العجائب موجود نہ سہی لیکن اس میں مرزا کا جو ترجمہ درج کیا گیا تھا وہ اتفاق سے ہمارے سامنے موجود ہے اور یقین ہے کہ یہ ترجمہ خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے"[2]

[1] نیر راجستان جلد ۲ نمبر ۵ ص ۱۱ و ۱۲

[2] احوال غالب ص ۲۷

مگر ڈاکٹر عبد الحق صاحب کامل احتیاط کے ساتھ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"اغلب ہے کہ یہ حالات مرزا صاحب نے اسی تذکرے کے لئے تحریر کئے ہوں"[1]

اور یہی بات صحیح بھی ہے۔ گمان غالب کو یقین کا درجہ دینے کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے وہ باتیں ملک صاحب کے مقالے میں مفقود ہیں، اور اس مقالے سے "غالب" کے طالب علموں کی معلومات میں کسی قسم کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس اغلب کو یقین کا درجہ دینے کے بعد "اغلب" کی بھی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ میں اس اغلب کی حیثیت کو ختم نہیں کرنا چاہتی۔ مگر اس یقین کے متعلق میرا یقین ہے کہ اس کی بنیاد غلط فہمی پر ہے، اور اس غلط فہمی کا سبب اردوئے معلیٰ میں تفتہ کے نام غالب کے خطوط میں رٹنگن کا نام اور مرزا غالب کے خود نوشت حالات کی اشاعت کے موقعے پر ڈاکٹر عبد الحق صاحب کا یہ ارشاد کہ یہ (حالات) کسی تذکرے نویس کی فرمائش پر لکھے تھے، اسی کے ساتھ اس تذکرے میں دربار شاہی میں باریابی اور ذاتی اعزاز کا بھی ذکر ہے، اور یہ باتیں ایسی ہیں کہ جس کی بنیاد پر ہر شخص غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مگر دربار میں باریابی اور ذاتی اعزاز کے لئے جو انداز اختیار کیا گیا ہے اُس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا فرماتے ہیں:

"گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدہ مدح نذر دیتا ہے، اور سات پارچہ جیغہ سرپیچ موتیوں کے مالے خلعت پاتا ہے۔ اب کے بار جو لاہور میں لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے درباداروں کی فہرست کے صاحب کمشنر بہادر جنھوں نے کہ درین ولا قائم مقام صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں، مثلاً اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا۔ بے چارہ بسبب تہی دستی اور بے مقدرتی کے لاہور نہ جا سکا۔ مجھ سے کہتا تھا کہ ستر برس کا آدمی کانوں سے بہرا اور اکثر بیمار رہتا ہوں۔ لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو نہ مانتا، اور بے شک لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا۔ خیر آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے"[2]

[1] "احوال غالب" ص ۲۴

مندرجہ بالا عبارت میں ایک بات خاص طور سے قابلِ غور ہے، وہ بات لاہور میں لارڈ صاحب کے دربار کا ذکر اور بسبب تہی دستی اور بے مقدرتی نہ شریک ہونے کا افسوس ہے۔ مگر اس تحریر کے خاتمے پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے کہ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اس کا زمانۂ تحریر کیا ہے۔ ملک صاحب اس حقیقت کے پیشِ نظر فرماتے ہیں کہ

"اس تحریر پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن داخلی شہادت اس بات کی موید ہے کہ اس کا زمانۂ تحریر ۱۸۶۴ء کے لگ بھگ ہوگا۔"[1]

اور وہ داخلی شہادت غالباً تفتہ کے نام مرزا غالب کے خطوط ہیں اسی لئے زمانے کے تعیّن میں ۱۸۶۴ء کے لگ بھگ تحریر کیا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال سے مرزا غالب کی یہ "خود نوشت سوانح عمری" کسی ایسی داخلی شہادت کی محتاج نہیں ہے کہ جس میں شک نمایاں ہو، بلکہ یہ تحریر خود اپنے زمانے کے تعیّن کے لئے ایک مستقل شہادت ہے اور وہ دربار لاہور کا تذکرہ اور پھر اس کے ساتھ اپنی عمر کی قید ۔۔ تاریخ کے طالبعلم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہ دربار اکتوبر ۱۸۶۴ء میں لارڈ لارنس کے زمانے میں ہوا تھا۔[2] (اس دربار کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ لارڈ لارنس نے دربار کے شرکار کو ہندستانی زبان میں خطاب کیا تھا۔[3] اس خبر کو سن کر غالب کے دل پر کیا گذری ہوگی۔ یقیناً یہ ایک ایسا داغِ حسرت ہوگا کہ جس پر جس قدر بھی تاسّف کیا جائے وہ کم ہے) اور یہ تحریر اس دربار کے بعد کی ہے، اور عمر کے تعیّن سے پتہ چلتا ہے ۱۸۶۵ء میں لکھی گئی ہے اور قمری حساب سے مرزا کی عمر ۱۸۶۵ء میں ستّر سال کی ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر میں اس "خود نوشت حالات" کو "تذکرہ مظہر العجائب" کے لئے تسلیم نہیں کرتی، دوسرے میرے سامنے ڈاکٹر عبد الحق صاحب کی تحریر کا وہ حصّہ بھی ہے کہ "یہ ورق کہیں سے سیّد افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا تھا اور اُنھوں نے اپنی عنایت سے بجنوری مرحوم کو بھیج دیا تھا" اس کی روشنی میں بھی میرا خیال یہی ہے کہ یہ تحریر "تذکرہ مظہر العجائب" کے علاوہ کوئی دوسری تحریر ہے۔ تاویلات کی دنیا میں جانے والے ان باتوں کو قیاسی

---

[1] "احوالِ غالب" ص ۲۷

[2] ملاحظہ فرمائیے "لارڈ لارنس" باسورتھ اسمتھ جلد ۲ ص ۲۴۴

[3] ملاحظہ فرمائیے "انڈیا انڈر گراونڈ" کے۔ پی۔ باسو، حال دربار لاہور

باتیں کہہ کر تاویلات میں پھنس جائیں گے تو اس باب میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور میں بقول مرزا غالب حق بات کو نہ ظاہر کرنا خدا پرستی اور حق پرستی کے خلاف سمجھتی ہوں۔ اس لئے جو دلائل ہیں اُن کو بھی پیش کر دینا ضروری سمجھتی ہوں۔

وہ دلائل کیا ہیں؟

تو میں کسی منطقیانہ یا فلسفیانہ بحث میں نہیں جانا چاہتی، بلکہ ایک ایسا صاف اور واضح ثبوت پیش کرنا چاہتی ہوں جو اس باب کو بند کرنے کے لئے کافی ہے۔ وہ ثبوت مولانا احتشام الدین صاحب دہلوی کی ایک تحریر ہے، اس تحریر میں میرے مدعا کے علاوہ دوسرے اور بھی اہم مباحث ہیں مگر اس کی اشاعت بھی دلچسپی سے خالی نہیں، اس لئے وہ پوری تحریر حاضر خدمت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"یہ غلط ہے کہ بجنوری نے یہ دیباچہ غالب کے نسخے دیوان معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ نہیں بلکہ دستیاب ہونے پر اُن کو مکمل کلام غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور یہ مقدمہ اس ارادہ کی پٹری میں لکھا گیا۔ اس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علی گڈھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا کٹا پھٹا ان کے پاس موجود تھا، اور انھوں نے خود اپنی زبان سے اس کو مجھے پڑھ کر سنایا۔ اور طباعت کے متعلق مشورے کئے، ارادہ ظاہر کیا کہ اس کے ساتھ غالب کا ایک فوٹو اور اُن کے خطِ خاص کا نمونہ بھی دینا چاہئے۔ مگر اس کی بہم رسی کے لئے متردد تھے۔ میرے پاس وہ مختصر تذکرہ خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا موجود تھا، جو ان سے مسٹر ہملٹن[1] ڈپٹی کمشنر دہلی کے تذکرہ شعراء فارسی کے لئے میرے والد ماجد[2] مرحوم نے لکھوایا تھا۔ وہ میں نے بجنوری مرحوم کو دیا مگر ان کے انتقال کے بعد جب یہ نسخہ بالآخر شائع ہوا تو نہ اس کے ساتھ مرزا کی تصویر تھی اور نہ اُن کے خط کا وہ نمونہ۔ مسٹر شعیب قریشی کی وساطت سے

---

[1] نام کے تحریر کرنے میں مولانا احتشام الدین صاحب کو سہو ہو گیا ہے۔ تذکرہ مظہر العجائب کے اشتہار میں اور تفتہ کے نام مرزا غالب کے خطوط میں مسٹر ہملٹن نہیں بلکہ مسٹر ریگن ہے اس لئے مسٹر ریگن ہی صحیح ہے۔ غالباً یہ سہو دلّی سوسائٹی میں مسٹر ہملٹن صاحب کی دلچسپیوں اور مرزا غالب سے حسنِ عقیدت کے پیشِ نظر ہو گیا ہو۔ [2] یعنی مولانا امداد الحق صاحب میر منشی ایجنسی مارواڑ جنھوں نے تذکرہ مظہر العجائب میں چار سو سے زیادہ شعراء کے حال کا اضافہ فرمایا۔

اس کو بہت تلاش بھی کیا کہ وہ مرحوم کے درشار کے واقف اور بروقت وفات بھوپال میں موجود بھی تھے، مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر حیدرآباد آکر معلوم ہوا کہ مولوی عبدالحق صاحب (انجمن ترقی اردو) کے پاس وہ "احوال غالب" خود اُن کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ الحمدللہ کہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ مگر انتظار ہے کہ کب شائع ہوتا ہے"۔ ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء محمد احتشام الدین دہلوی[1]

مولانا احتشام الدین صاحب دہلوی کے اس بیان سے خود نوشت احوال غالب پر پوری روشنی پڑ جاتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء تک وہ حالات شائع نہیں ہوئے تھے۔ پھر یہ حالات خود مولانا احتشام الدین صاحب نے ڈاکٹر بجنوری کو دئے تھے۔ اور جو خود نوشت حالات ماہ جولائی ۱۹۲۸ء کے "رسالہ اردو" (اورنگ آباد دکن) میں شائع ہوئے تھے وہ افتخار عالم صاحب مارہروی مرحوم کے دئے ہوئے تھے۔ احوالِ غالب میں اسی کا عکس ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر اس "خود نوشت سوانح عمری" کو "تذکرہ مظہر العجائب" کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ اُمید ہے کہ اظہار الحق صاحب ملک ان گذارشات پر غور فرمائیں گے۔

اس مقالے کی تیاری کے لئے اپنے مخدوم سید احتشام حسین صاحب (لکھنؤ یونیورسٹی) کی شکر گذار ہوں جن کی شفقتِ بزرگانہ کی بدولت اس نسخۂ حمیدیہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا جس پر مولوی احتشام الدین دہلوی نے خود اپنے قلم سے متذکرۂ بالا عبارت لکھی ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری طالب علمانہ معلومات کیا۔

[1] مقدمہ نسخۂ حمیدیہ ص ۴۰ اسحٰق کا تحریر قلمی۔ مملوکہ سید احتشام حسین صاحب رضوی

درۂ بانہال میں نئی سُرنگ

موسمِ سرما کے تین مہینے برف باری کے باعث درہ بانہال کے راستے پر لاریوں اور موٹروں وغیرہ کے ذریعے آمد و رفت کا جاری رہنا ناممکن ہو جاتا ہے پیر پنجال کے کوہستانی سلسلے میں ۹ ہزار فٹ کی بلندی پر تعمیر شدہ موجودہ سرنگ کے ذریعے بھی سال میں لگ بھگ نو مہینے آمد و رفت جاری رہ سکتی ہے، اور باقی کے تین مہینے پا پیادہ آمد و رفت کے لئے بھی بالکل غیر یقینی ثابت ہوتے ہیں۔ ان مشکلات پر قابو پانے کے لئے ہی مقابلتاً کم بلندی پر ایک اور سرنگ تعمیر کرنے کے منصوبے پر عمل شروع کیا گیا ہے۔ اس سرنگ کا کام گذشتہ دو ماہ سے جاری ہے۔ اور تقریباً تین سو کشمیری برف باری کا مقابلہ کرتے ہوئے بیلچے اور کلہاڑے اُٹھائے ہوئے مصروفِ عمل ہیں۔ چٹانوں کو گرانے کے لئے مشینیں بھی استعمال کی جا رہی ہیں۔ توقع ہے کہ چٹانوں کی صفائی کا کام مکمل ہونے کے بعد زمین میں سوراخ کرنے کا کام دکن کی طرف ماہ دسمبر کے آخر میں اور اُتر کی طرف وسط دسمبر میں شروع ہو جائے گا۔ اگرچہ اس وقت اس منصوبے کی تکمیل کے لئے صرف تین سو مزدور کام کر رہے ہیں لیکن جب پوری تعداد میں مشینیں سُرنگ کھودنے کے کام میں لگ جائیں گی تو مزدوروں کی تعداد تقریباً پانچ سو پہنچ جائے گی۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لئے درکار تمام بھاری مشینیں نومبر کے آخر تک جرمنی سے چل پڑی ہیں۔ بہت سی مطلوبہ بھاری مشینری پہلے بندرگاہ میں پہونچ چکی ہے۔

اس اسکیم کے سلسلے میں آزمائشی سُرنگ کو ۷ اگست ۱۹۵۴ء سے ڈیڑھ سال کے اندر اندر پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا پروگرام مُرتّب کیا گیا ہے۔ یہ ابتدائی منزل طے ہونے کے بعد زیادہ بڑی سُرنگ تیار کی جائے گی۔ ہمارے ملک میں اب تک کبھی بھی اتنی لمبی سُرنگ تعمیر کرنے کے منصوبے پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس سرنگ کا شمار دنیا کی بارہ طویل سرنگوں میں ہوگا۔ زیرِ تعمیر سرنگ موجودہ سرنگ سے چودہ گُنا زیادہ لمبی ہوگی، اور اس سے سفر کے دشوار گذار پہاڑی راستے میں لگ بھگ ۲ میل کی کمی واقع ہوگی۔ نئی سرنگ ۷۲۰۰ فٹ کی بلندی پر کھودی جا رہی ہے جبکہ موجودہ سرنگ جو سردیوں میں برف سے اٹ جاتی ہے۔ ۸۹۸۵ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

جرمنی کی جس انجینئرنگ فرم کو بھارت کی ایک کمپنی سے ملا کر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اُسے اس میدان میں ۷۰ سال کا تجربہ ہے۔ جرمنی میں بویرین ایلپس کے پہاڑی علاقے میں اسی فرم نے تقریباً چار میل لمبی سرنگ تیار کی ہے۔ ابتدائی نوعیت کی موجودہ سرنگ کی تعمیر کا ٹھیکہ ۲۷ لاکھ تیس ہزار روپے پر دیا گیا ہے۔ لیکن تمام اسکیم کی تکمیل پر تقریباً تین کروڑ روپے صرف ہوں گے۔

ایس ناثقہ

مرزا غالب کا ایک گمنام شاگرد

اُردوئے معلّٰی کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے ہندو اصحاب تھے جن کا مرزا غالب سے کافی ربط و ضبط تھا منجملہ ان کے ایک بابو ہرگوبند سہائے صاحب المتخلص بہ نشاط تھے۔ جن کو غالب کے شاگرد ہونے کا بھی شرف حاصل تھا۔ ان کے حالات و کلام سے بہت کم اشخاص واقف ہیں، حالانکہ آپ نہایت با رسوخ لوگوں میں سے ایک تھے جیسا خود مرزا کے خطوط سے جو بابو صاحب موصوف کے نام تحریر ہیں ظاہر ہے۔ جناب نشاط کے غالب مرحوم کے شاگرد ہونے کا اقرار خود ان کی زبانی موجود ہے ۱۸۶۹ء میں ایک مشاعرہ بمقام آگرہ منعقد ہوا تھا۔ اُس میں التزام یہ تھا کہ شاعر اپنے مختصر حالات، تعداد تصانیف وغیرہ لکھ کر منتظم مشاعرہ جناب محمد نیاز علی پریشاں کو روانہ کرے۔ جیسا کہ ۱۹۵۳ء کے مشاعرۂ نمائش علی گڑھ میں کیا گیا۔ آگرے کا مشاعرہ، علی گڑھ کے مشاعرے کی طرح ایک کتابی صورت میں شائع ہوا جس کا نام تذکرۂ شعر و سخن رکھا گیا۔

حضرت نشاط ایک نغز گو اور بلند خیال شاعر تھے۔ فصاحت آپکے کلام کا خاص جوہر ہے، جو شروع سے آخر تک آپ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ آپ کی ایک کتاب نشاط المحاسبین کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کو پڑھ کر آپ کی قادر الکلامی اور حسابی واقفیت پر انگشت بدنداں ہونا پڑتا ہے۔ اس میں نام و اقسام اعداد، اشکالِ اعداد، پہاڑے، اگر، قاعدۂ تحویل جمع، تفریق، ضرب و تقسیم مفرد و مرکب سے لے کر قاعدۂ راس المال Stock تک نظم کر ڈالا ہے۔ اس کے علاوہ بیانِ مربع و مکعب Squares & Cubes تناسب سلسلہ جمع، تفریق، ضرب و تقسیم Arithmetical & Geometrical Progressions اور تبدیل ترتیب و اجتماع Permutations & Combinations کے قاعدے سب کے سب منظوم درج ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب کہ برٹش گورنمنٹ کو علی گڑھ میں قدم رکھے ہوئے تقریباً ۵۰ سال ہوئے تھے۔ وہاں کے کسی باشندے کا اتنی واقفیت رکھنا اس غیر تسلط زمانے میں Ph.D کی ڈگری سے کسی طرح کم نہ سمجھنا چاہیئے۔

دوسرا منظوم کلام آپ کا دیوان ہے۔ جس کا نام دیوانِ نشاط الاحباب" رکھا تھا یہ ۸۸ اُردو و فارسی غزلوں کا ردیف وار مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ۴۵ رُباعیات بھی ردیف وار درج ہیں، اور ۸ دیگر نظمیں ہیں جو شکریہ و تواریخ بحساب ابجد پر مشتمل ہیں۔ اس دیوان میں دو قصیدے بھی ہیں جس میں ایک فارسی کا ہے۔ آپ نے ان دونوں کی سُرخیوں میں خوشامدانہ الفاظ کا استعمال بالکل نہیں کیا ہے۔ ایک میں "قصیدہ در مدح جناب ڈیوک آف ایڈنبرا" وغیرہ لکھا ہے اور دوسرے میں "بمخاطب بودن جناب فلاں کے سی۔ ایس۔ آئی"، استعمال کیا ہے۔ فارسی قصیدہ ۳۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے نمونتہً شروع کے دو اشعار پیش کرتا ہوں۔

> اے برتر از قیاسِ ملائک مکانِ تو — تو سایۂ خدا و فلک سائبانِ تو
> بخت جواں چنیں بکہ بخشید حق بتو — سوگند پیر چرخ بہ بخت جوانِ تو

اس میں سوگند کا لفظ قابلِ ملاحظہ ہے۔ مرزا غالب نے بھی ہندی اور انگریزی الفاظ اپنے اُردو نیز فارسی اشعار میں استعمال کئے ہیں۔

> سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے — غالب
> آرے نہ چک[1] بود نہ تمسک نہ مہر کہ ہست — نے دستخط نہ مہر نہ نام و نشانِ اوست
> مضمونِ شعر نوٹ بود فی زماننا — یعنی بدست ہر کہ بیفتاد از آن اوست — غالب

آپ کے دیوان کی پہلی غزل کا مطلع اور زیب مطلع ملاحظہ ہو۔

---

[1] Cheque

شرک سے دل جب کہ جدا ہو گیا — سنگ سے بُت، بُت سے خدا ہو گیا
پردۂ تحقیق جو وا ہو گیا — دل ہی مرا نورِ خدا ہو گیا

تیسری غزل کی بحر دیکھئے۔

ذکرِ غیر اوروں کا اور ہے گلا اپنا — بات پا گئے ہم بھی گم ہے مُدّعا اپنا
ماتمِ صحت ہوں مرگ ہے شفا اپنی — چارہ ساز بے پروا درد لا دوا اپنا

اور دیکھئے۔

شبِ لیالِم رویا جب میں ناتواں رویا — صبح خوئے نجدت سے منہ رقیب نے دھویا

آپ کی نویں غزل کا قافیہ تُو، آبجو، کو بکو ہے اُس میں آپ نے دکھبو، بھی باندھا ہے جس کا استعمال اُس وقت جائز تھا۔

میں بہ غفلت ہمیشہ دور رہا — اور وہ پاس سے کبھو نہ گیا

اس کے ساتھ ہی مومن کے مشہور شعر کا مقابلہ کیجیے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ایک مسلسل غزل میں ۳۴ اشعار ہیں۔ اس میں پہلے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا ہیچ نہیں ہے۔ اس غزل کا پہلا شعر ہے۔

تم کہتے ہو دنیا کو یہ ہے دارِ فنا ہیچ — تسلیم نہیں ہم کو، نہیں اس کی بقا ہیچ

۱۹ اشعار ختم کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

سچے نے بنایا ہے اسے جھوٹ ہو کیسے — تم کہتے رہو کہ یہ ہے دارِ فنا ہیچ

اس کے بعد ۲۳ اشعار کی غزل اسی ردیف و قافیہ میں ہے۔ جس میں ہر شے کی بے ثباتی ظاہر کی ہے۔

جب حشر کا دن آئے گا ہو جائے گا ظاہر — جو خلق ہوا ہیچ ہے اور خود ہے قضا ہیچ

ایک غزل طرحی ۲۵ اشعار کی رقم ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشاعرہ ہر پندرھویں روز ہوتا تھا، اور اس میں حضرت تفتہ بھی شریک ہوتے تھے۔

لطف تازہ مشاعرے میں آج — حضرتِ تفتہ کی بدولت ہے
پندرہ دن کے بعد ہے یہ دید — انکی صحبت ہی بس غنیمت ہے

ہندو تھے، بسنت اور ہولی پر بھی طبع آزمائی کیوں نہ کرتے۔

دعا یہی ہے ہماری کہ دہر میں جب تک — شگونِ سالِ نوی پر ہے شمارِ بسنت
نشاط مندر ہو تم جہاں میں ہر گو بند — نشاط سے رہے جب تک کہ یادگارِ بسنت

زیبِ رنگِ رُخِ خوباں ہے گلال — بحث اس رنگ پہ اکثر ہولی
اب کے ہولی میں پئیں گے مئے ناب — یہ قسم بر لبِ ساغر ہولی

آپ کی منکسر المزاجی اس رباعی سے کما حقہٗ ظاہر ہے۔

میں سلسلۂ خرد کا پابند نہیں — فی الواقع ہوں نادان خردمند نہیں
پر آپ نہ لکھئے مجھ کو ایسے الفاظ — میں بندۂ عاصی ہوں خداوند نہیں

دبیر کی یہ رباعی زباں زدِ خاص و عام ہے۔

دنیا عجب سرائے فانی دیکھی — ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا — جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

حضرتِ نشاط کا چُلبلا پن دیکھئے۔

گر چاہِ ذقن کی تہ میں پانی آجائے — اور اس میں ذرا ذرا روانی آجائے
پھر سیر ہو اس سے کثرتِ موہائے سپید — ممکن ہے گئی ہوئی جوانی آجائے

ریاست کوٹہ جہاں آپ نے بعہدۂ دیوانِ ریاست اور اکبر آباد یعنی آگرہ جہاں بطور وکیل عدالتِ دیوانی کام کیا، نیز جے پور، ان تینوں مقامات کی تعریف میں ۸ رباعیاں حضرتِ نشاط کے دیوان میں موجود ہیں۔

فارسی غزل کے صرف دو اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

بر کلیم شکوہ دارم کہ زچشم سرگینش — چہ بلا بجاں رسید و چہ بلا تباہی آمد
نشاط خاطرِ من چو سخن زنند اغیار — کہ بہ پیش آں ستمگر پئے عذر خواہی آمد

حضرتِ نشاط کی طبیعت کچھ مشکل پسند بھی واقع ہوئی تھی۔ باعث اور حادث کے قافیے باندھتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

ہر اک قطرہ ہے آنسو کا ہماری آنکھ میں طوفاں
حباب بحر وش میں اپنے آگئے نوح اور یافث
مئے عرفاں خمِ وحدت میں اب مجھ کو پلا ساقی
حریفِ بادہ پیما جامِ جم کے ہوگئے وارث
رقیبوں کو الم مجھ کو نشاطِ دہر حاصل ہے
یہ اپنی اپنی قسمت ہے عبث اس پر ہو تم باحث

ہیں دل سے کیوں نہ کہوں تجھ کو چشمِ تر، شاباش
بہایا اشک سے تُو نے عدو کا گھر، شاباش
فدا ہوں بے خبری کا کہ درد دل کی مرے
خبر جہاں میں ہے اور تم ہو بے خبر، شاباش

۳۰۔ اشعار کی غزل کے صرف دو اشعار

تھی انتظار میں نرگس بھی ایسی چشم براہ   کہ جس طرح ہو نظر بازِ سارقِ حراف
وہ قہر جس سے نمایاں تھے حشر کے آثار   وہ مہر جس سے ہویدا تھی صورتِ اعطاف

انگریزی الفاظ کا بحسن و خوبی استعمال

تاکہ توبہ خاطرِ خرم سے نہ کرے   بھرتے تو ساقیا مرے ساغر میں اولڈ ٹام شراب
قندی نہ شہدی اور نہ برانڈی نہ اولڈ ٹام   ساقی وہ مئے جو نکلی ہے از قعرِ خُم شراب

مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو نشاط صاحب کو لکھا ہے، اس میں اولڈ ٹام Old Tom کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر اولڈ ٹام کی بجائے اود ٹام تحریر کیا ہے۔

روز مرہ آپ کے کلام میں خصوصیت کا حامل ہے۔

اُن لبوں سے مرا گلہ نکلا   مُنہ کو تکتا ہوں میں یہ کیا نکلا
غیر سے مذکور ہمارا کیا   خوب کیا آپ نے اچھا کیا
آج وہ ترکِ وفا کرتے ہیں   ایسا کیوں کرتے ہیں، کیا کہتے ہیں
مجھ پہ یہ خشم ناروا کیا ہے   کچھ تو کہیئے مری خطا کیا ہے
بے وفاؤں سے چاہتا ہے وفا   دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

چُلبُلاپن

شیشۂ مے نہاں بغل میں نشاطؔ   اور دعویٰ ہے پارسائی کا
نشاط انگیز ہے یہ طرزِ گفتار   پیو مے، اب بنو گے پارسا کیا
پیری میں بھی نشاط جوانی نظر پڑی   ممنون ہوں میں دیدۂ معشوقِ باز کا
برچھی سہی، سناں سہی، تیرِ مژہ سہی   سب کچھ سہی، جگر پہ مگر آزمائے کون
ہو میسّر مئے دو سالہ اگر   اور پھر رحمتِ خدا کیا ہے؟

محاورات

بے سبب کیوں مریضِ عشق بنوں   تندرستی ہزار نعمت ہے
قاصد سے کہہ رہے ہیں اگر آئے ہیں نشاطؔ   پانی پئیں گے آج ترے سر پہ وار کے
کیوں روکوں میں طبع کی رَوانی   رُو دیتا ہے بند ہو کے پانی
وہ آچکے سرِ تربت پہ فاتحہ کے لئے   جو میری خاک سے دامن بچائے جاتے ہیں
ہاتھ کی کب لکیر مٹتی ہے   دستِ حجّام اور تمہارا خط

عربی فقرات کا بہ خوش اسلوبی استعمال

الا یا ایہا الساقی اٹھا ہے ابرِ مستانہ   ادر کاساً وناولہا صدا دیتا ہے میخانہ
دنیا کا نام مزرعۃ الآخرۃ بھی ہے   یاں بے پئے نہ پائیں گے جنت میں ہم شراب
تبسم پر اگر چینِ جبیں کا فیصلہ ٹھیرے   ادائے معنیٔ دَع ما کدر خذ ما صفا ٹھیرے

متفرقات

اس پہ مرتے ہیں جس کا دامن شرم   دستِ وہم وخیال چھو نہ گیا
تبسمِ گُل کا ہے یا خندۂ برق   وجودِ عشرتِ اہلِ فنا کیا
ہم نے سجدے کو سر جھکایا تھا   بارے واں اُن کا نقشِ پا نکلا
خواہشوں کا چھوٹ جانا ہے نشاطؔ   روتے ہیں ناداں کو دانا دیکھ کر
یہ دلِ دیوانہ بس مسرور ہے   اپنے گھر میں شکلِ صحرا دیکھ کر
خصوصاً جمع ہم نے ہی کیا ہے دولتِ غم کو   عموماً جس کا جی چاہے وہ لے شادمانی کر
ہیں جو محسوسات کے تارک وہ ہیں غم مدام   کاغذِ تصویر کی جلتی ہے بے باکانہ شمع
وعدوں ہی کو تمہارے نہ سمجھے ہیں ہم دروغ   تم جھوٹے، عہد جھوٹے، تمہاری قسم دروغ
آئینہ، رونمائے سکندر ہی گرچہ ہو   ہستی باعتبارِ وجودِ عدم دروغ
دشمن کے مرگ کی بھی نہ ہم آرزو کریں   کس طرح لوحِ زیست پہ کھینچیں قلم دروغ
زُلفِ سُنبل ہو نقابِ رُخِ گُل   غنچہ وا بندِ قبا کرتے ہیں
نشاطِ دل سے پہنچے تا درِ کعبہ وہ لے واں بھی   نشانِ یارگم پایا پڑا تھا صنم ویرانہ
بے المبر م یا نمال عدو کو نہ کیجیو   اتنا خیال بس مرے سر کی قسم رہے
طائف ہو شیخ ساجدِ سنگِ حرم رہے   ہم سنگ دیکھ زائرِ بیت الصنم رہے
نہ پہنچے بال برابر بھی واں نگاہِ خیال   نظر کا چاہیئے گنڈا تری کمر کے لئے
شفق تو بھی دعا کیجو مرے خوں کی قسم تجھ کو   نہ اس پائے نگاریں پر کہیں رنگِ حنا ٹھیرے
چھلنے گوندھیں گے کاکُلِ مشکینِ یار کے   ٹانکے اُدھیڑ دوں جگرِ زخمدار کے
نشاطؔ نام بھی تبدیل کیجئے صاحب   قدم جو دشتِ مصیبت میں تم کو دھرنا ہے

حضرتِ نشاطؔ پٹنہ (بہار) کے مشہور کائستھ ماتھر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد منشی خوب لال صاحب کسی کلکٹر کے ہمراہ پٹنے سے علی گڑھ تشریف لائے اور یہیں آباد ہو گئے۔ منشی صاحب پیشۂ وکالت کرتے تھے، اور علی گڑھ میں کافی جائیداد اور زمینداری حاصل کی۔ یہیں ۸۔ دسمبر ۱۸۳۲ء کو نشاط صاحب پیدا ہوئے۔ رواج کے مطابق آپ کو اُردو و فارسی کی تعلیم دی گئی۔ مگر ذاتی لیاقت کی وجہ سے آپ نے عربی میں بھی کافی مہارت حاصل کی، اور عمر کے آخری حصے میں سنسکرت سیکھی

بھی واقفیت حاصل کرلی تھی۔ شاعری سے آپ کو اوائل عمری سے ہی شوق تھا۔ خوش قسمتی سے آپ ۱۸۵۳ء میں بمقام دہلی نظارت صدر امینی کے عہدے پر ممتاز ہوگئے، اور مرزا ہرگوپال تفتہ سکندرآبادی کے توسل سے مرزا غالب دہلوی سے تلمذ حاصل کیا۔ میر پنجہ کش، بہاری لال مشتاق وغیرہم کے ہم صحبت وہم جلیس رہے۔ آپ نے ایک اچھی قیمتی قلمی اور طبع شدہ کتابوں کی لائبریری چھوڑی، جو بعدہٗ دھرم سماج کالج علی گڑھ کی نذر کردی گئی۔ چار سال بعد آپ نے استعفا دے کر گوالیار میں میر منشی کا عہدہ سنبھالا۔ مگر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے باعث آپ پھر علی گڑھ تشریف لے آئے اور ۱۸۵۸ء میں سررشتہ دار عدالت دیوانی مقرر ہوئے۔ سرجون شور ڈسٹرکٹ سیشن جج کی مہربانی سے آپ نے وکالت کا امتحان بھی پاس کرلیا اور آگرے میں ۱۸۶۳ء سے وکالت شروع کردی۔ اس میں کافی رسوخ حاصل کیا۔ میونسپل کمشنر بھی ہوگئے، اور درباریوں کی فہرست میں نام نامی بھی درج ہوگیا۔ آگرے میں رہنے کے لئے آپ نے جون بٹیس کی کوٹھی و باغ خرید کیا جو ۱۸۸۸ء میں میونسپل آفس اور سمسن گنج میں تبدیل ہوگیا۔ کسی زمانے میں یہ جگہ جمنا باغ کے نام سے موسوم تھی، جہاں دارا شکوہ پسر شاہجہاں بادشاہ دہلی کا مسکن تھا، اور جس کو اٹھارھویں صدی کے آغاز میں سندھیا گورنمنٹ نے کرنل فلوز کے خاندان کی رہائش کے لئے خرید کیا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں آپ ریاست کوٹہ کے جج مقرر ہوئے، مگر وہاں صرف ایک سال ہی رہ سکے، کیونکہ تندرستی نے ساتھ نہ دیا۔ ۱۸۸۶ء میں بڑی عزت کے ساتھ آپ کو دربار قیصری میں بمقام دہلی مدعو کیا گیا۔

آپ ایک زبردست سوشل ریفارمر تھے۔ قوم کی شادیوں میں اسراف کثیر اور بیجا خرچ دیکھ کر آپ نے ایک مسودہ تیار کیا جس کا نام "ضوابط شادی" رکھا۔ گورنمنٹ نے بھی اس کی کاپیاں خاص خاص اضلاع میں گشت کرائیں۔ یہ "ضوابط" بکثرت آرائے قوم پاس ہوا، اور اس کی پہلی جلد ۱۸۶۵ء میں طبع ہوئی۔ نویں بار ۱۹۲۷ء میں چھپی جو حسب معمول اصحاب قوم کو مفت تقسیم ہوتی رہتی ہے۔

۱۸۶۸ء میں آپ نے درستی اخلاق کے متعلق ایک کتاب "تالیف ہرگوبند" کے نام سے تحریر کی۔ یہ کتاب نہایت مقبول ہوئی، اور بذریعہ چٹھی نمبری ۱۵ ۳۵ مورخہ ۱۹۔ اگست ۱۸۶۸ء محررہ گورنمنٹ گزٹ آپ کو منجانب گورنمنٹ ایک سو پچاس روپے بطور انعام عطا ہوئے۔

پانچویں کتاب آپ کی "الہام ضمیر" ہے جس میں ازدواج ثانی بیوگان کے خلاف مستند ثبوت و دلائل پیش کئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کتاب نے اُس وقت کے لئے اس مسئلہ کو بالکل خاموش کردیا۔ یہ بات موجودہ زمانے کے خیالات کے مطابق نہ ہو مگر اس سے نشاط صاحب کے زورِ قلم اور مستحکم مزاجی کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ اس کتاب کا سال طبع ۱۸۸۹ء ہے۔

مذہبی خیالات وغیرہ

۱۸۸۱ء میں وکالت سے علیحدگی اختیار کرنے پر آپ نے مذہبی کاموں کی طرف رجوع کیا۔ اسی سال کنور وزیر علی خاں رئیس و زمیندار دان پور ضلع بلند شہر سے زمین حاصل کرکے برلب گنگ بمقام راج گھاٹ پندرہ ہزار روپیہ لگا کر ایک وسیع اور کشادہ دھرم شالہ تعمیر کی۔ اس کے سامان مہیا کرنے میں مسٹر گروس صاحب نے بہت مدد کی۔ آپ نے اسی مقام پر ۱۸۸۱ء میں ایک بڑا یگیہ کیا جس میں آٹھ سو دور و نزدیک کے پنڈت شریک ہوئے۔ اس موقعے کے لئے آپ نے ایک نظم موسومہ "کالستھ مکتاولی وسندھیو پاسن" تحریر کی جو کافی پسند کی گئی۔

حضرت نشاط ایک نہایت خوش خلق اور باوضع شخص تھے۔ خوش خوراک ہونے کی وجہ سے راجہ صاحب مُرسان سے (جو مشہور رئیس بھگت راجہ مہندر پرتاپ وارد حال دہرہ دون کے چچا تھے) آپ کے تعلقات نہایت گہرے تھے۔ یہ راجہ صاحب مرسان وہی ہیں جن کے لئے مشہور ہے کہ تیل کی بُو خاص طور پر محسوس کرلیتے تھے، کہتے ہیں کہ ایک دعوت میں راجہ صاحب کے لئے خاص طور پر تیل کا سجاؤ کیا گیا تھا، خس کی ٹٹیاں مشکوں کے ذریعے عطر سے چھڑکی گئی تھیں۔ قضارا ایک سقّے کی مشک نئی تھی اور اس میں تیل لگایا گیا تھا، راجہ صاحب نے باوجود اس تمام احتیاط کے تیل کی بُو محسوس کرلی۔

تقریباً دھرم شالہ کی تعمیر کے ساتھ ہی حضرت نشاط نے اپنا وقت شعر و شاعری و دیگر علمی مشاغل میں صرف کرنا شروع کردیا تھا۔ آپ کی درستی اخلاق کے متعلق کتاب بنام "تالیف ہرگوبند" ۱۸۶۸ء میں آپ کا دیوان موسومہ "نشاط الاحباب" نیز "مکتاولی وسندھیو پاسن" ۱۸۸۱ء میں اور کتاب "الہام ضمیر" ۱۸۸۹ء میں طبع ہوئیں۔ آپ کی زندگی سبق آموز زندگی تھی جس کا نقش تاریخ ہے۔ ماہ مئی ۱۸۹۱ء کو آپ اپنی آنے والی نسلوں کے لئے کتابی اور دھرم شالہ کی صورت میں چھوڑ کر اس دنیائے ناپائیدار سے ہمیشہ کے لئے ایسی جگہ چل دئے جہاں سوائے آرام دائمی کے اور کچھ نہیں۔

قدیر لکھنوی

غزل

تری محفل سے ساقی رِندِ مستانے کہاں جائیں
جُدا ہو کر مئے و مینا سے پیمانے کہاں جائیں

سنانے سوز و سازِ غم کے افسانے کہاں جائیں
تمھیں جب شمعِ محفل ہو تو پروانے کہاں جائیں

ابھی تو اہلِ حُسن و عشق ہی تک بات پہنچی ہے
ابھی کیا جانے میرے تیرے افسانے کہاں جائیں

چمن کے پھول ہنستے ہیں بیاباں خار کھاتا ہے
مجھے اب یہ بتا دے تیرے دیوانے کہاں جائیں

خدا رکھے بتوں کو یاد ہیں فن قتل و غارت کے
یہ میرا خون بھی کر دیں تو پہچانے کہاں جائیں

سزا دے یا جزا، جو حشر ہو دنیا میں ہو یا رب
ہم اپنی داستاں محشر میں دُہرانے کہاں جائیں

جنابِ شیخ سے اِتنا خدارا پُوچھ لے کوئی
حرم میں سب کریں سجدے تو بتخانے کہاں جائیں

جنابِ شیخ کے ماتھے پہ مُہرِ پارسائی ہے
جو یہ بالفعل پی بھی لیں تو پہچانے کہاں جائیں

ستمگر تو قیامت تک نہ ہم کو ڈھونڈھ پائیگا
تری محفل سے اُٹھ کر ہم خدا جانے کہاں جائیں

جو دینا ہے ہمیں وہ دینے والا خود بخود دے گا
قدیر اِک اِک کے آگے ہاتھ پھیلانے کہاں جائیں

رضیہ سجاد ظہیر

پنچ

شالی کو دیکھ کر سلطانہ کو لکڑی کے اُن بے ڈھنگے ٹکڑوں کا خیال آجاتا تھا جن کو الگ الگ دیکھو تو آڑے ترچھے اور بے ڈول لیکن ٹھیک سے ملا کر بناؤ تو طرح طرح کی ایسی خوبصورت شکلیں اور تصویریں بن جائیں کہ کیا کہنا۔

اس کے نقشے میں کوئی خاص چیز اچھی نہیں تھی، رنگ بھی گہرا سانولا تھا لیکن پہلے ہی دن جب سلطانہ رکشے سے اُتر کر اپنے دروازے میں داخل ہو رہی تھی اور اس نے باہر کے ایک شاگرد پیشے کی کوٹھڑی کے سامنے شالی کو بیٹھے دیکھا تھا تو اسے یہ احساس ہوا کہ یہ چیز بار بار دیکھنے کے لائق ہے۔ شالی نے بھی سلطانہ کو دیکھا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر نمستے کرنے کے بجائے وہ نظریں اُٹھا کے ذرا مسکرا دی تھی اور پھر سر جھکا کر چمکتی ہوئی پیتل کی تھالی میں چاول بیننے لگی تھی۔ اس کی یہ ادا سلطانہ کو بھا گئی کیونکہ اگرچہ وہ خود امیر متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی لیکن اُسے خیال تھا کہ وہ عوام سے محبت کرتی ہے۔ اور اسی لئے جب وہ کسی غریب محنت کش کو کسی بڑے آدمی کے سامنے ہاتھ جوڑتے دیکھتی یا اسے مائی باپ کہتے سنتی تو اسے نہ صرف اس امیر پر بلکہ اس غریب پر بھی غصہ آنے لگتا۔ جبھی تو اُسے شالی پر پیار آیا!

باہری دروازے سے اپنے کمرے تک آتے آتے سلطانہ کو بہت سی چیزیں یاد آنے لگیں، بچپن میں ہر وقت کی سنی ہوئی باتیں کہ نیچ ذات کی عورتوں کا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا، روٹی کپڑے کے لئے ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا مرد کر لینا ان کے لئے کوئی بات نہیں ہوتی۔ اس کی دادی اماں اور نانی جان اکثر ان لونڈیوں کا ذکر کیا کرتی تھیں جو کال میں خریدی گئیں لیکن روٹیاں جڑنے کے بعد اُن کی آنکھوں پر چربی چھا گئی اور پھر وہ گھر میں سے کسی نہ کسی نوکر کے ساتھ بھاگ گئیں! بھاگ جانا تو ان کے لئے جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ بے غیرت کہیں کی! کم اوقات! یکایک اسے شالی کا خیال آنے لگا۔ نہ جانے وہ کون تھی اور کیسے یہاں کوارٹر میں آئی، نہ جانے اس کا شوہر کہاں ہے ــــ ہے بھی کہ نہیں۔ پھر اسے اپنی بڑی بوڑھیوں پر غصہ آنے لگا۔ آخر وہ لونڈیاں بھاگ نہ جاتیں تو کرتیں بھی کیا... لیکن بھاگ جانا ہے بُری بات... لیکن پھر کیا کرتیں..... ان لوگوں کو لڑنا چاہئے تھا... لیکن کیسے؟ کس سے کیونکر.... کسی سے شادی کر لیتیں ان سے کون شادی کرتا، مگر شادی کئے بغیر تو..... اونہہ... اس نے جلدی جلدی کالج کے کپڑے تبدیل کئے۔ گھڑی نے ابھی پونے چار بجے تھے، بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت تھا۔ اس نے گھڑی اُتاری غسل خانے میں جا کر پانی کا نل کھولا تو پانی ندارد ــ کسی نے باہر نل کھول رکھا تھا جھنجھلا کر اس نے آواز دی "اُفوہ ــــ ارے بھئی نل بند کرو" پانی پھر بھی نہیں آیا۔ بھنا کر اس نے کھڑکی کھولی۔ نل پر شالی کھڑی چاول دھو رہی تھی، کھڑکی کھلنے کی آواز سُن کر مُڑی سلطانہ کو دیکھ کر جیسے اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ فوراً نل بند کیا اور بولی "بی بی جی۔ ہم آج ہی یہاں آئے ہیں، ہم کو خبر نہیں تھی کہ باہر نل کھولنے سے اندر پانی بند ہو جاتا ہے"۔

"کوئی بات نہیں" سلطانہ کا سارا غصہ رفو چکر ہو گیا تھا شالی کی آواز اسے بہت اچھی لگی تھی بات کرنے کا انداز پسند آیا تھا۔ دوسرے ہی دن بڑی کوٹھی میں حکومت کا ایک دفتر کرائے پر آگیا، بیچ کا بڑا ہال دفتر کو ملا۔ اِدھر اُدھر کے کمروں میں اسی دفتر سے متعلق حکام آگئے اور شاگرد پیشے کی تین چار کوٹھڑیوں کے علاوہ سب اردلیوں اور چپڑاسیوں سے بھر گئیں۔

سلطانہ اس شام کو کالج سے آ کر ڈاک دیکھ رہی تھی کہ اُس نے

باہر سے ہنسنے کی آواز سنی ـــ آواز شالی کی سی لگتی تھی۔ اس نے غسل خانے کی کھڑکی دھیرے سے ذرا کھولی۔ اس کی بچی شالی کو دوڑا رہی تھی۔ کئی اردلی چپڑاسی وغیرہ چاروں طرف کھڑے ہنس رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے شالی اپنی کوٹھڑی میں گھس گئی اور اندر چیخ چیخ کر بولی "بس بھئی۔ ہم نے ہار مان لی۔ ہم کو کھانا پکانا ہے۔ اب کل کھیلیں گے" بچی ٹھنکنے لگی "واہ۔ اول ہم نہیں جانتے۔ ہمارا داؤں دو" ـــ شالی نے کواڑ کھولے، ہنستی ہوئی نکلی اور دوسری چال چلی "آؤ آگ جلائیں گے۔ آٹا لو گی چڑیا بنانے کے لئے" بچی وہیں بیٹھ گئی اور شالی نے اوپلے چولھے میں ٹھونس کر پھونکیں مارنا شروع کیا۔ سلطانہ نے کھڑکی بند کر لی۔ اسے شالی کا اس طرح دل کھول کے اس معصومیت سے ہنسنا کھیلنا بہت اچھا لگا تھا لیکن اگر وہ چپڑاسی اور چوکی دار وہاں نہ کھڑے ہوتے تو اچھا ہوتا... مردوں کے بیچ میں اس طرح سے .... لیکن شالی نے تو ان میں سے کسی کی طرف دیکھا تک نہ تھا .. پھر بھی ایک بے غیرتی ہی ہے۔ لیکن بے غیرتی کیوں ہے ... اس نے یکایک نظر اٹھا کر دیکھا تو شالی سامنے کھڑی تھی، سلطانہ کو دیکھ کر ایسا شرمائی کہ سلطانہ بوکھلا گئی۔ کیا یہ وہی شالی تھی جو ابھی ابھی اتنے زور زور سے دوڑ رہی تھی، ایسا ہنس رہی تھی جیسا اس کا سارا وجود پنکھڑیاں بن کے بکھر جائے گا۔ کیا سلطانہ کے سامنے وہ ہنسنا نہیں چاہتی تھی ـــ ایک نظر اس نے سلطانہ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی "بی بی جی ایک دو مرچ چاہئیں۔ اندھیرا ہو گیا ہے دوکان جاتے .... نہیں نہیں ـــ دوکان جانے کی کیا ضرورت ـــ بیٹھ میں ابھی منگائے دیتی ہوں" اس نے خانساماں کو آواز دی۔ شالی بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ اس نے سلطانہ کے سوال کے جواب میں بتایا کہ اس کا شوہر مر چکا ہے اور وہ پاس ہی والی پیلی کوٹھی میں میجر صاحب کے بچے کو کھلانے پر نوکر ہے۔ پھر وہ بچے کے بارے میں بتانے لگی۔ اور بیچ بیچ میں ایک آدھ دفعہ ہنسی بھی۔ ایسا لگتا تھا اسے اس بچے سے بہت پیار ہے۔ خانساماں مرچیں لے کے آیا تو اس نے غور سے شالی کی طرف دیکھا لیکن شالی نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں، مرچیں لیں اور چپ چاپ چلی گئی! جب وہ چلی گئی تو خانساماں بولا۔ بیگم صاحب اس عورت کو گھر میں نہ آنے دیا کیجئے۔

"اُہنہ ـــ جاؤ اپنا کام کرو" سلطانہ نے پھر اپنی ڈاک اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن بوڑھے خانساماں نے برسوں اس گھر میں کام کر کے اپنی جو حیثیت قائم کی تھی وہ اسے آسانی سے چھوڑنے پر طیار نہ تھا۔ بولا یہ اپنے میاں کو چھوڑ کر آئی ہے۔ گھر سے بھاگ کے ـــ اور یہاں رام اوتار سے تعلق ہے۔ ٹھیک نہیں ہے یہ عورت" سلطانہ کو جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا "کون رام اوتار؟ وہ کرایہ داروں کا چوکی دار؟" اور رام اوتار جیسے اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ خاکی وردی پہنے جو اسے سرکار کی طرف سے ملی تھی، ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا اور ٹارچ اور پاؤں میں بڑے بڑے جوتے۔ کبھی کبھی جب اسے رات میں رام اوتار کی کھانسی کی اور بوٹوں کی آواز آتی "اُہنک اُہنک ـــ ہا ـ ہا ـ ہوشیار ـ ہا ـ ہا" تو وہ اسے آواز بھی دے لیا کرتی تھی ـــ "رام اوتار" ـــ

دلدار کے ادھر سے وہ جواب دیتا "گھبرائیے نہیں سرکار۔ ہم جاگ رہے ہیں" وہ اس کا چوکیدار نہیں تھا پھر بھی وہ کتنا اچھا تھا کہ اسے ہمیشہ اس طرح اطمینان دلا دیتا تھا! ـــ پھر یکایک وہ جیسے جاگ پڑی خانساماں کہہ رہا تھا "یہ اپنے میاں کو چھوڑ کر آئی ہے۔ رام اوتار بے چارہ راجپوت ہے اور یہ نیچ ذات کی۔ مگر اس نے اسے کچھ کھلا دیا ہے۔"

"خواہ مخواہ بکواس کرتے ہو" وہ چڑھ گئی "سچ دیکھو نہ جھوٹ بس تم لوگوں کو تو بات کہنے سے مطلب جاؤ یہاں سے! خانساماں مرچ کا ڈبہ لئے بڑبڑاتا ہوا باورچی خانے کی طرف کھسک لیا۔

سلطانہ نے خانساماں کو تو چلے جانے کا حکم دے دیا لیکن اس کے اپنے دماغ میں جو لگاتار خیالات چلے آ رہے تھے ان کو نکل جانے کا حکم دینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اسے یہ بات تسلیم کرنا پڑ رہی تھی کہ خانساماں کی باتوں سے اسے دھکا سا لگا تھا ـــ شالی نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے اپنے شوہر کو چھوڑا، یہاں رام اوتار سے تعلق کئے تھی اور وہ تو جو تھا سو تھا اس نے سلطانہ سے جھوٹ بولا کہ اس کا میاں مر چکا ہے ـــ آخر جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی، اسے سلطانہ پر بھروسہ کرنا چاہئے تھا کہ وہ سمجھ جائے گی.... شاید یہ نیچ ذات کی عورتیں ـــ ارے نہیں نیچ اور اونچ ذات .... اُفوہ ـــ

دوسرے دن شام کو مغرب کے وقت وہ عورتوں کے کسی جلسے

سے لوٹی، اندھیرا تقریباً چھا گیا تھا، دونوں وقت ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے، شالی کی کوٹھڑی سے دھواں نکل رہا تھا لیکن چراغ نہیں جلا تھا، چُولھے کے سامنے آگ کی سُرخ روشنی میں شالی کے روٹی پکاتے ہوئے ہاتھ دکھائی دے رہے تھے۔ سر پر اوڑھی ہوئی پیلی ساری میں سے اس کی ذرا سی ناک بھی دکھائی دے رہی تھی۔ روٹی پکاتے پکاتے وہ بار بار پلّو سے آنسو پونچھتی جاتی تھی، پاس ہی دو تین اینٹیں ایک کے اوپر ایک رکھ کے رام اوتار بیٹھا تھا! اس وقت وہ خاکی وردی کے بجائے سفید دھوتی اور سفید کرتا پہنے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اور سلطانہ کو ایکدم سے خیال ہوا کہ رام اوتار اور شالی کی جوڑی بہت ہی اچھی رہے گی؟ رام اوتار اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور سلام کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ سلطانہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی شالی کے نزدیک آکے کھڑی ہو گئی، ایک منٹ اسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر دھیمے سے بولی شالی — ہمارا خانساماں کہتا ہے تیرا آدمی زندہ ہے — تو تو کہتی تھی وہ مر گیا — اسے پوری امید تھی کہ شالی کہے گی نہیں بی بی جی۔ خانساماں کو کیا پتہ، وہ تو مرچکا پھر وہ اندر جاکے خانساماں کو خوب ڈانٹے گی کہ خواہ مخواہ تم لوگ ایک معصوم پر الزام لگاتے ہو وغیرہ وغیرہ — لیکن شالی نے نظریں اٹھا کر سلطانہ کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولی "میرے لئے وہ مر ہی گیا" — سلطانہ کو جیسے بچھّو نے ڈنک مار دیا۔ اپنے شوہر کے بارے میں ایسی بات! اسے چپ دیکھ کر شالی مسکرائی "وہ سمجھتا تھا روٹی کپڑا دے گا اور حکم چلائے گا۔ ہم کیا کوئی پتریا ہیں کہ روپے پیسے سے کوئی مول لے لے۔ اس جیسے دس کو کھلانے کی ہمّت رکھتے ہیں اور آٹے کے برتن میں پانی لے کر زور زور سے ہاتھ دھونے لگی۔ سلطانہ خاموشی سے اپنے دروازے کی طرف بڑھ گئی لیکن اس کے ذہن میں ایک ہیجان برپا تھا — شالی بڑی ہمت ور تھی جو اس نے ایسا کیا لیکن ہائے اپنے شوہر کے بارے میں کس دل سے اس نے یہ بات کہی، آخر اپنی دو ٹانگوں بغیر تو آگے بڑھا نہیں جا سکتا — شوہر! کتنی پیاری کتنی محبوب چیز! عورت کی دنیا، اس کا سہاگ، یہ نیچ ذات .... اس نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا — پھر اسے نیچ ذات کا خیال آیا؟ وہ اس بات کو اصول کی حیثیت سے مان چکی تھی نہ کہ ہمارے سماج میں شادی قانونی طوائفیت ہے اور کچھ نہیں — لیکن آج جب اس نے اس کا مظاہرہ دیکھا تو کیا ڈر گئی؟ تو کیا اصول اس نے صرف دوسروں کو قائل کرنے کے لئے یاد کئے تھے، ہاں — رٹ لئے تھے؟ لیکن دادی اماں تو کہتی تھیں ... لیکن یہاں تو روٹی کپڑے کو ٹھکرا دینے والا معاملہ تھا .... لیکن شوہر .... لیکن محبّت .... لیکن .... لیکن .... اس نے گھبرا کے خانساماں کو چائے لانے کا حکم دیا — تیسرے دن ہولی تھی، اس کی بچیاں نوکروں کے بچّوں سے رنگ کھیلنے نکل گئیں، خانساماں بازار چلا گیا۔ وہ اکیلی بیٹھی خطوط لکھ رہی تھی کہ پیچھے گیلری میں قدموں کی آہٹ ہوئی چھاگلوں کی رسیلی سنائی دی۔ پھر شالی کا سایہ دروازے میں دکھائی دیا۔ اس نے بڑے بڑے نیلے اور سُرخ پھولوں کی ریشمی ساری پہن رکھی تھی۔ زرد چمکدار ساٹن کا بلاؤز، مُنہ میں پان اور مستی بھی، آنکھوں میں گہرا کاجل اور گھنی بھوؤں کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی سنہری ٹکلی جو رہ رہ کر یوں تڑپتی تھی جیسے سرمئی بادلوں میں کبھی کبھی کوندا لپک جاتا ہے! ہاتھ میں پیتل کی ایک چھوٹی سی تھالی لئے وہ اس طرح سلطانہ کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی جیسے اجنتا کی سانولی شہزادی میں جان پڑ گئی ہو۔ تھالی میں رنگ تھا، طرح طرح کا رنگ ایک میں ملا ہوا اور اس میں ابرک کے ننھے ننھے بے شمار ذرے دمکتے ہوئے! اس نے بغیر کوئی نوٹس دیئے ایک چُٹکی بھری اور گھبرا کے پیچھے ہٹتی ہوئی سلطانہ کے ماتھے پر رنگ مل دیا۔ پھر اس نے تھالی کے دوسری طرف رکھی ہوئی مٹھائی میں سے ایک ڈلی اُٹھائی اور سلطانہ کے مُنہ میں دینے لگی۔ سلطانہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گلے میں جیسے کچھ اٹک گیا، دھیرے سے بولی "شالی میں مٹھائی نہیں کھاؤں گی — میں نے — میں نے — میں ابھی نہیں کھاؤں گی مٹھائی" — شالی جیسے سب کچھ یکلخت سمجھ گئی، — اس نے تھالی زمین پر رکھ دی اور آہستہ سے بولی "بی بی جی — دل تھوڑا نہ کرو۔ بھگوان نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا" — پھر وہ ہنس پڑی — "اور ہم سب آکے آپ کو مٹھائی کھلائیں گے مگر ..." اور اس کی آنکھوں میں محبّت اور شرارت کے ملے جُلے جذبات چمکنے لگے۔ مگر پھر آپ ہمارے ہاتھ سے کیوں کھائیں گی — سلطانہ جھینپ گئی۔ بات ٹالنے کو اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا، چاندی کے دو روپے اس کی ہتھیلی میں دب گئے اور باہر نکلنے ہی والے تھے کہ شالی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "دیکھئے ہم کو کچھ

دیجئے گا نہیں" ـــ جب شالی نے جانے کے لئے پیٹھ موڑی تو سلطانہ آہستہ سے بولی "شالی" ـ شالی مڑی اور رک گئی! سلطانہ نے گلا صاف کیا، اٹکتے ہوئے لہجے میں بولی "شالی ـــ تو ـــ تو اتنی اچھی ہے ..... مگر ... مگر .... تو نے اپنے شوہر کو کیوں چھوڑ دیا؟ شالی نے نظریں نیچی کر لیں اور پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی ـ چاندی کی چمکدار چھاگلوں میں اس کے پاؤں میں لگا ہوا سرخ سرخ مہاور پرچھائیاں بن کے تڑپ لینے لگا ـ دوسرے لمحے اس نے نظریں اٹھائیں، ان میں کچھ مایوسی اور کچھ طنز تھا، دھیمے سے بولی "جانے دیجئے بی بی جی ـــ آپ نہیں سمجھیں گی" ـــ اور باہر چلی گئی! سلطانہ دم بخود رہ گئی! اسے جیسے بجلی کے تار نے چھو لیا تھا ـ شالی کے جاتے ہی خانساماں بازار سے آگیا ـ سلطانہ کھوئی کھوئی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آکر کرسی پر گر سی پڑی! خانساماں گوشت اور سبزی وغیرہ کی سینی وغیرہ زمین پر رکھتا ہوا بولا "بڑے صاحب کا چپڑاسی کہتا تھا، رام اوتار کو نوکری سے جواب ملنے والا ہے"

"ارے ـــ کیوں"؟ وہ اچھل پڑی ـ

"جمعدار اور خانساماں نے شکایت کی ہے کہ یہاں کوارٹروں میں بڑی گڑبڑ رہتی ہے ـ ہم لوگ بال بچے دار لوگ ہیں اور یہ عورت بدمعاش ہے ـ چھوٹے بابو بھی کہتے تھے رام اوتار کی حرکتیں ٹھیک نہیں ہیں ـ کل شام کو ...." ہاں ہاں کل شام کو ہم نے بھی کچھ جھگڑے کی آوازیں سنی تھیں کیا قصہ تھا" ـ اسے یاد آیا کہ کل جھٹ پٹے کے وقت اس نے کچھ شور کی آواز سن کر کھڑکی کھولی تھی تو اندھیرے میں اتنا دکھائی دے سکا تھا کہ پلنگ پر دو تین آدمی بیٹھے زور زور سے اتنی جلدی جلدی باتیں کر رہے تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا ـ رام اوتار کھڑا تھا، اس کے پاس ایک آدمی بائیسکل پر ٹکا ہوا جھکا تھا ـ ایک اور آدمی کوٹ پہنے ہوئے دھمکی دینے کے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا ـــ شالی کہیں نہیں تھی، پھر سلطانہ نے کھڑکی بند کر لی تھی ـ

وہ رام اوتار کی برادری کے لوگ تھے، بیگم صاحب وہ اچھی ذات کا آدمی ہے، ماں باپ نے برادری میں اس کی بات چیت پکی کر دی ہے اور وہ یہاں ..... خانساماں کہتے کہتے رک گیا کیونکہ سلطانہ اس کی بات سن ہی نہیں رہی تھی ـ کھسیا کے بولا "گوشت میں لوکی پڑے گی بیگم صاحبہ؟" ہیں"

سلطانہ جیسے خواب سے چونکی "ہاں"

خانساماں نے سینی اٹھائی اور چپ چاپ کمرے سے نکل گیا! سلطانہ نے ایک نظر اس کو جاتے ہوئے دیکھا، پھر اپنے کاغذ اکٹھے کر ہی رہی تھی کہ دستک ہوئی ـــ اس نے دروازہ کھولا اور رام اوتار کو دیکھ کے ذرا جھجک گئی، پہلے بھی کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ سلطانہ کے خطوط بڑی کوٹھی میں چلے جاتے تھے تو رام اوتار دینے آتا تھا لیکن اس وقت اسے عجیب سا لگا! یہ رام اوتار تھا ـ شالی کا محبوب، شالی جو سلطانہ سے کہہ گئی تھی "آپ نہیں سمجھیں گی" اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر خط لے لیا اور ذرا رک رک کے بولی "رام اوتار" ـــ یہ ـــ یہ تمھاری نوکری کے بارے میں کیا سننے میں آرہا ہے رام اوتار نے نظریں نیچی کر لیں، چپ رہا ـ سلطانہ اس کی اس خاموشی پر دکھی ہو گئی ـ اس کا دل چاہا چیخ چیخ کر رام اوتار سے کہے خدا کے لئے مجھے اپنا دوست سمجھو ـ یہ دیوار جو تمھارے ہمارے بیچ میں کھڑی ہے اسے گرا دو رام اوتار شالی سے کہو مجھے سمجھنے کا موقعہ بھی تو دے ـ مجھ سے اتنی دور نہ ہٹئے ـ تم دونوں شاگرد پیشے میں پیدا ہوئے اور میں کوٹھی میں تو کیا یہ میرا قصور ہے؟ ـــ آنسو پی کر بولی "کیا شالی کی وجہ سے .... کیا کسی نے تمھاری شکایت کی" ـــ رام اوتار نے دھیرے سے بس اتنا ہی کہا ـ کچھ نہیں سرکار ـــ اب آپ سے کیا کہوں" ـــ اور سلام کر کے روانہ ہو گیا ـ جیسے اس کا بھی یہی خیال ہو کہ آپ سے کیا کہوں ـــ آپ نہیں سمجھیں گی" ـ سلطانہ کا خون کھولنے لگا، غصے سے نہیں، ارادے کی شدت سے! اس نے رام اوتار اور شالی کا چیلنج قبول کر لیا تھا! کل وہ بڑے صاحب سے جا کر لڑے گی اور ان کو بتائے گی کہ دو معصوم انسانوں کی محبت میں روڑا اٹکانے کا ان کو کوئی حق نہیں تھا، اگر رام اوتار کی نوکری چھٹی جائے گی تو وہ ان دونوں کو اپنے گھر میں پناہ دے گی، برادری والے بڑے آئے مار پیٹ کرنے والے، دیکھیں گے ـــ کتنی ہی دیر تک وہ بڑے صاحب اور رام اوتار کی برادری والوں سے کہنے کے لئے اچھے اچھے جملے دل ہی دل میں بناتی اور ان کا ریہرسل کرتی رہی ـــ وہ رام اوتار اور شالی پر یہ بات ثابت کر کے رہے گی کہ وہ ان کی دوست ہے، کہ وہ سب کچھ سمجھتی ہے! صبح وہ جلدی تیار ہو گئی اور کالج کے وقت سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے اپنے بڑے دروازے سے باہر نکلی، اسے امید تھی کہ روز

کی طرح شالی اپنی کوٹھڑی کے آگے سپر صاحب کے بچے کو کھلاتی ملے گی کیونکہ وہ اکثر بچے کو اپنے یہاں لے آتی اور اُسے گھنٹوں کھلایا کرتی تھی — اور اسے یہ سوچ کر بڑی پر اسرار سی خوشی بھی ہوئی کہ شالی کو گمان بھی نہ ہوگا کہ وہ اس کی خاطر بڑے صاحب سے لڑنے جا رہی ہے۔ دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی اس نے شالی کی کوٹھڑی کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا دیکھا، نہ وہاں اس کے برتن تھے نہ بستر، نہ اور کوئی سامان، چولھا بجھا ہوا تھا اور طاق میں رکھا ہوا چراغ اوندھا پڑا تھا — وہ سناٹے میں آ گئی! جمعدارن نے جو وہیں اپنی کھاٹ بچھائے اپنی لڑکی کی جوئیں دیکھ رہی تھی اُسے فوراً اطلاع دی" سرکار — شالی بھاگ گئی — سلطانہ کے مُنہ پر جیسے کسی نے تڑاق سے طمانچہ مارا۔ ایک دم سے اس کے مُنہ سے نکلا" اور رام اوتار؟" رام اوتار یہیں گئے"۔ جمعدارن نے ہنس کے کہا" رو رہے ہیں اپنے لکھے کو — ایسے بدمعاشوں کا کیا ٹھکانہ۔ آج ایک کیا، کل دوسرا، پرسوں تیسرا، نیچ کہیں کی" اور اس نے زور سے ایک جُوں ماری جیسے شالی کو دھر کے پیس دیا ہو — سلطانہ کے قدم لڑکھڑانے لگے — اب بڑے صاحب کے پاس جانا بے کار تھا، دھیرے دھیرے چلتی ہوئی صدر پھاٹک کی طرف بڑھی۔ پھاٹک کے پاس اسٹول پر رام اوتار بیٹھا تھا۔ اس نے روز کی طرح سلطانہ کو مسکرا کے سلام نہیں کیا، پہلے پھاٹک آدھا کھلا ہوتا تھا تو دوڑ کے پورا کھول دیتا تھا لیکن آج وہ اسی طرح اسٹول پر بیٹھا رہا۔ گم سُم اکیلا! سلطانہ نے بھی سر جُھکا لیا اور آگے بڑھ گئی۔ دراصل اُسے خود رام اوتار سے شرم آ رہی تھی، وہ بھی تو آخر عورت تھی اور ایک عورت ہی آج رام اوتار کو دغا دے کے بھاگ گئی، البتہ اس نے اتنا ضرور محسوس کیا کہ جمعدار، چپڑاسی، اردلی وغیرہ جو پہلے رام اوتار سے الگ الگ سے رہتے تھے آج اس سے بالکل قریب بیٹھے تھے اور جیسے اُسے بہلانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ سڑک کے ناکے تک پہنچتے پہنچتے سلطانہ کو شالی سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ بے چارہ رام اوتار — تو یہ ٹھیک ہی تھا کہ نیچ ذات ..... اُفوہ پھر اسے نیچ ذات کا خیال آیا — چلتے چلتے رستے میں اسے جتنی عورتیں ملیں سب کے بارے میں وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی کہ کیا یہ بھی نیچ ذات ہیں اور اگر ہیں تو کیا یہ بھی اپنے چاہنے والوں کو دغا دے کر بھاگی ہیں — ناحق اس نے شالی کو اتنا پیار کیا، ناحق اُسے اتنا مُنہ لگایا — سچ مچ کم اوقات نکلی — نیچ — اس نے زور سے زمین پر تھُوکا اور آگے بڑھ گئی — بھلا اتنے دن بعد اور اتنی دُور سے وہ شالی کو کیسے پہچان لیتی — لیکن شک اُسے پہلی ہی نظر میں ہو گیا تھا کہ سر پر امرود کی چھابڑی رکھے پیلی ساری پہنے یہ جو عورت سکندر باغ کے پھاٹک میں مُڑی ہے یہ شالی ہی ہے۔ اس نے اپنے رکشا والے سے کہا کہ اس کا پیچھا کرے، اور برابر سے رکشا نکالے تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ سکے — اپنے بالکل پیچھے رکشے کی کھڑ کھڑاہٹ سُن کر عورت نے مُڑ کر دیکھا اور ایک مرتبہ پھر سرمئی بادلوں میں کوندا سا لپک گیا

سلطانہ نے سوچا تھا کہ اگر وہ شالی نکلی تو اس کی ایسی خبر لے گی کہ وہ یاد کرے۔ چنانچہ اس نے فوراً اس کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا شالی تو بڑی بُری ہے، تو بھاگ کیوں آئی، بے چارہ رام اوتار اتنا رو رہا تھا، سب اس کی ہنسی اڑاتے ہیں، تو نے بہت بُرا کیا شالی۔ سلطانہ کے اس طوفان کا جواب شالی نے صرف ایک جملے سے دیا لیکن وہ نوکری سے الگ تو نہیں ہوا نہ" "نہیں" سلطانہ نے جواب دیا — تو پھر ٹھیک ہے" کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی "۔ مگر شالی ....." سلطانہ حیران رہ گئی۔

شالی نے امرود کی ٹوکری سر سے اُتار کے رکھ دی جیسے اس نے سلطانہ کا چیلنج قبول کر لیا ہو اور غصّے سے بولی" مگر کیا بی بی جی۔ مگر یہ کہ وہ بار بار مجھ سے کہتا تھا کہ تیرے کارن میں نوکری بھی چھوڑنے کو تیار ہوں — مجھ پر احسان دھرتا تھا۔ آپ بتائیے کیا میں نے اس سے کہا تھا میرے کارن نوکری چھوڑ — وہ مجھے پاتا، میں اس کو پاتی۔ اس میں نہ میرا احسان اس پر تھا نہ اس کا مجھ پر — ہونہہ — کیا سمجھتا تھا اپنے آپ کو — عمر بھر طعنے دیتا کہ تیرے کارن میری سرکاری نوکری چھوٹی۔ اس جیسے دس کو کھلانے کی ہمت رکھتے ہیں ہم"۔ کہہ کے اس نے ٹوکری اُٹھا کے سر پر رکھی، ایک پل خاموش رہی پھر دھیرے سے بولی" اس سے میرا ...... اس سے میرا" —

" اچھا" سلطانہ نے کہا" کہہ دوں گی — ضرور کہہ دوں گی" — شالی مُسکرائی جیسے کہتی ہو" ہاں ٹھیک ہے۔ اس بار آپ سمجھ گئیں"۔

بال مکند مشر

گُل کدہ

بسنت ۔ ہندی کویوں کی نظر میں

کوی ور چھبیس ——— برج بھاشا

پر ، سوں نہیں میری بسائے کچھو
پرسوں کے قرار گئے گھر سوں
گھر سوں اُن سوں کچھو بیر بریو
اب یا ہی بچار ہیئے ، ترسوں
ترسوں کب آ وہی وہ پرسوں
کرسوں جب پاؤں پیا پرسوں
پرسوں پر آئی نہیں سجنی !
پرسوں کے بتائے دئے برسوں

اپنے ور (پیا) سے میرا کچھ بس نہیں چلتا
گھر سے تو وہ پرسوں آ جانے کا اقرار کر کے گئے تھے
گھر میں اور اُن میں نہ جانے کیا اَن بَن ہو گئی ہے؟
اسی فکر میں دل گھُلا جا رہا ہے۔
جی اُسی پرسوں کے انتظار میں ترس رہا ہے نہ جانے وہ پرسوں کب آئے گی۔
جب اپنے ہاتھوں سے پیا کے پاؤں چھُو لوں گی
پیاری سکھی! موسم بہار گذرا جا رہا ہے
اور برسوں گذر گئے پر وہ پرسوں آج تک نہیں آئی

جے شنکر پرشاد ——— ہندی

آج اس یووان کے مادھوی کنج میں کوکل بول رہا
مدھو پی کر پاگل ہُوا کرتا پریم پرلاپ
شتھِل ہوا جاتا ہردیہ جیسے اپنے آپ
لاج کے بندھن کھول رہا
بچھل رہی ہے چاندنی چھوی متوالی رات
کہتی کمپت ادھر سے بہکانے کی بات
کون مدھو مدرا گھول رہا

جوانی کے چمن میں آج من کی کوئل کوک رہی ہے
بسنتی شراب کو پی کر من بہک رہا ہے
محبّت سے مدہوش دل بے خود سا ہوا جا رہا ہے
شرم و حیا کے بندھن آج خود بخود کھُلے جا رہے ہیں
چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور رات اپنی خوبصورتی پر خود مست ہے
اور ڈرتے ہوئے ہونٹوں سے وہ کچھ بہکاوے کی بات کہہ رہی ہے
زندگی میں مدہوشی کی یہ مٹھاس چپکے سے کون بھرے جا رہا ہے۔

سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا ——— ہندی

سکھی بسنت آیا!
بھرا ہرش ون کے من
نو اُتکرش چھایا!
کسلیہ وسنا نو وَیہ لتکا
ملی مدھر پریہ اُر ترو پتیکا
مدھوپ ورند بندی

پک شور نیھڑ سمرسایا
تنا مُسکی ہار گندھ بھار بھر
بھی پون مند مند مند تر
جاگی نینوں میں دن
یوون کی مایا
آورت سرسی اُر سریج اُٹھے
کبیر کے کیش کلی سے چھوٹے
سودن شتبہ اپخل
پرتھوی کا لہرایا

اے سکھی ! بسنت آگیا
پی کے من میں نئی امنگیں جھومنے لگیں،
اور نئے جذبات اُبھرنے لگے
سبز ریشمی لباس سے سجی دوشیزہ نرم و نازک بیلوں کو۔
چمن میں لہلہاتے اُن کے ہم شریک درختوں سے محبت کا پیغام ملا ہے
متوالے بھنورے کنول کی محبت میں قیدی ہوگئے
اور کوئل کی رسیلی تان فضائے آسمانی میں پھیل گئی
بیل اور پھول کی خوشبو سے دبی ہوئی
ہوا۔ ہلکے جھونکوں کے ساتھ بڑی مستی سے چل رہی ہے
آنکھوں میں بن سندری کا جادو بھرا۔
حسن و جمال سمایا جارہا ہے
کمل سے بھری تلیا کا من مُسکا اُٹھا ہے
کیسر کے ریشے پھول سے
الگ ہوگئے ہیں
دھرتی کا ہرا بھرا۔
اور سنہری آنچل بسنتی جھونکوں میں لہرا رہا ہے۔

شمبھوناتھ شیش ——————— ہندی

آنکھ اُپ ون میں کھلی ہو
ہونول مدھو ماس چھایا
رُوپ رنجیت کنج کایا
ورشتی مگدھا مادھُوری کے رشیمی جھولے جھلی ہو
رشمیاں نبھ سے اُتر کر
لا رہی ہوں سورگ بھو پر
وشو درشن ہو کلی میں ہر کلی کرنوں ڈھلی ہو
جب میری آنکھیں کھُلیں سامنے پھلواری لہرا رہی ہو
بسنت آچکا ہو
چمن کی کایا روپ میں ڈوبی ہوئی ہو
اور منظر دل فریب جمال کے ریشمی جھولے میں جھول رہی ہو
بسنت کی کرنیں آسمان سے نیچے اُتر کر
دھرتی پر اپنے ساتھ بہشت لا رہی ہوں
کلی میں کل عالم دکھائی پڑے
اور ہر کلی کرنوں سے ڈھل کر نکھر گئی ہو

اعداد و شمار

۱۔ پہلے پنج سالہ پلان کے تحت اب تک پندرہ لاکھ اٹھاون ہزار روپیہ نئے ہوائی اڈے اور ہوائی میدان تیار کرنے پر صرف ہوچکا ہے

۲۔ سال ۵۴-۱۹۵۳ء میں بھارت میں چاول کی پیداوار دو کروڑ اکہتر لاکھ ٹن اور رقبہ زیر کاشت سات کروڑ چھیاسٹھ لاکھ ایکڑ تھا۔ واضح رہے کہ پنجسالہ منصوبے کے تحت ۵۶-۱۹۵۵ء میں اس فصل کی پیداوار دو کروڑ بہتر لاکھ ٹن اور رقبہ زیر کاشت آٹھ کروڑ ایکڑ کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

۳۔ اگست ۱۹۵۴ء میں بھارت میں بجلی پیدا کرنے کے سرکاری انتظام کے تحت بجلی گھروں میں ترسیٹھ کروڑ اٹھائیس لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کی گئی۔ اس کے مقابلے میں اگست ۱۹۵۳ء میں یہ پیداوار ستاون کروڑ بیاسی لاکھ کلوواٹ تھی۔



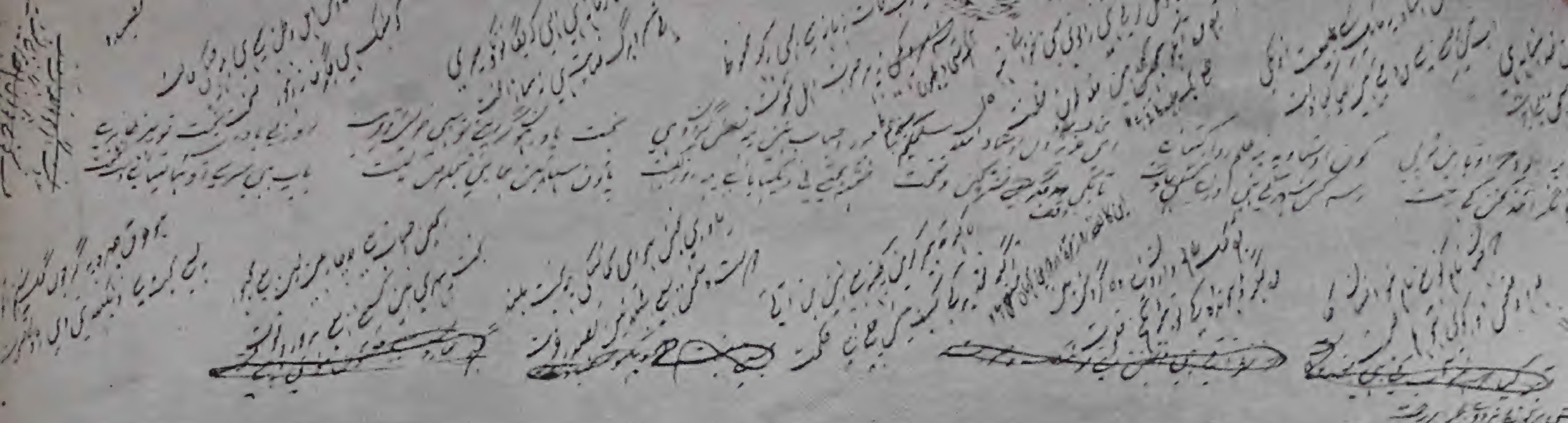
شریمتی وجے لکشمی پنڈت حال ہی میں یوگوسلاویہ
تشریف لے گئی تھیں۔ مارشل ٹیٹو آپ کو
خوش آمدید کہہ رہے ہیں

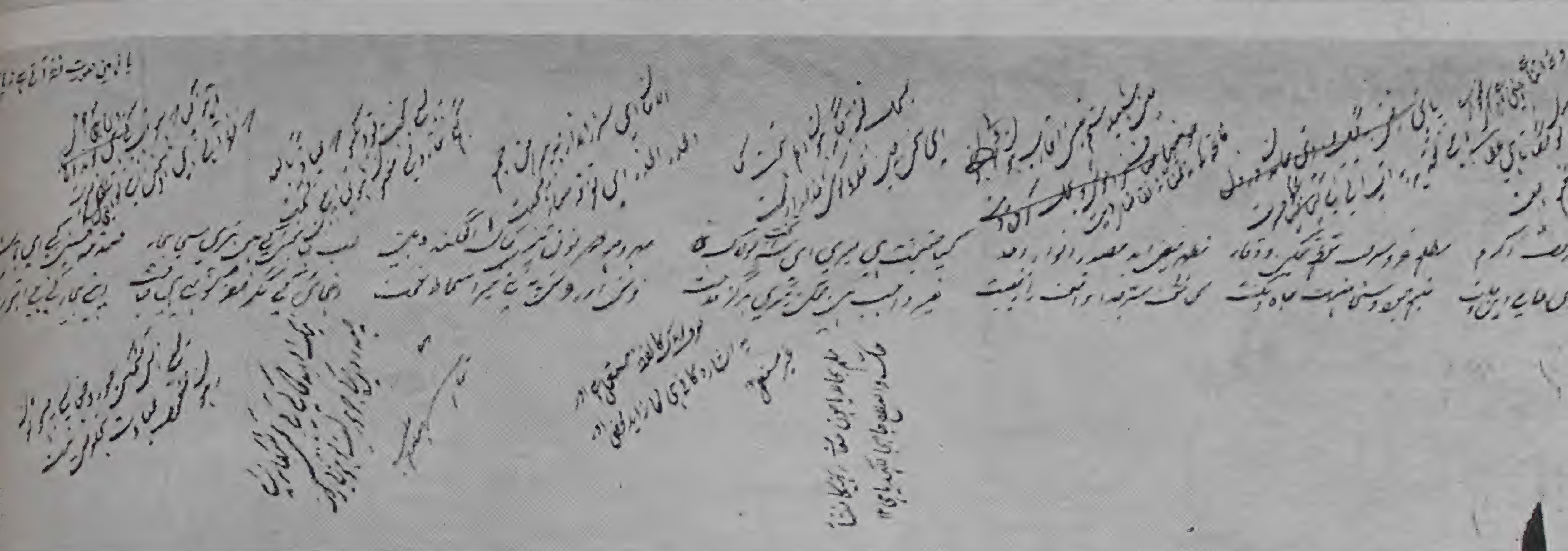


۱۷ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد
مارشل ٹیٹو صدر جمہوریۂ یوگوسلاویہ کا
استقبال فرما رہے ہیں

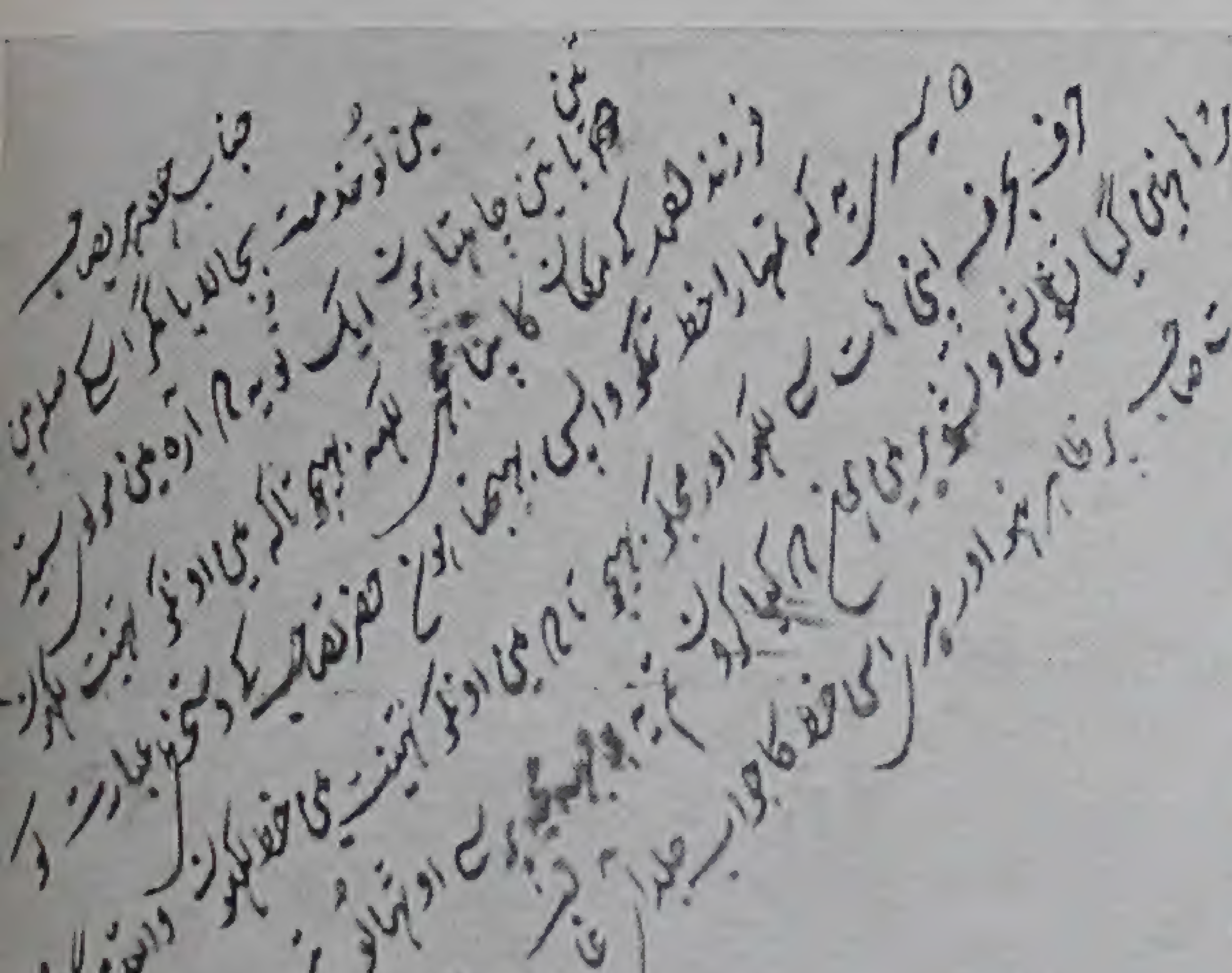
مارشل ٹیٹو ۲۰ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو دہلی یونیورسٹی میں تشریف لے گئے
نیشنل کیڈٹ کور کے طلبا نے آپ کو گارڈ آف آنر پیش کیا





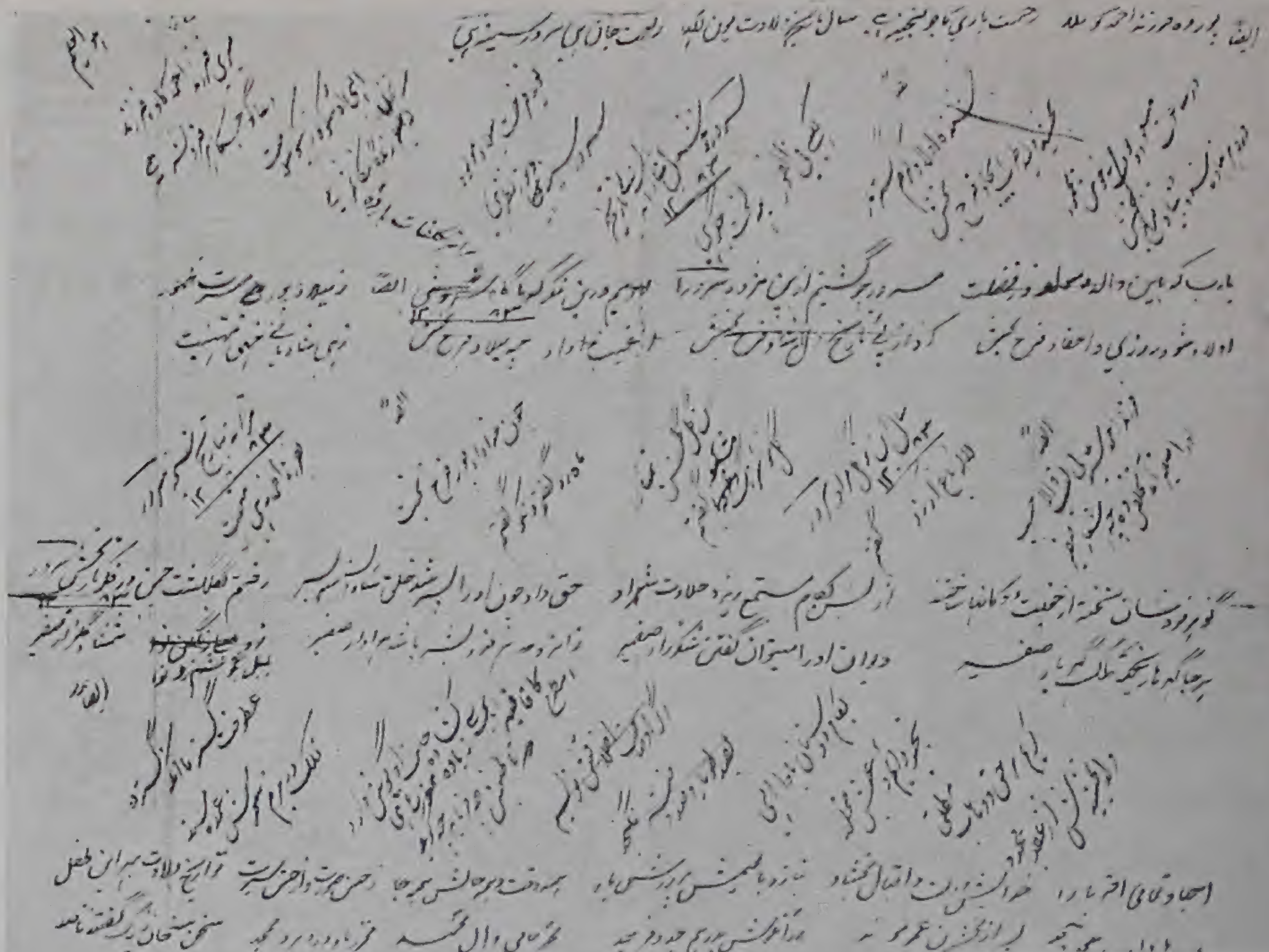


یہ چودھری عبدالغفور کا قصیدہ جس پر غالب کی اصلاحیں خود غالب کے قلم سے موجود ہیں

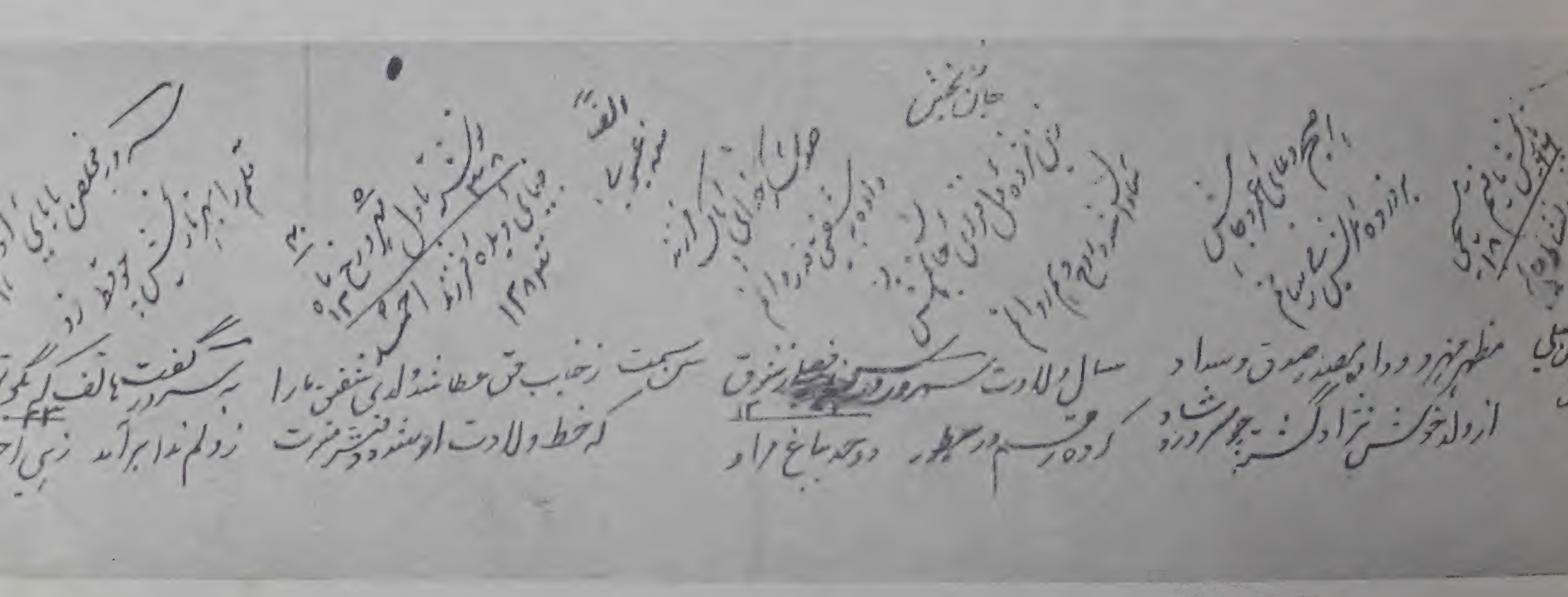




... عبدالغفور ... کے نام



سرور کے قطعات اور اُن پر غالب کی اصلاحیں







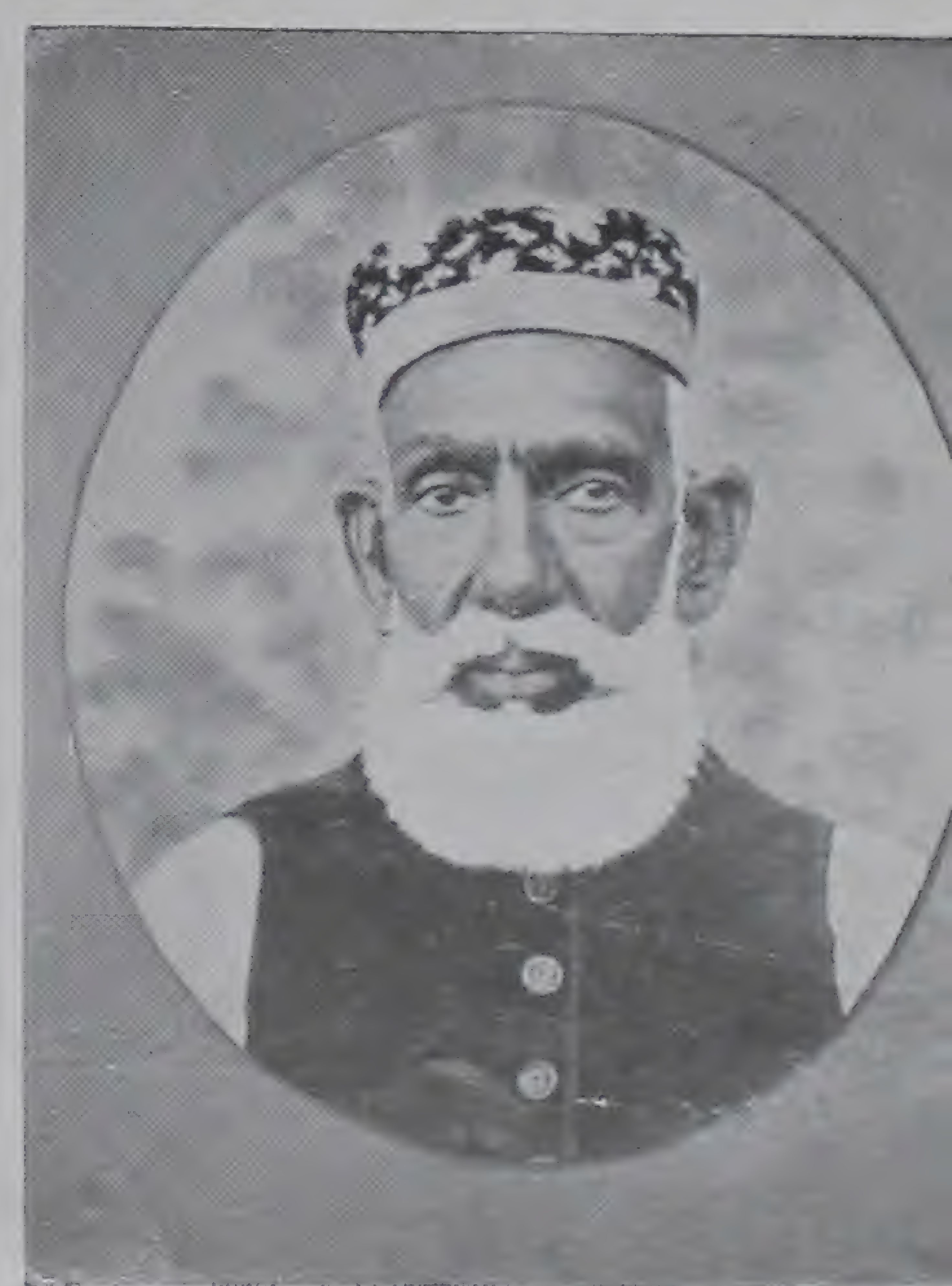
مُعظّم زمانی بیگم عُرف بگّا بیگم

۱۸۵۲ - ۱۹۴۵ء

آپ نواب ضیاء الدّین احمدؐ خاں نیّر رخشاں کی صاجزادی اور میرزا باقر علی خاں کامل رخلف مرزا زین العابدین عارف) کی بیوی تھیں ۱۹۴۵ء میں وفات پائی ۔صندل خانہ مرزا بابر (قطب صاحب) میں دفن ہوئیں۔

اُوپر دائیں طرف :۔ جناب بگّا بیگم کی سب سے بڑی صاجزادی محمدؐ سلطان بیگم عرف جندو بیگم دائیں طرف بیٹھی ہیں۔ یہ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئیں ۔ان کی شادی نیّر رخشاں کے پوتے اور مرزا شہاب الدّین احمدؐ خاں ثاقب کے صاجزادے مرزا شجاع الدّین احمدؐ خاں تاباں مرحوم سے ہوئی تھی، ۱۹۵۴ء میں انتقال فرماگئیں۔

(بائیں طرف) جناب بگّا بیگم کی دوسری صاجزادی رقیہ سلطان بیگم عرف مچھّن بیگم ہیں۔ ان کا سالِ ولادت ۱۸۷۰ء ہے ۔ان کا نکاح کرنل ذوالنور علی احمدؐ مرحوم (آئی ،ایم ،ایس) سے ہُوا تھا۔



بابو ہرگوبند سہائے نشاط شاگرد مرزا غالب (۱۸۲۸ء — ۱۸۹۱ء)

ہربنس سنگھ دوست

ہولی

اندر عورتیں گا رہی تھیں -

چھُپ چھُپ، چھم چھم چلی سانوری

گھیر لیئو گھنشیام . . . . . .

آں ں ں . . . . گھیر لیئو گھنشام

اور باہر جیسے دنیا بھر کے رنگ آ گئے تھے - تمام لوگ ہولی کھیل رہے تھے، اور ایک دوسرے کو بُری طرح رنگ رہے تھے - جب کسی پر رنگ گرتا تو ایک عجیب سا شور چاروں طرف سے اُٹھتا اور کچھ چلا اُٹھتے ---- ہولی ہے "

نوجوانوں کے انگ انگ میں آج مستی بھری پڑی تھی، اور آنکھیں بھنگ پی پی کر سُرخ ہو رہی تھیں - چہرے بھی بالکل اُلو کھے لگ رہے تھے - کسی کا ہرا، کسی کا سفید، کسی کا لال . . . . اور کسی کا بالکل سیاہ - دفعتاً نوجوان ایک سفید پوش بڑھیا کو اندر سے کھینچ لائے - واہ ---- کس ٹھاٹھ سے سفید کپڑے رکھ چھوڑے تھے اب تک اس نے - تمام بے چین تھے کہ پہلی پچکاری کا رنگ بڑھیا کے کپڑوں پر پڑے اور بڑھیا منت سماجت کر رہی تھی کہ نہیں بھائی - نہیں بیٹا گلال، عبیر سے آگے نہ بڑھو - لیکن وہ کس نے کسی کی سنی تھی جو اب سُنتا -

فیصلہ ہوا کہ صرف ایک پچکاری رنگ ڈالا جائے اور بوڑھی ماں کو چھوڑ دیا جائے - لیکن ایک پچکاری کا پڑنا تھا کہ چاروں طرف جیسے رنگوں کا طوفان آ گیا - بڑھیا کے کپڑے رنگ برنگے ہو گئے، اور بڑھیا کانپتی، بڑبڑاتی اندر عورتوں میں چلی گئی - نئے نئے رنگوں کا امتزاج بڑا اچھا لگ رہا تھا -

اندر عورتیں گا رہی تھیں -

ہاں دھر لینی، اچانک دوڑی . . . .

باہر قہقہے پر قہقہہ چھوٹتا تھا - عورتیں اور مرد آج گھل مل سے گئے تھے دو چار عورتیں جو باہر تھیں، ہر طرح مردوں کا ہاتھ بٹا رہی تھیں -

رامو اندر اُداس بیٹھا تھا، اور اپنے پاؤں کی ان انگلیوں کو دیکھ رہا تھا، جن میں کوڑھ اچھی طرح پھُوٹ چکا تھا - کوڑھ آج کوئی نیا نہیں تھا - قریب قریب سال پورا ہو گیا تھا اسے ظاہر ہوئے، لیکن آج جتنا اُسے احساس ہو رہا تھا کبھی نہیں ہوا تھا - وہ نظریں نیچی جھکائے، خاموش آزردہ سا سوچ رہا تھا -

پچھلے برس وہ بھی ہولی میں شریک تھا، اور ان دوسرے نوجوانوں کی طرح پھُولا نہ سمایا تھا - چاروں طرف رنگ ہی رنگ دکھائی دیتے تھے - اور رنگوں میں کس قدر مسرت اور شوخی نہاں تھی، آج تو جیسے ہر رنگ پھیکا تھا یا بالکل خراب، گدلا . . . . .

اُس نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا - واقعی اسے یُوں ہی لگ رہا تھا . . . . کسی رنگ میں بھی تو جان نہیں تھی اور لوگوں کی ہنسی بھی کتنی پھیکی پھیکی لگ رہی تھی جیسے ہنسنے پر مجبور ہوں - کھوکھلے ہوں . . . .

وہ اپنی انگلیوں کی پوروں کو دیکھنے لگا - جو بالکل سُرخ ہو رہی تھیں، اور سوزش سے پُر تھیں - ناخنوں کے چاروں طرف نیلاہٹ اور ایک عجیب سی کھجلی سی ہو رہی تھی -

. . . . پچھلے برس انھیں ہاتھوں سے اس نے آشا کے مُنہ پر عبیر ملا تھا گلال ملا تھا وہ شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی اور اس بل کھا رہی تھی جیسے ہاتھوں میں سے نکل جانا چاہتی ہو - اور آخر اس نے کہا تھا، بس بھی کرو، اب کیا ملے ہی جاؤ گے -

اور آج تو وہ صبح سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہولی کھیل رہی تھی - چہرہ گلال سے بالکل سُرخ ہو رہا تھا، اور آنکھوں کی نیلاہٹ یوں معلوم پڑتی تھی جیسے کسی پچکاری کا نیلا رنگ اندر جا بسا ہو - کتنی خوبصورت لگ رہی تھی وہ . . . لیکن کیا خوبصورت لگتی ہے - رامو نے خیال کیا - بالکل بندریا تو معلوم پڑتی ہے . . . . کاش! وہ اس کے پاس جا سکتا - اس کے ساتھ ہولی کھیل سکتا -

. . . . پچھلے برس جب وہ دونوں بہت دیر تک بھنگ پیتے رہے تھے

تو واقعی نشے میں آ گئے تھے۔ وہ اُسے بولا تھا۔

آشا — جی چاہتا ہے یہ ہولی کبھی ختم نہ ہو۔ یہ نشہ کبھی نہ اترے۔ ہم بھنگ کے نشے میں یوں ہی باتیں کرتے رہیں ...؟

آشا نشے میں تھی، اسی لئے تو اس نے راموکی ران پر ہاتھ مارا اور مسکرا کر بولی تھی۔

"تو تم کیا سوچتے ہو — یہ رنگ ختم ہو جائے گا"۔

"تو اور کیا رہ جائے گا" رامو نے نشے میں کہا تھا۔

"ذرا غور سے دیکھو" یہ کہہ کر اس نے پھر راموکی ران پر ہاتھ مارا تھا اور ران پر کی دھوتی کو ہاتھ میں پکڑ کر بولی تھی — "یہ رنگ نہیں اترے گا رامو — بالکل پکا رنگ ہے"۔

اور راموران پر پڑے ہوئے سیاہ رنگ کو دیکھنے لگا تھا، اور ہنس پڑا تھا ...؟

اس نے کھڑکی کھولی۔ آشا شیاموکے منہ پر عبیر مل رہی تھی۔ شیامو کے ہاتھ میں بھی عبیر تھا۔ راموکا دل بیٹھنے لگا۔ پچھلے برس کی ہولی اس کی آنکھوں کے سامنے تھی اور وہ دونوں برسوں کا موازنہ کرکے دیکھ رہا تھا کہ کتنی بڑی تبدیلی آ گئی ہے ..... آشا شیاموکے عبیر مل چکی تو شیامو نے اپنا ہاتھ اٹھایا لیکن آشا اُچھلی اور یہ جا وہ جا — اندر عورتوں میں جا شامل ہوئی۔ اندر گیت گایا جا رہا تھا۔

.... او چھوڑ تو دو میری بئیاں

راموسوچ رہا تھا۔ کاش! وہ ٹھیک ہو سکتا۔ اُسے تندرستی نصیب ہوتی۔ گاؤں کے لوگ اس کے قریب آتے ہوئے بار بار تھوکتے نہ لیکن یہ اتنی جلدی بھلا کیوں کر ممکن ہو سکتا تھا۔ نو دس ماہ ہو گئے تھے اُسے جا بجا علاج کراتے۔ لیکن ابھی تک کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا اب پاس کے شہر کے ایک ڈاکٹر کی دوا کھا رہا تھا۔ اس سے بیماری بڑھنا بند ہو گئی تھی۔ اور یہی کیا کم بات تھی۔ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو یقیناً وہ ایک ماہ بعد اس کے سارے جسم پر پٹیاں سی پٹیاں دکھائی دیتیں۔

یہ خیال آتے ہی اُسے کچھ تسلی ہوئی کیونکہ اگر ڈاکٹر کی دوا سے بیماری کی ترقی رک سکتی ہے تو ڈاکٹر کی دوا اسے ختم بھی کر سکتی ہے اور ڈاکٹر نے اُسے کہا بھی تو تھا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ دی ہوئی حیاتین کی گولیاں کھاتے جاؤ، اور دن میں دو بار دئے ہوئے صابن سے دھو کر دوا لگا لیا کرو اور ہفتے کے بعد آ کر انجکشن لگوا جایا کرو تو کوئی عجب نہیں کہ دو ہی تین ماہ میں دوسرے لوگوں کی طرح کے ہو جاؤ۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اچھا ہو رہا ہے۔

وہ سوچنے لگا آشا کس قدر پیاری لڑکی ہے۔ کس قدر معصوم اور خوبصورت لیکن اب تو جب سے بیماری چھوٹی ہے کبھی اچھی طرح نہیں بولی۔ دو چار بار اگر بولی بھی ہے تو دُور ہی سے، کہ کہئے کچھ آرام ہے پہلے سے؟

لیکن اس نے بھی تو کبھی اُسے بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔ جب بھی وہ سامنے آئی، اپنے زخموں کو چھپاتا ہوا اندر آ گیا.... آخر اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔ اُسے موقع تو ملنا چاہئے ورنہ وہ کس طرح بات کر پائے گی بھلا ... لیکن کیا اُسے اور کوئی نہیں ملتا جو وہ ایک کوڑھی سے پیار کرے گی، آخر اس کا بھی تو دل ہے۔ اس کی بھی تو کوئی پسند ہے۔ پیار کوئی کھیل تو ہے نہیں کہ جس کے ساتھ چاہا کھیل لیا ...

وہ پریشان سا ہو گیا۔ ماتھے پر جیسے پسینہ آ گیا۔ اس نے قمیض کے دامن سے ماتھا پونچھا لیکن پسینہ کہاں — پسینہ آئے تو نو دس ماہ بلکہ سال گزر گیا تھا .... لیکن ان دنوں وہ اس بات پر پورا یقین لا رہا تھا کہ پیار صورت و شکل یا جسم سے نہیں، بلکہ دل و روح سے ہوتا ہے۔

اسے ایک دفعہ کا واقعہ یاد آنے لگا۔ اس نے آشا کو کہا تھا۔ آشا! اگر تیری شادی مرے ساتھ ہو تو تم خوش ہو گی یا ناخوش،

اور وہ شرما گئی تھی۔ لیکن وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔

"لیکن فرض کرو کہ میں کانا یا اندھا ہو جاؤں —" اس نے پوچھا تھا

"چپ رہو جی ..." آشا نے اس کے منہ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

پھر اُسے یاد آیا کہ اس "چپ رہو جی ..." میں ایک ہلکی سی چیخ بھی شامل تھی، اور پھر دیر تک پیار اور محبت کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ وہ دیر تک ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے باتیں کرتے رہے تھے اور چاروں طرف جیسے فضا معطر تھی — عجیب دن تھے وہ بھی ....

واقعی کتنی عجیب بات تھی کہ وہی آشا جو پہلے اتنے بڑے بڑے وعدے کیا کرتی تھی اور ہر وعدے میں یقین دلاتی تھی کہ وہ راموکو پیار کرتی ہے اور کرتی رہے گی، آج اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ اور اس پر اس کی نظر پڑ

بھی جاتی تھی تو عجیب طنزیہ سی مسکراہٹ بکھیرتی آگے بڑھ جاتی تھی ۔
وہ من ہی من میں بل کھانے لگا ۔
وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا ۔ اس کے کپڑے ابھی تک سفید تھے۔ باہر نوجوانوں اور عورتوں نے پچکاریاں کس لیں اور مطلع کرتے ہوئے چلائے "ہوشیار رامو، ہوشیار"۔
اور اس نے دیکھا کہ آشا بھی ایک ہاتھ میں پچکاری لئے کھڑی ہے اسے کچھ تسکین سی ہوئی، اور ایک لمحے کے لیئے آشا کے متعلق بالکل صاف ہو گیا ۔ جیسے اُسے اُس سے کوئی شکوہ نہ ہو، کوئی شکایت نہ ہو ۔
لیکن رنگوں سے اس کے کپڑے بھیگ جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ آشا شرمائی سی اندر چلی گئی ۔ باقی بھی اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے ۔ کچھ ایک طرف جا کر بیٹھ گئے، کچھ ویسے ہی گنگنانے لگے ۔ اندر عورتیں گا رہی تھیں ۔
"اُوئی میں بھیگ گئی، مو ہے نہ مارو پچکار"،
وہ باہر کے دروازے کی دہلیز پر بیٹھ گیا ۔
اسے ماضی کو یاد کر کے اپنی قسمت پر اور قسمت سے زیادہ آشا پر غصہ آ رہا تھا ۔ اس کے دماغ میں ایک طوفان آشا کے خلاف طیار ہو رہا تھا ۔ وہ بار بار اپنے آپ کو کسی دوسری طرف منہمک کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ طوفان گھٹنے کا نام نہیں لیتا تھا، اور بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا ۔ عورت ذات بھی کس قدر کم ذات ہوتی ہے ۔ جب تک صحت ہے، خوبصورتی ہے محبت کا دم بھرتی رہی اور جیسے ہی ذرا سی خامی پیدا ہوئی کنارہ کش ہو گئی ۔
کون کہتا ہے محبت دل سے ہوتی ہے ۔ محبت تو ایک سودا ہے ۔ جس طرح بازار میں ہم سودا دیکھ کر کرتے ہیں ۔ چیز کو ہر طرح خوبصورت، پائیدار اور موزوں پاتے ہیں ۔ تب خریدتے ہیں، اسی طرح محبت بھی تو ایسی ہی ایک چیز ہے ۔ اگر محبت خوبصورتی، صحت اور چال ڈھال نہیں دیکھتی تو کیوں نہیں ہمیں کسی پتھر سے محبت ہو جاتی ۔ کیوں نہیں ہمیں کسی بھک منگی یا کوڑھی عورت سے محبت ہو جاتی ۔
کوڑھی عورت کا خیال آتے ہی وہ کانپ اُٹھا ۔ اس کا رنگ بالکل زرد سا ہو گیا ۔ آنکھیں پہلے سے کچھ گہری معلوم ہونے لگیں ۔ قسمت نے اُسے کہیں کا بھی نہ رکھا تھا ۔ ایسی خطرناک بیماری اُسے لگی تھی کہ تمام

اس سے نفرت کرنے لگے تھے ۔ اور جب سبھی اس سے نفرت کرتے تھے تو پھر آشا سے کس طرح محبت کی امید رکھی جا سکتی تھی ۔
منگو تیلی کے یہاں کام کرنے والی اس کے لئے بھنگ کے شربت کا ایک گلاس لے آئی ۔ گلاس کانچ کا تھا ۔
اس کا دل جل گیا ۔ تمام لوگوں کو کانسے کے گلاس اور اس کے لئے کانچ کا گلاس ۔ پہلے تو اس کا دل چاہا کہ وہ گلاس واپس کر دے لیکن نہ جانے کیوں وہ انکار نہ کر سکا ۔ اس نے آہستہ سے گلاس اُٹھایا اور اپنے ہونٹوں سے لگا لیا ۔
ایک ہی سانس میں ساری بھنگ پی جانے کے بعد اُسے منگو تیلی کی نوکرانی کے ہاتھ میں گلاس پکڑا دیا ۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کانچ کے گلاس میں بھنگ کا شربت نہیں پیا ۔ شارع عام چپت کھائی ہے ۔
وہ پریشان ہو اٹھا
غصّے میں پھر اضافہ ہوا اور وہ دوبارہ انجانے طور پر آشا ہی کے پاس چلا گیا ۔ دل ہی دل میں اسے عجیب عجیب طرح کوسنے لگا ۔ ہرجائی کہیں کی !
اُسے اس بات کا رتی بھر بھی احساس نہیں تھا کہ زیادتی کر رہا ہے ۔ ایسا معلوم پڑتا تھا کہ اگر آشا ابھی اس کے پاس آ جائے تو یہ اُسے گالیاں دینے لگے گا اور ممکن ہے دو چار ہاتھ بھی جما دے ۔
دو بج رہے تھے اور ہولی کی دھوم دھام اب قدرے کم ہو گئی تھی عورتیں سب اندر تھیں اور گانے میں مصروف تھیں ۔ مرد آہستہ آہستہ سب چوپال پر جا بیٹھے تھے ۔
رامو کے غصے میں کچھ بھی کمی نہیں ہوئی تھی ۔ اور وہ بیٹھا عجیب سی باتیں سوچ رہا تھا ۔
اچانک آشا اپنے گھر سے باہر نکلی ۔
اس کا دل چاہا اُسے بلائے اور پھر کھری کھری سنائے ۔
آشا نے گلی میں چاروں طرف دیکھا ۔ کوئی بھی تو نہیں تھا ۔ اور پھر رامو کو دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی، اور واپس اندر چلی گئی ۔
رامو کو جیسے آگ لگ گئی ۔ اس قدر نفرت کہ سامنے کھڑی بھی نہیں

ہو سکتی - سال بھر پہلے ہی دنیا بھر کے وعدے کرتی تھی اور اپنی محبت اور جذبے کا ثبوت دیتی تھی، اور آج وہ سامنے کھڑی نہیں ہو سکتی تھی -

وہ سوچنے لگا کہ جب وہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق دو تین ماہ کے بعد ٹھیک ہو جائے گا تو آشا سے بات نہیں کرے گا اور اگر اس نے ابتدا کی تو وہ اُسے کھری کھری سنائے گا -

اِس سے اُس کے غصے کو اور ہوا ملی، اور آشا سے انتقام لینے کے لئے عجیب و غریب پلان بنانے لگا -

یکایک اس نے مُڑ کر دیکھا تو آشا اس کے پاس سے گزر رہی تھی - اس کا دل چاہا کہ بہ ڈانٹ کر آشا کو بُلائے لیکن مُنہ میں جیسے زبان نہ تھی - ایک لفظ بھی نہ نکلا -

آشا نے جیسے اس کی آنکھوں میں سے کچھ پڑھا اور اس کے پاس آگئی اور پھر اُس کے چہرے کی طرف لپکی اور مٹھی میں چھپایا ہوا گلال اس کے چہرے پر مل دیا - جو اب تک بے رنگ تھا -

رامو کا سارا غصہ جیسے ہوا ہو گیا - وہ چلّایا " مجھ سے دور رہو آشا مجھ سے دور رہو "

لیکن گلال ملا جا چکا تھا - آشا نے تباہ سے میں گلال لگوانے کے لئے دوسری مُٹھی کا گلال اس کے ہاتھ پر ڈال دیا اور انتظار کرنے لگی -

" نہیں نہیں آشا ...." رامو صرف نہ نہ کہے جا رہا تھا -

آشا نے خود اس کا ہاتھ اپنے چہرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا " چھی چھی - اتنا بھرم کرتے ہو - اگر مجھے ہو جاتا تو کیا ہاتھ نہ لگاتے "

اور گلال کا رنگ چہرے پر چڑھنے لگا -

اندر عورتیں گا رہی تھیں

سمجھ سنیاں آئے نہ

کہ گلال ملے یا تو گال ....

آں ں ں گلال ملے یا تو گال

ڈاکٹر ایس - ایس پوریوال

قومی زندگی میں سبزیوں کی اہمیت

موجودہ زمانے کی انسانی خوراک میں سبزیوں کی شمولیت از بس لازمی ہے کیونکہ ساگ پات حیاتین، معدنی عناصر، نمک اور خام ریشے مہیا کرنے کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں - اس کے علاوہ عمدہ اور اچھی طرح پکائی ہوئی سبزیاں خوراک کے ذائقے، رنگ اور خوشبو میں اضافے کا باعث بنتی ہیں اور کھانے کی رغبت بڑھاتی ہیں جسم انسانی کے لئے ضروری تیزابی مادے کی موجودگی کی وجہ سے سبزیاں نہ صرف بہت لذیذ ہوتی ہیں بلکہ وہ جسم کے اندرونی عمل میں بھی معاون بنتی ہیں -

حیاتین - انسانی جسم کی نشوونما، صحت اور افعال کے لئے حیاتین بہت ضروری ہیں - حیاتین الف سردی، زکام، انفلوئنزا، امراض سوزشِ چشم اور شب کوری یا پائیریا اور دیگر بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں - گاجر، پالک، شلغم، کرم کلہ، پودینہ، کوتھمیر، چولائی، ٹماٹر، کاہو اور شکر قندی جسم کو حیاتین الف مہیا کرتے ہیں - آدھ پاؤ سبز پتوں والی سبزیاں کھانے سے ایک بالغ انسان کے لئے درکار حیاتین الف جسم کو بآسانی حاصل ہو جاتے ہیں -

حیاتین ب - لوگوں کی صحت مندی، افعالِ ہاضمہ کی درستگی اور استسقا کی قسم کی بیماریوں سے بچاؤ کے لئے بے حد مفید ہوتے ہیں - یہ حیاتین سبزیوں میں کم مقدار میں پائے جاتے ہیں لیکن سیم اور لوبیا کی پھلیوں، شکر قندی، سبز مٹر، خشک اور ہرے پیاز، کرم کلہ اور ٹماٹر میں یہ حیاتین کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں اور سالم دالوں اور گری دار اشیاء خاص کر مونگ پھلی میں یہ حیاتین سب سے زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں -

حیاتین ج - فسادِ خون اور خارش کی بیماریوں سے بچاتے ہیں، خون اور خون کی نالیوں نیز جوڑوں کو درست حالت میں رکھتے ہیں - یہ حیاتین پالک، کرم، کرم کلہ، آبی سلاد، ٹماٹر اور پھول گوبھی میں بکثرت ملتے ہیں - آملہ میں حیاتین ج بہت زیادہ موجود ہوتے ہیں - ایک آملہ میں اتنے حیاتین ج ہوتے ہیں جتنے دو سنگتروں میں ہو سکتے ہیں -

معدنی عناصر - ہڈیوں اور دانتوں کی ساخت میں خون اور جسمانی نالی کی بناوٹ اور جسم کے نظام کے افعال میں معدنی عناصر اور نمک استعمال ہوتے ہیں - پھلوں اور سبزیوں میں اور معدنی عناصر اور نمک بہتات سے موجود ہوتے ہیں - چولائی، میتھی اور پالک وغیرہ کے ساگ اور پتے دار سبزیوں میں کیلسیم بکثرت ہوتا ہے - گاجر، پیاز، ٹماٹر میں لوہا شامل ہوتا ہے

جے شنکر پرشاد

اپنا وقار

جے شنکر پرشاد ہندی کے ایک مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ آپ کاشی کے ایک مشہور تجارتی خاندان میں پیدا ہوئے اور گھر ہی پر ہندی، اردو، فارسی، سنسکرت کی تعلیم حاصل کی۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور سنسکرت زبان کے دلدادہ تھے۔ آپ کا نقطۂ نظر ادب کی دو خاص صنفوں "تمثیل نگاری اور شاعری" پر مرکوز تھا۔ چنانچہ اس میں کمال حاصل کیا۔ آپ کے ڈراموں میں چندر گپت، راج شری اسکندر گپت، تشکھا، جنمیجے کا ناگ یگیہ، کامنا، ایک گھونٹ بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ آپ نئے دور کی ہندی شاعری کے موجد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ کی نظموں کے بھی مختلف مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً لہر، جھرنا، آنسو اور کرنا کانن وغیرہ —— آپ کی کامائنی نظم پر آپ کو ایک انعام بھی ملا تھا۔ آپ کے ناولوں میں کنکال اور تتلی بہت مشہور ہیں —— زیر نظر مضمون آپ کے ایک ہندی ڈرامے کا اردو قالب ہے جو چندر گپت ناٹک سے لیا گیا ہے۔ (کلیم اللہ فاروقی کلیم مترجم)

(۱)

مقام:- تکشلا کے گوروکل کا مٹھ

اشخاص:- چاڑک اور سنگھ ہرن

چاڑک:- (سنگھ ہرن سے) عالی ہمت! اب متعینہ وقت پورا ہو چکا ہے۔ اور ناظم اعلیٰ نے مجھے گھریلو زندگی میں داخل ہونے کی اجازت دے دی ہے۔ اب تک مجھے محض تمہیں لوگوں کو علم اقتصادیات کا درس دینے کے لئے ٹھہرایا تھا کیونکہ سالِ رواں کے تمام ہونے والے گریجوئیٹوں کو اقتصادیات کا درس دے کر مجھ حقیر کو گورو دکھشنا کے فرض سے سبکدوش ہو جانا ہے۔

سنگھ ہرن:- صاحب جاہ و جلال! مالووں کو علم اقتصادیات کی اتنی ضرورت نہیں جتنی علم حرب کی۔ یہی سبب ہے کہ میں ہمیشہ اپنے ہم سبقوں سے پیچھے رہا۔ لہٰذا معافی کا خواستگار ہوں۔

چاڑک:- اچھا! تم اب مالوہ جا کر کیا کرو گے؟

سنگھ ہرن:- مجھے تو تکشلا کی سیاسیات پر نظر رکھنے کا حکم ملا ہے۔ فی الحال مالوہ جانے کا کوئی عزم نہیں ہے۔

چاڑک:- مجھے خوشی ہے کہ علم اقتصادیات کی تعلیم تمہارے لئے سود مند ہوگی۔ کیا تم جانتے ہو کہ یونانوں (یونانیوں اور مسلمانوں) کے سفیر یہاں کیوں آئے ہیں،

سنگھ:- میں خود اس بات کا پتہ لگانے کی فکر میں ہوں۔ آریہ ورت کا مستقبل لکھنے کے لئے بغاوت اور سازش کا قلم اور سیاہی تیار ہو رہی ہے۔ اور شمالی راستے کی ریاستیں آپس کی منافرت اور خانہ جنگی سے کمزور اور مضمحل ہو چکی ہیں۔ جلد ہی خطرناک وشفوٹ[1] ہوگا!

(یکایک آمبھیک اور الکا داخل ہوتے ہیں)

آمبھیک:- وسفوٹ؟؟ کیسا وسفوٹ؟ اور تم کون ہو جوان؟

سنگھ:- ایک مالو (مالوہ کا رہنے والا)

آمبھیک:- صرف نام کی ضرورت نہیں، خاص تعارف کی ضرورت ہے۔

سنگھ:- تکشلا گوروکل کا ایک متعلم۔

آمبھیک:- میں دیکھ رہا ہوں کہ تم شریر بھی ہو!

سنگھ:- کبھی نہیں شہزادے! عاجزی کے ساتھ نڈر ہونا مالووں کا خاندانی وقار ہے اور مجھے تکشلا کی تعلیم کا بھی غرور ہے۔

آمبھیک:- لیکن ابھی تم تو کسی وسفوٹ کی باتیں کر رہے تھے! اور چاڑک! تمہارا بھی اس میں کچھ ہاتھ ہے؟

(چاڑک خاموش رہتا ہے)

آمبھیک:- (غصے میں) برہمن! تیری یہ مجال! میری حکومت میں رہ کر اور میرے غلے سے

---

[1] کسی چیز کا زور سے پھٹنا

پرورش پانے کے باوجود میرے ہی خلاف بغاوت کی سازشیں!

چاڑک:۔ شاہزادے! برہمن نہ تو کسی کی قلمرو میں رہتا ہے اور نہ کسی کے غلّے سے پرورش پاتا ہے۔ برہمن تو اپنی ہی حکومت میں گھومتا پھرتا اور آبِ حیات ہو کر زندۂ جاوید رہتا ہے۔ یہ تمہارا جھوٹا غرور ہے۔ برہمن اپنی تمام طاقتوں کے باوجود بھی اپنی ہی خواہش سے ان مٹی کے مانند اوہام کو ٹھکرا دیتا ہے اور خلق کی بھلائی کے لئے اپنے علم کی خیرات کرتا ہے۔

آمبھیک:۔ یہ فرضی بڑائی محض دھوکے کا جال ہے۔ کھلے طریقوں سے ذلیل کاموں پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔

چاڑک:۔ لیکن وہ کیسے ہوگا؟ یقین نہ لانے والے چھتری! یہی سبب ہے کہ ڈاکو اور دوسرے فرقے کے لوگ اپنی اپنی سلطنت کا سنگِ بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اور آریہ قوم زوال کے کنارے پر کھڑی ہوئی صرف ایک دھکّے کی منتظر ہے۔ اور تم دھکّا دینے کی سازشیں طلباء کو سکھا رہے ہو؟

سنگھ:۔ طلباء اور سازش؟ یہ تو غیر ممکن ہے۔ یہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں کچھ حقوق ہوں۔ جن کی خواہشات سمندر سے بھی بڑی اور کوہ شمیر سے بھی بلند ہوں۔ جو یونوں کی دوستی کے لئے خود والہیک تک ....

آمبھیک:۔ بس بس! شریر نوجوان! بتا تیرا مقصد کیا ہے؟

سنگھ:۔ کچھ بھی نہیں!

آمبھیک:۔ نہیں مجھے بتانا بھی ہوگا، یہ میرا حکم ہے!

سنگھ:۔ گورو کل میں صرف ناظمِ اعلیٰ ہی کا حکم سر آنکھوں پر رکھا جاتا ہے، اور ان کے علاوہ دوسروں کا حکم نافرمانی کے کان سے سُنا جاتا ہے شہزادے!

السکا:۔ میرے بھائی! جنگل میں جھرنے والے صاف و شفاف آبشار کے مانند اس کے دل میں دیکھو کتنی روانی ہے؟ یہ نافرمانی بھی لائقِ محبّت ہے، خیر! جانے بھی دو!

آمبھیک:۔ خاموش رہو السکا! یہ کوئی ایسی باتیں نہیں ہیں جو یوں ہی اڑا دی جائیں اس میں ضرور کچھ راز ہے۔

(چاڑک خاموشی سے مسکراتا ہے)

سنگھ:۔ ہاں ہاں ضرور راز ہے، راز! یوَن حملہ آوروں کے دکھانے کے لئے سنہرے خوابوں سے اثر اندوز ہو کر آریہ ورت کی سکون سے بھری ہوئی خاموش رات کی غفلت بھری نیند میں شمالی راستے کا دروازہ آہستہ سے کھول دینے کا راز ہے، کیوں شہزادے! ممکن ہے شہنشاہ تکشلا والہیک تک اسی سازش کے لئے گئے ہوں۔

آمبھیک:۔ (پیر ٹیک کر) اُف، نوجوان! تو قیدی ہے!

سنگھ:۔ کبھی نہیں! مالو کبھی قیدی نہیں ہو سکتا۔

(آمبھیک تلوار کھینچ لیتا ہے، اتنے میں چندرگپت داخل ہوتا ہے)

چندرگپت:۔ ٹھیک ہے! ہر آریہ جس کا کوئی قصور نہیں آزاد ہے، آزاد! اسے کوئی قیدی نہیں بنا سکتا۔ یہ کیا ہے شاہزادے! تلوار کی کوش (تلوار کی میان، خزانہ) میں جگہ نہیں ہے کیا؟

سنگھ:۔ (مزاحیہ طرز سے) وہ تو سونے سے بھر گیا ہے!

آمبھیک:۔ ہوشیار! تم سب سازش سے بھٹکے ہوئے ہو! اور اس مالوی کو تو میری بے عزّتی کا ثمرہ ضرور جھیلنا پڑے گا۔ یعنی سزائے موت!

چندرگپت:۔ کیوں! کیا وہ ایک بے سہارا طالب علم تمہاری قلمرو میں تعلیم حاصل کرتا ہے، اور تم ایک شہزادے ہو، کیا اسی لئے؟

[آمبھیک تلوار چلاتا ہے اور چندرگپت اپنی تلوار پر اسے روک لیتا ہے۔ آمبھیک کی تلوار چھوٹ جاتی ہے۔ وہ بے سہارا ہو کر چندرگپت کے حملے کا انتظار کرتا ہے۔ بیچ میں السکا آ جاتی ہے]

سنگھ:۔ بہادر چندرگپت! بس جاؤ شہزادے! یہاں کوئی سازش نہیں ہے اپنی سازشوں سے خود اپنی حفاظت کرو۔

چاڑک:۔ شاہزادی! میں گورو کل کا ذمہ دار ہوں۔ میں حکم دیتا ہوں کہ تم غصّے سے لال پیلے شاہزادے کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ گورو کل میں حربوں کا استعمال صرف تعلیم کے لئے ہوتا ہے، باہمی خانہ جنگی کے لئے نہیں، یقین رکھنا کہ اس بدسلوکی کی خبر شہنشاہ کے کانوں تک نہ پہونچ پائے گی۔

السکا:۔ ایسا ہی تو بہتر ہے! بھائی چلو!

(غصّے کی حالت میں آمبھیک بھی اس کے ساتھ جاتا ہے)

چاڑک:۔ (چندرگپت سے) تمہارا سبق ختم ہو چکا ہے اور آج کا یہ حادثہ غیر معمولی ہے۔ میری رائے ہے کہ تم جلد از جلد تکشلا چھوڑ دو، اور سنگھ ہرن تم بھی!

چندرگپت:۔ صاحبِ جاہ و جلال! ہم ماگدھ (مگدھ کا باشندہ) ہیں اور یہ مالو، بہتر تو یہ ہوتا کہ اسی گورو کل میں جب ہم لوگ آلاتِ حرب کا بھی امتحان

دیتے۔

چاڑک :۔ کیا یہی میری تعلیم ہے؟ بچوں کی سی شوخی دکھانے کی یہ جگہ نہیں۔ تم لوگوں کو وقت آنے پر آلاتِ حرب کا استعمال کرنا پڑے گا۔ لیکن بلاوجہ خون خرابہ سیاسی شعور کے خلاف ہے۔

چندر گپت :۔ لائق صد تعظیم و تکریم! دنیا بھر کی سیاست اور تعلیم کا مطلب میں نے یہی سمجھا ہے کہ اپنے وقار کی حفاظت کے لئے مر مٹنا ہی سنہری زندگی ہے۔ سنگھ ہرن میری روح کا حصّہ اور میرا دوست ہے اور اس کی عزّت میری اپنی عزّت ہے۔

چاڑک :۔ میں دیکھوں گا کہ تم اپنے وقار کے لئے مستقبل کے امتحان میں کس درجہ کامیابی حاصل کرتے ہو۔

سنگھ :۔ آپ کی دعاؤں سے ہم لوگ ضرور کامیاب ہوں گے!

چاڑک :۔ اپنے وقار کے تحفّظ سے پہلے اسے پہچاننا ہوگا۔ شخصی وقار کے لئے تو تم تیار ہو کیونکہ تم مالوی ہو اور یہ مگدھی۔ یہی تمہارے وقار کی حد ہے لیکن اپنا وقار اتنے ہی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ مالوی اور مگدھی کو بھول کر جب تم آریہ ورت کا نام لوگے جبھی وہ حاصل ہوگا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ مستقبل میں آریہ ورت کی تمام آزاد حکومتیں ایک ایک کرکے بیرونی فاتح کے پیروں تلے روند دی جائیں گی آج جس مذاق کو لے کر اتنا بڑا حادثہ ہوا، اس کا حق اب یہیں تک نہیں رہا۔ مستقبل قریب میں ہونے والے شہنشاہ گاندھار آمبھیک کے دل میں وہ باتیں تیر کی طرح چبھ گئی ہیں۔ پنچ ندنریش پر وتیشور کی مخالفت کے سبب یہ ذلیل دل والا آمبھیک یونانیوں کو خوش آمدید کہے گا اور آریہ ورت کو خاک میں ملائے گا۔

چندر گپت :۔ استادِ معظّم، یقین رکھیں۔ یہ سب کچھ بھی نہیں ہونے پائے گا۔ یہ چندر گپت آپ کے قدموں کی قسم کھا کر عہد کرتا ہے کہ یون (یونانی) یہاں کچھ نہ کرسکیں گے۔

چاڑک :۔ ذی حوصلہ، عالی ہمّت! تمہارا عہد مصمم ہو۔ لیکن اس سے پہلے مگدھ جا کر تم تمام ذرائع سے مطمئن ہو۔ یہاں وقت گذارنا بے سود ہے۔ میں بھی پنچ ندنریش سے ملاقات کرتا ہوا مگدھ آؤں گا۔ کیونکہ مجھے ذریعۂ معاش کی تلاش ہے اور سنگھ ہرن تم بھی ہوشیار رہنا۔

سنگھ :۔ صاحبِ آبرو! آپ کی دعائیں ہی میری حفاظت کریں گی۔

(چندر گپت اور چاڑک رخصت ہوتے ہیں)

سنگھ :۔ ایک آگ سے بھرا ہوا گندھک کا فتیلہ آریہ ورت کے آہنی ذخیرۂ حرب میں گھس کر وسفوٹ (دھماکہ) کرے گا۔ جنگل جنگ کی دیوی قوس وقزح سا فتح کا ہار ہاتھوں میں لئے نیلگوں جنگ کے بادل میں گھومے گی اور بہادروں کے دلوں کے طاؤس ناچیں گے۔ دیوی! آؤ تم کو مبارک ہو۔ (الکا داخل ہوتی ہے)

الکا :۔ مالوی بہادر۔ ابھی تک تم نے تکشلا نہیں چھوڑا؟

سنگھ :۔ یہ کیوں دیوی! کیا میں یہاں رہنے کے قابل نہیں؟

الکا :۔ نہیں، میں تمہارے آرام اور چین کے لئے فکر مند ہوں۔ بھائی نے گو کہ تمہارا قصور کیا ہے لیکن وہ بے سبب نہ تھا جس کا جو راستہ ہے وہ چلے گا۔ اس پر غور وفکر کرنے کا سب کو حق نہیں حاصل۔ تم نے بِنا حقوق اس پر غور کیا تھا۔ میں دیکھتی ہوں کہ کبھی کبھی انسان دوسروں کو اپنی راہ پر چلانے کے لئے رک بھی جاتا ہے اور اپنا چلنا بھی ترک کردیتا ہے

سنگھ :۔ لیکن شریف دیوی! ایام زندگی میں مختلف راستوں پر چل کر انتہا تک جو ٹھہرتا ہوا چلتا ہے وہ دوسروں کو فائدہ ہی پہونچاتا ہے یہ تکلیف دہ تو ہے لیکن بیکار نہیں۔

الکا :۔ لیکن انسان کو اپنی زندگی اور آرام و آسائش کا بھی خیال رکھنا ہی چاہیئے۔

سنگھ :۔ انسان کب راکشش سے بھی خطرناک، جانور سے بھی ڈراؤنا اور پتھر سے بھی سخت، بے رحم اور بے مروّت اور سخت دل والا ہوگا، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ماضی اور مستقبل کے لئے تشکیک ہی کیوں اور حال کو میں اپنے مطابق ہی بنا لوں گا۔ پھر غور وفکر کا سوال ہی کیا۔

الکا :۔ تمہارے ملک کے لئے تمہاری زندگی بیش قیمت ہے، لیکن وہی یہاں مصیبت میں ہے۔

سنگھ :۔ شہزادی! میں تمہاری اس مہربانی کا شکر گذار ہوں لیکن میرا ملک مالوہ ہی نہیں گاندھار بھی ہے۔ یہی کیا بلکہ سارا آریہ ورت ہے، اس لئے میں . . . .

الکا :۔ (تعجّب سے) یہ کیا کہہ رہے ہو؟

سنگھ :۔ گاندھار آریہ ورت سے مختلف نہیں۔ اسی لئے اس کے زوال کو میں اپنی بے عزّتی سمجھتا ہوں

الکا :۔ (سانس لیتے ہوئے) میں اسے محسوس کر رہی ہوں لیکن جس ملک میں ایسے شجاع نوجوان ہوں اس کا زوال غیر ممکن ہے، مالوی بہادر، تمہارے دل کی طاقت میں آزادی کا عنصر اور تمہارے مضبوط بازوؤں میں آریہ ورت کے تحفظ کی طاقت بھری ہے۔ تمہیں محفوظ ہی رہنا چاہیئے میں بھی آریہ ورت کی دوشیزہ ہوں۔ اسی رشتے سے میں تم سے گذارش کر رہی ہوں کہ تم جلد از جلد گاندھار سے ہجرت کرو۔ میں آمبھیک کو اپنی طاقت بھی سمجھاؤں گی اور زوال سے بچانے کی کوشش کروں گی۔ اگر وہ نہ مانا تو تمہاری ضرورت ہوگی، جاؤ بہادر!

سنگھ :۔ اچھا شہزادی! تمہاری ہمدردانہ مخالفت سے میں جانے کے لئے تیار ہو رہا ہوں۔ جلد ہی چلا جاؤں گا، دیوی! لیکن کاش کہ کسی طرح سندھ ندی کی تیز دھار کو یون کشتیاں نہ پار کرسکیں۔۔۔

الکا :۔ میں کوشش کروں گی بہادر! اور ہاں تمہارا نام؟؟

سنگھ :۔ مالو گڑھ کے راشٹر پتی کا فرزند سنگھ ہرن!

الکا :۔ پھر کبھی کمانا! ہوشیار!

(دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں) (پردہ گرتا ہے)

شعر و سخن

غزل
ارشد کاکوی

دورِ کس بیکسی کا آیا ہے
کل جو اپنا تھا اب پرایا ہے

حسن اور مائلِ کرم؟ کیا خوب
عشق نے پھر فریب کھایا ہے

چاند تاروں کی چھاؤں سے پیارا
آپ کے گیسوؤں کا سایا ہے

زندگی اور ہوگئی پیاری
موت کا دن قریب آیا ہے

جس کو دنیا نشاط کہتی ہے
در حقیقت وہ غم کا سایا ہے

اس کو اللہ صرف راحت دے
جس نے مجھ کو فقط رُلایا ہے

سو گئی چشمِ انتظار آخر
کون آئے گا کون آیا ہے

جب بھی جاگا ہوں نیند سے ارشد
غم نے آکر مجھے جگایا ہے

غزل
شفا گوالیاری

بڑھے گم گشتگی آسودگی ایسی بھی ہوتی ہے
نظر رہ جائے کھو کر بدنشتی ایسی بھی ہوتی ہے

جو منزل بخش دے وارفتگی ایسی بھی ہوتی ہے
خودی کو جگمگا دے بیخودی ایسی بھی ہوتی ہے

جو کر دیتی ہے ساری عمر کی تاریخ کو روشن
حیاتِ مختصر میں اک گھڑی ایسی بھی ہوتی ہے

ہنسی میں اشک اشکوں میں ہنسی بھی تو ہم سمجھے
الم ایسا بھی ہوتا ہے خوشی ایسی بھی ہوتی ہے

پناہیں مانگتی ہے دشمنی کی مصلحت جس سے
خدا محفوظ رکھے دوستی ایسی بھی ہوتی ہے

ہماری مسکراہٹ میں اداسی دیکھنے والے
غموں سے جو سنورتی ہے خوشی ایسی بھی ہوتی ہے

نہ ہر اک سر پھرے پر مسکراؤ تم حقارت سے
خرد افروز ہو دیوانگی ایسی بھی ہوتی ہے

عزائم میں جوانی ہے نہ قدموں میں روانی ہے
شفا یہ کھیل کیا ہے، زندگی ایسی بھی ہوتی ہے؟

عرفانِ حیات
افسر سیمابی احمد نگری

زمیں اُسی کے لئے آسماں اُسی کے لئے
ملے جو خاک میں ناموسِ زندگی کے لئے

جو بد نصیب ہے فیضانِ عشق سے محروم
نہ موت کے لئے موزوں نہ زندگی کے لئے

یہ کیا نظام ہے یارب تری خدائی کا
خوشی کسی کے لئے فکر و غم کسی کے لئے

وہ ظلمتیں ہیں سوادِ حیات پر طاری
کہ مہر و ماہ ترستے ہیں روشنی کے لئے

سمومِ جَور ہے یا آپ کی نسیمِ کرم
کہ ایک موجِ تبسم نہیں کسی کے لئے

خرابِ کفر دیجئیں کو نگاہ دے یارب
کہ زندگی سے گریزاں ہے زندگی کے لئے

حریمِ عرش بھی اس کا طواف کرتا ہے
جو اپنے دل کو جلاتا ہے روشنی کے لئے

میں ترجمانِ رموزِ حیات ہوں افسر
مرا کلام ہے عرفانِ زندگی کے لئے

غزل
جلیل عرشی

بات جب دل کی زباں پر آگئی
بن کے افسانہ جہاں پر چھا گئی

جس قدر چاہا نکالیں پیچ و خم
زلفِ گیتی اور کچھ بل کھا گئی

میں تو دیوانہ تھا دنیا تو نہ تھی
کیوں فریبِ آرزو میں آگئی

ہوش ننگِ عاشقی کا نام ہے
بیخودی آکر مجھے سمجھا گئی

سیکڑوں تھے حسن کے حائل حجاب
بیخودی کیوں درمیاں میں آگئی

دل سے جب احساسِ غم جاتا رہا
نیند کانٹوں پر بھی اکثر آگئی

اب خیالِ عیش اے عرشی کہاں
ناامیدی حسرتوں پر چھا گئی

حبیب تنویر

ڈراما اور تعلیم

"انھیں اپنی محبّت دو۔ لیکن اپنے خیالات ان پر مسلط نہ کرو۔ کیونکہ ان کے پاس ان کے اپنے خیالات ہیں"۔

ان کا جسم تو تم اپنا سکتے ہو۔ مگر روح اور دل میں گھر نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی روح کا گھر مستقبل کا وہ محل ہے۔ جہاں تم کبھی نہیں پہنچ سکتے خواب میں بھی نہیں۔

تم ان کی طرح بننے کی کوشش تو ضرور کرو۔ لیکن انھیں کسی طرح بنانے کی کوشش ہرگز نہ کرنا"۔

خلیل جبران نے اپنی کتاب "پیغمبر" میں بچّوں کے بارے میں یہ لکھا ہے بچّوں کے ڈرامے صحیح معنوں میں اسی قول کی بنیاد پر لکھے اور کھیلے جا سکتے ہیں۔ اور اگر غور کیا جائے تو شاید لکھنے کا بھی سوال پیدا نہ ہو۔ بچّے خود اپنے ڈرامے بناتے ہیں۔

انسان کی زندگی بذات خود ایک ڈراما ہے۔ بچپن میں اس ڈرامے کو آدمی خوب سمجھتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی آواز کے ساتھ تجربہ کرتا ہے۔ بولنا سیکھتا ہے۔ چلنا سیکھتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی مشکل اس کے لئے ایک زبردست مرحلے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور اس کا حل کر لینا اس کے لئے ایک مہم سر کر لینے کے برابر ہے۔ ایک بہت بڑا کارنامہ ایک زبردست ڈراما ہے۔ اپنے آس پاس کی دنیا، ہر نامانوس چیز۔ اپنے جسم کا ہر عضو اور ہر راز اس کے لئے ڈرامے کا ایک مستقل عنوان ہے۔

یہ تو ہوا بچّے کی زندگی کا داخلی ڈراما۔ ڈرامے کا احساس اسی جذبے کو جب خارجی ڈرامے کی شکل میں نکھارتا ہے تو بچّے راجا رانی کے کھیل کھیلتے ہیں۔ ماں باپ بزرگوں اور اپنی ہم عمروں کی نقلیں اتارتے ہیں۔ گڈّے گڑیا کا بیاہ رچاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے کھیل ایجاد کرتے ہیں۔ انھیں کھیلوں میں آپ کو بچّوں کے اصلی ڈرامے مل جائیں گے۔

ان ڈراموں کو اگر ہم دیکھیں اور سمجھ سکیں۔ تو بچّوں کے ڈرامے اور ان کی تعلیم کا بہت بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بچّوں کے ڈراموں کا مسئلہ یہ ہے کہ کس ڈھب کے ڈرامے ان کے لئے لکھے جائیں۔ اوّل تو بچّوں کے ادب ہی کی طرف ہمارے ملک میں توجہ کم ہے۔ ڈراما تو پھر بھی دُور کی بات ہے۔ پھر یہ کہ اگر کوئی بچوں کے لئے کچھ لکھتا بھی ہے۔ تو وہ ان کے سر پر اپنی بات تھوپنے کی کوشش کرتا ہے بچّوں کے اپنے کھیلوں اور من گھڑت ناٹکوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ہی اس انداز کے ڈرامے لکھے جا سکتے ہیں۔ جن کو بچّے پسند کریں گے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لکھنے والے کو اپنے معیار سے نیچے اُتر کر بچّوں کے لئے ڈراما لکھنا ہوگا۔ بچّوں کا معیار بہت اونچا ہونا ہے۔ اس معیار کی چیز لکھنے کا مطلب ہے بہت بلند معیار کا ادب پیدا کرنا۔ ان کا اندازہ تو صرف بچّوں کی باتیں سننے اور ان کی لکھی ہوئی کہانیاں اور مضامین پڑھنے سے ہو جاتا ہے۔

یہی بات اسٹیج کی ٹکنیک کے سلسلے میں بھی صحیح ہے۔ بچّے اپنے خود ساختہ ڈرامے کھیلتے وقت جس ٹکنیک کا استعمال کرتے ہیں وہ ہماری ٹکنیک سے کہیں بہتر ہوتی ہے، انھیں عام طور سے اسٹیج کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا طور پر ان کی ٹکنیک ایک ہوتی ہے وہ ڈیرا یا ایک دائرے کی شکل میں چار طرف گھوم گھوم کر کھیلتے ہیں۔ اور چلنے پھرنے میں کسی قسم کی پابندی اپنے اعائد نہیں کرتے۔ اسٹیج کی کوئی حد مقرر نہیں کرتے۔ اسٹیج ان کے ذہن میں ہی نہیں۔ بلکہ ان کے ذہن میں تو دیکھنے والے بھی نہیں ہوتے۔ دیکھنے والوں کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہم تو اپنا جی خوش کرنے کے لئے ڈراما کھیل رہے ہیں۔ ان میں کسی اور کو کیا دخل —— یہ احساس ان میں دکھاوے کا جذبہ نہیں پیدا ہونے دیتا۔ جو اچھے آرٹ کا دشمن ہے۔

اگر دیکھنے والے موجود بھی ہوں تو بچّے ان کے اور اسٹیج کے درمیان حد

بندی نہیں کرتے ۔ بلکہ دیکھنے والے بھی اگر بچے ہی ہوں تو ان کی خواہش یہ ہوگی کہ وہ بھی ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہو جائیں ۔

مختلف ملکوں کے قدیم تھیٹروں میں بھی یہی ٹکنیک رائج تھی ۔ اور آج یہی ٹکنیک یورپی تھیٹر کی نئی نئی ایجادات اور جدّت طرازیوں کی بھی بنیاد بن گئی ہے ۔

مشرقی ممالک خصوصاً چین، جاپان اور ہندوستان کی تھیٹر کی قدیم روایتیں بھی یہی ہیں کہ اکثر ڈراما کھیلنے والوں اور ڈراما دیکھنے والوں کے فرق کو مٹا دیا جاتا تھا، رنگ منچ اور تماشا گاہ میں یگانگی قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی ۔

مصر میں تین ہزار برس قبل مسیح اوسائرس (Osyrus) نامی ایک پروڈیوسر گزرا ہے ۔ جس کا پیشن پلے (Passion Play) مذہبی ڈراما بہت مشہور ہے ۔ اس کے ڈراموں میں ہزاروں آرٹسٹ بیک وقت شریک ہوتے تھے ۔ اور حقیقت نگاری کے اصول کی پابندی مضحکہ خیز حد تک کی جاتی تھی یہ حقیقت نگاری کیا ہوتی تھی ۔ نیچرلزم یعنی ایک قسم کا فطرت کا تتبع تھا ۔ مثلاً اس کے اسٹیج کی وسعتیں محض اپنے شہر آبی ڈوس (Abydos) ہی تک محدود نہ تھیں؛ بلکہ ڈراما کھیلنے والے آس پاس کے علاقوں اور بستیوں تک نکل جاتے تھے ۔ سیکڑوں آدمی کشت و خون کا شکار ہوتے تھے اور ہزاروں گھر اُجڑ جاتے تھے ۔

چین کے شہنشاہ منگ ہوانگ نے ایک باغ بنوایا تھا جو دراصل بچوں اور نوجوانوں کا ایک اسکول تھا ۔ یہاں کے طالب علموں اور استادوں کا بنیادی کام یہ تھا کہ وہ ڈرامے کے سلسلے میں نئی نئی ٹکنیک تلاش کریں اور ان کے جو یہاں بھی تماشہ دیکھنے والے اسٹیج ہی کا ایک جزو بن گئے تھے ۔

یہ کہ جاپان کے مشہور ڈرامے "نوپلے" کی ٹکنیک بھی بال ناٹک کی ٹکنیک سے ملتی وہ جلتی ہے اور قرون وسطیٰ کے یورپی انقلاب کے زمانے میں اٹلی کی مشہور کمیڈی سم جسے (Commedia dell Arte) کہتے ہیں اسی ٹکنیک کی خ مرہون منت تھی ۔

دوسرے ملکوں کے بچے اپنے ڈراموں کے لئے جس ڈھنگ کے "ماسک" (مصنوعی چہرے) بناتے ہیں ۔ اس میں آپ کو ہماری قدیم روایتوں اور ہندوستان کے ماسکوں کی واضح جھلک نظر آئے گی ۔

"دائرہ" جس پر اما اسلاوسکی ۔ اسٹیج اور ریہرسلوں کے سلسلے میں بہت زور دیتا ہے اور جسے وہ (Circle of attention) "توجہ کا دائرہ" کہتا ہے ۔ ایشیا اور افریقہ کے عوامی ناچوں کی خاص چیز ہوتی ہے ۔ یہی ترتیب آپ کو ہر ملک کے بچوں کے بے ساختہ کھیلوں اور ناچوں میں نظر آئے گی ۔ طبعاً ان کے ذہن میں ڈراما کھیلتے وقت ایک دائرے ہی کا تصور ہوتا ہے ۔

جہاں تک اسٹیج پر آواز کے ذریعے اثر پیدا کرنے اور ہر قسم کے اثر کے لئے اسی ڈھب کی آواز کے استعمال کا تعلق ہے ۔ اس میں بھی بچوں کی ٹکنیک افریقہ کی کلچرل روایتوں سے ملتی جلتی ہے ۔ یہی ٹکنیک حبشی گانوں میں جنھیں بلوز (Blues) یعنی موز کہتے ہیں ۔ بلکہ امریکہ کے مخصوص میوزک یعنی جاز (Jazz) میں بھی پائی جاتی ہے ۔

یورپ کے جدید ڈراموں اور تھیٹروں میں جہاں فنکار اور ناظرین کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ بچوں ہی کی ٹکنیک کا تتبع ملے گا ۔ خاص کر ڈراموں کی اس ٹکنیک میں جس میں نصف دائرے والا اسٹیج استعمال کیا جاتا ہے ۔ اسے ہارس شو اریناپروڈکشن (Horse-shoe Arena production) کہتے ہیں اور اس میں لوگ اسٹیج کے تین طرف سے کھیل دیکھ سکتے ہیں ۔ اگر بچوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو آپ دیکھئے کہ ذرا بڑی عمر کے بچے ڈراما کھیلتے وقت اسٹیج پر اسی قاعدے کو برتیں گے ۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ بچوں کے اندر ڈرامے کی فطری صلاحیت پائی جاتی ہے اور ان کا تخلیقی معیار اپنی بے ساختگی کی وجہ سے فنی نقطۂ نظر سے بھی بہت بلند ہوتا ہے ۔ یہی بات بچوں کی کہانیوں اور تصویروں کے بارے میں بھی صحیح ہے ۔ بڑی تحقیق کے بعد پروفیسر ہربک نے توجہ دلائی ہے کہ انسان کے قدیم ترین فن مصوری کی کڑیاں بچوں کے آرٹ سے ملتی ہیں ۔

اگر یہ سب صحیح ہے تو پھر کیا ضروری ہے کہ ہم بچوں پر اپنے خیالات تھوپیں ۔ ان کے لئے اپنے مذاق کے من مانی ڈرامے لکھیں اور اپنی فرسودہ ٹکنیک ان کے متھے مڑھیں ۔ بلکہ ان سے تو ہم اپنے کام کی بہت سی باتیں سیکھ سکتے ہیں ۔ اس بات کے نہ سمجھنے سے بچوں کے تھیٹر کے سلسلے میں اکثر لوگوں کے ذہن میں بہت الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے ۔ طرح طرح کے

تصورات ہیں - اور چونکہ اس سلسلے میں باتیں بہت ہو رہی ہیں اور کام کم - اس لئے صفائی کی کوئی صورت نہیں -

(۱) کوئی تو یہ سمجھتا ہے کہ بچّوں کا تھیٹر نام ہے ایک بڑی اور حسین عمارت کا جو بچّوں کے نام سے مشہور ہو جائے اور جسے دیکھنے کے لئے دُور دُور کے فنکار اور سیّاح آئیں -

(۲) کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بچّوں کا تھیٹر وہ ہے جس میں بڑی عمر کے لوگ بچّوں کے لئے ڈرامے کھیلیں اور بچّے صرف دیکھیں اور خوش ہوں -

(۳) مغربی ملکوں میں ایک یہ تصوّر بھی عام ہے کہ بڑی عمر کے لوگ بچّوں کے لئے اتنے قریب سے اور اس انداز سے ڈراما کھیلیں کہ بچّے یہ بھول جائیں کہ وہ محض دیکھنے والے ہیں بلکہ ڈراما کھیلنے والوں میں گھل مل جائیں - ان کے اندر بے ساختہ طور پر ایک احساس شرکت پیدا ہو اور وہ بھی ایک حد تک کھیل میں بے اختیار شامل ہو جائیں -

(۴) ایک خیال یہ ہے بڑوں کے لکھے ہوئے ڈرامے بچّے کھیلیں اور بڑے چھوٹے سب دیکھیں -

(۵) ایک صورت یہ بھی ہے کہ بچّے اپنے ڈرامے خود ہی لکھیں تیار کریں - کھیلیں اور دیکھیں -

ان میں کچھ صورتیں ایسی ہیں جن پر عمل کرنا غالباً ایک حد تک مفید ہوگا - لیکن ان میں سے کوئی بھی طریقہ ایسا نہیں جو بچّوں کے ڈرامے اور تعلیم کے سلسلے میں بنیادی مسئلے کا حل پیش کرتا ہو -

جس ڈھنگ سے بچّوں کے ڈرامے ایک زمانے میں پیٹس کچن (Pete's Kitchen) میں کھیلے جاتے تھے اس میں شاید اس مسئلے کا حل مل جائے -

"پیٹس کچن" پیٹر سلیڈ (Peter Slade) کا قائم کیا ہوا بچّوں کے ڈرامے کا ایک مرکز تھا جس نے انگلینڈ میں بہت شہرت حاصل کی - اس مرکز میں پیٹر سلیڈ نے بچّوں کے ڈرامے کے سلسلے میں بڑے بڑے تجربے کئے اور آج وہی اصول یورپ اور امریکہ کے اکثر اسکولوں اور تھیٹروں میں رائج ہیں -

اس مرکز میں کچھ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر، تھوڑے بہت کھلونے اور بچّوں کے کھیلنے کے لئے بہت سی الٹی سیدھی چیزیں تھیں - بچّے اپنے کھیل پیٹر سلیڈ کی مدد سے تیار کرتے اور یہیں کھیلتے اور انھیں میز، کرسیوں کھلونوں اور اُلٹی سیدھی چیزوں کو ہزار ڈھنگ سے استعمال کرتے - سیٹ اور اسٹیج کے سامان کے سلسلے میں بچّوں کے تخیل کا مقابلہ کون کر سکتا ہے - وہ اپنی ضرورت کے مطابق انھیں بدحال اشیاء کو ہر بار اک نیا رنگ اور نیا کردار بخش دیتے - اسٹیج کی کوئی حد مقرر نہ تھی تماشہ دیکھنے والوں کی صف بہت کم علیحدہ ہوتی تھی - اکثر اوقات دیکھنے والے ہوتے ہی نہ تھے سب کھیل میں شریک رہتے تھے - زیادہ تر بے لکھے اور بے ساختہ ڈرامے ہوتے تھے اور مختلف عمر کے بچّے جس ڈھنگ سے چاہتے تھے کھیلتے تھے - ان کھیلوں میں پیٹر سلیڈ کی حیثیت ایک ڈائرکٹر کی نہ تھی بلکہ ایک ہمدم، مشفق باپ اور ساتھ کے کھیلنے والے کی تھی - وہ بچّوں میں مل کر انھیں کی طرح ان کھیلوں میں شریک ہوتا - نہ صرف ڈراموں میں ان کی مدد کرتا اور انھیں کھیلنا سکھاتا بلکہ خود بھی ان سے نئے نئے خیالات حاصل کرتا اور بہت کچھ سیکھ لیتا -

ہمیں بچّوں کے لئے بڑی بڑی حسین عمارتوں سے زیادہ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے ڈرامے کے مرکزوں کی ضرورت ہے جنھیں بچّے اپنا گھر سمجھیں اور جہاں وہ ڈراموں کے ذریعے اپنی شخصیت بنائیں اور سنواریں اور صحیح معنوں میں زندگی کی تعلیم حاصل کریں -

ڈراموں کے ذریعے نہ صرف بچّوں کی ذہانت بڑھتی ہے اور ہر مضمون و ہر موضوع کا درس آسانی سے ان کے ذہن نشین ہو جاتا ہے بلکہ ہر قسم کے کردار میں اپنی شخصیت کو ڈھال کر بچّے اپنے مذاق اور مزاج کی تربیت آپ کرنا سیکھ جاتے ہیں - اپنے ان خطرناک رجحانات کا علاج کرتے ہیں جو انھیں ناپسند ہیں - مگر جنھیں وہ اکثر اپنے کردار سے نہیں بلکہ دوسروں کی طبیعت سے وابستہ کرنے کے عادی رہتے ہیں -

یہ سچ ہے کہ اس قسم کے ڈرامے کے مرکزوں کے لئے بڑے سرمائے کی ضرورت ہوگی لیکن بچّوں کی تعلیم و تربیت میں ان کی زندگی کا تفریحی پہلو سب سے زیادہ اہم ہے - ان کی اہمیت کو مدّنظر رکھ کر انگلینڈ کے مدرسین اور سماجی کام کرنے والوں نے ایک تحریک شروع کی تھی جس کا نام تھا "بچّوں کو بچاؤ فنڈ (Save the Children Fund)"، بچّوں کے کھیل کود اور تعلیم و تفریح کے سلسلے میں اس تحریک نے بڑے بڑے کام انجام دئے ہیں -

یورپ کے بعض ملکوں میں اور چین میں بچّوں کے مدرسوں اور تفریح گاہوں کے لئے سرکاری بجٹ میں خاصی رقم رکھی جاتی ہے ۔ اسکول اور کالجوں میں ڈراما اور تھیٹر نصاب میں شامل ہیں ۔ کیا وجہ ہے کہ یہی چیز ہم اپنے ملک میں نہیں کر سکتے ۔

اس بات کی وضاحت کی مطلق ضرورت نہیں کہ طوطے کی طرح رٹ کر سبق یاد کرنے کا طریقہ ذہن کو کُند اور شخصیت کو مسخ کر دیتا ہے ۔ انگریزوں کے سکھلائے ہوئے امتحانات کے مروّجہ دستور نے بچّوں کی نگاہ میں اسکول کی تعلیم کو ایک ہوّا بنا دیا ہے ۔ کالجوں میں تعلیم تو کیا ہوتی ہے "کلرک سازی کا کام ہوتا ہے ۔ لڑکے کالج سے سرٹی فیکٹ اور ڈگریاں حاصل کر کے اپنے آپ کو تعلیم سے فارغ البال سمجھتے ہیں اور دفتروں میں بابو اور منشی بن جاتے ہیں ۔ یا زندگی سے بیزار سڑکوں پر چپلیں چٹخاتے پھرتے ہیں ۔ امتحانات کا یہ خطرناک تعلیمی دستور ہم نے مغربی ممالک سے سیکھا ہے ۔ لیکن خود مغربی ممالک کے روشن دماغ مدرسین اب اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ بچّوں کی بہترین تعلیم تخلیقی آرٹ کے ذریعے ہوتی ہے ۔ ڈراما تھیٹر آرٹ کا ایسا شعبہ ہے جس میں سارے فنون لطیفہ کا امتزاج پایا جاتا ہے جو تعلیم کے سلسلے میں ہر فن پر حاوی ہے ۔

ہربرٹ ریڈ کہتا ہے ۔ تعلیم کی ہر منزل میں ڈرامے کو قطعی طور پر ایک لازمی حیثیت دینا چاہئے ۔ حقیقت یہ ہے کہ آرٹ کے ذریعے تعلیم دینے کے جتنے بھی طریقے ہیں ۔ میرے نزدیک ڈراما ہی وہ ایک واحد طریقہ ہے جو ان تمام وسائل اور طریقوں کو اپنے اندر پورے پورے طور پر سمو لیتا ہے ۔ چونکہ میرا یہ نظریہ ہے کہ تعلیم خواہ وہ کسی بھی چیز کی ہو بنیادی طور پر آرٹ کے ذریعے دینا چاہئے ۔ اس لئے اب یہ بات صاف ہے کہ بچّوں کے ڈرامے پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے ۔

مارشل ٹیٹو کا بیان

بھارت کا دورہ

بھارت ہمارے ملک سے بہت دُور واقع ہے اور بہت سے لوگوں کی طرف سے یہ دریافت کیا جا رہا ہے کہ مجھے اتنی دور جانے کی ضرورت کیوں پیش آئی میں کھُلے طور پر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے مشکلات کا احساس ہے ۔ لیکن میرا وہاں جانا ہمارے ملک اور امنِ عالم کے مفاد میں ہے اور یہ دورہ بہت اہم ثابت ہوگا ۔ بھارت کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت ہی خوشگوار ہیں ۔ بھارت نے تھوڑا عرصہ پیشتر آزادی حاصل کی ہے اور اسے بھی پسماندگی سے باہر نکلنے کے لئے بہت حد تک اپنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جن کا سامنا ہمیں کرنا پڑا تھا ۔ بھارت کے لوگ بہت امن پسند واقع ہوتے ہیں اور پردھان منتری شری نہرو کی ذات میں انھیں ایک بہت دانشمند رہنما کی قیادت حاصل ہے ۔ ملکی مسائل کو حل کرنے کے لئے بھارت کے لوگ اپنی تمام تر قوت سے کام کر رہے ہیں اور بین الاقوامی میدان میں وہ بقائے امن کی جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لئے امکانی حد تک اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں ۔ میں اس عظیم ملک کا قریب سے مطالعہ کرنا چاہتا ہوں اور ممکن ہے کہ میرے ذریعے بھارت کے لوگوں کو بھی ہمارے ملک کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے کا موقعہ ملے ۔ مختصر یہ کہ بین الاقوامی میدان میں امنِ عالم کو قائم رکھنے کے لئے ہمارے سامنے ایک مشترکہ کام ہے اور بنی نوع انسان کے لئے اس کی بڑی اہمیت ہے تاکہ ہم پُر امن طریقے سے ایک بہتر دنیا کی تعمیر کر سکیں ۔

یوگوسلاویہ اور بھارت کے درمیان تعاون

بھارت اور یوگوسلاویہ کے درمیان تعاون کے متعدد امکانات ہیں اور میں ان میں سے چند ایک اہم ترین امکانات کا ذکر کروں گا ۔ خارجہ پالیسی میں دونوں ملکوں کے لئے تعاون کا وسیع میدان موجود ہے ۔ ان امور پر دونوں ملکوں کے تعاون کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے جن سے امنِ عالم کو برقرار رکھنے اور مستحکم بنانے میں مدد مل سکے ۔ کیونکہ اس مسئلے پر ہمارے خیالات ایک ہیں لہذا اس سلسلے میں تعاون کو عملی شکل دینا زیادہ آسان ہے اور یہ امر اور بھی زیادہ اہم ہے کہ بھارت اور یوگوسلاویہ کے صرف مدبرین ہی یہ خیالات نہیں رکھتے بلکہ ان سے دونوں ملکوں کے عوام کی زبردست امنگوں کی ترجمانی بھی ہوتی ہے ۔

رالف ڈبلیو فلپس

بھارت میں دودھ کی پیداوار اور موسمی مشکلات

دودھ دنیا کے اکثر ممالک میں انسانی خوراک کی اہم شے ہے لیکن بھارت کے لئے تو یہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا کے بہت سے ملک اپنی غذا میں حیواناتی پروٹین کے اجزا گوشت سے حاصل کرتے ہیں لیکن دھارمک وجوہ کی بنا پر بھارت میں گوشت کی کھپت بہت محدود ہے۔ اس لئے حیواناتی پروٹین حاصل کرنے کے لئے دودھ ہی ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اگر حیواناتی ذرائع سے پروٹین کی معقول مقدار کو بھارت کی روزمرہ خوراک میں شامل کیا جانا ہے اور خاص کر اس ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے مدنظر یہ لازمی ہے کہ زیادہ مقدار میں دودھ مہیا کرنے پر خاص توجہ دی جائے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہو جاتا ہے کہ بھارت کے اکثر حصوں کے گرم موسمی حالات میں دودھ کی پیداوار سے متعلقہ مسائل پر زیادہ توجہ کی جائے۔

دنیا کے مختلف ملکوں میں حیواناتی پروٹین کی فی کس روزمرہ کھپت کے نقشے پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بھارت میں یہ کھپت بہت محدود ہے۔ اگرچہ غذائیت کے ماہرین کسی ایسے عام قاعدے پر متفق نہیں ہو سکے ہیں کہ انسانی جسم کے لئے حیواناتی پروٹین کی کتنی زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم مقدار فی کس فی یوم لازمی ہے۔ پھر بھی مسٹر موریس نے ۱۹۴۵ء میں ۷۰ گرین کل پروٹین اور ۳ر۳۳ گرین حیواناتی پروٹین فی کس روزمرہ ایک مناسب غذا تجویز کی ہے۔ اگر ۳۰ گرین فی کس روزانہ حیواناتی پروٹین غذا کے لئے معقول مقدار فرض کر لی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے مندرجہ ذیل ملکوں میں سے صرف اٹھارہ ملکوں میں یہ مقدار یا اس سے زیادہ روزمرہ کی غذا میں شامل کی جا رہی ہے۔

نام ملک یا خطہ	حیواناتی پروٹین کی روزانہ کھپت فی کس
آئس لینڈ	۸۰ سے ۹ر۸۸ گرین
ارجنٹائن۔ نیوزی لینڈ۔ آسٹریلیا۔ اروگوے	۶۰ سے تقریباً ۷۰ گرین
سویڈن۔ امریکہ۔ ڈنمارک۔ کینیڈا۔ ناروے	۵۰ ،، ،، ۶۰ ،،
سوئیٹزرلینڈ۔ آئرلینڈ۔ برطانیہ۔ فن لینڈ	۴۰ ،، ،، ۵۰ ،،
نیدرلینڈ۔ فرانس۔ بلجیم و لکسمبرگ۔ چیکوسلواکیہ	۳۰ ،، ،، ۴۰ ،،
برما۔ کولمبیا۔ کیوبا۔ برازیل۔ آسٹریا۔ مڈغاسکر۔ چلی۔ ایل سلویڈور۔ ہانڈورس۔ مراکو۔ پولینڈ۔ حبشہ۔ سپین	۲۰ ،، ،، ۳۰ ،،
اٹلی۔ فلپائن۔ پرتگال۔ میکسیکو۔ ہنگری، یونان۔ جرمنی (روسی علاقہ) تھائی لینڈ، ترکی۔ سائپرس۔ پاکستان۔ ٹانگانیکا، ماریشس۔ یوگوسلاویہ۔ مصر۔ سیلون	۱۰ ،، ،، ۲۰ ،،
الجیریا۔ پیرو۔ نیوٹیشیا۔ ہند چینی، جاپان، بھارت۔ شام اور لبنان۔ چین۔ انڈونیشیا	صفر ،، ،، ۱۰ ،،

مویشیوں اور خاص کر دودھ دینے والے مویشیوں پر موسمی اثرات کے بارے میں تحقیقات پچھلے چند برسوں میں کی گئی ہے۔ جو طلبا منطقہ معتدلہ میں واقع ممالک کی انسٹی ٹیوشنوں میں تربیت حاصل کرنے کی غرض سے جاتے رہے، وہ مویشیوں پر موسمی اثرات کی اہمیت کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ اس لئے وہ اپنی تربیت کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہ کر سکے۔

خوش قسمتی سے بھارت میں صدیوں سے دودھ دینے والے مویشیوں کی کئی عمدہ نسلیں موجود ہیں۔ جو بھارت میں دودھ کی پیداوار بڑھانے کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارۂ خوراک و زراعت نے بھارت اور پاکستان کے مویشیوں کے متعلق ایک کتاب شائع کی ہے جس میں بھارت کے دودھ دینے والے مویشیوں کی اہمیت کو

بیان کیا گیا ہے۔ بھارت کی زرعی تحقیقاتی کونسل نے دودھ اور گھی کے بارے میں ضروری اعداد وشمار ایک اسکیم کے تحت فراہم کئے ہیں — دودھ کی پیداوار پر موسمی ماحول کے اثرات کے مطالعے اور تجربات سے یہ واضح ہوا ہے کہ ۴۰ سے ۷۰ ڈگری تک درجۂ حرارت کی فضا میں دودھ کی پیداوار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس حد سے نیچے کے درجۂ حرارت میں پیداوار کم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس حالت میں گایوں کو زیادہ غذا دینے سے یہ کمی صرف برائے نام ہی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اس حد سے اوپر کے درجۂ حرارت میں ۸۰ درجے تک دودھ کی پیداوار بتدریج کم ہو جاتی ہے۔ لیکن ۸۰ درجے سے اوپر درجۂ حرارت کی فضا میں دودھ کی پیداوار یک لخت کم ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں گھی کی مناسبت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ نتائج یورپی نسل کے مویشیوں پر تجربات سے حاصل کئے گئے ہیں۔ لیکن بھارت کی ساہیوال اور سرخ سندھی نسلوں کی گایوں پر موسمی اثرات معلوم کرنے کے لئے مزید تجربات کرنے پڑیں گے۔

فضا کا درجۂ حرارت، بارش وغیرہ کئی ایسے ماحولی عناصر ہیں جو انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔ لیکن ان عناصر کے اثرات کو مویشیوں کی پرورش اور غذا دینے کے ڈھنگ میں تبدیلیوں کے ذریعے بدلا جا سکتا ہے۔ بھارت میں مویشیوں کی پرورش کے لئے ان کو مناسب اور کافی مقدار میں غذا مہیا کرنا ایک اہم مسئلہ ہے جس پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ مویشیوں کی پرورش اور ان کی نسل افزائی کے لئے سائنسدانوں کا بین الاقوامی تعاون نہایت ضروری ہے۔ تاکہ مختلف ملکوں کے تجربات سے دنیا کے سب ملک فائدہ اٹھا سکیں۔ متحدہ اقوام کے ادارۂ خوراک وزراعت نے سنہ ۱۹۵۰ء میں ایشیا اور دور پورب کی ایک علاقائی کانفرنس منعقد کر کے اس جانب پیش قدمی کی تھی۔ یہ میٹنگ لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی۔ بھارت کے نمائندہ سردار داتار سنگھ صدر منتخب کئے گئے تھے۔ اس کانفرنس کی کارروائی اور بحث مباحثے ایک کتاب کی صورت میں شائع کئے گئے ہیں منصوبے کے مطابق مستقبل میں اس قسم کے اور اجلاس بھی منعقد کئے جائیں گے۔

سوگباشی گرجاشنکر باجپائی

۵۔ دسمبر سنہ ۱۹۵۴ء کو اتوار کی رات کے ڈھائی بجے گورنر بمبئی شری گرجاشنکر باجپائی انتقال فرما گئے۔ شری باجپائی کی موت سے ہندوستان ایک قابل اور پر اعتماد شخصیت سے محروم ہو گیا جس نے بین الاقوامی حلقے میں اپنے ملک کی ممتاز خدمات انجام دی تھیں۔

شری گرجاشنکر باجپائی ۳۔ اپریل سنہ ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد سنہ ۱۹۱۴ء میں انڈین سول سروس میں داخل ہوئے تھے، اور اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت کی بدولت سرعت سے ترقی کی۔ سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں لندن کی امپیریل کانفرنس اور تخفیف اسلحہ جات کے متعلق واشنگٹن کانفرنس کے دوران مرحوم نے ہندوستان کی طرف سے سکریٹری کی حیثیت سے خدمت سرانجام دی تھی۔ بہت سی ممتاز خدمات انجام دینے کے بعد مرحوم ۳۶ سال کی عمر میں سنہ ۱۹۲۷ء میں حکومت ہند کے سکریٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔

بین الاقوامی معاملات میں مرحوم کی خدمات کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ چنانچہ آپ مئی اپریل کانفرنس میں مسلسل بین الاقوامی انجمن کی جنرل اسمبلی کے نظم ونسق اور ہندوستان کی اصلاحات کے متعلق راونڈ ٹیبل کانفرنسوں میں بھی شرکت کی تھی۔ گورنر جنرل کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد شری گرجاشنکر باجپائی کو امریکہ میں ہندوستان کا ایجنٹ جنرل مقرر کر دیا گیا تھا۔ ازاں بعد مرحوم نے کئی بین الاقوامی اداروں اور کانفرنسوں میں ہندوستان کی نمائندگی کی تھی۔

آزادی کے بعد شری باجپائی نے "انڈین فارن سروس" کو منظم کیا اور دوسرے ممالک کے ساتھ ہندوستان کے سفارتی تعلقات قائم کرنے میں مدد دی۔ وزارت امور خارجہ کے جنرل سکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد سنہ ۱۹۵۲ء میں مرحوم گورنر بمبئی کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔

ہندوستانی ڈرامہ

تامل ڈرامہ

تامل کی پرانی کتابوں میں جب "سوانگ" یا تماشہ اور ادبی ناٹکوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ لیکن ایک بھی پرانا ڈرامہ زمانے کے دست بُرد سے بچ کر ہم تک نہیں پہنچا۔ غالباً تفریحات کے ان دونوں ڈھانچوں پر بھارت نیتم اور کتھا کلاک شیپم چھا گئے۔ بھارت نیتم خالص ناچ ہوتا تھا جس میں ابتدائی ایکٹنگ کے امکانات کا امتزاج بھی پایا جاتا کتھا کلاک شیپم قصہ گوئی کو کہتے تھے جس کے ساتھ سنگیت اور ایکٹنگ کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔

ساتویں صدی عیسوی میں ایک راجہ مصنّف راجہ مہندر ورمن نے جو سنت اپار کا چیلا تھا ایک دلچسپ ڈرامہ لکھا۔ یہ بالکل جدید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں شراب نوشی اور مذہبی تعصّب کے خلاف طنز کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن یہ ڈرامہ جس کا عنوان ہے بھگت ولاس پرداسنم' سنسکرت اور پراکرت کی ایک ملی جلی زبان میں لکھا گیا ہے۔ گیارھویں صدی میں "راجا راجا چولا جس نے تنجور کا مشہور مندر تعمیر کیا' اس نے اسی مندر میں ناٹک کی سالانہ تقریب کا افتتاح کیا۔ لیکن یہ سالانہ تقریب اس کے موجد کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔ پھر یہ صحیح معنوں میں ڈرامہ بھی نہیں تھا۔ جس چیز کو ہم ڈرامے کا روپ کہہ سکتے ہیں وہ سڑکوں کے جلوس تما رقص میں پایا جاتا تھا۔ اس میں گاؤں کے عام دستکار (خصوصاً دھوبی جن کے پاس ہر قسم کے کپڑے ہوتے تھے) عموماً پُرانوں کے ناٹک کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی "نلا تھنگال" جیسے بڑے بڑے ڈرامے بھی کھیلے جاتے تھے۔ ان کے پاس اسٹیج کی کچھ ملکیت بھی ہوتی تھی۔ اور ان ناٹکوں میں زیادہ تر مقبول عام اقتباسات اور پُرانے گیت ہوتے تھے۔ اس کا نام دیہی "بھیر وکوتو" تھا یہ چیز اب بھی بعض مقامات پر پائی جاتی ہے۔

جب تنجور کے مرہٹہ راجوں خصوصاً سرابوجی مہاراجہ کے عہدِ حکومت میں تامل ادب اور ثقافت تخلیقی عروج کی طرف مائلِ پرواز تھے اس وقت ڈرامے کی ایک نئی قسم "کوراونجی" (خانہ بدوشوں کے ناٹک) نے رواج پایا اس ناٹک کی نمایاں خصوصیات لوک گیت اور غنائیت (بھاگو ماں دی چندو اور تھیلانا) ہیں۔ اس ناٹک کی ایک قسم "کترالا کوراونجی" بہت مشہور ہے "کوراونجی" میں فن رقص کھپت بھی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اس ناٹک کے موضوع تو دیوتا ہوا کرتے تھے لیکن پھر بھی اس میں انسانی جذبات کے سلسلے میں موسیقی اور تماشہ گری کے معاملات خصوصاً محبت، ہجر اور وصال کی کیفیتوں کا اظہار ہوتا تھا۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں عوامی ناٹک کی تجدید ہوئی۔ ۱۸۶۶ء میں پانڈیچری کے مقام پر "سارنگ کو اسٹیج کیا گیا۔ یہ ڈرامہ ہندی کے پورن بھگت ناٹک سے مشابہت رکھتا تھا اور اس کی کہانی بھی بعینہ وہی تھی جو بنگالی ڈرامہ نویس گریش چندر کے ناٹک "پورن چندر" کی ہے۔ اس طرح ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ خصوصاً ضلع تنجور میں عوامی اسٹیج مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا جبکہ ناٹک کھیلنے والوں کے گروہ گاؤں گاؤں گھومتے اور معمولی تھیٹروں میں ڈرامے کیا کرتے۔ "نولی" "کویلن" اور ہریش چندر کا شمار مقبول عام ڈراموں میں ہوتا تھا۔ ان میں اور دوسرے ناٹکوں میں زیادہ تر صوتی موسیقی پر زور دیا جاتا جس کا اکثر ڈرامے سے کم ہی تعلق رہتا۔

پھر مغرب کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ سندرم پلّے کا ڈرامہ "مانون مینم" نظم میں لکھا گیا ہے اور ناٹک کے درمیانی وقفہ میں مزاحیہ نقل بھی ہے۔ اور یہ چیز ایک جوگی کے کیریکٹر کی شکل پیش کی گئی ہے۔ لکشمن پلّے کا ناٹک "ستنیہ وتی" شکسپیر کے ڈرامہ "سمبیلائن" کی طرز پر لکھا گیا ہے اس دور کے دوسرے ڈرامے وی۔ جی سوریہ نارائن شاستری کے ناٹک

"رد پادتی" اور "کلاوتی" ہیں۔

شہر مدراس کے ارباب ذوق نے اس صدی کے ابتدائی سالوں میں "سگن ولاس سبھا" قائم کی جو تامل ناڈ میں جدید تھیٹر کے آغاز کی نشاندہی کرتی ہے۔ سبھا کے ایک کرتا دھرتا شری پی سمبندا مدالیار نے جو اب مدراس ہی میں بود و باش رکھتے ہیں متعدد ایسے ڈرامے لکھے جن کے غیر مذہبی پلاٹ جدید یورپ کے طرز کے ہیں۔ انھوں نے اور ان کے دوستوں نے اسٹیج میں کئی اصلاحات بھی کیں ان کی کامیابیوں کی بدولت ڈرامے کے پیشے کو نئے سرے سے احترام کی جگہ نصیب ہوئی۔ ازاں بعد متعدد اداروں نے ان کی تقلید کی جس میں مدراس سیکر ٹریٹ ایسوسی ایشن (ڈرامیٹک کلب) سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اور کوپنیہ کمپنی نے اسٹیج کے فن کو چلا دیا۔ اس طرح عوامی روایات میں نئی جان آگئی۔ آج اس سلسلے میں نواب راجا منکم کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ان کے ناٹکوں میں جا بجا گیت ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے اسٹیج کا فنی اعلیٰ ترین ہوتا ہے۔ مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان ڈراموں کو دیکھنے کے لئے لوگ بھاری تعداد میں کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ اعلیٰ ادبی ڈراموں میں "سمو کا ٹی سپا تھم" جیسے ناٹک میں اس ناٹک کے نیشنل ڈرامہ فیسٹول" میں تامل روایات کی نمایندگی کی اور نئی دہلی میں اسٹیج کیا گیا۔ یہ ڈرامہ پلاوادُں اور چالوکیوں کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ عصر جدید کی زندگی اور مسائل سے بحث کرنے والے سماجی ڈرامے بھی لکھے جا رہے ہیں۔ اس کی ایک حالیہ مثال "رتھ پاسم" ہے۔ تامل اسٹیج نے ٹی۔ کے۔ ایس برادرس جیسے ذہین ایکٹروں کو بھی جنم دیا ہے جو اس کا معیار بلند کرنے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔

مراٹھی ڈرامہ

اگرچہ جدید اصطلاح کے لحاظ سے مراٹھی ڈرامہ لگ بھگ ۱۰۵ سال پہلے عالم وجود میں آیا۔ تاہم تنجور لائبریری میں مرہٹی ڈراموں کے پرانے مسودات کا جو ذخیرہ موجود ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں بھی ڈرامہ مہاراشٹر میں مقبول تھا۔ جدید طرز کا پہلا مرہٹی ڈرامہ "سیتا سویمبر" ۱۸۴۳ء میں لکھا گیا جسے وشنو داس بھاوے نے سانگلی کے مقام پر اسٹیج کیا۔

مرہٹی ڈرامے کا آغاز 'للت' اور 'تماشہ' کی قسم کی تفریحات سے ہوتا ہے۔ 'للت' دھارمک تہواروں پر اسٹیج کیا جاتا تھا۔ اس کا موضوع مہابھارت اور پورانوں کے واقعات سے لیا جاتا۔ 'للت' میں بھگتی کے گیت بھی شامل کر لئے جاتے۔ روایاتی شخصیتوں کے علاوہ برہمن، سادھو اور درزی وغیرہ کے کیریکٹر بھی ان میں جگہ پاتے۔ پیشواؤں کے آخری دور میں تماشے بہت مقبول تھے۔ دراصل 'تماشے' 'للت' اور جدید ڈرامے کی درمیانی کڑی ہیں۔ تماشوں میں نثر کا حصہ برائے نام ہوتا تھا۔ اصل کہانی شاعری کی ایک قسم 'لاونی' کے ذریعے بیان کی جاتی۔

۱۸۴۳ء میں وشنو داس بھاوے کے ڈرامہ 'سیتا سویمبر' کی بدولت مرہٹی ناٹک کی روایاتی ہئیت اور روپ میں خوشگوار تبدیلی عمل میں آگئی۔ بھاوے نے 'دود شنک' اور 'سوتر دھار' کو رواج دیا۔ ناٹک کے کیریکٹروں کا مکالمہ نثر میں ہوتا تھا لیکن 'سوتر دھار' کے ذریعے سنگیت کا وقفہ کیریکٹروں کے جذبات کے اظہار کا کام دیتا۔

سنگیت کے ڈرامے کی روایات کی مضبوط نیو اس وقت پڑی جب انا صاحب کرلوسکر نے 'شکنتلا' کو اسٹیج کیا۔ متعدد ڈرامہ کمپنیاں عالم وجود میں آئیں جنہوں نے آرٹ کے اس شعبے کو وسیع پیمانے پر مقبول بنانے میں مدد دی۔ کرلوسکر ناٹک منڈلی کے بعد گندھرو ناٹک منڈلی قائم ہوئی جس کے موسس بال گندھرو تھے۔ بال گندھرو گانے اور زنانہ پارٹ ادا کرنے میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ ازاں بعد سودیش ہت چنتک منڈلی نے جنم لیا۔ اس کے بعد 'للت کلا آدرش منڈلی' معرض وجود میں آئی۔

اگرچہ ڈرامہ اس دور میں زیادہ تر سنگیت کی تفریحات کا ایک شعبہ تھا پھر بھی اس میں سماجی خیالات جذب ہونے لگے۔ اس مقصد کے لئے نثر کا ڈرامہ بہترین وسیلہ ثابت ہوا۔ چنانچہ گڈکری کے ڈرامہ "پریم سنیاس" نے بڑے مؤثر پیرائے میں بیوہ کی شادی کا مسئلہ پیش کیا۔ گووند بلال دیول نے بھی سماجی تنقید کی اس روایت کا ساتھ دیا۔ گووند بلال نے سدرا کا کے ناٹک "مرچ کٹک" کا ترجمہ کیا اور اس طرح ڈرامے کی دنیا میں قدم رکھا۔ اس کے بعد انھوں نے "شاردا" جیسے سماجی ڈرامے بھی لکھے۔ "شاردا" کا انتخاب نیشنل ڈرامہ فیسٹول کے لئے کیا گیا۔ اس ناٹک کا پلاٹ ایک دولت مند بوڑھے آدمی کے اردگرد گھومتا ہے جو

کسی غریب گھرانے کی دوشیزہ سے بیاہ رچانا چاہتا ہے۔

کرشناجی پربھاکر کی تصانیف کی بدولت تاریخی ناٹکوں کی داغ بیل پڑی۔ پربھاکر کا دوسرا نام کاکا صاحب کھڈیلکر ہے۔ ان کے نثر کے ڈراموں میں شیواجی اور تاریخ مہاراشٹر کے دوسرے سورماؤں وغیرہ کے حالاتِ زندگی قلمبند کئے گئے ہیں۔ ان ڈراموں میں جہاں حب الوطنی کا جذبہ کارفرما تھا وہیں ان میں انقلابی مواد بھی کافی موجود تھا گو کہ یہ چیز روایاتی کہانیوں کی شکل میں پیش کی گئی تھی۔ مثال کے طور پر کھڈیلکر کے ڈرامہ "کیچک ودھ" میں لارڈ کرزن کی پالیسیوں پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ بعدازاں اس پر پابندی لگادی گئی۔ نیشنل فیسٹول میں مہاراشٹر کے تواریخی ناٹکوں کی روایات کی نمایندگی کے لئے کھڈیلکر کا ڈرامہ "بھاؤ بندکی" چنا گیا ہے اس ناٹک میں مرہٹہ تاریخ کا ایک دردناک باب یعنی نارائن راؤ پیشوا کے قتل کا واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں بھی ایک واضح اپیل ہے کیونکہ رام شاستری کا کیریکٹر لوکمانیہ تلک کی شخصیت کے رنگ ڈھالا گیا تھا۔ ایکٹر رام شاستری کا پارٹ ادا کرتے وقت لوکمانیہ تلک کا لباس پہنتا اور وہی الفاظ استعمال کرتا جو مؤخرالذکر نے اپنے مقدمے کے دوران میں کہے تھے۔

رومانی ڈرامے کا رواج کولھاٹکر نے شروع کیا۔ انھوں نے ہلکے گانوں اور ہلکے پھلکے گانوں کو مقبول بنایا جو اردو غزلیات کے نمونے پر لکھے گئے تھے۔ کولھاٹکر نے ذومعنی الفاظ کا استعمال بڑی ہوشیاری سے کیا

آج سماجی ڈرامے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جہاں تک ناٹکوں کو اسٹیج کرنے کا تعلق ہے۔ کولھاپور کے مرحوم کیشو راؤ بھونسلے نے بہت عمدہ کام کیا ہے۔ انھیں آرٹ ڈائرکٹر مرحوم آنند راؤ پینٹر کا تعاون حاصل تھا۔ اس قسم کے جدید ڈراموں میں ماما واریکر کا ڈرامہ "ستاپچے غلام" بھی تھا جسے ۱۹۲۲ء میں للت کلا آدرش نے اسٹیج کیا تھا۔ سٹوس بلاکوں کے مناظر جدید فلیٹ جن میں نئے دور کے فرنیچر لگ رہے تھے اور بجلی کے قمقمے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے اور مکانات کے اندر کا وسیع اور شاندار حصہ۔ یہ ساری چیزیں اسٹیج پر مرہٹی ڈرامہ دیکھنے والوں کے لئے نئی تھیں۔ ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے قومی آزادی کی جدوجہد کی تحریک شروع کی تھی۔ ماما واریکر کا یہ ڈرامہ "ستاپچے غلام" جس کے معنی ہیں "حق کی رو سے غلام" اس تحریک سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔

جن تمثیل نگاروں نے نئے ذرائع کا استعمال کیا۔ ان میں پی کے اترے اور ایم جی رانگنیکر بھی ہیں۔ اترے کے ڈراموں میں طنز و مزاح کا عنصر غالب رہتا ہے جبکہ رانگنیکر میں سنجیدگی زیادہ پائی جاتی ہے اور ان کے ناٹک متوسط طبقہ کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ماما واریکر پہلے ڈرامہ نگار ہیں جنھوں نے ایک ایکٹ کے ڈرامے کو رواج دیا جس سماجی مسائل سے سنجیدگی سے بحث کی جاتی۔ ان کا پہلا ایک ایکٹ کا ڈرامہ "ترنگا چیادرانت" (جیل کے پھاٹک پر) ۱۹۲۳ء میں لکھا گیا تھا۔ اس میں چھوت چھات کے مسئلے کو چھیڑا گیا تھا۔ آج سماجی روایات کے حامل مرہٹی ڈرامے اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لئے سنیما کی صنعت سے دست و گریباں ہیں۔

گجراتی ڈرامہ

بارھویں صدی عیسوی میں گجرات میں سنسکرت کے نامور عالم رام چندر نے جنم لیا جنھوں نے لگ بھگ دس ڈرامے لکھے۔ انھوں نے ڈرامے کے فن پر بھی ایک رسالہ لکھا جس کا عنوان تھا "ناٹیہ درپن"۔ رام چندر کے تمام کے تمام ڈرامے سنسکرت میں تھے۔

اگرچہ اس کلاسیکی روایت نے گہری جڑ نہیں پکڑی تھی۔ پھر بھی ڈرامے کی عوامی روایات کو 'راسوں' کے ذریعے زندہ رکھا گیا۔ یہ راس زیادہ تر کرشن جی کی زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں بھاوائیوں کا بھی رواج ہوا۔ بھاوائیوں میں بیشتر سنگیت کا حصہ تھا اور مکالمے فی البدیہہ ہوتے بھاوائی میں ناپختہ کامیڈی کے عناصر چھپے ہوئے تھے کیونکہ ان کے کیریکٹر غیر سماجی افراد کا مذاق اڑایا کرتے ان میں گجرات کا گربا ناچ بھی شامل کر لیا جاتا تھا۔

سترھویں صدی میں پریم آنند نے گجراتی ڈرامے کی روایات کا معیار بلند کرنے کی جدوجہد کی تھی۔ ان کے "اکھیان" کا تانا بانا پورانوں کی کہانیوں کی بنیاد پر بنا جاتا۔ لیکن جدید اصطلاح میں جس چیز کو ڈرامہ کہتے ہیں اس کا وجود رنچھوڑ بھائی ادیارام (۱۸۳۸ - ۱۹۲۳ء) کا مرہون منت ہے۔ ان کا ناٹک "للت دکھ درشک" جو ۱۸۶۵ء میں اسٹیج کیا گیا تھا مؤثر سماجی ڈرامہ تھا۔ اس میں بچپن کی شادی کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک اسکول ماسٹر

پرورتم مہتا جی نے اس ناٹک کو اسٹیج کرنے کے لئے ایک ڈرامہ کمپنی قائم کی۔ یہ راہ پارسیوں وغیرہ کی روایات سے بالکل جدا تھی جنھوں نے ڈرامے کی قدر و قیمت کی بجائے پرشکوہ مناظر اور سنگیت کی بھرمار پر زیادہ زور دیا۔

داہیا بھائی ڈھول ساجی (۱۸۶۷-۱۹۰۶) اور ناما لال نے گجراتی ڈرامے کو مزید اونچی سطح پر اٹھانے کی کوشش کی۔ پہلے پہل تو انھوں نے اسٹیج پر توجہ دی۔ اس کے بعد انھوں نے ڈرامے کے ادبی پہلو پر بھی دھیان دیا گو ان کے بہت سے ڈراموں میں ڈرامے کی بجائے شاعری کا عنصر غالب رہا۔

تاریخی ڈراموں کا رواج بھی فروغ پا رہا تھا۔ اس سلسلے میں کنھیالال منشی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر بی۔ کے ٹھاکر نے گجراتی اسٹیج کی اصلاح کے لئے سماجی روایات کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ چندر ادن مہتا نے ناٹکوں میں حقیقت پسندی کا رنگ بھر دیا۔ برجھودیان دویدی جنھوں نے "سرودیہ" لکھا اور پرو تل دلبھائی ان دونوں تمثیل نگاروں نے انھیں روایات کو اپنایا۔

نیشنل ڈرامہ فیسٹول کے لئے چندر ادن کا ڈرامہ "نرام رات" منتخب کیا گیا۔ یہ ایک متوسط طبقے کے گھرانے کے بحران اور اصلاح سے بحث کرتا ہے۔

چین کے ڈرامے

چینی ڈرامے میں ناچ اور گانے کی بھی وہی اہمیت ہے جو ایکٹنگ کی ہے حضرت عیسیٰ سے قبل کے زمانے میں چاؤ خاندان کے مذہبی رسوم کا ناچ غالباً چینی ڈرامے کا منبع ہے۔ آٹھویں صدی میں شہنشاہِ منگ ہوانگ نے "ناشپاتی کے باغ کے نوجوان لوگ" نام سے زنانہ اور مردانہ ایکٹروں کی ایک کمپنی قائم کر کے خالص ڈرامے کی ترقی کو فروغ دیا تھا۔ لیکن اس کو ایک اہم ادب کی شکل میں استقلال اس وقت حاصل ہوا جب کانفیوشس کی اولاد میں سے کنگ تاؤ خو ایک سفیر کی حیثیت سے منگولیا گیا اور اس کے بعد عنانِ اختیار کیلائی خان کے ہاتھ میں آئی منگولوں کے عہد میں پچاس برس کے عرصے میں پانچ سو سے زائد ڈرامے لکھے گئے جن میں سے ایک سو تو ڈرامائی لٹریچر کے مستند نمونوں کے طور پر منتخب کئے گئے۔ "مغربی ایوان" کا رومان کا شمار بہترین ڈراموں میں ہوتا ہے۔ یہ سولہ مناظر کا ڈرامہ وانگ تھافو کی تصنیف ہے۔ اس کی زبان کو بارانِ برف کی طرح خوبصورت اور چاندنی کی طرح ملائم مانا جاتا ہے۔ اس میں ایک نوجوان اسکالر اور ایک خوبصورت لڑکی کی محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔

عوامی جمہوریہ چین کا ایک ثقافتی وفد حال ہی میں ہندوستان آیا تھا۔ یہ لوگ چین کے کلاسیکی اور عوامی سنگیت ناٹکوں میں سے منتخبہ نمونے بھارت کے لوگوں کے سامنے پیش کریں گے کلاسیکی نمونوں میں "مغرب کا سفر" نامی ایک بلند پایہ کلاسیکی ناول کے واقعات پر مبنی ایک ڈراما بھی شامل ہے اس ناول میں ہوان چانگ کی بھارت یاترا سے متعلق اس وقت کی زیادہ تر مقبولِ عام کہانیاں بیان کی گئی ہیں جو تانگ خاندان کے دورِ آخر سے لے کر منگ خاندان کے زمانے میں زبان زدِ عام تھیں۔ اس کتاب کا ہیرو بندروں کا بادشاہ سن ووکنگ ہے جسے ایک ہر دلعزیز ہیرو تصور کیا گیا ہے۔ دیگر کلاسیکی انتخاب میں سورما راجہ ہیانگ یو کی وہ المناک کہانی بیان کی گئی ہے جب اس کی سپاہ نے اس سے دغا کی اور وہ دشمنوں سے گھر گیا تھا۔ اس کلاسیکی سنگیت ناٹک میں "سبز نیلے پتھر کی ہیرپن" کے مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ یہ سونگ خاندان سے متعلق ایک دلکش داستانِ محبت ہے جس میں قوم کے جنگ آزما بہادروں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

عوامی اوپیرا کے انتخابات میں دوشیزہ ایمزان جیسی مقبول کہانیاں شامل ہیں۔ ایک دوبدو لڑائی میں ایک حسینہ اپنے مدِمقابل بہادر سردار کو مغلوب کر لیتی ہے اور پھر اس کا دل موہ لینے کے بعد اسے مکمل طور پر جیت لیتی ہے۔ ایک اور ناٹک میں ایک ایسے بزدل ظالم کا کردار پیش کیا گیا ہے جسے سماج کی بھلائی کے لئے مغلوب کر لیا جاتا ہے۔

گرجا شنکر باجپائی

انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ

انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ کے قیام کو پچیس سال پورے ہونے والے ہیں۔ چونکہ گزشتہ زمانے میں میرا اس ادارے سے تعلق بھی رہا ہے، اس لئے مجھ سے زرعی تحقیق کی رفتارِ ترقی کے بارے میں مضمون قلم بند کرنے کو کہا گیا ہے۔

زراعت سے متعلقہ رائل کمیشن نے، جس کے چیئرمین لارڈ لنلتھگو تھے، اپنی رپورٹ ۱۹۲۹ء میں پیش کی تھی۔ اس کمیشن کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ زراعت میں ترقی اور اصلاح کے اقدامات کی بدولت ہندوستان کی دیہی آبادی کو مطمئن کرنے میں دور رس نتائج برآمد ہوں گے۔ اس طرح قومی آزادی کا مطالبہ کمزور پڑ جائے گا۔ لیکن آئینی اصلاحات کے سائمن کمیشن کی طرح یہ کمیشن بھی لوگوں کو مطمئن نہ کر سکا۔

بہرحال کمیشن نے اپنے محدود دائرۂ عمل میں ہندوستان کی زراعت میں مربوط تحقیق و تدقیق کی غرض سے ایک مفید نظام اور متعدد طریقے ضرور تجویز کر دئے تھے کیونکہ تحقیقات کے کاموں میں ارتباط کا فقدان ملک کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ لہٰذا رائل کمیشن نے زرعی تحقیقات کی ایک ایسی کونسل کے قیام کو کافی خیال کیا جو زراعت کے ماہرین اور مویشیوں کے ماہر ڈاکٹروں پر مشتمل ہو۔ اگرچہ اس تجویز نے صوبوں کے وزراء کو مایوس کر دیا تھا اور سرکاری ماہرین پر مشتمل ادارے سے خاطر خواہ نتائج کی امیدیں بھی ٹوٹ گئی تھیں لیکن رائل کمیشن کے ارکان اور وزیرِ ہند کو اس نوعیت کے ادارے سے بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔

سر محمد حبیب اللہ مرحوم اس وقت گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن برائے زراعت تھے اور میں محکمہ زراعت کا سیکرٹری تھا۔ رائل کمیشن نے مذکورہ کونسل کی مالی امداد کے لئے یہ بھی سفارش کی تھی کہ مرکزی حکومت کی آمدنی میں سے پچاس لاکھ روپے کی امداد سے ایک ایگریکلچرل ریسرچ فنڈ قائم کیا جائے اور وقتاً فوقتاً اس فنڈ کو مزید مالی امداد بھی دی جائے۔ قانون سازی کی بنا پر اس سفارش میں کچھ نقائص بھی تھے جن کو اس وقت کے وائسرائے لارڈ ارون کے سامنے مدلل طریقے سے پیش کیا گیا اور مجھے ایک متبادل اسکیم مرتب کرنے کا حکم دیا گیا۔ لہٰذا میں نے ایک ایسی تنظیم مرتب کی جس کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ نگران مجلس کا ہو جس میں وزرائے زراعت شامل ہوں اور دوسرا حصہ مشاورتی بورڈ کا ہو جس میں زیادہ تر ڈائرکٹران زراعت اور علاج الحیوانات کی سروسوں کے افسر شامل ہوں۔

اس سلسلے میں ایک متبادل اسکیم تیار کرنا ہی کافی نہ تھا بلکہ مجلس قانون ساز کے ارکان کی حمایت بھی حاصل کرنا ضروری تھا کیونکہ اس وقت انڈیا آفس میں لارڈ برکن ہیڈ جیسی شخصیت وزیرِ ہند تھی اور اسمبلی میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ اور مسٹر محمد علی جناح جیسی با اثر شخصیتیں موجود تھیں۔ الغرض رائل کمیشن کی اصل تجاویز کے پہلو بہ پہلو متبادل اسکیم کے متعلق مذکورہ بالا اشخاص سے تبادلۂ خیالات کر کے ان کی تائید حاصل کی گئی اور اس متبادل اسکیم کو وزیرِ ہند کے سامنے پیش کر دیا گیا جو بہت پس و پیش کے بعد منظور کر لی گئی۔

محکمہ تعلیم صحت و اراضی سے علیحدہ ہونے کے دو سال بعد پریذیڈنٹ فرینکلن ڈی روزویلٹ کی طرف سے منعقد کردہ خوراک و زراعت کی بین الاقوامی کانفرنس میں مجھے ہندوستان کی نمائندگی کرنے کی خدمت سپرد کی گئی تھی۔ میرے ہمراہ اس کونسل کے دوسرے چیئرمین شری فیروز کھارے گھاٹ بھی تھے۔ ہم نے ہندوستان میں جو تجربات حاصل کئے تھے وہ اس موقعہ پر بیش بہا ثابت ہوئے۔ اس کانفرنس کے بعد مجھے اس کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا تھا جس نے اقوام متحدہ کے ادارۂ خوراک و زراعت کا دستور مرتب کیا تھا۔ اس دستور میں انھیں امور کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ ہندوستان میں کامیابی سے سرانجام دے چکی تھی۔ بہرکیف ہندوستان کی زرعی تحقیق کونسل کو بھی بنی نوع انسان کی سودمندی اور بہبود کے سلسلے میں ایک اہم خدمت سرانجام دیتی ہے۔ اس کونسل کے پہلے پچیس سالہ دور کی کامیابیاں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے مستقبل کے لئے ایک نیک فال ہے۔

ع م

نئی کتابیں اور رسالے

کیفِ سرمدی

مصنّف ایس، پی نگم ناشاد کانپوری ایم اے۔ مجموعۂ کلام۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت دو روپے۔ کتاب مجلّد ہے۔ کتابت طباعت وغیرہ عمدہ۔ ملنے کا پتہ۔ دوارکا بھون۔ کاشی ڈیرہ لکھنؤ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی پروفیسر ضیا احمد ضیا اور منشی شیام موہن لال جگر بریلوی نے شروع میں کلامِ ناشاد پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اور حق یہ ہے کہ بڑی حق گوئی سے کام لیا ہے۔ ایسے باکمال شاعر کا کلام اتنی مدّت تک زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوا۔ اس کے لئے ناشاد صاحب کی متانت اور انکسار ہی ذمہ دار ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔ یہ کلام جب پڑھ کر واقعی کیف سرمدی حاصل ہوتا ہے آپ نے عمر کے سینتالیسویں سال میں شائع فرمایا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا دامن سستی شہرت کی ہوس سے آلودہ نہیں۔ صنفِ غزل کی باریکیوں کو آپنے خوب سمجھا ہے اور غزل کے مزاج کو خوب پایا ہے۔ چھوٹی بحر کی غزلوں میں بالخصوص آپ نے بہت اچھے شعر نکالے ہیں۔

تم سچے لو میں ہی جھوٹا   کون بڑھائے تم سے بات
عشق کا بھی کیا کھیل ہے پیارے   پیچھے بازی پہلے مات

صدّیقی صاحب نے خوب فرمایا ہے۔

"غزل میں حُسن و محبت کا ذکر ہوتا ہے اور حُسن و محبّت کے کاروبار میں "ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے" جس شامت یا شادمانی سے دوچار ہوتے ہیں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی لیاقت سے کبھی حماقت سے۔ کہیں شرافت سے کہیں شہدپن سے۔ لیکن ان مدارج سے گزر کر غزل اب وہاں پہنچ گئی ہے جہاں ممکن ہے آپ سب کو دھوکا دے سکتے ہیں، غزل کو نہیں دے سکتے"

ناشاد صاحب نے فی الحقیقت غزل کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ آپنے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے مجموعے میں اچھے اشعار کی تعداد بہت ہے۔ اوسط درجے کے اشعار کم اور گھٹیا اشعار نادر ہیں۔ یہی اچھے کلام کی دلیل اور معیار ہے۔

زبان کی بے ساختگی اور اسلوبِ بیان کی ندرت ناشاد صاحب کے کلام کا طرّۂ امتیاز ہے۔ پیچیدہ بیانی اور دقّت کہیں نہیں۔

تذکرہ تھا گردشِ ایّام کا   آپ کیوں تیور بدل کر رہ گئے

سیدھے سادے الفاظ ہیں مضمون میں بڑی وسعت ہے، اور دونوں مصرعے باہم جان و دو قالب ہیں۔ محاکات کا کیا کہنا۔ کچھ اور شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ترکِ محبت کر دیں لیکن! — اس پر بھی جب وہ یاد آئیں
وقت کی خوبیاں معاذ اللہ — ہم بھی اپنے نظر نہیں آئے
بھا گئی ہیں دہر کی نیرنگیاں — ہو گیا ذوقِ نظر برباد کیا
یہ دل میں کون چھپتا جا رہا ہے — ستارے جھانکتے ہیں آسماں سے
بیل محبّت کی جب بوئی   پھول ہنسے اور شبنم روئی
کوئی دُکھ کا مارا رویا — دنیا چادر تان کے سوئی
بُرا ہو بے خودیٔ عشق کا خبر نہ ہوئی   ہزار بار گلے سے لگا لیا تونے

کتنے اشعار ہیں کہ ضرب المثل بن جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کوئی ہنستا ہے کوئی روتا ہے — یہی دنیا میں روز ہوتا ہے
دل کا ایمان اور ہی کچھ ہے — عاشقی ذات پات کیا جانے
ایک دل کی کلی نہ کھِل پائی — پھول لاکھوں کھِلے بہار آئی
جب تصوّر میں اُن کو لاتا ہوں — دونوں عالم کو بھول جاتا ہوں
یہی کیا کم ہے تم نے پوچھ لیا   اور اس سے زیادہ کیا کرتے

بعض سالم غزلیں ایسی ہیں کہ سحرِ حلال کا درجہ رکھتی ہیں۔ موسیقی اور گھلاوٹ کے ساتھ معنی آفرینی کا کمال بھی ہے۔ مثلاً

۱۔ پریم کہانی کون سُنائے   درد کی دولت کون لُٹائے

۲۔ جھوٹی دُنیا جھوٹی مایا — کون ہے اپنا کون پرایا
۳۔ وہ کس سے کرتے ہیں بات — اُن کا دن ہے اُن کی رات
۴۔ دنیا ہے آئینہ خانہ — ہم جیسے تھے ویسا دیکھا

چند نظمیں، گیت اور قطعات بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ لیکن ناشاد کا مزاج خالص غزل کا مزاج ہے، وہ دوسرے اصنافِ سخن میں بھی نمایاں ہے۔ یہ مجموعہ ہر چند مختصر اور بہ قامت کہتر ہے۔ لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے بہتر ہے۔ ع

پس از مدت گذر اُفتاد بر ما کاروانے ما

مزاحیہ افسانے

کرشن چندر کے ایک درجن مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ۔ ناشر آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل دہلی۔ قیمت تین روپے۔ ضخامت ۲۴۴ صفحے۔ کتاب مجلّد اور جلد پوش کی حامل ہے۔

کرشن چندر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی طبیعت اور مزاج میں مزاح کے صحت مند عناصر پوری آب و تاب سے جلوہ نما ہیں۔ اُردو میں اچھا مزاحیہ ادب کم یاب ہے۔ یہ مجموعہ اس کمی کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

اپنی موج میں

پبلشر ادارۂ فروغِ اُردو، امین آباد پارک لکھنؤ۔ حضرت آوارہ اپنی موج میں بہنے والے لوگوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ یہ تصنیف انھیں کے قلم کی خلاقی کی مظہر ہے۔ ان چھبیس لفظی خاکوں میں آوارہ صاحب نے ایسے کرداروں کی جیتی جاگتی تصویریں بھر دی ہیں جو قوم کی تمدنی زندگی کا جزو اعلیٰ رہے ہیں، اور اب مٹتے جا رہے ہیں۔ ان کرداروں کی بول چال اور اُن کے فن کے کمالات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں، اور وہ بھی خالص "آوارگی" کے رنگ میں۔ فسانۂ آزاد کے کردار اب تک ہمارے ادب کا دلچسپ سرمایہ بنے ہوئے ہیں۔ یقیناً آوارہ کے بٹیر باز، مرغ باز، پتنگ باز، کبوتر باز اور نہ جانے کیا کیا باز زندہ و پائندہ کردار ہیں۔ ان کا مشاہدہ، اصطلاحات پر عبور، زبان پر قدرت، اس کتاب کی اہمیت میں اضافے کا موجب ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ: ہندوستان میں۔ انوار بک ڈپو۔ امین آباد پارک لکھنؤ
پاکستان میں۔ مبارک بک ڈپو بندر روڈ مقابل ڈینو ہال کراچی ۲

نادر روزنامچہ

مرتّب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی لکھنؤ یونیورسٹی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔
پبلشر، ادارۂ فروغِ اُردو، ۳۷۔ امین آباد پارک لکھنؤ
ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ کتاب مجلّد اور جلد پوش کی حامل ہے۔

مولوی مظہر علی سندیلوی نے ۱۸۶۲ء میں اپنا روزنامچہ لکھنا شروع کیا تھا، اور پورے ۴۵ سال تک لکھتے رہے۔ یہ روزنامچہ ۸ ہزار فل سکیپ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک عہد کی داستان اور تاریخ ہے۔ اس میں ہندوستان، ریاستوں، تعلقوں اور بیرونِ ہند کے حالات کے ساتھ ساتھ مقامی اور ذاتی کوائف و معلومات درج ہیں۔ اس روزنامچے کا خلاصہ مرتب نے رسالہ اُردو، شمارہ بابت جنوری ۱۹۳۹ء تا جنوری ۱۹۴۲ء میں باقساط شائع فرمایا تھا، اب یہ ترمیم و اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ یہ صنف ادب اُردو میں قریب قریب ناپید ہے۔ امید ہے یہ کتاب قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

اُردو تنقید کی تاریخ (پہلی جلد)

مصنّف مسیح الزماں صاحب لکچرار الہ آباد یونیورسٹی

ملنے کا پتہ۔ خیابان ۱۱۰ سبزی منڈی الہ آباد ۳۔ قیمت تین روپے

مصنّف کا ارادہ اس کتاب کو تین جلدوں میں ختم کرنے کا ہے پہلی جلد میں ابتدا سے تقریباً ۱۸۵۷ء تک کی تنقیدی تحریروں کا جائزہ ہے۔ دوسری میں ۱۸۵۷ء کے نتائج اور جدید تنقید کا ذکر ہوگا، اور تیسری میں ترقی پسند مصنفین کی تنظیم اور اس کے بعد کا بیان۔ مواد کی فراہمی بڑی محنت سے کی گئی ہے۔ پرانے تذکروں اور دوسری تحریروں میں نقد و نظر کے جو آثار ملتے ہیں ان کا ذکر اختصار اور سلیقے سے اس جلد میں ملے گا۔ عربی اور فارسی کے اصول نقد، اُردو تنقید کا پہلا دور۔ فائز سے باقر آگاہ تک، دوسرا دور میر سے مصحفی تک، تیسرا دور گلزار ابراہیم اور گلشن ہند سے طبقات شعرا تک، اور آخر میں غدر کے بعد پرانا اسکول کے جلی عنوانات کے تحت اردو تنقید کی تاریخ بیان کی گئی ہے، مصنّف نے ان اقوال کو کہ اُردو میں تنقید کا وجود فرضی ہے، اور حالی سے پہلے اُردو میں تنقید نہیں تھی غلط ثابت کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مصنّف کی اس قدر حوصلہ افزائی ضرور ہوگی کہ بقایا دونوں جلدیں جلد منظرِ عام پر آجائیں۔

ساحل اور سمندر

مصنف سید احتشام حسین ۔ ضخامت ۳۶۸ صفحات ۔ کتابت، طباعت عمدہ ۔ ملنے کا پتہ :- سید وجاہت حسین سرفراز قومی پریس لکھنؤ

اردو میں سفرنامہ اور ڈائری بہت کم لکھا گیا ہے ۔ احتشام صاحب نے اپنے امریکہ اور انگلستان کے سفر سے متعلق تاثرات کو اس کتاب میں درج فرمایا ہے ۔ خود ان کے قول کے مطابق یہ سفرنامہ اور ڈائری ادبی، فلسفیانہ یا علمی مباحث سے گراں بار نہیں ۔ اس میں تاریخی، سیاسی، جغرافیائی معلومات یا مختلف قسم کے اعداد و شمار کو بھی یک جا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ جہاں کہیں یہ آگئے ہیں ان کا ذکر کر دیا ہے ۔ سفرنامے کے حالات بہت دلچسپ ہیں ۔ احتشام حسین اردو کے مستند نقاد بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ نقادوں کے قافلے کے سالاروں میں سے ہیں ۔ آپ سے یہی امید کی جا سکتی ہے کہ آپ تصویر کا ہر رُخ پیش کریں ۔ سفر کے حالات یا ڈائری میں خاص دیانت داری جھلک رہی ہے ۔ دس مہینے کی مُدت میں آپ نے جو دیکھا یا محسوس کیا اُسے اختصار آمیز وضاحت سے آپ نے بیان فرما دیا ہے ۔ آپ نے مغرب کی ہماہمی کا نظارہ کیا ۔ علمی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں ۔ ادبی اور صنعتی اداروں کو دیکھا ۔ سیاست دانوں سے ملے ۔ اقتصادی اور سماجی مسائل پر گفتگو کی ۔ سائنس کے کرشموں سے ترقی یافتہ دنیا کی سیر کی ۔ ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد جو اثر آپ پر ہوا اس کا نچوڑ آپ نے سخن ہائے گفتنی کے عنوان سے کتاب کے آخر میں درج کر دیا ہے ۔ یہ صفحات احتشام صاحب کے نقطۂ نظر کی وضاحت کما حقہ کرتے ہیں ۔ سفر سے پہلے اور سفر کے بعد کے احتشام میں کوئی نظریاتی فرق نظر نہیں آتا ۔ معلومات اور تماشا کی خیرہ کن روشنی میں بھی انھیں ہر چیز اپنے اصلی رنگ میں نظر آتی دکھائی دیتی ہے ۔

رسالے

فکر و نظر ۔ ادارۂ ادب علی گڑھ کا چار ماہی رسالہ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی نے شائع کیا ہے ۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ چار آنے

ادارت کی عمارت ادب کے نو ستونوں پر کھڑی ہے، قاضی عبد الغفار، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عبد العلیم، اختر انصاری، جذبی، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر منیب الرحمن، خلیل الرحمن اعظمی، اور ڈاکٹر مسعود حسین کے اسمائے گرامی رسالے کے اسم بامسمّی ہونے کی ضمانت ہیں ۔ زیرِ نظر شمارہ اچھی اور معیاری تخلیقات کا حامل ہے ۔ جدید غزل پر رشید احمد صدیقی کا مقالہ ایک قابل قدر مضمون ہی نہیں بلکہ شمع ہدایت ہے ۔

کردار ۔ مفتی صدیقی کی ادارت اور علامہ محوی صدیقی لکھنوی کی سرپرستی میں یہ رسالہ بھوپال سے شائع ہو رہا ہے ۔ سالانہ چندہ چار روپے اردو کے نامور ادیبوں کے نگارشات اس میں شائع ہوتے ہیں ۔ رسالے کا ادبی معیار اچھا ہے ۔ بھوپال جیسے مقام سے ایک اچھے رسالے کا اجرا اور اس کا زندہ رہنا فال نیک ہے ۔

کونگ پوش ۔ کشمیر سٹیٹ کلچرل کانفرنس کا یہ دوماہی رسالہ سری نگر سے شائع ہوتا ہے ۔ زرِ سالانہ چھ روپے ۔ کشمیر اور کشمیری ادب سے متعلق مضامین اس میں شائع ہوتے ہیں ۔ لکھائی چھپائی مزید توجہ کی محتاج ہے ۔ غالباً کشمیر میں بہتر ذرائع طباعت کے میسّر نہیں ۔

برگِ گل ۔ اردو کالج کراچی کا شائع کردہ منتخب مضامین کا یہ مجموعہ حسین و جمیل بڑے اہتمام سے ٹائپ میں چھپا ہے ۔ بڑی تقطیع کے ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ مضامین دلچسپ اور معیاری ہیں ۔ تصاویر بھی شامل ہیں ۔ قیمت درج نہیں ۔

کرنیں ۔ شفیقہ فطرت کی ادارت میں بچّوں کا یہ رسالہ ناگ پور سے شائع ہوتا ہے ۔ ملنے کا پتہ :- "کرنیں نیو کالونی ناگ پور" ۔ چندہ سالانہ چار روپے رسالہ خوبصورت ہے ۔ تصاویر سے آراستہ ہے ۔ بچّوں کے لئے بہت دلچسپ نظمیں اور مضمون اس رسالے میں شامل ہیں ۔

چاند ۔ فیض انصاری کی ادارت میں بچّوں کا یہ رسالہ بھی ناگ پور سے شائع ہوتا ہے ۔ قیمت فی پرچہ پانچ آنے، سالانہ تین روپے آٹھ آنے

بچّوں کے لئے مفید ادب اس رسالے کا طرّہ امتیاز ہے ۔ تصاویر بھی ہیں نظمیں بھی اور دلچسپ کہانیاں بھی ۔

ریویو کے لئے دو جلدوں کا آنا نہایت ضروری ہے ۔

رفتارِ زمانہ

بے روزگاری کے خلاف بھارت سرکار کا عظیم الشان منصوبہ

بھارت میں بے روزگاری کو ختم کرنے کے لئے بھارت سرکار اپنے تمام ذرائع استعمال میں لارہی ہے۔ اس سلسلے میں لوک سبھا میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پلاننگ کے ڈپٹی منسٹر شری ایس این مشرا نے ہاؤس کو بتایا کہ بے روزگاری ختم کرنے کی مہم کو تیزی کے ساتھ کامیاب بنانے کے لئے پانچ سالہ پلان میں دو ارب سولہ کروڑ روپے کی مالیت کی مزید اسکیموں کی منظوری دے دی گئی ہے جس میں سے زراعت اور دیہاتی ترقی ۱۴ کروڑ ۳۵ لاکھ روپے، آبپاشی ۲۴ کروڑ ۷۲ لاکھ روپے۔ انڈسٹری ۹۱ کروڑ ۳۵ لاکھ روپے۔ سڑکیں اور سڑکوں کی آمد و رفت ۲۶ کروڑ ۳۴ لاکھ روپے، تعلیم ۷ کروڑ ۸۹ لاکھ روپے۔ صحت اور پانی کی بہم رسانی ۱۹ کروڑ ۱۵ لاکھ روپے اور رہائش کے لئے مکان مہیا کرنے پر ۵۹ کروڑ ۳۹ لاکھ روپیہ خرچ کیا جائیگا۔ اور ان پروگراموں میں ایسی اسکیموں کو ترجیح دی جائے گی۔ جن سے عوام کو روزگار مہیا کیا جاسکے۔

بھارت اور ایران میں تجارتی معاہدہ

بھارت اور ایران کے مابین ایک اہم تجارتی اور جہاز رانی کے معاہدے پر دستخط ہوگئے ہیں جس کے مطابق ہر دو ممالک کے باشندوں کو ایک دوسرے کے علاقے میں داخل ہو کر تجارت کرنے کا حق حاصل ہوگیا ہے، اور کئی طرح کی مزید رعائتیں بھی اس سلسلے میں دی گئی ہیں۔ بھارت اور ایران کے باہمی تعلقات بہت پرانے ہیں۔ ہزاروں برس پیشتر بھی ان دونوں دیشوں کے درمیان تجارت اور جہاز رانی کا سلسلہ جاری تھا۔ نئے تجارتی معاہدے کے ذریعے دونوں ممالک ایک بار پھر دوستی اور بھائی چارے کے رشتے میں منسلک ہوگئے ہیں۔

پاکستان اور ترکی کے فوجی معاہدے میں عراق کی شمولیت

عراق کے وزیر خارجہ نے پاکستان اور ترکی کے فوجی معاہدے میں شامل ہونے کا اعلان کردیا ہے۔ آپ نے ایک انٹرویو میں کہا کہ جنگ کی صورت میں مغربی طاقتوں کو عراق کے اڈے استعمال کرنے کا اختیار ہوگا۔ عراق کے بعد مشرق بعید کے دوسرے ممالک کو بھی اس معاہدے میں شامل ہونے کی ترغیب دی جارہی ہے، اور شاہ ایران سے بھی جو ان دنوں واشنگٹن میں ہیں اس سلسلے میں بات چیت کی توقع ہے۔

جرمنی کا نیا دور

اُدھر مغربی جرمنی کو مسلح کرنے کا اعلان ہوگیا ہے، اِدھر اس امر کی اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مشرقی جرمنی کی حکومت نے آئندہ موسم بہار میں فوجی بھرتی کے لئے ۱۸ سال سے ۲۲ سال تک کی عمر کے تمام نوجوانوں کے نام رجسٹر کرنے کے فوری احکام جاری کردئے ہیں۔ اس سلسلے میں معلوم ہوا کہ ساڑھے تین لاکھ نوجوانوں پر مشتمل ایک فوج طیار کی جائے گی اور اس میں ہٹلر کے وقت کے بڑے بڑے نازی جرنیلوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔

وزیر اعظم کشمیر کی تقریر

ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے سری نگر سے کچھ میل دُور ایک مقام شوپیان کے ایک بھاری پبلک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کشمیر کے تخریب پسند عناصر کو تنبیہہ کی کہ وہ اپنی ناجائز حرکتوں سے باز آئیں۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم نے مظلوم عوام کی خدمت کے لئے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ اور تھوڑے عرصے میں میری گورنمنٹ نے عوام کی جو سیوا کی ہے وہ سب پر بخوبی روشن ہے، اور اسی لئے ہمیں عوام کا اعتماد حاصل ہے۔ ریاست کے وزیر مال میر قاسم نے بھی اسی جلسے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر بھی بھارت کا ویسا ہی ایک حصہ ہے جیسے کہ دوسرے صوبے۔ اس لئے ہم مرکز سے امداد لینے کے حقدار ہیں۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم بھارت کی امداد پر زیادہ انحصار رکھتے ہیں۔ بھارت ہمارا ہے اور ہم بھارت کے ہیں۔ اس لئے جو بھی امداد بھارت سے حاصل ہوگی اُسے عوام کی بہبود کے لئے استعمال کریں گے۔ جلسے کے بعد

وزیر اعظم اور وزیر مال کا شہر میں شاندار جلوس نکالا گیا۔

پردھان منتری کی جنتا سے اپیل

اُتر پردیش کی ایک سیاسی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے بھارت واسیوں سے اپیل کی کہ وہ اگلے پانچ برس دیش کو آگے لے جانے کی انتھک کوشش کریں تاکہ بھارت صحیح معنوں میں ایک خوش حال دیش بن جائے۔ شری نہرو نے کہا کہ اب تک ہمارے دیش نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں، اور اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم نے جو کام بھی کیا نہایت پُر امن طریقے سے کیا۔ دیش کی آزادی حاصل کرنے میں پُر امن جدو جہد کی گئی اور اب اقتصادی خوش حالی بھی پُر امن طریقوں سے ہی حاصل کی جائے گی، اور میرا یہ یقین ہے کہ ہماری خوش حالی اسی صورت میں پائیدار اور مستحکم ہو سکتی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ سوراج کا حقیقی مقصد افلاس، جہالت، بیماری اور ناقص غذا کا خاتمہ کرنا ہے۔ لیکن یہ کام محض ایجی ٹیشن کرنے اور دوسرے ممالک کی نقل کرنے سے نہیں ہو سکتے، بلکہ تمام کمزوریوں کا خاتمہ کرنے سے ہی ہوگا۔ ہم نے اپنی ایک یک جہتی کی وجہ سے چھ ماہ کے اندر چھ سو ریاستوں کو ختم کر دیا، اور پھر زمینداری اور جاگیرداری کے صدیوں پُرانے نظام پر خطِ تنسیخ پھیرا۔ کیا یہ کوئی معمولی کام تھا، اور پھر ہمارے اس کام کی اہمیت میں مزید اضافہ اُس وقت ہو جاتا ہے جب آپ دیکھتے ہیں کہ یہ سارے مسائل ہم نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر انجام دیئے۔ دراصل ہماری سرزمین ایسی ہے کہ یہاں جو چیز پُر امن طور طریقوں سے نہیں بوئی جائے گی وہ ہرگز جڑ نہیں پکڑے گی۔ اس لئے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم رُوس یا کسی دوسرے ملک کی نقل کر کے ترقی کریں گے وہ سراسر غلطی پر ہیں۔ ہمیں اپنے آپ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے، اور مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر آگے بڑھتے جانا چاہیئے۔

وزیر اقتصادیات بھارت کی تقریر

بھارت کے وزیر اقتصادیات شری چنتامن دیش مکھ نے ایسوسی ایٹڈ چیمبر آف کامرس کلکتہ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ دوسرے پنج سالہ پلان میں سرکاری اور نجی دونوں طرح کی صنعتوں کا دائرہ زیادہ وسیع ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ دیش کی قومی آمدنی کا دس بارہ فی صدی سرمایہ ہر سال صنعتی ترقی کے لئے لگانا پڑے گا۔ وزیر خزانہ نے آگے چل کر بتایا کہ بھارت سرکار کی یہ تجویز ہے کہ ایسے ذرائع استعمال کئے جائیں جس سے دس سال کے اندر مُلک سے بیکاری کا خاتمہ ہو جائے اور قریباً ایک نسل میں ہر ایک شخص کی آمدنی دُگنی ہو جائے۔ یہ سارا کام ۲۵ سال کے اندر انجام پا جائے گا۔

مارشل ٹیٹو صدر یوگوسلاویہ کی دہلی میں آمد

یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو کا بھارت کی راجدھانی دہلی میں شاہانہ استقبال کیا گیا۔ آپ بذریعہ سپیشل ٹرین بمبئی سے دہلی چار بجے پہنچے۔ ریلوے سٹیشن پر راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد، پردھان منتری شری جواہر لال نہرو، اُپ راشٹرپتی ڈاکٹر رادھا کرشنن، بھارت سرکار کے دیگر وزرا، بحری، بری اور ہوائی افواج کے کمانڈر انچیف، غیر ملکی سفیر اور پارلیمنٹ کے ممبر موجود تھے۔ ٹرین کے پلیٹ فارم پر رُکتے ہی مارشل ٹیٹو مسکراتے ہوئے باہر آئے، اور اُترتے ہی نہایت گرم جوشی سے راشٹرپتی سے ہاتھ ملائے۔ راشٹرپتی نے اس کے بعد پردھان منتری، اُپ راشٹرپتی اور دیگر وزرا اور سفیروں سے اُن کا تعارف کرایا۔ اسی دوران میں اُن کے اعزاز میں ۲۱ توپوں کی سلامی دی گئی۔ پلیٹ فارم سے باہر آنے پر اُن کو گارڈ آف آنر دیا گیا، اور یوگوسلاویہ اور بھارت کے قومی ترانے بجائے گئے۔ بعد ازاں وہ راشٹرپتی کی کھُلی کار میں سوار ہو کر راشٹرپتی بھون تک گئے۔ راستے میں لاکھوں اشخاص نے پرجوش نعروں اور تالیوں سے اپنے معزز مہمان کا سواگت کیا۔ ریلوے سٹیشن سے روانہ ہونے سے قبل مارشل ٹیٹو نے بھارت کے لوگوں کے نام اپنا پیغام پڑھا جس میں آپ نے بھارت کے گزشتہ تاریخ و تمدن کی دل کھول کر تعریف کرتے ہوئے اس امر کی پختہ اُمید ظاہر کی کہ اُن کی راشٹرپتی، پردھان منتری اور دوسرے لیڈروں سے بات چیت دُور رس اور مفید نتائج کی حامل ہوگی، اور اس سے دُنیا میں امن کو بھی تقویت ملے گی۔ دوسرے دن آپ نے مہاتما گاندھی کی سمادھ پر پھُولوں کا گلدستہ چڑھایا، اور جامع مسجد، لال قلعہ، قطب مینار اور دیگر تاریخی مقامات کی سیر کی۔ دہلی میونسپلٹی کے زیرِ اہتمام لال قلعے میں اُن کو دہلی کے شہریوں نے ایڈریس پیش کیا۔ آپ سونی پت (پنجاب) بھی گئے۔ جہاں آپ نے کیمونٹی پراجیکٹ کے کام کو دیکھا۔ آپ نے دہلی یونیورسٹی کا بھی معائنہ کیا۔ حیدرآباد ہاؤس میں ہندوستانی لیڈروں کے اعزاز میں آپ نے ایک دعوت دی جس میں صدر جمہوریہ، پنڈت نہرو، دیگر وزرا، اور دیگر ممالک کے سفرا بھی شریک تھے۔

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—509

آج کل

آٹھ آنے

مارچ ۱۹۵۵ء



بھارت کی ترقی و خوشحالی کے لئے

چھوٹی بچتوں کی اسکیم میں روپیہ لگائیے

آپ کی بچت سے فائدے

مُلک کیلئے

- بہتر معیارِ زندگی
- بہتر سماجی خدمات
- مالی و صنعتی ترقی

آپ کیلئے

- ایک محفوظ مد
- معقول شرح سود
- انکم ٹیکس سے مبرّا آمدنی

مُلک کی خوشحالی اور آپ کا مستقبل محفوظ

روپیہ بچائیے اور ان ضمانت شدہ مدّوں میں لگائیے

بارہ سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ

معیاد پورا ہونے پر ۴.۱۶ فیصدی سالانہ شرح سے سود ملتا ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ ۵ روپیہ سے ۵۰۰۰ روپیہ تک کی رقموں میں ملتے ہیں اور انفرادی طور پر ۲۵۰۰۰ روپیہ تک خریدے جاسکتے ہیں۔

دس سالہ ٹریژری سیونگز ڈپازٹ سرٹیفکیٹ

۳½ فیصدی سود سالانہ ادا کیا جاتا ہے یہ سرٹیفکیٹ ۱۰۰ روپیہ سے لیکر ۲۵۰۰۰ روپیہ تک کی رقموں میں ملتے ہیں انفرادی طور پر ۲۵۰۰۰ روپیہ تک خریدے جا سکتے ہیں۔

دس سالہ نیشنل پلان سرٹیفکیٹ

معیاد پورا ہونے پر ۴½ فیصدی سالانہ شرح سے سود ملتا ہے یہ سرٹیفکیٹ ۲۵ روپیہ، ۵۰ روپیہ، ۱۰۰ روپیہ اور ۵۰۰ روپیہ کی رقموں میں جاری کئے گئے ہیں اور انفرادی طور پر ۱۰۰۰ روپیہ تک خریدے جا سکتے ہیں۔

پوسٹ آفس سیونگز بنک اکاؤنٹ

۱۰۰۰۰ روپیہ تک کی رقم پر ۲ فیصدی سالانہ شرح سے سود دیا جاتا ہے۔ اور اس سے زاید ۱۵۰۰۰ روپیہ تک کی رقم پر ۱½ فیصدی سالانہ شرح سے سود دیا جاتا ہے۔

پندرہ سالہ اینوٹی سرٹیفکیٹ

یہ سرٹیفکیٹ ۳۵۰۰ روپیہ، ۷۰۰۰ روپیہ، ۱۴۰۰۰ روپیہ، ۲۸۰۰۰ روپیہ کی مالیت کے جاری کئے گئے ہیں اور انفرادی طور پر ۲۸۰۰۰ روپیہ تک خریدے جا سکتے ہیں۔

آپ کا لگایا ہوا روپیہ پندرہ سال تک ۳½ فیصدی سالانہ سود مرکب کے ساتھ ماہواری قسطوں کی شکل میں ملتا رہے گا۔

مزید تفصیلات یا قواعد کیلئے نیشنل سیونگز کمشنر شملہ یا اپنی سٹیٹ کے ریجنل نیشنل سیونگز آفیسر کو لکھئے۔

AC-646

بھارت کے مستقبل میں روپیہ لگائیے

ترتیب

بچّوں کا آج کل

سرورق :- سوشیل سرکار کی ایک تخلیق

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر :- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۸

سالانہ چندہ :- ہندوستان میں :- چھ روپے
پاکستان میں :- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے :- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ :- ہندوستان میں :- آٹھ آنے
پاکستان میں :- آٹھ آنے (پاک)

مارچ سنہ ۱۹۵۵ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

سکندر علی وجد

شاعر کے کھیل

کبھی صبحِ گل بار سے کھیلتا ہوں
کبھی شامِ خوں خوار سے کھیلتا ہوں

کبھی چھیڑ دیتا ہوں سازِ خموشی
کبھی حسنِ گفتار سے کھیلتا ہوں

کبھی مسکراتا ہوں تقدیرِ گل پر
کبھی قسمتِ خار سے کھیلتا ہوں

کبھی چشمکیں ہیں مہ و کہکشاں سے
کبھی زلف و رخسار سے کھیلتا ہوں

کبھی برقِ شب تاب کی روشنی میں
شبک سایۂ دار سے کھیلتا ہوں

قوانینِ زنداں ڈراتے ہیں لیکن
سلاسل کی جھنکار سے کھیلتا ہوں

یہی رقصِ مستی یہی رقصِ ہستی
ستم گر کی تلوار سے کھیلتا ہوں

کمندِ جنوں کی بدولت مسلسل
فلک بوس افکار سے کھیلتا ہوں

تکلف سے کچھ دور ہمراہ چل کر
زمانے کی رفتار سے کھیلتا ہوں

متاعِ سخن کے جواہر دکھا کر
نگاہِ خریدار سے کھیلتا ہوں

بلونت سنگھ

آبشار

اگر کبھی دہرہ دون جانے کا اتفاق ہو تو آپ کا میزبان آپ کو سنسل دھارا نامی مقام دیکھنے کی دعوت ضرور دے گا .... اور آپ انکار ہرگز نہ کیجئے گا۔

سُنا ہے کہ اب وہاں بسیں جانے لگی ہیں لیکن پہلے دہرہ دون سے راجپور قصبے تک کوئی آٹھ میل کا سفر لاری میں طے کرنا پڑتا تھا اور سنسل دھارا تک پہنچنے کے لئے راجپور سے بھی آگے چند پہاڑیوں کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا تھا۔

منزل کے آخری حصّے میں چند جھونپڑیوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں واقع ہے۔ دائیں بائیں اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں۔ ان کے بیچوں بیچ ایک ندی بہتی ہے۔ ندی کے کنارے کنارے آگے بڑھیئے تو گاؤں سے ڈیڑھ دو فرلانگ پرے وہ مقام ہے جسے سنسل دھارا کہتے ہیں۔

ندی کے کنارے پر ایک چھوٹا سا مسافر خانہ بنا ہوا ہے۔ قریب ہی گندھک کے پانی کا چشمہ ہے جس کا پانی پینے اور اس میں اشنان کرنے کے لئے لوگ دُور دُور سے آیا کرتے ہیں۔ ندی پار دائیں ہاتھ کو ایک گپھا دکھائی دیتی ہے جس کے اندر پہاڑ کی چھت سے ہر وقت پانی ٹپکتا رہتا ہے اور بائیں ہاتھ کو ایک چھوٹا سا قدیم مندر دکھائی دیتا ہے۔ مندر تک جانے کے لئے ایک اونچا سا لوہے کا پُل بھی بندھا ہے۔ ہر چہار جانب ہریالی ہی ہریالی، پانی ہی پانی، خنکی ہی خنکی ہے۔ الغرض ان صفات کے باعث یہ تفریح کا مقام بن گیا ہے جہاں بچّے، بوڑھے مرد اور عورتیں اکٹھا ہوتے ہیں سب گندھک کے چشمے یا ندی میں نہاتے ہیں یا گپھاؤں میں آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے ہیں۔

اس پار پل کے قریب کھڑے ہو کر سامنے کی جانب نگاہ دوڑائیں تو مندر کے بائیں طرف پہاڑی کے اوپر سے نیچے تک آپ کو ایک طویل و عریض لکیر دکھائی دے گی۔ بہت اوپر پہنچ کر یہ لکیر جھاڑیوں میں گھل مل جاتی ہے ...

پہلے اس جگہ ایک آبشار تھا۔ جیتا جاگتا، بے تاب و بے چین اترتا ہوا اور کف اڑاتا ہوا آبشار ...... لیکن اب اسی مقام پر نشان باقی رہ گیا ہے ایک بہت بڑے گھاؤ کے مانند۔

یہ آبشار ختم کیوں کیا گیا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ جن دنوں آبشار موجود تھا اُن دنوں پہاڑی کی بلندی پر آبشار کے قریب ہی ایک بنگلہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر جگہ کم و بیش ہموار تھی جو چوڑی کم لیکن لمبی کافی تھی۔ اس کے چاروں طرف چھوٹی بڑی پہاڑیوں کا جمگھٹا تھا دُور اونچے پہاڑ پر بسا ہوا شہر مسوری۔ اور پرے کوہ ہمالیہ اور کوہ شوالک کے سلسلے میلوں دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس جگہ کھڑے ہو کر دیکھئے تو قدرت کے بیسیوں مناظر دل کو موہ لیتے تھے۔ یہ مناظر شب و روز کے مختلف حصّوں میں نت نئی کیفیتیں پیش کرتے تھے۔

جہاں تک بنگلے کا تعلّق ہے وہ پرانی طرز کی ہلکی پھلکی چھوٹی سی دو منزلہ عمارت تھی۔ چند کمرے نیچے اور چند اوپر والی منزل پر تھے۔ کسی زمانے میں بنگلہ خوبصورت رہا ہوگا لیکن اب تو اس کی حالت خستہ تھی۔ اس سے سرائے یا ہوٹل کا کام لیا جا رہا تھا۔ وہاں تک پہنچنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی لیکن بعض منچلے تفریح کی خاطر وہاں جا پہنچتے تھے۔ کھانے پلانے کا معقول انتظام تھا۔ گرمیوں کے موسم میں بعض اوقات خاصی چہل پہل ہو جاتی تھی۔ ایک ہی آدمی تھا وہاں جو مالک، منیجر، باورچی اور بیرا وغیرہ سبھی کچھ تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے دو تین پہاڑی لونڈے رکھ چھوڑے تھے اس کا نام تھا کالے۔ اس کی عمر پچپن سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ اکہرے سے بدن کا قدرے کبڑا سا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے خطوط کا جال سا بُنا ہوا تھا جب وہ ہنستا تھا تو اگلے دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کے باعث اس کی صورت مضحکہ خیز دکھائی دینے

لگی تھی۔

تقسیمِ ہند سے بہت پہلے موسمِ سرما کی ایک خوش گوار شام کو ادھیڑ عمر کا ایک مسافر وہاں وارد ہُوا۔

اس کا قد چھوٹا، بدن اکہرا، ڈاڑھی خشخشی، لباس انگریزی، صورت متین — آنکھوں پر چشمہ، سرمئی رنگ کا سویٹر — پاؤں میں گم بوٹ جو اس کے گھٹنوں تک پہنچتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ راجپور سے پیدل آ رہا تھا اور راستے کی ندی نالوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا آیا تھا۔ اس کے پیچھے ایک پہاڑی قلی سامان اُٹھائے تھا۔ بستر اور چمڑے کا بڑا سا سوٹ کیس جس پر انگریزی حروف میں اے احمدؔ لکھا تھا۔

بنگلے کے سامنے بے تحاشہ اُگی ہوئی گھاس کے لان پر وہ ٹانگیں قدرے پھیلا کر کھڑا ہوگیا اور خوابناک نظروں سے بنگلے کا جائزہ لینے لگا...... اس کے دانتوں میں پائپ دبا ہُوا تھا۔ اس کی مونچھوں کے بال دھواں کھا کھا کر بھورے رنگ کے ہوگئے تھے۔

کچھ دیر تک وہ بنگلے کو دیکھتا رہا پھر اس نے شانوں کو حرکت دے کر اِرد گرد دُور دُور تک نگاہ دوڑائی۔ اس کی نظریں گھوم پھر کر بنگلے کے قریب دانہ دنکا چگنے والی مرغیوں پر رُک گئیں۔

اس وقت کالے بنگلے کے ایک سرے پر بنے ہوئے باورچی خانے میں بڑے پتیلے میں کڑچھی گھما رہا تھا۔ پینے کی عادت پُرانی تھی چناں چہ وہ سرور کے عالم میں انگریزی طرز پر "لا لا" کی دھن اڑا رہا تھا اور ساتھ ہی بھونڈے پن سے کمر کو بھی ہلائے جا رہا تھا۔

جب اس کی نگاہ اجنبی پر پڑی تو فوراً کڑچھی ایک لونڈے کے ہاتھ میں تھما دی اور خود جھاڑن سے ہاتھ پونچھتا ہوا نووارد کی جانب بڑھا اور فخریہ لہجے میں بیروں کی سی انگریزی میں دریافت کیا۔

"گڈ ایوننگ سر! یُو وانٹ رُوم سر!"

اجنبی نے کالے کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اسے انگریزی میں بات کرتے دیکھ کر مسکرایا۔ "یس"

نووارد اے احمدؔ کو بنگلے کے اوپر والی منزل کا ایک کمرہ پسند آیا۔ سامان وہاں رکھوا کر اس نے سب سے پہلے گرم گرم چائے کے پیالے کی خواہش کا اظہار کیا...... کالے سرپٹ بھاگا۔

مسافر نے کمر کی پیٹی ڈھیلی کی، بوٹ اُتار کر الگ رکھے اور پاؤں کسلمندانہ انداز سے پھیلا دئے۔

وہ اس کمرے کی فضا سے مانوس رہ چکا تھا لیکن اس طویل مدت میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کمرہ بھی بوڑھا ہوگیا ہو۔ صاف ستھرا لیکن پرانا فرنیچر۔ فرش پر بوسیدہ کوئیر میٹنگ۔ صوفوں کے پھوسڑے اُڑ چکے تھے۔ دیواروں پر "یا اللہ۔ یا اللہ" لکھا ہُوا۔ کچھ دیوی دیوتاؤں کی تصویریں۔ ایک تصویر ایڈورڈ ہشتم کی بھی تھی جو اُن کی نوجوانی کی تھی جبکہ وہ پرنس آف ویلز کہلاتے تھے۔ کھڑکیوں پر بندروں سے بچاؤ کے لئے لگی ہوئی جالی بھی برائے نام رہ گئی تھی۔

اس کھڑکی سے قریب ڈھائی فرلانگ پرے آبشار نیچے گرتا دکھائی دیتا تھا اس وقت وہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے کوئی عظیم الجثہ سفید اژدہا پہاڑیوں کی گود میں پھنکار رہا ہو۔ ہزاروں من پانی تیزی و تندی کے ساتھ کف اور چھینٹے اڑاتا سینکڑوں فٹ نیچے گر رہا تھا۔ اس گھاٹی میں گھومنے پھرنے والے انسان کیڑوں مکوڑوں کے مانند دکھائی دیتے تھے۔

احمدؔ نے آبشار پر چند ثانیوں تک نگاہ جمائے رکھی اور سوچا کہ انسان کے جذبات کو بھی تو اس آبشار سے کس قدر مشابہت ہے...... اس خیال کے آتے ہی اس کے ذہن میں ایک دِل رُبا صورت کے لطیف اور نرم و نازک خطوط اُبھرے اور اس کا دل زخم خوردہ پرندے کی طرح پھڑکنے لگا۔

اسی اثنا میں کالے سرور کے باعث قدرے لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہُوا اور چائے کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے بولا

"سر! پیالے کو منہ ذرا سنبھل کر لگائیے گا۔"

"کیوں....؟ آخر ماجرا کیا ہے!"

"ماجرا کچھ نہیں........ گرم ہے..... کالے کی بنائی ہوئی چائے ہے"

یہ کہہ کر اُس نے داد طلب نگاہوں سے مہمان کی جانب دیکھا۔

اس پر احمدؔ نے خوش طبعی سے جواب دیا "بھئی! قائل ہوگئے تمھاری اُستادی کے..... کیوں نہ ہوں۔ آخر بڑے اونے گھاگ ہو تم۔"

کالے سرِ تسلیم خم کر کے جانے کو تھا کہ احمدؔ نے دریافت کیا۔ "بھئی کالے! ایک حسین لڑکی تھی یہاں۔ بے حد حسین لڑکی...... اس کے بارے میں جانتے ہو؟"

کالے نے رُک کر تامل کیا۔ بولا۔ "کچھ یاد نہیں آتا......... ایک قسم

چل کر کہا۔ "آپ کا مطلب میم صاحب کی لڑکی سے تو نہیں ؟"

" میم صاحب کون ؟ "

انھیں کا یہ بنگلہ ہے۔ جب وہ جوان تھیں تو بہت خوبصورت تھیں۔ کانسرو والے چائے کے باغ کے مالک مسٹر ہاٹینڈل انھیں ولایت سے لائے۔ انڈیا ہی میں ہی ان کی شادی ہوئی لیکن بچارے زیادہ جئے نہیں۔ یہ بنگلہ انھوں نے اپنی بیوی کے لئے بنوایا تھا۔ لیکن ان کے مرنے پر میم صاحب کا دل اتنا کھٹا ہوا کہ انھوں نے اس جگہ کی طرف رُخ تک نہیں کیا۔ وہ چائے کے باغوں میں رہتی ہیں۔ اب تو وہ سوچ رہی ہیں کہ باغ بیچ باچ کر ولایت چلی جائیں۔ انھیں کی لڑکی پچھلے مہینے ادھر آئی تھیں۔ میں سمجھا آپ کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔

" اوہ نہیں ۔۔۔۔۔۔ اچھا تو یہ بنگلہ تمھارے سپرد ہے۔

"جی ہاں میں ہی اس کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ ان کی اجازت سے آپ ایسے صاحب لوگوں سے پیٹ پالنے کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے ۔۔۔۔ "

" لیکن یہاں بہت کم لوگ آتے ہوں گے۔"

" جی ہاں ۔۔۔۔ گرمی کے موسم میں رونق بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت آپ سمیت تین مسافر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک تو نیا بیاہا جوڑا ہے۔ وہ تو اوپر والے سرے کے کمرے میں بند رہتے ہیں۔ دین و دنیا سے انھیں کچھ غرض نہیں ۔۔۔۔۔۔ اگر آپ کو گپ اڑانی ہو تو وہ دیکھئے سامنے کھڑکی میں سے بڑے صاحب! ہم انھیں بڑا صاحب کہتے ہیں۔ ارے بہت بڑا ڈیل ڈول ہے ان کا۔ آپ ہم ایسے آدھ درجن شخص ملائے جائیں تب جا کے ایک بڑا صاحب بنے۔ لیکن جی بڑے خاندانی آدمی ہیں۔ بہت بڑے افسر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی سبھی چیزیں بڑی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ رات کا کھانا اگر نیچے کھائیے تو آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے۔ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔"

احمد نے کھڑکی میں سے لان کی ڈھلان پر کھڑے ہوئے بڑے صاحب کو دیکھا۔ واقعی بہت بھاری آدمی تھے۔ پورے جن دکھائی دیتے تھے۔ " اچھا بھئی کالے! نیچے ہال ہی میں کھانا کھائیں گے۔ تمھارا کہنا نہ موڑیں گے ہم۔ پھر تمھارے بڑے صاحب سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

" یس سر! ضرور۔ اور پھر اب تو پرسوں تک وہ واپس جانے والے ہیں۔ دو ہفتے سے ٹکے ہوئے ہیں۔"

کالے چلا گیا۔

احمد نے منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے تبدیل کئے اور بستر پر نیم دراز ہو کر ریلوے بک اسٹال سے خریدے ہوئے ایک انگریزی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ جوں جوں وقت گزرنے لگا اس کے خوابوں کی لڑکی کی یاد تازہ ہونے لگی جو حسن کی تمام رعنائی خوبیوں سے مالا مال تھی۔ کیسی عجیب لڑکی تھی وہ، کس قدر والہانہ تھا اس کا عشق۔ کس قدر حدّت تھی اس کے سینے میں۔ کیسی شدّت تھی اس کے جذبات میں، کس قدر تیز و تُند تھے اس کے احساسات ۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ بالکل اس آبشار کی طرح ۔۔۔۔۔۔۔ بے چین، وحشی، طوفانی۔

لیکن اس واقعہ پر اب لگ بھگ چوتھائی صدی کی گرد جم چکی تھی۔ پچیس برس اس حسین لڑکی کے بارے میں کس قدر احمقانہ سوال کیا تھا اس نے کالے سے۔ جیسے کل کی بات ہو۔ اب تو اس کی یاد کی حیثیت ایک بھولے بسرے خواب سے بہتر نہیں کہی جا سکتی ۔۔۔۔۔۔۔ اس وقت وہ جہاں کہیں بھی ہوگی۔ بوڑھی ہو چکی ہوگی۔

اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ حسن و شباب اور لطافت و تازگی کا مجسمہ اس ناپائیدار دنیا میں کس قدر جلد ساری خوبیاں کھو بیٹھتا ہے۔

وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ خود اس کی حالت قابلِ دید تھی۔ کبھی وہ یہیں ایک نوعمر طالب علم کی حیثیت سے آیا تھا۔ چہرے کی تازگی اور ہمواری کی جگہ خستگی اور گہرے خطوط نے لے لی تھی۔ بال پک گئے تھے۔ صورت سے خشونت کا اظہار ہونے لگا ۔۔۔۔۔۔

رات کے آٹھ بجے کالے آیا اور کہا کہ کھانا نیچے لگ رہا ہے۔ جب وہ نیچے آیا تو بڑے صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ جُثّے کے لحاظ سے جن دکھائی دیتا تھا لیکن صورت کے اعتبار سے وہ خاصہ حسین انسان تھا۔ رنگ سرخ سپید۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ ناک اونچی۔ ہونٹ بھرے پورے۔ یہ بڑے بڑے ہاتھ، موٹی اور لمبی انگلیاں بڑی بڑی نیچے کو لٹکتی ہوئی مونچھیں جنھوں نے اس کے اوپر والے ہونٹ کا بیشتر حصّہ چھپا رکھا تھا۔

اس کی گفتگو سے شگفتگی اور سنجیدگی، حرکات و سکنات سے متانت اور وقار دونوں کا اظہار ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی جلا وطن تاجدار ہو۔

احمد نے سوچا اچھا ہوا جو میں کھانا کھانے کے لئے نیچے چلا آیا۔ کیونکہ علیک سلیک کے فوراً بعد ان کے مابین قہقہوں اور خوش گپیوں کا دور چلا۔ اور یہ صحبت اس قدر کامیاب رہی کہ دوسرے دن صبح کا ناشتہ بھی انھوں نے ایک ساتھ ہی کیا۔

دوسرے دن شام کو دفعتاً ہر طرف دُھند سی چھا گئی۔ آسمان میں بادلوں کے غول کے غول جمع ہو رہے تھے۔ برآمدے کے ایک گوشے میں احمدؔ بید کی کُرسی پر بیٹھا چائے کا انتظار کر رہا تھا۔ سامنے لان پر کالے پُرانے گرم کپڑے پہنے منظر بیٹھے اپنے ٹٹّو پر کاٹھی کسنے کی فکر میں تھا۔ پھر وہ چلّا کر پکار اُٹھا۔

" ابے لونڈے جلدی سے چائے لے آ صاحب کے لئے۔ . ."

احمدؔ نے کہا۔ " کوئی مضائقہ نہیں .... ابھی تمھارے بڑے صاحب بھی تو لباس تبدیل کر کے نہیں آئے۔ ان کے بغیر چائے کا کیا لُطف بھلا ؟...

اس وقت کہاں کی تیاّری ہے ؟"

" راجپور تک جا رہا ہوں۔"

" گھومنے یا کسی کام سے ؟"

" صاحب دونوں باتیں ہیں۔ چینی، بسکٹ، پیسٹری، انڈے سبھی کچھ لانا ہے۔ اور ——" یہ کہہ کر اُس نے صاحب کی طرف پُر معنی نظروں سے دیکھا۔"

..... اور ممکن ہے کچھ اور بھی ہو جائے۔"

" وہ کیا ؟" احمدؔ نے دل چسپی کا اظہار کیا۔

اس پر کالے نے جُھکی ہوئی کمر کو دفعتاً سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

" کیوں صاحب اگر میں شادی کر ڈالوں تو کیسی رہے۔"

اس کی مضحکہ خیز صورت اور شادی اور پھر وہ بھی اس عمر میں ؟ احمدؔ نے ہنسی دباتے ہوئے پائپ میں تمبا کو بھرنا شروع کیا۔

جواب نہ پا کر بھی کالے نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

" کیا بتاؤں صاحب ایک بیوہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہے۔ کبھی سوچتا ہوں ثواب کا کام ہے کر ڈالو......" پھر اُس نے کھٹ سے پُتلیاں چڑھا کر آسمان کی جانب دیکھا اور مسکین لہجے میں کہا۔

" اچھا جو اللہ کو منظور ہے سو ہی ہوگا۔

پھر کالے نے دوسرا بورا ٹٹّو کے آر پار پھینکا اور اس کی لگام کھینچ کر رکاب پر رکھتے رکھتے دفعتاً رُک گیا۔ " ہاں صاحب خوب یاد آیا۔ آپ کل کس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ارے آپ فیروزہ کے بارے میں تو نہیں دریافت کر رہے تھے۔ لیکن وہ تو بہت پُرانی بات ہے۔ آپ اس لڑکی کو تو نہیں جانتے ہوں گے......"

" نہیں، نہیں میں جانتا نہیں۔ یونہیں سنا سا تھا کچھ۔"

" ہاں ہاں کیوں نہیں، ضرور سنا ہوگا۔ اتنے سال بیت گئے پھر بھی اس لڑکی کے بارے میں بڑے بوڑھے باتیں کیا کرتے ہیں.......

کل میں کچھ نہیں سمجھا۔ اس لڑکی کے بارے میں کچھ خیال ہی نہیں آیا۔ بھلا میں یہ بات کیسے سمجھ سکتا تھا کہ اتنے برس پہلے والی لڑکی سے آپ کو کوئی دل چسپی ہو سکتی ہے......"

" نہیں نہیں دل چسپی نہیں..... وہ تو میں......

" ٹھیک ہے آپ کو ضرور کسی نے کچھ بتایا ہوگا۔ لیکن جو باتیں میں بتاؤں گا وہ سولہ آنے سچ ہوں گی...... بہت پہلے کی بات ہے۔ بائیس چوبیس برس پہلے کی بات۔ ہمارے صاحب کو مرے زیادہ مدّت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے یہی دھندا اس بنگلے میں شروع کر دیا تھا۔ انھیں دنوں ایک نوجوان پٹھان ادھر آ نکلا۔ اس کے ہمراہ ایک بے حد حسین لڑکی تھی......فیروزہ اس کا نام تھا۔ اس نوخیز لڑکی کے حُسن کو کیوں کر بیان کروں۔ لفظوں میں تو ایسا کرنا ممکن نہیں......... وہ تو صاحب! الف لیلےٰ کی دنیا کی کوئی شہزادی معلوم ہوتی تھی۔"

اتنے میں چائے آ گئی۔ احمدؔ نے چمچہ اُٹھایا اور کالے نے اپنی کہانی جاری رکھی۔

وہ دونوں میرے اللہ واسطے کے مہمان بن گئے۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ وہ گھر سے بھاگے ہوئے تھے۔ ایک ہی رات رہنے کے بعد وہ جوان میرے پاس آیا اور میری ہتھیلی پر دس روپے رکھ کر بولا۔ " اس لڑکی کو اپنی بیٹی سمجھ کر اس کا خیال رکھو۔ میں جا رہا ہوں لیکن دو تین دن تک لوٹ آؤں گا۔ تمھیں انعام دوں گا اور اسے لے جاؤں گا —————!

میرے خیال میں وہ روپے کا بندوبست کرنے گیا تھا۔ لیکن دو ہفتے بیت گئے نہ وہ خود آیا نہ کوئی خط لکھا۔ لڑکی آگ پر رکھی ہوئی کلی کے مانند اندر ہی اندر جلتی رہی۔ شب و روز رونے دھونے میں مصروف رہتی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا تعلق کسی بھلے گھر سے ہے۔ میں نے اسے اس کے گھر واپس بھیجنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن اس نے مسکرا کر انکار کر دیا۔ اسے اپنے ساتھی کی بے وفائی کا بے حد رنج تھا۔"

احمدؔ نے چمچے سے چائے میں شکر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

" اچھا تو پھر۔"

"اسی اثنا میں ہمارے یہاں کالج کا ایک لڑکا آکر ٹھہرا..... اور صاحب دوسرے ہی دن سے اس لڑکی کی حالت میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ میں فکرمند ہو رہا تھا لیکن معاملے کو اس طرح سلجھتے دیکھ کر میں نے بھی دخل نہیں دیا۔ وہ دونوں شب و روز ایک ساتھ رہتے لیکن آٹھ دس دن کے بعد وہ لڑکا بھی دفعتاً غائب ہوگیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد جو حالت اس لڑکی کی ہوئی اسے بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں....... میں نے ہر ممکن طریقے سے اس کی ڈھارس بندھانے اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن اس لڑکی کی فطرت کچھ ایسی تیز و تند تھی کہ اس نے ایک نہ سنی۔ وہ نیم پاگل ہو گئی......."

اتنے میں بنگلے کے بازو والے کمرے کی کھڑکی کھلی اور نئے شادی شدہ نوجوان نے آواز دی۔

"کالے! کسی لڑکے سے کہو ہمارے کمرے میں چائے لے آئے اور پھر اس کی نوخیز حسین بیوی کا مکھڑا لمحہ بھر کو دکھائی دیا اور معاً کھڑکی بند ہوگئی۔

احمدؔ اور کالے دونوں پر کچھ دیر کے لئے خاموشی طاری ہوگئی۔ تب کالے نے لونڈے کو چائے لے جانے کے لئے کہا۔ احمدؔ کہانی سننے کے لئے بے چین تھا چناں چہ کالے نے پھر کہنا شروع کیا:۔

ایسی ہی ایک شام تھی۔ ہر طرف کہرا اور دھند۔ دور سے کالی گھٹاؤں میں بادل کی گرج سنائی دے رہی تھی۔ اسی روز نیچے گھاٹی کے گاؤں والوں کو آبشار کے شور میں نسوانی چیخوں کی آواز سنائی دی۔"

احمدؔ کا ہاتھ رک گیا اور چائے کا پیالہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔ "تمہارا مطلب ہے وہ مر گئی۔"

"برسات کا موسم تھا۔ نالہ چڑھا ہوا تھا۔ اس لئے اُس کے جسم کا کوئی سراغ نہیں ملا۔"

اتنے میں بڑے صاحب بھی آ گئے۔ اپنے لمبے نیوی بلیو رنگ کے اوور کوٹ میں وہ بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ چھ فٹ اونچے دروازے میں سے بھی انھیں جھک کر گزرنا پڑا۔

کالے نے بیڑی جلا کر دانتوں میں داب لی۔ احمدؔ نے پوچھا۔ "اچھا تو پھر عاشق صاحب کا پتہ بھی چلا۔"

"لڑکی کے مرنے کے دو دن بعد وہ بھی آ گیا۔ بڑا خوش تھا۔ اس نے بتایا کہ حالات نے مجبور کر دیا اس لئے نہ وہ خود آ سکا اور نہ خط لکھ سکا۔ .... جب اسے لڑکی کی موت کا پتہ چلا تو وہ میرے سامنے نڈھال سا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ دو تین روز تک وہ آبشار کی جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ مجھ سے کالج کے لونڈے کا حلیہ پوچھا اور چھرا بغل میں دبا کر اس کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ سارا ہندوستان چھان ماروں گا۔"

احمدؔ بہت متاثر ہوا۔ کالے نے ٹٹو پر سوار ہوتے ہوئے کہا صاحب یہ تو مشہور کہانی ہے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اب تک یہ کہانی خوب مسالے لگا کر بیان کرتے ہیں۔"

"لیکن جو مسالے تم لگاتے ہو وہ شاید ہی کوئی اور لگاتا ہو۔" بڑے صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"لیجئے انھیں بھی یہ قصہ سنا چکا ہوں۔"

"جب سے میں آیا ہوں میں نے دیکھا ہے کہ تم ہر مسافر کو یہ داستان سناتے ہو۔"

اس پر کالے نے ہنس کر ٹٹو کو ایڑ لگائی اور دیر تک اس کے ٹخ ٹخ کرنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔

بڑے صاحب نے چائے کا پیالہ ختم بھی کر لیا لیکن احمدؔ اپنے خیالات میں ڈوب سا گیا۔ بڑے صاحب نے بیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا:۔

"سیر کو نہیں چلیں گے؟"

"چلئے۔"

دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ پہاڑیوں، چٹانوں اور جھاڑیوں کے خطوط بالکل مدھم ہو گئے تھے۔

دونوں چپ تھے۔ بالآخر احمدؔ نے مہرِ سکوت توڑ دی "کس قدر دردناک سانحہ تھا۔"

"جی ہاں"۔

احمدؔ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "واقعی وہ لڑکی یکتا تھی اپنے حسن کے لحاظ سے اور اپنے تیز و تند جذبات کے اعتبار سے۔ اس مقام کے ایک ایک پتھر بلکہ ایک ایک ذرّے سے اس کی یادیں وابستہ ہیں۔ اس کے تابناک حُسن کی دعوت سے کوئی انسان منہ نہیں موڑ سکتا تھا اور نہ اُس کے جذبات کی گرمی کا

متحمل ہو سکتا تھا .... اور پھر اس وقت میں ایک معمولی لڑکا ہی تو تھا...... بس گھبرا گیا...."

"آپ ؟" بڑے صاحب نے رُک کر پوچھا۔

اس پر احمدؔ نے مردانہ حسن کے اس مجسمے کے روبرو ذرا تن کر کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "جی ہاں آپ کے اس معمولی غلام ہی سے اس ماہ پارہ کو اس قدر والہانہ محبّت ہوئی اور غلام ہی کی محبّت کھو کر اس نے جان دے دی .... مگر چوتھائی صدی گزرنے کو آئی کالے مجھے پہچانتا بھی تو کیوں کر..

...... میں اس لڑکی کو بھول سا گیا لیکن نہ جانے کون سی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی۔

وہ پھر آگے بڑھنے لگے، آبشار کی جانب۔ وہ چپ تھے۔

رفتہ رفتہ بنگلے کی مرغیوں اور بطخوں کا شور مدھم ہوتا گیا اور آبشار کا شور بڑھتا گیا۔

آبشار کے قریب پہنچ کر وہ رُک گئے۔ نیچے گھاٹی میں دُھند ہی دُھند تھی آبشار کا پانی کچھ دور تک گرتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بعد پانی کی سفیدی دُھند میں گھل مل جاتی تھی۔

"اگر آپ کو اُٹھا کر یہیں سے آبشار میں پھینک دیا جائے، تو ؟"

احمدؔ نے یہ الفاظ سن کر سر اوپر اُٹھایا اور ساتھی کی طرف دیکھا۔ بڑے صاحب کے ماتھے پر ایک گہرا بل دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آبشار کی سی تیزی و تندی دکھائی دے رہی تھی۔ احمدؔ کو اپنے کانوں پہ یقین نہ آیا اس نے مریل سا قہقہہ لگا کر دوستانہ انداز میں ساتھی کے ہاتھ پر ہاتھ مارا .... تو ساتھی نے اپنے مضبوط ہاتھ میں اس کا کمزور ہاتھ مضبوطی سے دبوچ لیا۔

احمدؔ کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ نکلیں۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا "آج کس قدر سردی ہے۔ میرا خیال ہے کہ واپس جا کر بستر میں گھس جاؤں۔"

اس کی بات کے جواب میں اس کے ساتھی کی گرفت اور مضبوط ہوگئی...

..... چند لمحوں کے لئے نہایت بھدی خاموشی طاری رہی پھر بڑے صاحب کی بھاری آواز سنائی دی :-

"اتنی لمبی مدّت کے بعد کالے نے مجھے بھی نہیں پہچانا۔"

ہنس راج رہبر

پریم چند اور ترقّی پسندی

"آج کل" کی گذشتہ دو اشاعتوں اگست ۱۹۵۴ء اکتوبر ۱۹۵۴ء میں راجندر ناتھ شیدا صاحب کے دو مضمون اسی موضوع پر شائع ہو چکے ہیں۔ رہبر صاحب کا یہ مضمون اُن مضمونوں کے جواب میں ہے۔ (ادارہ)

"آج کل" کے سالنامہ اگست ۱۹۵۴ء میں "پریم چند اور ترقی پسند نقّاد" کے عنوان سے راجندر ناتھ شیدا کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انھیں شکایت ہے کہ "پچھلے چند سالوں میں "ترقی پسند" نقّادوں نے پریم چند پر جو کچھ لکھا ہے اس سے پریم چند کی قدروں کا صحیح تعیّن اور خود ان ادیبوں کے نظریۂ تنقید و ترقی پسندی کو سمجھنا دشوار ہو گیا ہے۔"

اور پھر ترقی پسندوں کو نعرہ بازی کا مرتکب ٹھہرا کر خود پریم چند کی ترقی پسندی کے متعلق خالص ادبی بحث کا آغاز کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پریم چند کو اگر وہ لوگ ترقی پسند کہتے جو اخلاقیات، روحانیات اور اعلیٰ تر مذہب کی" عالم گیر اور ابدی قدروں" کے معتقد نہیں، اور اپنے عقیدے کے مطابق انھیں چیزوں پر انسانی ترقی کو منحصر تصوّر کرتے ہیں تو مجھے یہ سطریں لکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور اگر کچھ لکھا بھی جاتا اور کوئی اعتراض بھی ہوتا تو اس کی نوعیت مختلف ہوتی۔ لیکن جب پریم چند کو وہ لوگ ترقی پسند قرار دیتے ہیں جو خود کو مارکسی کہتے ہیں اور مارکسی سمجھے اور بتائے جاتے ہیں تو اُن کے ارشادات کا جائزہ لینا ناگزیر ہو جاتا ہے!"

ظاہر ہے کہ دشواری یہ نہیں کہ پریم چند کی صحیح قدروں کا تعین کیسے ہو۔ کیونکہ شیدا صاحب کے خیال میں اگر اعلیٰ تر مذہب کی" عالم گیر اور ابدی قدروں" کے معتقد لوگ پریم چند کو ترقی پسند کہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ پریم چند اعلیٰ مذہب کی" عالم گیر اور ابدی قدروں" کے قائل تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ شیدا صاحب کی نظر میں" عالم گیر اور ابدی قدروں" کا عقیدہ مشکوک ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اعتراض کی گنجائش اس لئے پیدا نہیں ہوتی کہ ان لوگوں نے پریم چند کو ترقی پسند ثابت کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی اس لئے ان سے اپنے اختلاف کی نوعیت کو واضح کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

اسی اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ "ترقی پسند" نقّادوں کا نظریۂ تنقید و ترقی پسندی مارکسی ہے یا کم از کم وہ خود کو مارکسی کہتے ہیں، اور مارکسی سمجھے اور بتائے جاتے ہیں۔ لیکن شیدا صاحب کے خیال میں وہ مارکسی ہیں نہیں بنتے ہیں، اس لئے ان کی "ترقی پسندی" مشکوک ہے، اور اسی لئے اُن کے ارشادات کا جائزہ لینے اور یہ مضمون لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

جائزہ اُنھوں نے تین چیزوں کا لیا ہے۔ احتشام حسین کا مضمون "پریم چند کی ترقی پسندی"، سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" کا ایک باب "حقیقت اور رومانیت"، اور میری کتاب "پریم چند" کے دو ابواب "آرٹ اور شہرت"، اور اس جائزے کی ابتدا یوں کی ہے۔

"سید احتشام حسین کے مقالے میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے موضوعِ بحث براہِ راست یہی مسئلہ رہا ہے۔ اس میں واقعات کی پردہ پوشی کی کوشش نسبتاً بہت کم ہے۔ وہ پریم چند کے نظریات کو زیادہ مسخ نہیں کرتے بلکہ خود نظریۂ" ترقی پسندی" کو پریم چند کے جسم کے مطابق تراشنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لئے اگرچہ وہ "تاریخ کے مادّی تصوّر" والی ترقی پسندی کی رو سے پریم چند کو ترقی پسند نہ ماننے والوں کے اعتراض کو "بہت کچھ صداقت" پر مبنی مانتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس صداقت کو ادھوری بھی بتاتے ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی اصرار ان کا بھی یہی ہے کہ پریم چند کو ترقی پسند تسلیم کیا جائے۔"

یعنی یہ "مارکسی" نقّاد پریم چند کو ترقی پسند ثابت کرنے کی دھن میں یا تو واقعات کی روپوشی کرتے ہیں اور پریم چند کے نظریات کو مسخ کرتے ہیں اور یا پھر خود "نظریۂ ترقی پسندی" کو پریم چند کے جسم کے مطابق تراشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوششیں ان کے سیاسی مقاصد کی غمّاز ہیں اور شیدا صاحب نے ایک غیر جانبدار اور صداقت کے علمبردار نقّاد کی حیثیت سے اپنا یہ فرض سمجھا کہ وہ ان مقاصد کو بے نقاب کریں اور شاید اسی لئے وہ خالص ادبی بحث کو ۱۹۳۶ء سے کھینچ کھانچ کر بھمبڑ کانفرنس ۱۹۴۹ء تک لے گئے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ان کے اس جائزے پر مزید بحث کی جائے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ خود شیدا صاحب کا نظریۂ تنقید کیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے اس مضمون میں پریم چند کو تو اعلیٰ تر مذہب کی "عالمگیر اور ابدی قدروں" کا قائل یعنی عینیت پرست اور آدرش وادی بتایا ہے۔ اور اس لئے "تاریخ کے مادّی تصوّر" کے قایل یعنی مارکسی سمجھے جانے والوں سے کہا ہے کہ وہ انھیں رجعت پرست کہیں۔ لیکن ان دونوں مدرسۂ فکر میں سے وہ خود کس سے تعلق رکھتے ہیں اس کی وضاحت کہیں نہیں ہوتی۔ بلکہ جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں انھوں نے غیر جانبداری کا رویّہ اختیار کیا ہے۔

مگر غیر جانبداری محض رویہ ہے، کوئی فلسفۂ حیات یا نظریہ نہیں۔ نظریے کے اعتبار سے دنیا میں یہی دو مدرسۂ فکر ہیں۔ تیسرا کوئی ابھی تک دریافت یا ایجاد نہیں ہوا۔ اور دنیا میں ہر شخص کا جانے ان جانے ایک فلسفہ ہوتا ہے اور جانتے ان جانے وہ ان دونوں میں سے کسی ایک مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ شیدا صاحب باشعور آدمی ہیں۔ دانشور ہیں اور "ترقی پسند" نقّادوں کے نظریۂ تنقید و ترقی پسندی کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کا اپنا بھی کوئی واضح نظریہ ہونا ضروری ہے جس کا پتہ اس مضمون سے نہیں چلتا۔ اس لئے میں قارئین کی توجہ ان کی کتاب "جائزے اور مطالعے" کے دیباچے یعنی "احوالِ واقعی" کی طرف دلانا چاہتا ہوں جس میں وہ رقمطراز ہیں۔

"ادیب اور شاعر کی طرح نقّاد کی بھی انفرادیت ہوتی ہے۔ زندگی کی طرف ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ اس انفرادیت اور نقطۂ نظر سے وہ مختلف ادیبوں اور ادب پاروں کو دیکھتا ہے اور ان پر تبصرہ کرتا ہے۔ اتنی بات البتہ ہے کہ اصولی طور پر ایک مخصوص نظر رکھتے ہوئے بھی نقّاد کی کامیابی کا انحصار منفرد ادیبوں پر رائے زنی کرتے وقت بالکل غیر جانبدار رہنے پر ہوگا۔"

اور پھر لکھا ہے:۔

"فرد کا شعور بہت کچھ اس کے انفرادی اور سماجی گوناگوں اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس لئے نقّاد کے لئے ادیب کے پورے انفرادی ماحول اور ادیب پر اس کے اثرات کا مطالعہ بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان سب چیزوں کے صحیح علم کے بغیر شعور کا تعیّن نہیں ہو سکتا۔"

"انفرادی طور پر ادیب کے شعور کو سمجھنے اور اس کے احساسات کو ترتیب میں رکھنے کے بعد نقّاد کا دوسرا بڑا کام اس کے ادب کی قدروں کا تعیّن ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب زندگی پر دُور رس اثر ڈالتا ہے۔ اس لئے نقّاد کے اہم فرائض میں ادب کی سماجی قدروں کا اندازہ لگانا بھی شامل ہے۔ اس مقصد کے لئے اسے زندگی اور خصوصاً ادیب کے دور کے اقتصادی سیاسی اور ثقافتی رجحانات اور تحریکات کو بخوبی جاننا ہوگا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان رجحانات میں کونسے جاندار اور زندگی کو آگے لے چلنے والے ہیں۔ اور کون سے کمزور اور روبہ زوال۔ یہ سمجھنا تو بہرحال ضروری ہے ہی کہ ان تحریکات میں سے کون کون سی اور کس حد تک ادیب پر اثر انداز ہوئی ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ "تاریخ کے مادّی تصوّر" کا نظریہ ہے اور اس کتاب میں درج اپنے ایک مضمون "اقبال اور اشتراکیت" میں اقبال کے فلسفۂ حیات کو مارکس کے فلسفۂ حیات سے مختلف بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

"انسانی حیات کا محل اقتصادی زندگی کی ٹھوس چٹانوں پر قائم ہے۔ ہمارے خیالات، احساسات، جذبات اور ذوقِ جمالیات سب اس اقتصادی زندگی کی آبیاری سے سرسبز ہوتے ہیں۔ اس لئے زندگی اور خصوصاً موجودہ زندگی کے مسائل سمجھنے کے لئے اقتصادی مسائل کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ان مسائل سے چشم پوشی کرنا زندگی کے حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ ایسا فلسفہ جو اقتصادی بصیرت کا نتیجہ نہ ہو زندگی سے اپنا تعلق قائم نہیں رکھ سکتا۔"

یہ اندازِ فکر مارکسی ہے اور اس میں جو انفرادیت ہے وہ شیدا صاحب کی اپنی ہے اور میں نے اُن کے اقتباس شدہ بیانات میں خط کشیدہ کر کے اس سے اپنا اختلاف ظاہر کیا ہے اور اسی اختلاف کی بنا پر شیدا صاحب کا نظریہ خود کو مارکسی کہنے اور سمجھے جانے والے نقادوں سے مختلف ہو جاتا ہے جسے ریاضی کی زبان میں یوں بھی لکھا جا سکتا ہے۔

شیدا صاحب کا نظریۂ تنقید۔ تاریخ کا مادی تصور۔ غیر جانبداری۔

اور انھوں نے اپنے اس نظریے کا اطلاق کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"پریم چند کو اس نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کا خیال جس سے لینن نے طالسطائی کو دیکھا تھا معقول نظر آتا ہے"۔۔۔۔۔۔

مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے "ترقی پسند" احباب پریم چند پر تبصرہ فرماتے ہوئے طالسطائی سے متعلق لینن کے خیالات سے بھی استفادہ نہیں کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ لینن طالسطائی کی عظمت کا قائل اور معترف ہے۔ کسانوں کی زندگی کے مشاہدے، ظلم اور ریاکاری کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے اور غیر معمولی فن کارانہ صلاحیتوں کے باعث لینن نے طالسطائی کو دنیا بھر کے چوٹی کے ادیبوں میں شمار کیا لیکن نے اُسے ہمارے فاضل نقادوں کی طرح "ترقی پسند" کبھی نہیں بتایا۔۔۔۔۔۔۔"

یعنی انھیں اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف پریم چند کو "ترقی پسند" کہنے میں اور اپنے اس اختلاف کو انھوں نے پہلے بھی نہایت تلخ اور طنزیہ انداز میں یوں بیان کیا ہے "جیسے کہ ان کی عطا فرمودہ ترقی پسندی کی اس اعزازی ڈاکٹریٹ سے محروم ہو کر پریم چند لامحالہ عظیم فن کاروں کی صف سے خارج ہو جاتے ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ بڑا ادیب ہونا ایک بات ہے اور ترقی پسند ہونا دوسری"

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جس ترقی پسندی سے وہ اس قدر ناراض اور چڑھے ہوئے ہیں اس سے اُن کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے لئے میں قارئین کی توجہ ایک بار پھر ان کی مذکورۂ بالا کتاب میں درج ایک مضمون "احتشام حسین اور ترقی پسندی" کی طرف دلانا چاہتا ہوں جس میں ہندوستانی تاریخ کے مختلف ادوار کے بارے میں احتشام صاحب کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔

"احتشام حسین کی نظر میں جن لوگوں نے بہاؤ کا ساتھ دیا وہ ترقی پسند ہیں، اور جو ساتھ نہ دے سکے یا جنھوں نے اس میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی وہ رجعت پسند۔ ترقی پسندی کا یہ تصور بہت معصوم ہے، جس کی وسعتوں میں سرسید، حالی، نذیر احمد اور چکبست بھی آ جاتے ہیں اور سیاسی اعتبار سے شاید اکبر الہ آبادی بھی۔ ترقی پسند حلقوں کے باہر اور بہت سے ترقی پسندوں میں بھی عموماً ترقی پسندی سے جو رجحانات اور ان کی علمبردار تحریک مراد لی جاتی ہے وہ وہ ہے جو "انگارے" کی اشاعت اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے باقاعدہ قیام کے بعد رونما ہوئی۔۔۔۔"

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ملک میں ترقی پسند تحریک کی جو منظم شکل ہے وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد وجود میں آئی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ مارکس کے نظریۂ حیات کا اس تحریک یا انجمن سے کیا تعلق ہے۔ اسے تو مارکس نے بہت پہلے دریافت کر لیا تھا، اور بقول شیدا صاحب یہ فلسفہ "مادی دنیا کو حقیقت مان کر زندگی کا ہمہ گیر مطالعہ پیش کرتا ہے" اس نظریے کے مطابق تمام انسانی تحریک کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے، اور ہر دور کا وہ خیال اور تحریک ترقی پسند ہے جو تاریخ کے ارتقا میں مد ثابت ہوئی ہے جس نے اپنے وقت کی حیات افروز قوتوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق خود عینیت پرستی اور مذہبی اعتقادات کا ترقی پسند رول رہا ہے۔ کیونکہ انھوں نے قدرت کی اندھی طاقتوں کے خلاف لڑنے اور زندگی کو آگے بڑھانے میں انسان کی مدد کی ہے، اور اگر آج بھی کوئی شخص یا ادیب جو نظریے کے اعتبار سے عینیت پرست یا آدرش وادی ہے۔ لیکن محنت کش اور مظلوم کا ساتھ دیتا ہے اور ظلم اور جبر کے خلاف لڑتا ہے تو ہم اسے ترقی پسند کہیں گے۔ اس کے برعکس مذہب کا مخالف اور مارکسی نظریے کا حامی شخص یا ادیب جو جانے ان جانے ظلم اور جبر کی حمایت کرتا ہے اور دوسروں کی محنت پر چلنے والے طبقے کا ساتھ دیتا ہے وہ رجعت پرست کہلائے گا۔

یوں ہر ملک اور ہر دور کی ترقی پسند روایات ہوتی ہیں جو ادب میں منعکس ہو کر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا مقصد انھیں روایات کو شعوری طور پر آگے بڑھانا تھا، اور اس میں وہ سب مارکسی اور غیر مارکسی ادیب شامل تھے، جو ادب کے ذریعے اس دور کی سماجی اور سیاسی ترقی پسند تحریکوں کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ مگر

شیدا صاحب کا خیال ہے کہ "ترقی پسند" کا جنم انجمن کے ساتھ ہوا، اور اس کا مقصد خاص قسم کے خیالات کی اشاعت ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اسی "احتشام حسین اور ترقی پسندی" والے مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ہمیں اس وقت یہ یاد نہیں کہ ۱۹۳۵ء میں تحریک کا مطمح نظر اشتراکیت قرار دیا گیا تھا یا نہیں مگر اتنا خیال ضرور ہے کہ جب انجمن کا سرکاری پرچہ "نیا ادب" لکھنؤ سے جاری ہوا تو اس کے حلقۂ ادارت میں تین نام چھپتے تھے، علی سردار، اسرار الحق مجاز اور سبطِ حسن۔ بعد میں کلیم بند ہونے پر جوش کا نام بھی چھپنے لگا، اور جوش کا ایک بیان بھی شائع ہوا کہ اس پرچے سے میرا تعاون مکمل نظریاتی ہم آہنگی کے سبب ہے۔ کیا یہ سب اشتراکیت نہیں چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ملحوظِ خاطر رہنی چاہیئے۔ پرچے میں جو مضامین چھپتے تھے اُن میں ہمیشہ اشتراکیت کی حمایت ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں رسمی طور پر انجمن کے مقاصد میں اشتراکیت کا شامل ہونا یا نہ ہونا کوئی فرق پیدا نہیں کرتا۔"

یعنی انجمن کے مقاصد خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اس کے ذریعے ہمیشہ اشتراکیت کا پرچار ہوتا رہا ہے، اور لکھتے ہیں۔

"ہماری رائے میں اشتراکیت ہی موجودہ زندگی کے مسائل کا واحد حل ہے، اور اگر انجمن اس کے لئے کوشاں تھی تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں۔ مگر۔۔۔۔۔" (مطالعے اور جائزے)

مگر احتشام صاحب اور اُن کے ساتھی اس بات کو چھپاتے کیوں ہیں؟ اور زیر نظر مضمون میں اس "مگر" کا اطلاق پریم چند پر یوں ہوتا ہے کہ جب وہ بقول احتشام صاحب "طبقات کے ختم ہونے سے بہتری کے جو امکانات تھے ان پر نظر نہ ڈال سکے" اور "جب پریم چند کی تحریروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اشتراکیت یا مارکسزم کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا تھا" تو پھر انھیں ترقی پسند کیوں کہا جاتا ہے؟ شیدا صاحب فرماتے ہیں۔

"۔۔۔۔ رہی پہلی کانفرنس کی صدارت تو میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں صرف اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ پریم چند نے نوجوان ادیبوں کی وہ دعوت محض یہ سمجھ کر قبول کی تھی کہ یہ لوگ ادب کو روایتی خرافات سے پاک کر کے اس کے ذریعے سے سماج کی خدمت کرنا چاہتے ہیں مگر محض اس بات پر اتفاق رائے ہونے کو نظریاتی اور جذباتی ہم آہنگی قرار دینا غلط ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ پریم چند نے اپنے وقت کے دوسرے کانگرسی رہنماؤں کی طرح یا تو اس وقت کے کانگرسیوں کی ہمت افزائی کے لئے ایسا کیا اور یا ان کے نظریات اور مقاصد کو بخوبی نہ سمجھ کر۔"

چونکہ شیدا صاحب کے خیال میں ادب کو خرافات سے پاک کر کے اس کے ذریعے سماج کی خدمت کرنا ترقی پسند ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ ترقی پسند کہلانے کے لئے مارکسی نظریۂ حیات اور اشتراکیت کا حامی ہونا ضروری ہے۔ اس لئے یہاں بھی وہی "مگر" نمودار ہوتی ہے، اور اس کے بعد وہ "یا" کے چکر میں کچھ ایسا اُلجھ جاتے ہیں کہ انھیں اپنے منطق کی معقولیت اور غیر معقولیت کا بھی دھیان نہیں رہتا۔ ہزار سوچنے پر بھی یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ یہ "یا" "تاریخ کے مادی تصور سے پیدا ہوتی ہے یا غیر جانبداری کے رویے سے۔

دراصل یہ بے دلیل منطق ہی ان کی پریشانی کا باعث ہے حالانکہ کسی نے بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ پریم چند آدرش وادی نہیں تھے۔ لیکن انھیں شکایت ہے کہ ترقی پسند نقاد پریم چند کے نظریات کو مسخ کرتے ہیں" اور "واقعات کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ اور انھیں یہ شکایت سردار جعفری اور مجھ سے ہی نہیں سید احتشام صاحب سے بھی ہے جنھیں وہ بقولِ خود اردو کا سب سے بڑا نقاد مانتے ہیں اور جن کے ہمہ گیر علم اور ادبی مسائل میں بصیرت اور سوچنے سمجھنے کے سلجھے ہوئے طریقے سے وہ متاثر بھی ہیں اور جن کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے "زندگی اور ادب کے جتنے گوناگوں مسائل اور اُن کے باہمی رشتوں کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے، اس وسعتِ نظر سے کسی اور نے ان مسائل کا جائزہ نہیں لیا۔" (مطالعے اور جائزے)

احتشام صاحب نے اپنے مضمون "پریم چند کی ترقی پسندی" میں اس وسعتِ نظر سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے۔

"پریم چند کو بیسویں صدی کی ابتدائی اور انیسویں صدی کے آخری دور کا انسان سمجھنا چاہیئے۔ ان کے شعور کی تشکیل میں ان اصلاحی تحریکوں کا ہاتھ تھا، جن کی ابتدا غدر کے کچھ دن پہلے ہو چکی تھی اور

جو بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں پھل پھول رہی تھیں۔ وہ ایک دیہات کے رہنے والے تھے۔ نچلے طبقے کا ایک خاندان ان کا گہوارہ تھا۔ تحصیلِ علم کی وہ آسانیاں جو انسانی شعور کو خاص سانچوں میں ڈھالتی ہیں پریم چند کو میسر نہ تھیں۔ اُنھیں خود اپنا راستہ ڈھونڈنا اور فضا کے تیور پہچاننا، مصیبتوں کا مقابلہ کرنا اور ہواؤں کے رُخ کو سمجھنا تھا۔ انھیں کشمکشِ حیات کے بپھرے سمندر میں کودنا اور زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرنا تھا۔ خود اُن کی خانگی زندگی کی دشواریاں، انفرادی اور خاندانی زندگی کے متعلق اُن کا نقطۂ نظر خاص قسم کا بنا رہی تھیں۔"

اسی ماحول اور انھیں واقعات نے پریم چند کو حقیقت پسند بنایا۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ رشید احمد صاحب بتاتے کہ کم یا زیادہ احتشام صاحب نے کہاں واقعات کی پردہ پوشی کی ہے اور کہاں اپنے نظریہ ترقی پسند کو پریم چند کے جسم کے مطابق تراشنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے برعکس آپ جوش میں آکر فرماتے ہیں۔

"پریم چند کو انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کا انسان بنانا سراسر غلط ہے۔۔۔۔۔۔"

پھر وہی اُلجھی ہوئی اور پُرتضاد منطق شروع ہو جاتی ہے اور رشید احمد صاحب گھما پھرا کر یہ بات منوانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پریم چند کا اصل شعور یعنی نظریۂ حیات پہلی جنگِ عظیم کے بعد جو واقعات رونما ہوئے ان سے بنا اور ۱۹۳۰ء کے بعد اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کیونکہ اس وقت تک ان کا شعور پختہ بن چکا تھا، اور یوں بھی اس وقت پریم چند کی عمر پچاس برس تھی، اور پچاس برس کے بعد انسان میں کوئی بڑی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ اس لئے پریم چند گاندھی وادی یعنی عینیت پرست ہونے کے علاوہ کچھ نہیں تھے۔ لہٰذا جس طرح لینن نے طالسطائی کے نظریے کو باطل ہوائی اور رجعت پرست کہا ہے اسی طرح ترقی پسند نقاد پریم چند کو رجعت پرست قرار دیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جب گاندھی واد کو رجعت پرست اور باطل فلسفہ کہا جاتا ہے تو بھی رشید احمد صاحب خوش نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر میں نے پریم چند کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"پریم چند نے زندگی کو کھلاڑی کی طرح گذارنے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ یہ کھلاڑی پن کا فلسفہ بھی گاندھی ازم کی ایک شاخ ہے۔ اُس نے بہت لوگوں کو کھلاڑی بنایا ہے۔ لیکن اُن کے عمل کو چرخے سے باندھے رکھا ہے؟ اور پھر پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں سے ثبوت فراہم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کے یہ کھلاڑی اور گاندھی وادی کردار عوام کے انقلابی عمل کو راہ میں روک دیتے ہیں اور باطل فلسفے کی آڑ لے کر دل کو تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس پر رشید احمد صاحب کو اعتراض ہے کہ گاندھی واد کو "باطل فلسفہ" اور پریم چند کے مرغوب کرداروں امر کانت، چکردھر، اور سورداس کو کھلاڑی کیوں قرار دیا۔ لیکن اسی فلسفے اور ان کرداروں کے بارے میں ان کی اپنی رائے ملاحظہ ہو۔

"جہاں تک نظریاتی پس منظر کا تعلق ہے ہمیں پریم چند کے ناولوں میں یہ نقص جگہ جگہ کھٹکتا ہے۔ مثلاً "پردۂ مجاز" جیسے طویل ناول کا پلاٹ تناسخ اور دوسرے مشتبہ روحانی فلسفوں پر قایم ہے۔ "روٹھی رانی" کی تمام فضا جاگیردارانہ ہے۔ "چوگانِ ہستی" کا سورداس اپنی تمام خوبیوں کے باوصف جس طرح بنارس کی گلیوں میں قیامت برپا کرا دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ ایک بڑی حد تک غیر عملی اور پلاٹ کو ایک خاص منتہا تک پہنچانے کی مصنوعی کوشش محسوس ہوتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت "میدانِ عمل" میں ہوتی ہے جب ہم سلیم، سکھدا، پٹھانی، سکینہ اور شانتی کما کے ساتھ سمرکانت جیسے زرپرست اور رامابائی جیسی عشرت پسند عورت کو شورش کے دہکتے ہوئے شعلوں میں کودتے دیکھتے ہیں۔

(مطالعے اور جائزے صفحہ ۱۲۰)

ظاہر ہے کہ پریم چند کی عظمت کا انحصار مشتبہ روحانی فلسفے اور غیر عملی اور مصنوعی کوشش پر نہیں ہو سکتا بلکہ کسی اور چیز پر ہے جس کا اعتراف خود رشید احمد صاحب نے دوسرے ہی پیرے میں یوں کیا ہے:

"لیکن ساتھ ہی ان ناولوں کے صفحوں میں اس عہد کی تقریباً پوری پھیلائی ہوئی تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی ہے جس میں ہر طبقے کے مرد اور عورتیں، بچے اور بوڑھے اپنے مخصوص قول و فعل سے دیہاتی اور شہری زندگی کے جیتے جاگتے مناظر پیش کرتے ہیں۔"

(جائزے اور مطالعے)

اس سے دو باتوں کی وضاحت ہوتی ہے کہ پریم چند کا آدرش واد اور گاندھی واد اُن کی نظریاتی خامی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے کرداروں سے غیر فطری، مصنوعی اور عجیب و غریب حرکتیں کراتے ہیں اور سمر کانت جیسے زر پرستوں اور رانا بابائی جیسی عشرت پسند عورتوں کے "ہردیہ پریورتن" ہونے کے معجزے دکھاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُن کی تصنیفات کے صفحوں میں اس عہد (بقول رشید احمد موجودہ صدی کے ابتدائی ۳۵-۳۶ سال) کی تقریباً پوری تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گذر جاتی ہے جس میں وہ جیتے جاگتے مناظر پیش کرتے ہیں۔ یہی حقیقت نگاری اُن کی خوبی ہے اور اسی پر اُن کی عظمت کا انحصار ہے۔ انھوں نے گاندھی وادی آدرش اور تکنیک کو ملک کی نجات کا ذریعہ سمجھ کر اپنایا ضرور لیکن وہ روحانیت پسندوں اور رعیت پرستوں کی طرح ابدی قدروں اور بندھے ٹکے اصولوں کے قائل نہیں تھے۔ "گوشۂ عافیت" میں لکھا ہے۔

"زندگی کے تجربے نے انھیں (پریم شنکر کو) سکھایا کہ اصولوں کی بہ نسبت انسان زیادہ قابلِ عزت ہے۔" اس لئے وہ گاندھی وادی تکنیک سے کبھی مطمئن نہیں ہوئے۔ ان کے مرغوب کردار بھی جب محض کھلاڑی نہ رہ کر حقیقت پسند بنتے ہیں اور اپنے فعل کا تجزیہ کرنے لگتے ہیں تو اس گاندھی وادی آدرش اور تکنیک سے بیزاری اور بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً چکر دھر راجا کے افسروں اور فوج پر کسانوں مزدوروں کے حملے کو روک کر سوچتا ہے۔

"پھر اگر ظلم کی مخالفت نہ کی جائے تو تنظیم سے فائدہ ہی کیا؟" اس کے بعد وہ سنیاسی بن کر اور مریضوں میں دوا بانٹ کر دل کا اطمینان ڈھونڈتا ہے۔ مگر یہ اطمینان جھوٹا ہے۔ خود فریبی ہے۔ آخر میں جب اہلیا، شنکر دھر، رائے دیو پریہ اور وشال سنگھ سب مر جاتے ہیں وہ یہ سب دیکھ کر چلّا اُٹھتا ہے: "ہائے ایشور! کیا تو مجھے یہی دکھانے کے لئے یہاں لایا تھا؟"

اب صرف منورما رہ جاتی ہے جو چڑیوں سے جی بہلاتی ہے اور چکر دھر اسے چڑیاں پال پال کر دیتا ہے اور سوچتا ہے: "کیا میری اس زندگی کا مقصد صرف چڑیاں پالنا ہے؟"

پریم چند کے ناولوں میں سب سے بڑا کھلاڑی گاندھی وادی کا دوسرا روپ سورداس ہے۔ ذرا فن کارانہ طنز ملاحظہ ہو کہ پریم چند نے جانے ان جانے گاندھی واد کے اس مجسّمے کو اندھا دکھایا ہے جو حقیقت سے آنکھیں بند کرکے چلتا ہے، جو کارخانہ داری کے خلاف پُر جوش و خروش سے لڑتا ہے۔ لیکن بالآخر اس کی ہار ہوتی ہے۔ پانڈے پور میں جان سیوک کا کارخانہ لگتا ہے اور ازمنۂ وسطیٰ کا سماجی نظام ٹوٹ جاتا ہے۔ جاگیردارانہ روحانیت کے خلاف سرمایہ دارانہ مادیت کی یہ فتح تاریخی صداقت ہے۔ جسے پریم چند آدرش وادی ہوتے ہوئے بھی جھٹلا نہیں سکے۔ اسی میں ان کی حقیقت پسندی اور فن کارانہ عظمت کا راز مضمر ہے۔ اسی ناول کے بارے میں ہندی "آج کل" کے پریم چند نمبر میں منمتھ ناتھ گپت نے اپنی ہی کتاب کے حوالے سے لکھا تھا۔

"ہم نہیں کہتے کہ لیکھک نے جان بوجھ کر "رنگ بھومی" میں پانڈے پور کو اُجڑتے ہوئے دکھایا ہے۔ نہیں، ایسا نہیں۔ پر ہوا یہ کہ اپنے گاندھی وادی آدرش کے باوجود انھوں نے اپنے پیروں کو وہاں سے نہیں ہٹایا۔ اس حقیقت پسندی کی زمین پر پاؤں جما کر ہی وہ گاندھی وادی پنکھوں کے سہارے اڑے۔ جو نتیجہ ہے سو سامنے ہے۔"

ایسا لگتا ہے کہ "چوگانِ ہستی" میں پریم چند کے آدرش واد کو سرمایہ دارانہ تہذیب کے خلاف اتنا زیادہ زور لگانا پڑا کہ آخر وہ تھک کر چکنا چور ہو گیا اور اس کے ذریعے ان کے من میں آخری فتح حاصل کرنے کا جو بھرم بنا ہوا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ "چوگانِ ہستی" کے بعد کی تصنیفات میں یہ بھرم صاف طور پر ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے، اور اس کے بعد پریم چند کے شعور میں جو تبدیلی آئی وہ بہت ہی نمایاں ہے۔ ہندی کے ایک اور نقاد ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر نے اپنی کتاب "پریم چند" میں اس تبدیلی کو یوں بیان کیا ہے۔

"'گئودان' اور 'کفن' مجموعے کی کہانیوں میں پریم چند کے نظریے میں ہم بنیادی تبدیلی دیکھتے ہیں۔ لگ بھگ ۱۹۳۱ء ہی سے وہ حقیقت نگاری کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ غبن (۱۹۳۱ء) اس کا ثبوت ہے، اس میں انھوں نے خلافِ معمول ایک کمزور فطرت انسان کو ہیرو بنایا ہے۔ میدانِ عمل (۱۹۳۲ء) اور گئودان (۱۹۳۶ء) میں انھوں نے حقیقت نگاری کی جانب ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے ......

اِن تخلیقات میں سورداس جیسا کوئی آدرش وادی کردار نہیں ملے گا۔ ناول کے آخر میں پریم چند کوئی سمجھوتہ پیش نہیں کرتے۔ وہ عریاں حقیقت کی تصویر کشی کرتے ہیں اور ہوری کی ساری کمزوریوں کو کاٹ چھانٹ بنا قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ یہی کمزوریاں اسے سوچنے پر مجبور کریں گی۔

۔۔۔۔۔ ہوری پریم چند کے اس آدرش واد کا ٹائپ کردار ہے جو انھیں گوشۂ عافیت (۱۹۲۲ء) سے میدانِ عمل (۱۹۳۲ء) تک قائل رکھ سکا۔ یہ آدرش اب حقیقت کی چٹان سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا ہے۔

مگر شیدا صاحب اتنی بڑی تبدیلی کو تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں "۱۹۳۰ء میں پریم چند پچاس برس کے تھے اور پچاس برس کے بعد انسان میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی"۔ اور اسی لئے وہ اپنے مضمون کے دوسرے حصے یعنی "گئو دان اور ترقی پسند نقّاد" میں بہت ہی متضاد باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے کرداروں کو سمجھنے میں قاصر رہتے ہیں یا انھیں مسخ کر کے پیش کرتے ہیں، اور اس ناول میں آدرش اُ کے جو تھوڑے بہت اثرات ہیں اُنھیں بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ گئو دان میں بھی پریم چند کے نظریۂ حیات میں کوئی تبدیلی نہیں بلکہ وہ بدستور عینیت پرست اور جاگیردارانہ قدروں کے حامی اور علم بردار تھے۔ شیدا صاحب رقم طراز ہیں۔

"گئو دان میں جاگیرداری کے ایک اور پہلو پر بھی غور کرنا ضروری ہے "گوشۂ عافیت" اور "میدانِ عمل" کا کسان اپنے پاؤں پر کھڑا بھی ہوتا ہے، شورش بھی کرتا ہے۔ لیکن گئو دان میں وہ محض مظالم برداشت کرتا ہوا فنا ہو جاتا ہے۔ وہ انقلاب کے عمل میں شریک نہیں ہوتا بلکہ اپنی زبوں حالی دکھا کر دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس ناول میں جاگیردار اور کسان کے مفاد میں کوئی بڑا تصادم بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں پریم چند نے "مجبوریوں" کے ریشمیں پردوں میں سے تعلقہ داری کی "فطری نیکیوں" کی جھلکیاں دکھانے کی کوشش کی ہے"۔

شیدا صاحب کے اس تجزیے کی صحت پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں، ممکن ہے یہاں اُن کا مقصد پریم چند کی تصنیف کا صحیح اور سائنٹیفک مطالعہ پیش کرنے کی بجائے یہ ثابت کرنا رہا ہو کہ "گئو دان" کے بارے میں ترقی پسند نقّادوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست نہیں ہے۔ اس جذبے کے تحت اُنھوں نے ایک دوسری جگہ جد و جہد کی "تکنیک اور تشدّد یا عدم تشدّد" کے سلسلے میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ جس زمانے میں "مایا" ناول لکھا گیا وہ قومی جذبات میں اُبال آنے کا زمانہ نہیں تھا بلکہ آئندہ کے طریقۂ کار کو سمجھنے کے لئے غور و فکر کرنے کا زمانہ تھا۔ اسی وجہ سے اس ناول میں جگہ جگہ زندگی کے مختلف مسائل سے متعلق غور و فکر کی شہادت ملتی ہے۔ اس لحاظ سے اس میں حیرت انگیز تنوع بھی ہے اور گہرائی بھی۔ مگر مارکسزم کی طرف کوئی واضح قدم اُٹھتا نظر نہیں آتا۔

شیدا صاحب کے دونوں بیانات میں تضاد ملاحظہ ہو۔ پہلے بیان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چونکہ گئو دان میں "مجبوریوں" کے ریشمیں پردوں میں سے تعلقہ دار کی فطری نیکیوں کی جھلکیاں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے یہ ناول فن اور شعور کے لحاظ سے "گوشۂ عافیت" اور "میدانِ عمل" سے بھی کم درجے کا ہے۔ لیکن دوسرے بیان کے مطابق اسی ناول میں "حیرت انگیز تنوع ہے گہرائی بھی" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس ناول میں کوئی طبقاتی شعور نہیں ہے صرف جذباتی ڈھنگ سے کسان کی مجبوریاں ہی دکھائی گئی ہیں، تو پھر اس میں جو حیرت انگیز تنوع اور گہرائی ہے۔ اس کے اسباب کیا ہیں؟ کہیں یہ بات نہ ہو کہ چونکہ انھوں نے اپنے ذہن میں پہلے ہی سے طے کر رکھا ہے کہ پچاس برس کے بعد کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اس لئے وہ گئو دان کی نمایاں تبدیلی ہی کو "حیرت انگیز تنوع اور گہرائی" کا نام دے رہے ہوں۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک پریم چند کا طبقاتی شعور مارکسی مطالعہ سے نہ سہی مشاہدہ اور تجربہ سے ہی بہت بڑھ گیا تھا اور زمیندار امرپال سنگھ کے کردار میں ہمیں کہیں "فطری نیکیاں" نظر نہیں آتیں۔ گئو دان میں اس کی دیش بھگتی اور مذہب پرستی کی حیثیت ریاکاری اور ملمع سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ جو ادب اور اشتراکیت کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کرتا ہے اس سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ

اس شخص کے قول اور فعل میں کتنا بھاری تضاد ہے۔ ہاں بانکپن، خاندانی اور سماجی رشتوں میں محبت اور فیاضی جاگیرداری کی خوبیاں جو سرمایہ داری میں نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے پریم چند نے امرپال سنگھ کو سچا طور پر سرمایہ داری کے نمائندہ پرکاش چند کھنہ سے بہتر دکھایا ہے۔ یہ کوئی عیب نہیں ہے، اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ جاگیرداری دور کے نمائندے تھے اور اس کے مٹنے کا انھیں افسوس ہے۔ یہ سیدھی سادی تاریخی حقیقت ہے۔ سرمایہ داری میں انسانی سماج نے مجموعی طور پر ترقی کی۔ لیکن سرمایہ داری ہر پہلو میں جاگیرداری سے بہتر نہیں ہے، خود مارکس نے اپنے مضمون "ہندوستان میں برٹش رول" میں لکھا ہے کہ پرانے ہندوستانی سماج میں جو خوبیاں تھیں وہ برٹش سامراج نے تباہ کردیں، اور نئی مشینی تہذیب کے جو لوازم تھے ان سے اُسے محروم رکھا۔ امرپال سنگھ بھی اسی پرانے سماج کا نمائندہ ہے۔ یہ طبقہ مٹ رہا ہے۔ لیکن اپنی ان خوبیوں کے باوجود مٹ رہا ہے۔ پریم چند اگر ان خوبیوں کو نظر انداز نہیں کرتے تو یہ فن کارانہ خلوص اور حقیقت پسندی کے باعث گئودان میں حیرت انگیز تنوع اور گہرائی پیدا ہوئی ہے، اور اسی وجہ سے ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ادیبوں نے گئودان کو ان کی بہترین تخلیق تسلیم کیا ہے۔ پنڈت کشن پرشاد کول نے انھیں بحیثیت ناول نگار کے ناکام بتاتے ہوئے حال ہی میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"البتہ ان کا ناول گئودان جس میں انھوں نے ہماری دیہاتی زندگی کا مکمل مرقع بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے اور جس کے کردار جیتے جاگتے ہیں باوجود اپنی خامیوں کے اعلیٰ پائے کے ناولوں میں شمار کیا جائے گا، اور وہ اردو ادب میں ایک نیا تجربہ اور نیا اضافہ ہے"۔

(سب رس کانفرنس نمبر)

ظاہر ہے کہ نیا تجربہ اور نیا اضافہ نمایاں تبدیلی کے بنا نہیں ہوا۔ اور گئودان کی فنی عظمت کا راز حقیقت نگاری ہے نہ کہ مشتبہ روحانی فلسفہ۔

مگر جب اسی حقیقت نگاری کی بنا پر پریم چند کو گاندھی وادی آدرش اور تکنیک سے مختلف ثابت کیا جاتا ہے تو شیدا صاحب اُسے بھی ناراضی اور تلخی کا لہجہ اختیار کرلیتے ہیں۔ مثلاً میں نے پریم چند کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی کتاب کے "آرٹ" باب میں لکھا ہے۔

"ہزاروں لاکھوں ہندوستانیوں کی طرح پریم چند نے بھی بھول سے یہ سمجھ لیا کہ گاندھی جو کچھ چاہتے ہیں وہ پہلے ہی سے وہی کچھ کررہے تھے: "گوشۂ عافیت" میں منوہر غوث خاں کو قتل کرتا ہے، اور پریم چند نہایت جانبداری سے اس کے فعل کی تائید کرتے ہیں اور اسے ہیرو اور سورما بناتے ہیں۔ لیکن گاندھی جی نے منوہر کے فعل کی کبھی تائید نہیں کی، بلکہ وہ منوہر کے عمل کو آدھے ہی میں روکنے کے لئے منظرِ عام پر آئے تھے۔ کانگریس کے لیڈر بنے تھے"۔

شیدا صاحب میرے اس خیال کو "غلط بیانیوں کا عجیب وغریب کاغذی گلدستہ" بناتے ہیں۔ کیونکہ پریم چند نے کہیں نہیں کہا کہ غوث خاں کے قتل نے گاؤں کے مسائل حل کردئے بلکہ اس کے بعد گاؤں پر زمیندار کے مظالم اور بڑھ گئے۔ نیا کارندہ فیض اللہ خاں انھیں پہلے سے بھی زیادہ تنگ کرنے لگا۔

شیدا صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ گو "گوشۂ عافیت" ناول ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا، لیکن انھوں نے اسے ۱۹۱۸ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ جب ان پر جنگ کے بعد کے واقعات اور روسی انقلاب کا اثر تھا، جب ہمارے عوام میں طبقاتی جدوجہد اور انقلاب کا جذبہ اُبھار پر تھا۔ منوہر اسی جذبے کا نمائندہ کردار ہے، اور خود شیدا ہی کے الفاظ ہیں "پریم چند نے منوہر کا کردار بڑی خوبصورتی سے ابھارا ہے، وہ دیہات پر زمیندار کے عام مظالم کے خمیر سے اُٹھتا ہے ------ اس میں غیر معمولی قوتِ ارادی موجود ہے، اور عمل کے وقت (وہ کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو) پائے استقلال میں جنبش نہیں آتی"۔

ظاہر ہے کہ منوہر کے کردار کی یہ تعمیر پریم چند کی جانب داری کا نتیجہ ہے انقلاب کا مخالف ادیب کبھی ایک انقلابی کردار کو اس خوبصورتی سے نہیں اُبھار سکتا۔ یہی منوہر زمیندار کے بے رحم اور ظالم کارندے غوث خاں کو قتل کردیتا ہے۔ اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ گاؤں پر زمیندار اور اس کی حمایتی سرکار اور فوج کے مظالم اور بڑھ جاتے ہیں۔ منوہر اُس کے بیٹے اور گاؤں کے تمام کسانوں کو پکڑ کر جیل میں بند کردیا جاتا ہے۔ گرفتار شدہ کسان منوہر کو اپنی مصیبتوں کا باعث سمجھ کر

اُسے لعنت ملامت کرتے ہیں تب ان میں سب سے زیادہ دانشور اور نرم دل کسان قادر ان سے کہتا ہے ۔

"یارو ایسی باتیں نہ کرو ، بے چارے نے تم لوگوں کے لئے تمہارے حقوق کی حفاظت کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے ۔ اس کے جیوٹ اور ہیاؤ کی تعریف تو نہیں کرتے الٹا اس کی برائی کرتے ہو ۔ ہم سب کے سب ڈرپوک ہیں وہ ایک مرد ہے ۔"

بلاشبہ قادر کی یہ آواز پریم چند کی آواز ہے ۔ یہی آواز آگے چل کر باعمل ہو جاتی ہے ۔ گاؤں کی عورتیں منوہر کی بیوی بلاسی کو طعنے دیتی ہیں کہ تم نے یہ ستیاناس کرایا ۔ گاؤں پر یہ تباہی تمہارے کارن آئی ۔ بلاسی بے چاری بے دل ہو کر سوچتی ہے کہ شاید واقعی بُرا ہوا ۔ لیکن اس موقعے پر سکھو چودھری جو اب سنیاسی بنا ہوا ہے وہاں آ پہنچتا ہے اور وہ بلاسی کو ڈھارس بندھاتے ہوئے کہتا ہے کہ تیرا منوہر سورما ہے ۔ اس نے گاؤں کی مرجاد بچائی ہے ۔ میں یہاں ایک مندر بنواؤں گا جس میں منوہر کی مورتی لگائی جائے گی ۔ اس سے بلاسی کو منوہر کے فعل کی صداقت اور عظمت کا یقین ہو جاتا ہے ، اور وہ فخر سے گردن بلند کر لیتی ہے ۔

شیدا صاحب بتائیں کہ اس میں کیا غلط بیانی ہے ۔ کیا ہم اسے منوہر کے فعل کی تائید نہیں کہیں گے ؟ یہ صریحاً جانبداری کا رویہ ہے ، جس کی مزید وضاحت فیض اللہ خاں والے واقعے سے ہوتی ہے جسے شیدا صاحب نے ادھورا اور توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ نیا کارندہ فیض اللہ لگان وصولی کی قرقی لے آیا ہے اور سب کچھ قرق کر رہا ہے ۔ سکھو چودھری اسے لگان کا ڈبہ دے کر ظلم بند کرانا چاہتا ہے تو وہ عدالت کے خرچے کے نام پہ بڑی رقم طلب کرتا ہے ۔ اب پریم چند لکھتے ہیں ۔

" دفعتاً چودھری نے اپنا چمٹا اُٹھایا ، اور اتنے زور سے فیض اللہ کے سر پر مارا کہ وہ زمین پر گر پڑا ۔ پھر بولے ، یہی عدالت کا خرچہ ہے ۔ جی چاہے تو اور لے لو ۔ بے ایمان ، پاپی کہیں کا ۔ کارندہ بنا پھرتا ہے ۔"

شیدا صاحب چاہیں تو ان حقائق کی روشنی میں خود اپنے بیان کی تصحیح کر سکتے ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ سکھو چودھری نے فیض اللہ سے نپٹ لینے کے بعد اس کے ساتھی کرتار سنگھ کو روپوں کے ٹھیکروں میں بدلنے کا معجزہ بھی دکھایا ۔ لیکن اس سے نہ تو منوہر کے فعل کی تردید ہوتی ہے اور نہ گاندھی وادی ستیہ اور اہنسا کی تائید بلکہ پریم چند نے واضح الفاظ میں لکھا ہے ۔

" ستیہ گرہ میں تشدد کو مغلوب کرنے کی طاقت ہے ۔ یہ خیال غلط ثابت ہوا ۔"

عدم تشدد گاندھی جی کی طرح پریم چند کا مذہبی عقیدہ نہیں تھا ۔ گاندھی جی تو کہتے تھے کہ تشدد سے سوراج بھی ملے تو میں نہیں لوں گا ۔ لیکن پریم چند اندر ناتھ مدان کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

" اگر مجھے یقین ہو جاتا اور میں جان لیتا کہ خون ریزی سے ہمیں سوراج ملے گا تو میں نے خون ریزی کی فکر نہ کی ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس لئے وہ گاندھی وادی تکنیک سے ہٹ کر کئی بار مظلوم عوام کے تشدد پر مبنی جذبے کی بھی حمایت کر دیتے ہیں بلکہ خود ان میں یہ جذبہ اُبھارتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ مثلاً "استعفا" کہانی میں گالی دینے پر ایک ہندوستانی کلرک سے انگریز افسر کو خوب پٹوایا ہے ۔

اب آخر میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مذہب اور اعلیٰ تر مذہب کی "عالمگیر اور ابدی" قدروں کے بارے میں پریم چند کا رویہ کیا تھا ، کیا بقول شیدا وہ مذہب کے قائل تھے اور اس سلسلے میں خالصتاً گاندھی وادی تھے ؟ یا پھر ان کا عقیدہ کچھ مختلف تھا ؟

انھوں نے اندر ناتھ مدان کو اپنے ایک خط میں لکھا تھا ۔

" شروع میں فکر کے نتیجے کے طور پر نہیں بلکہ روایتی عقیدے کے طور پر میں ایک عظیم غیبی طاقت میں یقین رکھتا تھا ، مگر اب وہ عقیدہ ٹوٹ رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

دیا نرائن نگم اور بنارسی داس چترویدی کے نام لکھے گئے خطوط میں بھی اس بات کا واضح ذکر ہے کہ خدا کی ہستی اور موت کے بعد کی دنیا میں ان کا یقین نہیں تھا ، اور آخری دور کی اپنی ایک کہانی "قہر خدا" میں ہیرو کی زبان سے کہلوایا ہے ۔

" جب تک دنیا کا یہ نظام قائم ہے ۔ مجھے ایشور پر وشواس نہیں آئے گا ۔ اگر میرے جھوٹ بولنے سے کسی کی جان بچتی ہے تو مجھے مطلق تامل

نہ ہوگا۔ میں ہر ایک فعل کو اس کے اسباب تحریک کے اعتبار سے دیکھتا ہوں جس سے دوسروں کا بھلا ہو وہی سچ ہے، جس سے دوسروں کو نقصان ہو وہی جھوٹ ہے۔"

ظاہر ہے کہ سچ اور جھوٹ کے اس فلسفہ کا گاندھی وادی آدرش سے کوئی تال میل نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی ایسے شخص کو اعلیٰ تر مذہب کی ابدی قدروں کا قائل کہا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں ہے کہ وہ خدا کی ہستی اور مذہب سے منحرف ہو کر مادّیت پرست بن گئے تھے یا مارکسی نظریۂ حیات پر یقین لے آئے تھے، بلکہ بات یوں تھی کہ پریم چند کو عوام سے بے حد محبت اور عقیدت تھی، اور وہ ان کے مذہبی عقائد اور مصیبت میں بھروسہ دینے والے توہمات کا احترام کرتے تھے۔ لیکن وہ دیکھتے تھے کہ یہی معصوم اور سادہ دل لوگ افلاس، ظلم اور بے انصافی کی چکّی میں پس رہے ہیں۔ اگر دنیا کا خدا واقعی رحیم اور منصف ہے تو پھر یہ نابرابری، یہ دُکھ یا آہیں کیوں ہیں؟ اور اگر مذہب کے ذریعے اب تک دنیا کے مسائل کا حل نہیں ہوا تو آگے بھی نہیں ہوگا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"اخوت اور مساوات، تہذیب اور معاشرت ابتدا سے ہی آئیڈیلسٹوں کا دریں خواب رہی ہے۔ پیشوایانِ دین نے مذہبی، اخلاقی اور روحانی بندشوں سے اس خواب کو حقیقت بنانے کی متواتر ناکام کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمدؐ سبھی نبیوں نے اخلاقی بنیادوں پر مساوات کی یہ عمارت کھڑی کرنی چاہی۔ مگر کسی کو پوری کامیابی نہ ہوئی، اور آج اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفاوت جتنی بے دردی سے نمایاں ہو رہی ہے شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔

آزمودہ را آزمودن جہل است کے مصداق اب بھی دھرم اور اخلاق کا دامن پکڑ کر ہم اس منزل پر پہنچنا چاہیں تو ہمیں ناکامی ہوگی۔" (خطبۂ صدارت)

اس کے باوجود ہم شیدا صاحب کی اس بات سے متفق ہیں کہ پریم چند میں آخری وقت تک اصلاح پسندی کے عناصر موجود تھے، اور "گئودان" یا کسی بھی مارکسیت کی طرف کوئی واضح قدم اُٹھتا نظر نہیں آتا۔

لیکن کسی نے انھیں مارکسی وادی ثابت کرنے کی کوشش بھی نہیں۔ شیدا صاحب کی یہ بات بھی درست ہے کہ ہوری کو جیتا جاگتا اور مظلوم کسانوں کا نمائندہ کردار تو کہا جا سکتا ہے، لیکن عظیم کردار کہنا درست نہیں۔ شیدا صاحب کی یہ شکایت بھی بجا ہے کہ کچھ لوگ پریم چند کو بنا پڑھے ہی ان پر تنقید لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ بات صرف ترقی پسندوں تک ہی محدود نہیں۔ دوسرے لوگ بھی ایسا کرتے ہیں۔

اگر پریم چند کو شروع سے آخر تک سلسلے وار پڑھا جائے تو یہ بھید کھلتا ہے کہ ان سے پہلے رومانی اور جاسوسی چیزیں لکھی جاتی تھیں۔ انھوں نے حقیقت نگاری کی بنا ڈالی، سماجی اور سیاسی مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ اور بقول احتشام حسین "ان کی بڑائی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ادبی سفر میں کسی ایسی جگہ قیام نہیں کیا جہاں سے ترقی کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔" وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی صدارت کرنے یا گئودان لکھنے کے باعث ترقی پسند نہیں بنے بلکہ ان کی ترقی پسندی نے یہ کام ان سے کروائے۔ آدرش واد انھیں وراثت میں ملا تھا، اور "گئودان" اور "مہاجنی تہذیب" مضمون میں بھی اس کے اثرات باقی ہیں۔ لیکن ایک ادیب کے معاملے میں نظریہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دور کی حقیقتوں کو کس کامیابی سے پیش کیا ہے، اور تاریخ کی کن طاقتوں کا ساتھ دیا ہے۔ ٹالسٹائی کے فلسفے کو رجعت پرست بتانے کے باوجود لینن نے اسے روسی انقلاب کا آئینہ کہا ہے اور لکھا ہے۔

"ٹالسٹائی کے افسانوی ادب کا مطالعہ کرنے سے روسی مزدور طبقے میں اپنے دشمنوں کو سمجھنے کا بہتر شعور پیدا ہوگا اور ٹالسٹائی کے نظریۂ حیات کے مطالعے سے روسی جنتا کو یہ سیکھنا چاہیئے کہ ان کی اپنی کمزوری کا سبب کیا ہے اور انھیں اپنی آزادی کی جد و جہد میں حصہ لینے سے کونسی بات مانع ہے۔ ترقی کے لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے۔"

اگر شیدا صاحب اس بات سے متفق ہوں کہ پریم چند کا مطالعہ بھی انھیں معنوں میں ترقی کے لئے ضروری ہے تو وہ انھیں بڑا ادیب اور عظیم فن کار کہیں۔ ہم ترقی پسند کہلانے پر مُصر نہیں ہیں۔

سامعین نے کہا

نازش پرتاپگڈھی

عرش و سدرہ کی بلندی سے ہٹا کر نظریں
چھوڑ کر اپنے تخیّل کا فلک بوس محل
آپ پستی کے مکینوں میں کہاں آ پہنچے
آپ ہم خاک نشینوں میں کہاں آ پہنچے

چُور ہو جائیں گے سب آپ کے نازک سپنے
ہم میں احساسِ غم و درد زیادہ ہوگا
تلخیٔ زیست کے طوفاں سے جو ٹکرائیں گے
آپ رنگین غزل گا کے چلے جائیں گے

ہاتھ میلے بھی ہیں گستاخ بھی ہم لوگوں کے
کس قدر گندے ہیں ہم لوگوں کے ننگے تلوے
قصّۂ دامنِ جانانہ کہاں لائے ہیں آپ
فرشِ مخمل کا یہ افسانہ کہاں لائے ہیں آپ

آپ چھیڑیں نہ یہاں خلدِ بریں کی باتیں
دھجّیاں جیب و گریباں کی اڑائیں نہ حضور
ہم گنہ گار بھی سُن لیں گے تو پھر کیا ہوگا
بچّے ننگے ہیں جو سُن لیں گے تو پھر کیا ہوگا

دیکھیے زندوں کی فریاد و فغاں میں آ کر
ہم سے بچیے کہ پسینے ہیں ہمارے رِل کر
آپ کے مُردوں کا محشر نہ کہیں سو جائے
آپ کی بُوئے گُلِ تر نہ کہیں کھو جائے

تیز ہے آنچ یہاں سینوں میں سوزِ غم کی
شعلے بھڑکے ہیں حوادث کے ہمارے دل میں
شمعِ محفل کو پگھلنے سے بچائے رکھیے
پرِ تخئیل کو جلنے سے بچائے رکھیے

بات آرائشِ محفل کی نہ چھیڑیں حضرت
ہیں یہاں جاڑے کی شدّت سے ٹھٹھرتے ہوئے لوگ
ہم کہ ہیں مفلس و نادار کہیں لوٹ نہ لیں
قصّۂ گرمیٔ رخسار کہیں لوٹ نہ لیں

زہر بھی ہم کو میسّر نہیں، کیا ذکرِ دوا
کوئی تہذیب نہ احساسِ لطافت ہم میں
دیدۂ نرگسِ بیمار کو واپس لے جائیں
آپ اس یارِ طرحدار کو واپس لے جائیں

جرم ہوتا ہے اگر اشک بہائیں ہم لوگ
جس جگہ ہم ہیں وہاں حکم تڑپنے کا نہیں
ذکرِ شبنم جو چھڑے گا تو قیامت ہوگی
مُرغِ بسمل نہ بنیں آپ، عنایت ہوگی

پیچ و خم درد کے ہیں، بھوک کی اندھیاری ہے
دیکھیے کتنا گراں بار ہے ماحولِ حیات
لیلیٔ فکرِ رسا راہ بھٹک جائے گی
شاعری آپ کی نازک ہے لچک جائے گی

یہ چمکتے ہوئے سپنے یہ لہکتی تانیں
ہم جسے پا بھی سکیں اور جسے چکھ بھی سکیں
دل کے بہلانے کو بے شک یہ خیال اچھا ہے
جامِ جمشید سے یہ جامِ سفال اچھا ہے

گھنشیام سیٹھی

غوّاصی ــــ دکن کا ملک الشعراء

مُلّا غوّاصی قطب شاہی دَور کا دوسرا اہم ترین شاعر گذرا ہے۔ وہ ہندی کے مشہور شاعر گوسوامی تُلسی داس کا ہم عصر تھا۔ غوّاصی کی صرف دو تخلیقات ہی منظرِ عام پر آئی ہیں :۔

۱۔ مثنوی سیف الملوک اور بدیع الجمال

۲۔ طوطی نامہ

اوّل الذکر کی تخلیق ۱۶۲۵ء میں ہوئی اور خالصتاً شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر اس کا اسلوب "طوطی نامہ" پر فوقیت رکھتا ہے۔ "طوطی نامہ" "سیف الملوک" سے چودہ سال بعد کی تخلیق ہے اور نسبتاً سلیس اور دل کش پیرائیہ انداز میں ادا کی گئی ہے۔ کیونکہ تب (۱۶۳۹ء) شمالی ہند کے اثرات نے دکن کے ادبی اور شمالی ماحول کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ "طوطی نامہ" میں فارسی الفاظ اور ترکیبیں جا بجا ملتی ہیں اور نظم کے حسن اور دل کشی میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ ۱۶۳۹ء میں غوّاصی ملک الشعراء کے رتبے پر پہنچ چکا تھا اور گولکنڈہ کے شاہی دربار میں اس نے خاصہ اثر در سوخ قائم کر لیا تھا۔

قطب شاہی عہد کی تاریخیں اور تذکرے اس عظیم شاعر کے تفصیلی حالات سے بالکل خالی ہیں۔ حالانکہ اس نے سلطان محمد قلی قطب کے عہد ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا، لیکن اس کی قدر ۱۶۲۶ء کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے عہد (۱۶۲۶ء تا ۱۶۷۲ء) میں ہی ہوئی۔ غوّاصی کی ابتدائی زندگی نہایت عُسرت میں بسر ہوئی اور ۱۶۲۶ء سے قبل وہ بالکل گمنامی کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔ غوّاصی سے پہلے طبعی اور ابنِ نشاطی کا سکّہ شاہی دربار میں بیٹھا ہُوا تھا۔ غوّاصی کے یہ دونوں ہم عصر شاہی دربار میں اس کی ترقّی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان قلی قطب شاہ جیسا عظیم شاعر بھی جسے اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے، غوّاصی کی قدر نہ کر سکا۔ قلی قطب کا وارث، داماد سلطان محمدؐ قطب شاہ شعر و شاعری سے لگاؤ نہ رکھتا تھا اور نہ ہی اپنے مخصوص دائرے سے باہر نکل کر ربط ضبط بڑھانا اُسے پسند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے "سیف الملوک" کے منظرِ عام پر آ جانے کے باوجود بھی شاعر کی کوئی قدر نہ کی۔ غوّاصی ناامید ہو چلا تھا جبکہ اُس نے تیسرے سُلطان عبداللہ قطب شاہ سے انصاف کی توقّع رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار لکھے اور رفتہ رفتہ اُس کی قسمت موافق ہوتی گئی۔

"جو سلطان عبداللہ انصاف کر
میرے جوہراں پوتے دل صاف کر — پر سے
دیوئے داد میرا بہت مان پاؤں — عزّت
اُس دُورتے تاگر بیان پاؤں — دُور سے
کہ پوشاہ میرا خریدار ہوئے — یہ بادشاہ
کہ تازہ میرا تب یہ گلزار ہوئے
کہ غمگین ہوں سخت سنسار تے — دُنیا سے
دھروں داغ نے لاکھ اس آزار تے — مصیبت سے
پریشانگی میں جمع خیال میں
لے آیا ہوں ایسے رتن ڈھال میں"

(سیف الملوک و بدیع الجمال)

۱۶۳۵ء میں اُسے بحیثیت شاہی سفیر محمدؐ عادل شاہ کے دربار میں بیجاپور بھیج دیا گیا۔ بیجاپور کے سلطان نے غوّاصی کی بڑی عزّت کی اور بڑے بڑے انعام و اکرام سے اُسے نوازا گیا۔ اس عزّت کو، جو اُسے اپنی غیر معمولی قابلیت اور اپنے آقا سلطان عبداللہ قطب شاہ کی بدولت حاصل ہوئی تھی، قائم رکھنے کے لئے اس نے دوسرے درباری شاعروں کی تقلید کرتے ہوئے سلطان کی جھوٹی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے۔ "طوطی نامہ" میں ایک جگہ وہ لکھتا ہے :۔

"مہاراج سلطان عبداللہ ناؤں — نام
ثریا کے تارک پر اس کا ہے پاؤں

دیکھنت زور آور طالع اس راج کے	نصیب
منعادار روشن دلاں آج کے	روشن دل والے
کہیں وہ بہک کے علی وعلی	
کہ پھر جگ میں آیا محمد قلی	
سچے آج اے خسروِ نیک نام	پہنچا پہنچ
ہیں اُس کے کہ آثار تجھ میں تمام	

. . . .

سچا توں مالک ہے بشر نوع توں	
خداوندِ روئے زمین ہوئے توں	
توں وہ آج جوگی جواں مرد ہے	
جو دیو مندر ایسا جہاں گرد ہے	فرشتہ اندر جیسا
فلک سو ہے تابع تیرے عزم کا	
مرگ دن سو سایا تیرے بزم کا	

. . . .

تجھے دیکھنے واٹ اگر پادتے	راستہ
تو آسمان والے اُتر آوتے	
کہ بے مثل ربّا تو ایسا چے	ہی
غلط نیں میری بات یو سچ ہے	یہ
کیا مجھ غواصی کو تونے نہال	
کروں کیوں نہ میں شکر لے جگ اجال	دنیا کو روشن کرنے والے

(طوطی نامہ)

غواصی نے اپنی شاعری میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کو دنیا کا سب سے بڑا اور آزاد بادشاہ گردانا ہے۔ لیکن حقیقت اس سے اُلٹی ہے ۱۶۳۹ء میں شکست کھا کر اس نے شاہجہان کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اسی برس غوّاصی کا طوطی نامہ بھی منظرِ عام پر آیا اور اسی برس گولکنڈہ کی آزادی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ لیکن اُس وقت کے سبھی درباری شاعروں میں یہی بات دیکھی جاتی ہے، اس لئے ہم غوّاصی کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتے۔

شاعری کے میدان میں غوّاصی نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان بھر میں کسی کو اپنا مدِمقابل نہیں گردانتا تھا۔ اس کی اس تعلی کے ثبوت میں اس وقت تک صرف دو ہی کتابیں دریافت ہوئی ہیں جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ یہ دونوں کتابیں فارسی سے ترجمہ ہیں۔ اس لئے غوّاصی کی قوتِ تخیل، اور تصرفِ الفاظ کا صحیح اندازہ ان دونوں کتابوں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن اس کی قادر الکلامی کا یہ ثبوت ہے کہ ان ترجموں میں بھی اس نے اصل کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار "سیف الملوک" سے اخذ ہیں۔ ان میں غواصی کا زورِ قلم دیکھئے:۔

۱۔ خوبصورت عورت

"چلیا سیر کرنے کوں چھپے چمن	
سو وہ شہہ پری ناز چندر بدن	
پڑی تھی سو دیکھا نجک جا اُسے	نزدیک
بدیع الجمال ہے سمجھا اُسے	
اگر چہ نہ دیکھا تھا اس سے اول	اس سے قبل
چلے اس کی بے مثل صورت نچھل	معصوم
چُبھی اس کے نیناں میں بے اختیار	
پڑیا دیں زمین کے اوپر بے قرار	نہیں
جو دیدار کا شوق اُبلیا ادھیک	زیادہ
درس دیکھنے تیں آیا نجیک	نزدیک
بھرا نور اس کا اتھاہ نور یوں	
اُبلتے تھے آسماں کے سمدر جیوں	سمندر
سمن پت ہری ہے ادھک نازُن	زیادہ
سہیلی کنول سیں ہے نازک بدن	سے
دو رخسار روشن اموُلک ہے لال	
سو ہے ناؤں جس کا بدیع الجمال	نام
جو دستے اچھے لوگ پاتال کے	تھے
کہ جیوں موتیاں ڈھال نچ تھال کے	
دیکھیا جو چندر اس کو مونڈے کاڈ کر	چاند۔ مُنہ نکال کر
سٹیاں پیدھن آسماں کے پھاڑ کر	پھینک دیا
ستارے دیکھ اس کا نچھل نور سب	
لئے ہاتھ شرمندہ ہو چور سب	

۲ - بدصورت عورت

اکھیاں ڈونگیاں جو کھڑی سار کے	جیسے
دو دیدہ بھیتر جو پتھر غار کے	اندر
چڑھیاں ہونٹ اُپرال کا ناک پر	بالائی ہونٹ
ٹھڈی پر پڑیا ہے مس کا انتہ	ٹھوڈی - نیچے والا
تمام انگ کونی کیرا ٹاٹ جیوں	
چُچیاں دو سینے پر ہیں دو ماٹ جیوں	مشکیاں
نکل پیٹ انگے ٹک جیوں آکھڑا	آگے ٹھکا ہوا
تھا پیٹ سے سخت پیڈو بڑا	

. . . .

. . . .

ٹکتی جو یہ چھوٹی رُ سے	
سو جیوں جھاڑ کی پیڈ موٹی رہے	
سوئے سار پنڈلیاں اوپر تیز بال	سوئے جیسی
نہ تھی جگ میں ڈائن کوئی اس مثال	
سڑی بُو بغلاں تے یوں جھڑے	
بچنے باس اس کی ٹُسنگھے سو مرے	جو - سونگھے

۳ - شرابیوں کی محفل

عجب رات نرمل تھی اس دن کی رات	
چمکتے تھے نوراں میں لکھ دھانت بھات	لاکھ طرح
نکل آ بیکہ چاند تاریاں سیتی	ساتھ
جھمکتا اتھا جگمگاریاں سیتی	چمکتا تھا
دنے دن پون مکمکاتی اٹھی	ہوا
چمن در چمن لکلکاتی اٹھی	
خوش ایسی نچھل چندنی دیکھ رات	چاندنی
لے ساتھ کوں سیف الملوک اب سنگات	
صراحی و پیالے کی مجلس جو آپ	
لگے ذوق سوں پینے بھر بھر شراب	
نچھل کا تہاری سو گانے لگی	مغنیہ
رجھانے کے باجے بجانے لگی	
ادھی رات گھٹنے ہوئی ایسی بات	جانے
وہے ماندے قید کرے سنگات	
ہوتے لوگ یکدھرتے سب ٹھاڑ ٹھاڑ	ایک طرف سے
یک شاہزادہ سو تھا ہوشیار	اکیلا

طوطی نامہ" سیف الملوک" سے لگ بھگ دُگنے صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور چار ہزار ایک سو پچپن شعروں پر مشتمل ہے۔" سیف الملوک" لکھتے وقت وہ ایک غریب، بے سہارا اور گمنام شاعر تھا لیکن طوطی نامہ لکھتے وقت وہ دولت و عزت کا چہیتا مصاحب بن چکا تھا اور تب تارک الدنیا ہونے کا ارادہ کر رہا تھا۔ "طوطی نامہ" سنسکرت کی عظیم اور قدیم تخلیق "شکا سپ تتی" کا ترجمہ ہے۔ شکا سپ تتی کے معنی ہیں طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں۔ غواصی نے ستر کہانیوں میں سے صرف ۵۲ کو ہی اپنی زبان میں منتقل کیا ہے۔ طوطی نامہ کو مولانا سید محمد قادری نے ۱۶۸۲ء میں اور ابو الفضل نے ۱۵۳۹ء میں سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا تھا۔ یہ ترجمے نثر میں تھے۔ "شکا سپ تتی" آج ادب العالیہ کی ایک عظیم کڑی سمجھی جاتی ہے اور دنیا کی شاید کوئی ہی ایسی زبان ہو جس میں اس کا ترجمہ موجود نہ ہو۔ "طوطی نامہ" کی مقبولیت اور افادیت کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ کتاب برسوں تک ہندوستان اور بیرونی ممالک میں صرف تفریح طبع کے لئے ہی نہیں بلکہ حقائق و معارف کی تعلیم کے لئے بھی پڑھائی جاتی رہی ہے۔

طوطی نامہ میں ایک تاجر کی داستان ہے جسے تجارت کے سلسلے میں دور دراز کا سفر کرنا پڑا اور وہ وقت پر گھر نہ پہنچ سکا۔ اس کی بیوی پر یہ جدائی نہایت شاق گزری اور طرح طرح کے بُرے بُرے خیالات نے اس کے نازک دل کو اپنا مسکن بنا لیا۔ فارغ البال تاجر جدا ہوتے وقت اپنی بیوی کو طوطا اور مینا کا ایک جوڑا دے گیا تھا۔ جو بلا تکلف انسانی لہجے میں بات چیت کرنا جانتے تھے۔ ایک دن وہ اپنے بالاخانے پر بیٹھی تھی کہ اس کی آنکھیں ایک خوبرو نوجوان سے لڑ گئیں۔ محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ نوجوان نے ایک بڑھیا کے ذریعے خفیہ ملاقات کا پیغام بھیجا۔ تاجر کی بیوی ہوا و ہوس کے ریلے میں بہہ رہی تھی۔ راضی ہو گئی۔ اُس نے مینا کو اپنا ہمراز بنانا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا اور اسے اس گناہ سے باز رکھنا چاہا۔ بیوی کو اس پر بہت غصہ آیا اور اس نے مینا کو بڑی

بے دردی سے ہلاک کر دیا۔ پھر وہ طوطے کے پاس صلاح لینے کے لئے آئی۔ طوطے نے سیدھا منع کر دینا خلافِ مصلحت سمجھا کیونکہ مینا کا حشر وہ دیکھ ہی چکا تھا۔ اُس نے بیوی کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی ایک شرط بھی رکھ دی کہ وہ اپنے دِل کا بھید کسی کے آگے نہ کھولے گی ورنہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے پہلے ایک رانی کا ہوا تھا۔ اس نے طوطے سے رانی کا قصّہ سُننے کی خواہش ظاہر کی۔ طوطے نے نہایت دلکش اور دلچسپ انداز میں اسے بیان کیا۔ صبح ہو گئی لیکن قصّہ ختم نہ ہوا اور بات اگلی رات پر ٹل گئی اور اس طرح طوطے نے لمبی لمبی اور سبق آموز پینتالیس کہانیاں اُنتیس راتوں میں بیان کیں حتیٰ کہ تاجر سفر سے لوٹ آیا اور اس کی بیوی من مانی نہ کر سکی۔ ہر کہانی کے شروع میں کالی رات کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے ۔

"کہ دن عاشقاں کا سو ہے پردہ دار	
رین ہوئے تو آونگی اُس کے دھار	
غواصی اُتم رین کالی دراز	بہترین
یقین جان ہے عین عاشق نواز	
رین تے تو ہے دِموس روشن صبح	
وِلے کال سو عاشقاں کا یہی	لیکن

ذیل میں غواصی کے کچھ شعر طوطی نامہ سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ان کی بہار دیکھئے۔

۱۔ جگا جوت سورج اتم جات کا	
جو کر سیر سب دن سماوات کا	آسمان
ڈُبیا جا کے مغرب کے ظلمات میں	ڈوبا
لگے دیوَنے جیوں دِیوے رات میں	جلنے - چراغ
۲۔ گگن بن تے جھڑ جیوں گل آفتاب	آسمان، جنگل
لیا آپ سے لوں میں مغرب کی داب	
کنول چاند کا نرملا بے بدل	بے مثال
چمن تے جو مغرب کا آیا نکل	
۳۔ جہاں گرد خورشید جیوں وقت شام	
گیا غرب کے گھر منے جا مقام	گھر میں
نکل چاند مشرق کے باڑے تے باہر	
جوں آیا سو اُڈ دلہ با بے قرار	
۴۔ سونے کا پنکھی سورج جیوں سر کر	
چلیا غرب کے آشیانے بھیتر	اندر
بگولا روپ سارکھا صاف چاند	
کیا دیکھ پرواز آنچل سر کو باندھ	
۵۔ غواصی اگر نار گھاتک پہ آئے	عورت، دشمنی
تو سچ بات کوں جھوٹ کر یوں ہرائے	
جو پھٹ جا سچاں کا سینہ چیدہ ہوئے	سچ
بُری ذات ہے یہ اگر مور ہوئے	
۶۔ سورج چوتھے آسمان کا دیدبان	پہرے دار
گیا دید باقی کوں مغرب کے میان	
نکل چاند جاسوس مشرق سے باہر	
جو آیا سو پھر غمزدی ہو وہ نار	عورت
۷۔ جو سلطان خورشید کا شام کوں	
چلیا غرب کے گھر میں آرام کوں	
نکل گشت کوں چاند کا کوتوال	
جوں آیا سو وہ نار صاحب جمال	
۸۔ شکر تے اگرچہ ہے عورت میٹھی	
دلے سر بسر زہر کی ہے گھٹی	
میٹھیاں اگرچہ دِسیاں ہیں جیوں شکر آج	
دلے دل میں کچھ نیں کڑواتی باج	
۹۔ ڈبیا دیکھ دن شام مالی کے ساگ	
لیا سود کے آبنکوں جو آثار	
نکل شرق کے ڈالتے چاند سیب	
گگن کے چمن کوں دیا دیکھ زیب	آسمان، شوبھا
۱۰۔ فرشتے جو شمشیر کوں جان کے	
دئے ڈال بیچ غرب کی میان کے	
فلک شرق کا کھول رنگیں غلاف	
لیا ہات میں چاند کا سیف صاف	ہاتھ

۱۱۔ نہ جا اُن کی ظاہر کی خوبی پہ بھول
کہ کانٹے تے ہے تیز یو گرچہ پھول
غواصی جو ناریاں کیرا مکر کوتے (عورتوں کا)
لکھے سو کتاباں تو پورا نہ ہوئے (کتابیں)

اوپر دی گئی چند مثالوں میں شام، ستاروں، سورج اور چاند کا ذکر غواصی نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ سورج کو سونا، گلاب، پہرے دار، فرعون، ہاروت، شمشیر اور سونے کے ٹکے سے اور چاند کو روپا، کنول، جاسوس، سامری، سیبق اور نڈیہ سے تشبیہ دی ہے۔

غواصی نے سترھویں صدی میں جو شہرت اور عزت حاصل کی ہے وہ اس کے ہم عصر یا بعد کے شعراء میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ غواصی نے طوطی نامہ کے اختتام میں تارک الدنیا ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس نے اس پر عمل بھی کیا، کیونکہ اس کی زندگی کا آخری حصہ بھی ابتدائی حصے کی طرح بظاہر گمنامی میں گزرا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی تاریخ وفات اور جائے وفات کے متعلق بھی کوئی تذکرہ معلومات بہم نہیں پہنچ سکا

ہیروں کا دیش

ریاست وندھیا پردیش کا علاقہ "پنّا" گزشتہ کئی صدیوں سے ہیروں کی پیداوار کا مرکز چلا آ رہا ہے۔ اکبر کے عہد میں بھی اس علاقے کے ہیرے مشہور تھے۔ ہیروں کی پیداوار کا یہ خطہ بندھیل کھنڈ کے میدان سے اوپر کی طرف بلندی پر واقع ہے اور دکھن پچھم میں کیرا با سے لے کر اتر پورب میں اتوڈنڈ بلاک تک ۴۰ میل لمبے اور پانچ سے دس میل تک چوڑے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ تجارت کے ارضیاتی سروے کے شعبے کے تحت جنوری اور مئی ۱۹۵۲ء کے درمیانی عرصے میں اس خطے کا جائزہ لیا گیا۔

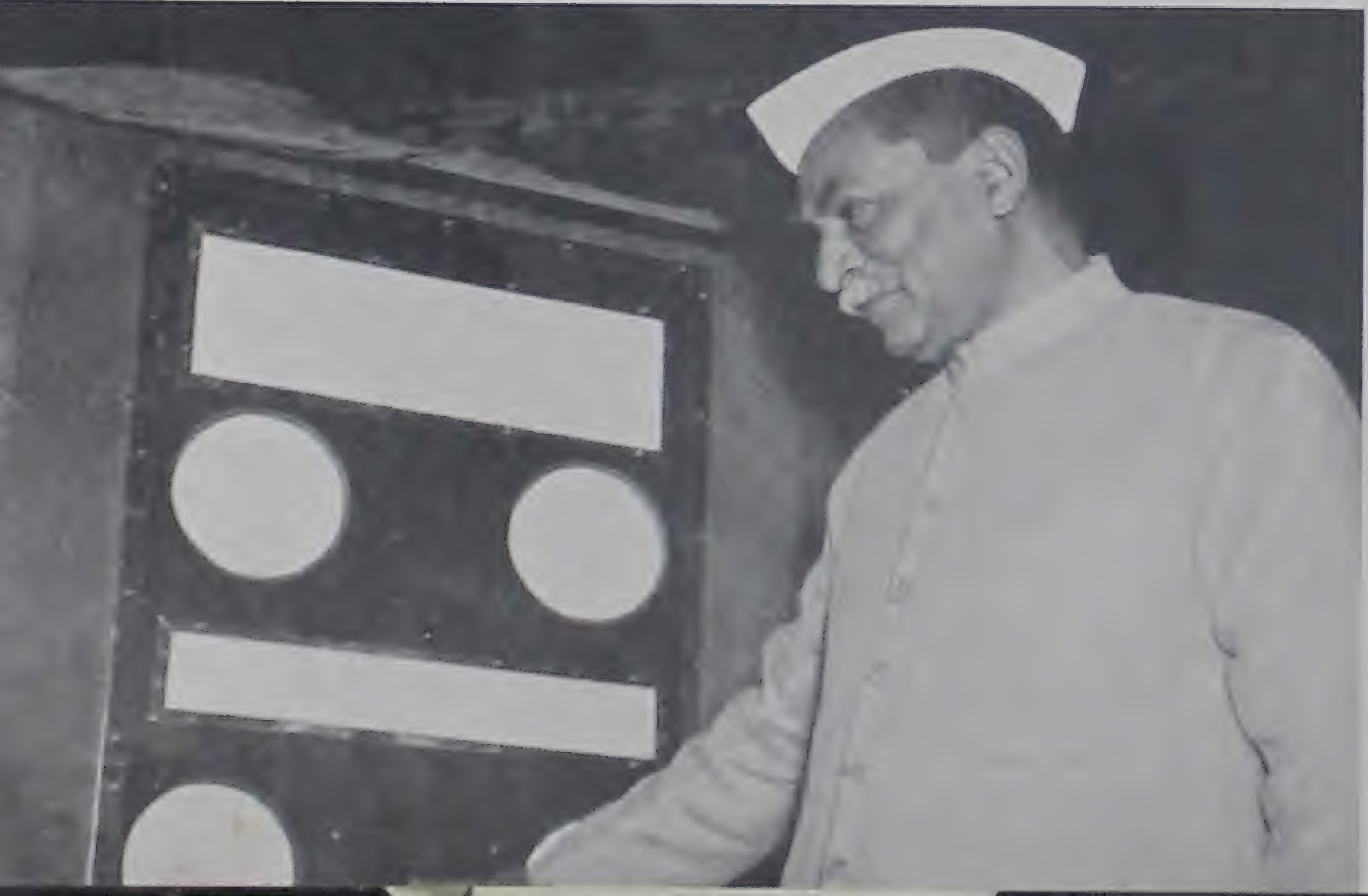
یورپی سیاحوں نے بہت عرصہ پیشتر ہیروں کی ان کانوں کے حالات سپرد قلم کئے، جنھیں ہیروں کی چمک بھارت کے اس حصے کی طرف کھینچ لائی تھی ۱۸۱۹ء میں فرانکس بکینن ہیملٹن نے اس علاقے کے حالات سپرد قلم کئے اور اس کے بعد ۱۸۳۲ء اور ۱۸۴۲ء میں جے آدم نے اس موضوع پر لکھا۔ اسی طرح جے فرنکلین اور دی مال وغیرہ نے بھی اس بارے میں اپنے تاثرات تحریر کئے اور ان مصنفین نے کانوں سے ہیرے برآمد کرنے کے طریقوں اور زیر زمین الماس خیز مادہ کی ساخت کا بھی ذکر کیا ہے۔

ارضیاتی سروے کے شعبے کے ای وریڈن برگ نے بیسویں صدی کے آغاز میں پنّا کے علاقے کا دورہ کیا اور ۱۹۰۶ء میں انھوں نے دو مضامین شائع کئے جن میں اس زمانے میں ہیروں کی کانکنی کے مختلف طریقوں اور ریاست مذکور میں چٹانوں کی ساخت وغیرہ کے بارے میں ضروری واقفیت درج کی گئی ہے۔

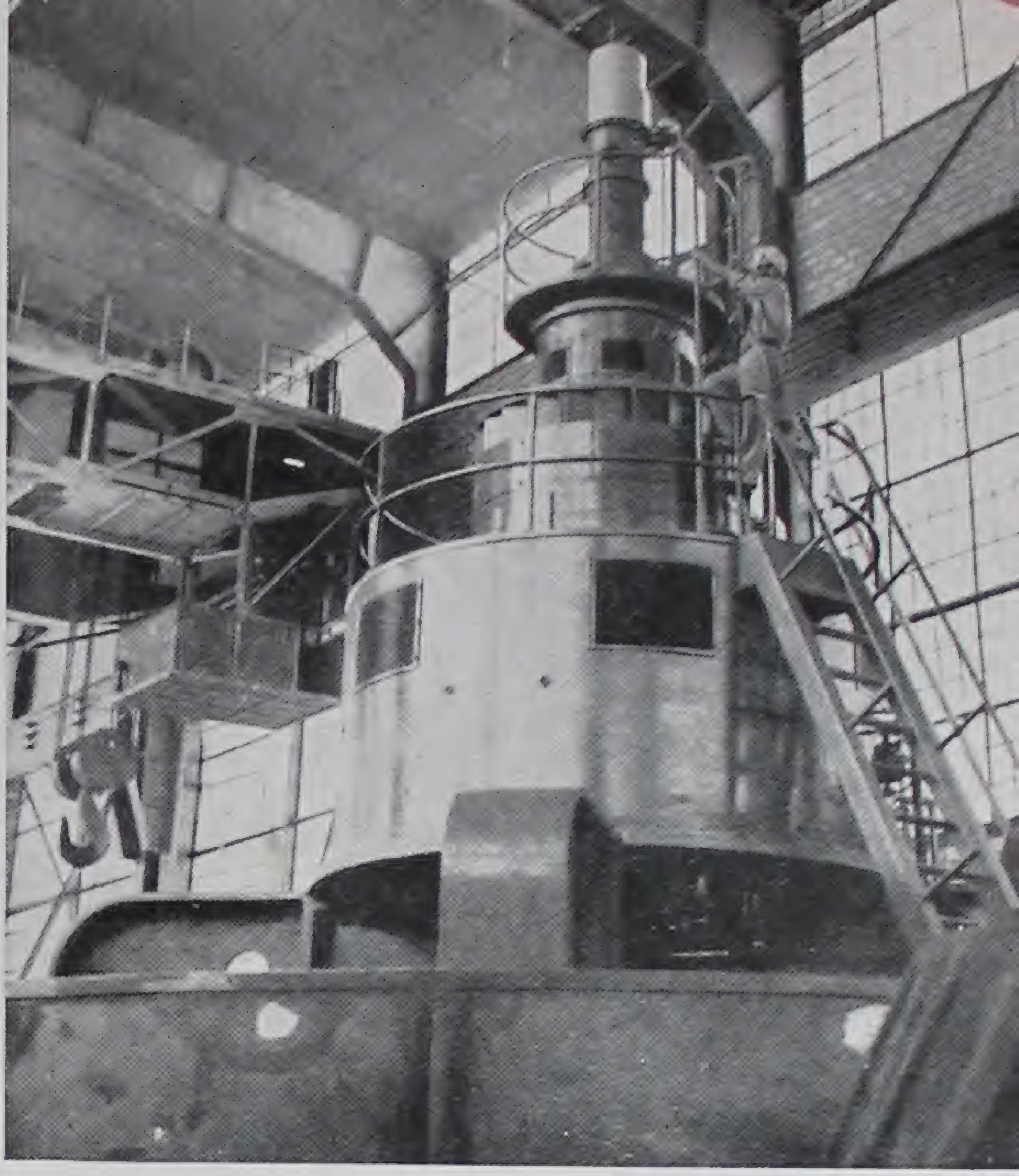
۱۹۳۰ء میں کے۔ پی سمور نے اس علاقے کا جامع سروے کیا اور اس کی بنا پر ایک مقالہ شائع کیا۔ ۱۹۳۵ء میں شری ای۔ سی۔ گپتا نے اس بارے میں تحقیق کی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مذکورہ علاقے میں ہیروں کی ساخت کے لئے ضروری مواد براہ راست بیجاواڑ کی چٹانوں کی بجائے کاموُر کے زیریں حصے میں جمع شدہ مادے سے فراہم ہوتا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں شری دی ایس ڈیوے اور ایس مرہ نے ماجھگوں کے علاقے میں الماس خیز مادے کا ذخیرہ دریافت کیا اور ان کا اندازہ ہے کہ اس علاقے کے تین ہزار فٹ کے بالائی پتھریلے رقبے میں تقریباً ۵ لاکھ قراط (سونا و جواہرات تولنے کا وزن) وزن کے ہیرے موجود ہیں۔

بھارت کے ارضیاتی سروے کے شعبے نے وندھیا پردیش کے اضلاع پنّا اور ستنا میں ہیروں کی پیداوار کے علاقے کا جائزہ لینے کے بعد اب یہ رپورٹ پیش کی ہے کہ اگرچہ ابھی تک صرف ماجھگوں کے رقبے میں ہی ایسے مادے کی موجودگی کا علم ہوا ہے جس سے ہیروں کی ساخت عمل میں آتی ہے لیکن چٹانوں اور سیلابوں سے جمع شدہ مٹی اور ریت کے ڈھیروں کے نیچے اس قسم کے مزید مادے کی موجودگی ممکنات میں سے ہے۔ کیونکہ اس امر پر یقین کرنا مشکل ہے کہ اس علاقے کی وسیع کانوں میں کثیر تعداد میں جو ہیرے پائے جاتے ہیں اُن کی ساخت کے لئے صرف ماجھگوں سے فراہم ہونے والا خام مادہ ہی کافی ہے۔





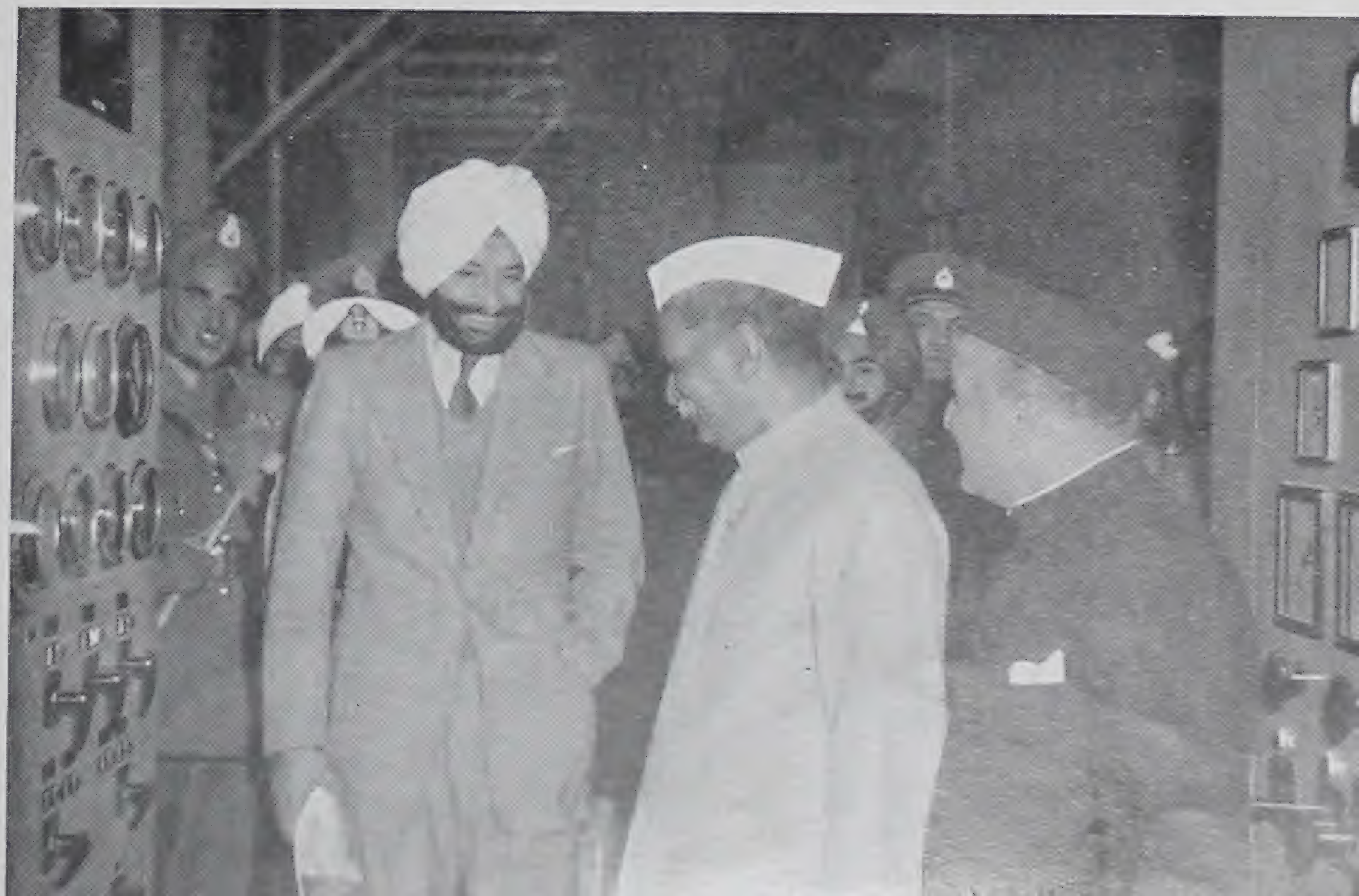
بھاکڑا ننگل پراجیکٹ کي تعمیر میں
گنگووال پاور ھاؤس پہلا برقابي پاور ھاؤس
ھے جو مکمل ھوا ھے - ۲ جنوري ۱۹۵۵ کو
صدر جمھوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اس کا
افتتاح فرمایا - اوپر کي تصویر میں وہ
اپنا افتتاحي ایڈریس پڑھ رھے ھیں اور
بائیں طرف کي تصویر میں بٹن دبا کر
پاور ھاؤس کا افتتاح فرما رھے ھیں



گنگووال پاور هاؤس کا جنریٹر جو ۲۴۰۰۰ کلووات
بجلی پیدا کرے گا



بجلی پہنچانے والے تاروں پر ۸۰۹۷ کروڑ روپیہ خرچ آیا ھے
یہ تصویر ننگل دھلی ڈبل سرکٹ لائن کے
ایک اینگل ٹاور کی ھے



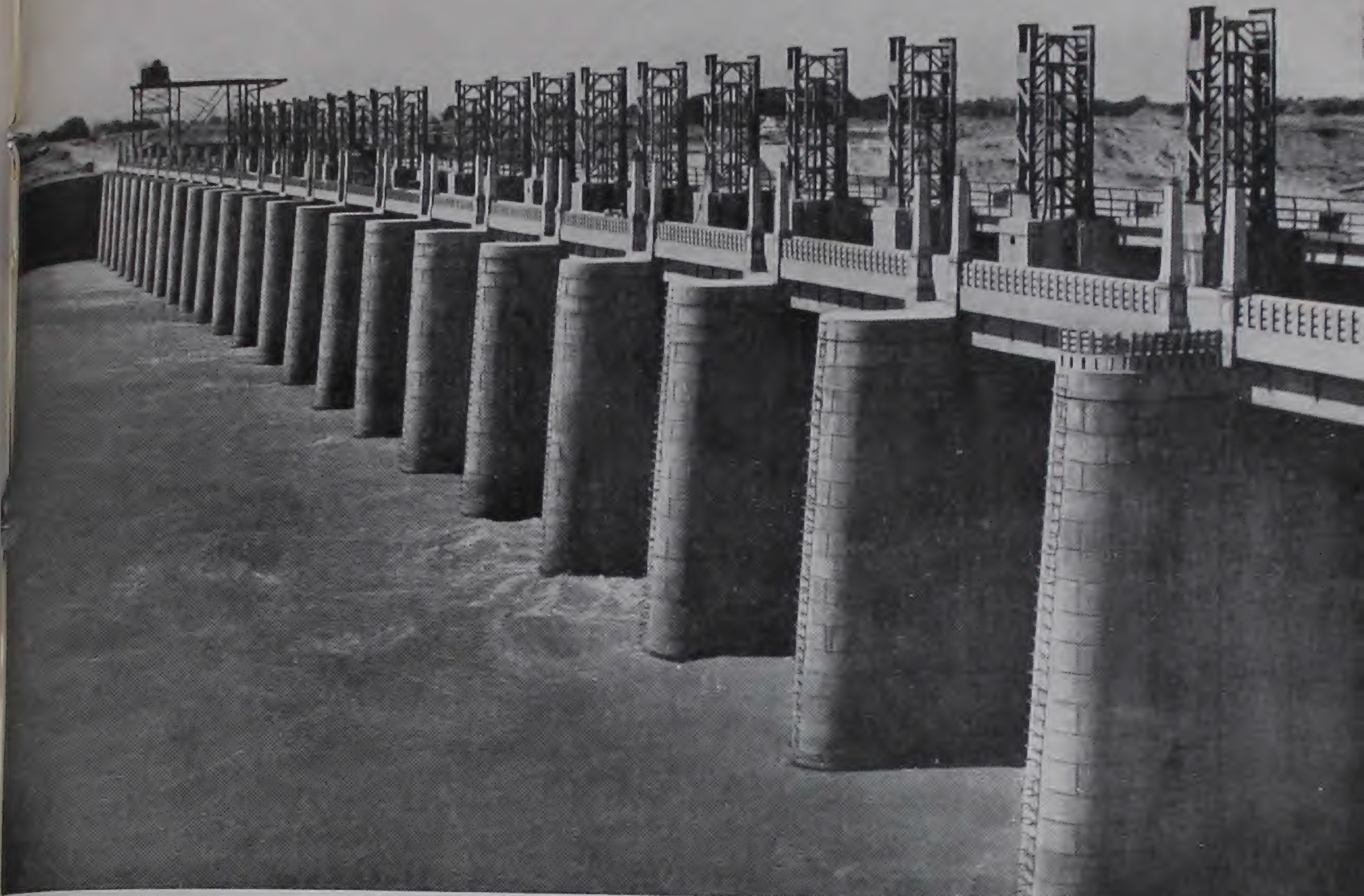
رسم افتتاح ادا کرنے کے بعد صدر
جمہوریہ گنگووال پاور هاؤس کا
معائنہ فرما رھے ھیں - پیپسو کے
راج پرمکھ ھزھائی نس مہاراجہ
پٹیالہ اور پنجاب کے وزیر اعظم
شری بھیم سین سچر موصوف کے
همراہ ھیں



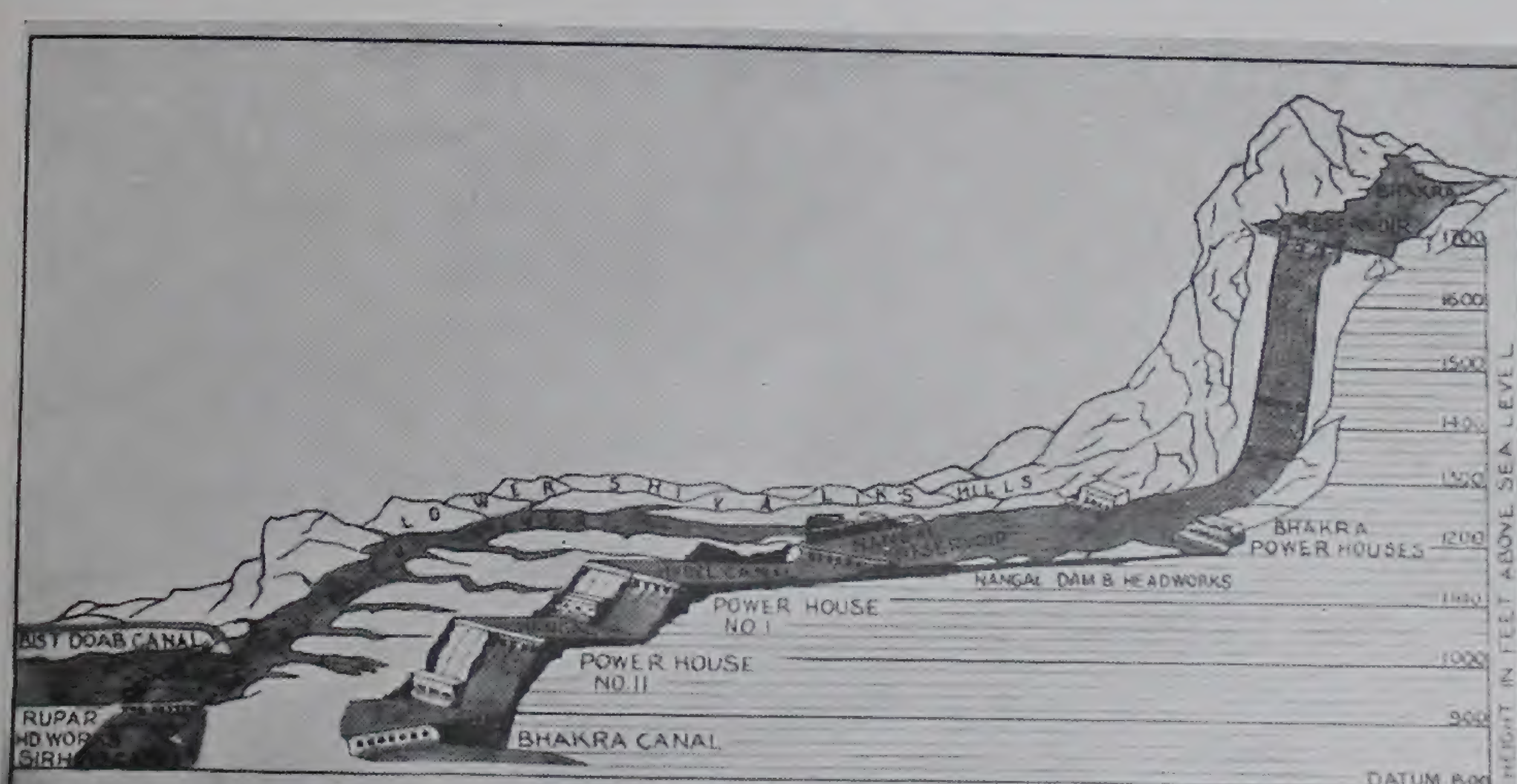
۲۵ فٹ چوڑی ننگل بھاکڑا روڈ بھاکڑا ڈیم کی جائے تعمیر تک بھاری مشینیں لے جانے کے لئے بنائی گئی تھی - تصویر کے درمیان میں اولندا پل دریائے ستلج پر صرف سات مہینے کی مدت میں بنایا گیا تھا



ننگل ورکشاپ



ننگل ڈیم



ھاکڑا ڈیم اور ننگل
ائڈل نہر کا نقشہ جس
ے مختلف پاور ھاؤسوں
ي سطح بحر سے
ندي ظاھر ھوتي ھے

مالک رام

باغِ دودر

غالب کے فارسی کلام کا کچھ حصہ ابھی تک غیر مطبوعہ پڑا ہے۔ اگرچہ اس کی ترتیب ان کی زندگی میں شروع ہو گئی تھی، لیکن اس کے مکمل ہونے سے پہلے ہی ان کی وفات ہو گئی۔ اسے وہ سبدِ چین کی طبعِ ثانی کے طور پر باغِ دودر کے نام سے چھاپنا چاہتے تھے۔ اس مجموعے میں مطبوعہ سبدِ چین کے علاوہ جو نیا کلام ہے اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۔	قطعات	۱۰ عدد	(۳۸ شعر)
۲۔	مثنوی	ایک	(۲۵ شعر)
۳۔	قصیدہ	ایک	(۳۱ شعر)
۴۔	غزل	ایک	(۷ شعر)
۵۔	مخمس	۷ بند	(۱۴ شعر)
۶۔	فردیات	ایک	(۱ شعر)
۷۔	رباعیات	۲ عدد	(۴ شعر)

گویا ان تمام اصناف میں (۱۲۰) نئے شعر ہیں۔

اس کے علاوہ اس مجموعے میں غالب کے کچھ غیر مطبوعہ فارسی خط بھی ہیں یہ تعداد میں (۱۳) ہیں اور سب کے سب منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام ہیں۔ جوہر، غالب کے عزیز دوست رائے چھجمل کھتری کے بڑے بیٹے تھے اور سرکاری ملازمت کے سلسلے میں پنجاب اور یو۔ پی کے مختلف مقامات پر تعینات رہے تھے۔ ان خطوط سے غالب کی زندگی سے متعلق بعض نئی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔

ہم آج کی صحبت میں اس مجموعے سے غالب کے دو نئے تاریخی قطعے ناظرین کے پیش کرتے ہیں۔ جوہر کے والد رائے چھجمل کی تاریخِ وفات لکھی ہے ؎

گویند: رائے چھجمل شیریں کلام مرد
دیرینہ دوست رفت، ازیں تنگنا دریغ
گفتم، کسے ز سالِ وفاتش نشاں دہد
غالب شنید و گفت، چہ گویم "لیسا دردریغ" [۱۲۷۷]

رائے چھجمل کی وفات کا سال پہلی مرتبہ اس قطعہ سے معلوم ہوا، یعنی وہ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱-۱۸۶۲ء) میں فوت ہوئے۔

سبدِ چین میں شیخ محمد ابراہیم ذوق کی تاریخِ وفات کا حسبِ ذیل قطعہ موجود ہے ؎

تاریخِ وفاتِ ذوق، غالب
با خاطرِ دردمندِ مایوس
خوں شد دلِ زار تا نوشتم
"خاقانیٔ ہند مرد" افسوس

"باغِ دودر" سے معلوم ہوا، کہ غالب نے ان کی وفات پر مندرجۂ ذیل قطعہ بھی کہا تھا ؎

گویند، رفت ذوق ز دنیا، ستم نبود
کاں گوہرِ گراں، بہ تہِ خشت و گل نہند
تاریخِ فوتِ شیخ بود، "ذوق جنتی" [۱۲۶۹]
بر قولِ من، روا ست اگر احباب دل نہند

اس میں مادۂ تاریخ "ذوق جنتی" سے ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) برآمد ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ غالب نے دونوں قطعے ذوق کی وفات کے بعد بیک وقت کہے ہوں گے۔ ان میں سے صرف ایک کی سبدِ چین میں شمولیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں یہ دوسرا قطعہ پسند نہیں تھا۔ اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ باغِ دودر میں بھی جہاں یہ قطعہ لکھا ہے اس پر نشان بنا دیا ہے کہ اسے شاملِ اشاعت نہ کیا جائے۔

غلام ربّانی تاباں

تابانیاں

مانندِ جام دور میں تاباں رہے ہیں ہم
یعنی حریفِ گردشِ دوراں رہے ہیں ہم

کس کس چمن میں گونجی ہماری نوائے شوق
پھولوں کی انجمن میں غزلخواں رہے ہیں ہم

نکلا ہے جب جلوسِ بہاراں چمن چمن
ہر سروِ رواں کے ساتھ خراماں رہے ہیں ہم

دورِ خزاں میں، موسمِ برق و شرار میں
ناموسِ گلستاں کے نگہباں رہے ہیں ہم

نکلے ہیں گھر کو چھوڑ کے جس دم جنوں کے پاؤں
مہمانِ دشت و خارِ مغیلاں رہے ہیں ہم

کیا پوچھتے ہو آبلہ پائی کی لذّتیں
کانٹوں پہ فرطِ شوق سے رقصاں رہے ہیں ہم

اگرچہ کیا ہے راہِ طریقت سے انحراف
اکثر شریکِ محفلِ رنداں رہے ہیں ہم

شاہوں کو بھی نگاہ میں لاتے نہیں مگر
خدمت گزارِ بادہ فروشاں رہے ہیں ہم

جس شب ہُوا ہے چشمۂ تسنیم پر گزر
اُس رات ایک حور کے مہماں رہے ہیں ہم

یہ حسنِ اتّفاق کہ بیمار جب پڑے
زیرِ علاجِ عیسیٔ دوراں رہے ہیں ہم

اُس چشمِ حیلہ ساز و لبِ حیلہ جُو کی خیر
آوارۂ تتار و بدخشاں رہے ہیں ہم

دیر و حرم کی راہ سے گزرے تو بار بار
تنگیٔ رہگذر سے پریشاں رہے ہیں ہم

مقصودِ کفر و حاصلِ ایماں ہے زندگی
کافر رہے ہیں ہم نہ مسلماں رہے ہیں ہم

علم و یقیں پہ تنگ تھا جب عرصۂ وجود
وہم و گماں سے دست و گریباں رہے ہیں ہم

ہر تازہ واردات سے نسبت ہمیں بھی ہے
ہر تازہ انقلاب کے عنواں رہے ہیں ہم

روشن ہیں بزمِ دہر میں مثلِ چراغِ طور
یہ اور بات ہے تہہِ داماں رہے ہیں ہم

رتن پنڈوروی

ہندوستانِ قدیم اور فنونِ جنگ

زمانہ شجاعت کی حیرت انگیز جنگی ایجادات اور فنونِ حرب کے خوارقِ عادت اور فوق العقل کرشمے آج تک ایک عالم کو مبہوت کئے ہوئے ہیں۔ بلکہ بعض مغرب زدہ اور پست ہمّت نوجوان تو اُن قدیم آلاتِ جدال و قتال کے سحرکار اثرات سے قطعاً منکر بن چکے ہیں۔ لیکن صدیاں گزر جانے کے بعد پھر زمانے نے کروٹ لی اور مشرق کی گم شدہ سائنس کو مغرب نے انتہائی تحقیق و تفحّص کے ساتھ اس مرتبہ عروج تک پہنچایا کہ منکر بھی احسنت و مرحبا پکار اُٹھے اور سائنس کی ایجادی ارتقا کے ساتھ ساتھ موجودہ طرزِ جنگ و حالاتِ ضرب و حرب کی دہشت انگیز و قیامت خیز تباہ کاریوں نے زمانۂ قدیم کی جادو اثر ایجادات کا لوہا منوا دیا۔ بالخصوص پرمانو بم کے وجود نے تو رامائن اور مہابھارت میں مذکورہ ہتھیاروں کی کامل طور پر تصدیق کر دی۔ اس لئے ناظرین کی ضیافتِ طبع اور واقفیت کے لئے زمانۂ قدیم کی جنگی ایجادات کا مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ قدیم ہندوستانی تہذیب اور آرین تمدن پر پھبتی کسنے والے حضرات کا منہ بند ہو سکے۔ اور ساتھ ہی قدیم آریوں کی جنگی قابلیت کا صحیح طور پر پتہ چل جائے۔

اہلِ ہند اپنے بزرگوں کی عظمت و شان کے شاندار کارنامے ویدوں اور اس کے بعد کے ویدک ساہتیہ رامائن، مہابھارت اور پرانوں میں پڑھتے رہے ہیں لیکن پڑھتے وقت بعض حضرات ان کارناموں کو فرضی یا قیاسی کہہ کر خاموش ہو جاتے رہے ہیں۔ ایسے حضرات کی شکست خوردہ ذہنیت کو دور کرنے کے لئے جناب دیوان بہادر ہربلاس شاردا اجمیری نے ۱۹۱۷ء میں "ہندو سوپی ری اوریٹی" کے نام سے ایک معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی جس میں بے شمار حوالوں سے ثابت کیا کہ قدیم ہندی آریوں نے تہذیب و تمدن کے دیگر حیرت خیز ارتقائی مدارج کے علاوہ فنونِ جنگ میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ مذکورہ کتاب کے صفحہ ۲۹۵ پر مرقوم ہے۔ کہ "ہندوؤں کی یدھ ودّیا کا پراچین گرنتھ "دھنروید" چونکہ آج کل کہیں نہیں ملتا۔ اس لئے اس ودّیا کا تذکرہ مہابھارت، اگنی پران، شو پران، کلک پران، رامائن اور ایسے ہی دوسرے گرنتھوں میں جو تھوڑا بہت ملتا ہے وہی ہماری معلومات کا ذریعہ رہ گیا ہے۔ ایک اور مشہور مؤرخ ڈاکٹر سر ڈبلیو ہنٹر" نے "انڈین گزیٹر" میں "انڈیا" کے زیرِ عنوان صفحہ ۲۲۳ پر لکھا ہے کہ "فوجوں کی باقاعدہ نقل و حرکت، ان کے کوچ اور قیام کے انتظامات صف بندی۔ خیمہ زنی۔ سامانِ حرب و رسد کی بہم رسانی کے اصولوں سے قدیم آرین کماحقہ، واقف تھے۔

"مسٹر وارڈ" نے ۱۸۸۱ء میں رسالہ "تھیو سافسٹ" کے مارچ نمبر صفحہ ۱۲۴ پر ایک مقالہ کے ذریعے منکشف کیا ہے کہ ہندوؤں نے فنِ جنگ کو بھی نظر انداز نہیں کیا"۔ یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندو راجا خود اپنی فوجوں کو میدانِ جنگ میں لے جایا کرتے تھے اور وہ اس اہم خدمت پر مامور ہونے سے پہلے باقاعدہ فوجی و جنگی تعلیم میں مہارتِ تامہ و قابلیتِ کاملہ حاصل کرتے تھے چنانچہ بہت سے راجاؤں نے میدانِ جنگ میں اپنی بے نظیر جرأت و عدیم المثال فوجی قابلیت کے لئے نام وری اور شہرت پائی تھی۔ علاوہ ازیں رامائن اور مہابھارت اس امر کے شاہد ہیں کہ عوام الناس کے علاوہ راجا لوگ بھی اپنے لڑکوں کو ایسے اُستادوں کے سپرد کرتے تھے جو علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہونے کے علاوہ فنونِ سپاہ گری میں بھی شہرۂ آفاق اور نبرد آزمائی میں طاق ہوں۔ چنانچہ بھگوان رام چندر جی کو وشوامتر ایسے گورو کے سپرد کیا گیا۔ اسی طرح راجہ "شن تن نو" نے بھیشم پتامہ جی کو پرس رام کے سپرد کیا۔ اور پھر بھیشم پتامہ نے کورو اور پانڈووں کو درون اچاریہ کے جو اس وقت فنونِ جنگ میں یگانۂ زمانہ اور وحیدِ عصر تھا سپرد کیا۔ یہ وہی درون اچاریہ ہیں جنھوں نے کرپا اچاریہ کے ساتھ مل کر جنگ مہابھارت میں ایسی ایسی فوجی قلعہ بندی تیار کی جس کو دیکھ کر بھیم سین جیسے شیر افگن پہلوان بھی کانپ اُٹھے۔ یہ سب کرتب دیکھنے کے لئے ہمیں "برہسپتی رشی" کی لکھی ہوئی کتاب "یدھ وچیتا"

کی طرف توجہ کرنی چاہئے - مگر افسوس ہے کہ اس وقت اس پستک کا تو کیا رشی جی کی لکھی ہوئی اسی قسم کی دوسری پستکوں کا بھی کہیں نشان نہیں ملتا - ہاں بعض پراچین پستکوں میں رشی جی کے تصنیف کردہ گرنتھوں کے حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ پراچین "یُدھ وِدیا" کے مطابق فوجوں کو میدانِ جنگ میں صف آرائی کے موقع پر سات حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا - ان میں سے پہلا حصہ "مرکزی" ہوتا تھا جو میدان کی چھاتی سمجھا جاتا تھا - دوسرا حصہ "پہلو" جسے سنسکرت میں "کُکشا" کہتے تھے - تیسرا حصہ "بازو یا پر" جو "پکش" کہلاتا تھا - چوتھا حصہ "پرتی گرہا" اس میں محفوظ دستے شامل تھے - پانچویں حصے میں ہراول دستے تھے جن کو "کوٹی" کہا جاتا تھا چھٹا حصہ "مدھیہ" کہلاتا تھا - جن کو درمیانی دستے سمجھنا چاہئے - یہ دستے چھاتی کے دستوں سے پیچھے رہتے تھے - ساتویں حصے کا نام "پرشٹھ" یعنی پیٹھ تھا - یہ عقبی دستے تھے جو درمیانی دستوں سے بھی پیچھے رہتے تھے - اسی طرح فوجوں کو غنیم کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں اُتارنے کے لئے بھی صف آرائی اور قلعہ بندی کے کمال دکھائے جاتے تھے چنانچہ مہابھارت یُدھ میں گورو درونا چاریہ نے چکر ویوہ کی جو رچنا کی تھی - رہتی دُنیا تک دُنیا کو دہشت زدہ و مبہوت رکھے گی - پر لطف یہ کہ ارجن کے سوا دوسرا کوئی شخص اس قلعہ بندی کو توڑنا ہی نہیں جانتا تھا - اس ویوہ میں ارجن کا بیٹا ابھمنیو کام آیا - پانڈووں کے سب سُورما ہیکڑی بھُول گئے - آخر ارجن کسی دوسرے محاذ سے خبر پاکر آیا اور قلعہ شکنی کی نوبت آئی - اسی طرح راون کے سُورمیر بیٹے اندرجیت نے بھی ایسی ایسی قلعہ بندیاں تیار کی تھیں کہ لچھمن ایسے یودھا اور ہنومان، جاموتت ایسے سُورما ان میں گھر جاتے تھے - ان کے نام "ناگ پھانس" "برہم پھانس" "وشنو پھانس" وغیرہ تھے - رامائن، مہابھارت اور اگنی پران میں اس قسم کے سینکڑوں ویُوہوں کا ذکر آتا ہے - قلعہ بندی - تقسیم فوج اور بہم رسانی رسد کے علاوہ ہتھیاروں کا بیان بھی کوئی کم دلچسپ نہیں شوپران میں صرف "شنکھ چُوڑ راکشس" اور بھگوان شنکر کی جنگ ہی میں حسب ذیل ہتھیاروں کا ذکر آیا ہے -

۱ - کال کال استر، ۲ - مہانل استر، ۳ - مہیشور استر، ۴ - پاپ ڈنڈ استر ۵ - سموہن استر، ۶ - دِویہ سمرتھ استر، ۷ - سوے دِویہ استر، ۸ - رَشنی ۹ - بھُشنڈھی، ۱۰ - نارائن استر، ۱۱ - مگدر، ۱۲ - گندھرب استر، ۱۳ - برہم استر، ۱۴ - گرڑ استر، ۱۵ - پارجنیہ استر، ۱۶ - پاشوپت استر، ۱۷ - جِیبھن استر، ۱۸ - پاروت استر، ۱۹ - مہاویر استر، ۲۰ - پرش، ۲۱ - پراشس مگدر ۲۲ - کھٹ وانگ، ۲۳ - ترشکھا، ۲۴ - شول، ۲۵ - تومر، ۲۶ مُشٹی، ۲۷ - پٹش ۲۸ - کٹھورا استر، ۲۹ - گدا، ۳۰ - برہم استر، ۳۱ - ناگ پھانس، ۳۲ - اگن بان - ۳۳ - موسل، ۳۴ - کھڑگ، ۳۵ - پرسا، ۳۶ - شکتی، ۳۷ - سدرشن چکر، ۳۸ - بجر ۳۹ - سارنگ دھنش، ۴۰ - گانڈیو دھنش، ۴۱ - اگنی ترشول، ۴۲ - وشنو دھنش ۴۳ - نندک ترشول، ۴۴ - رُدر دھنش، ۴۵ - باہو یُدھ استر، ۴۶ - مل یُدھ استر ۴۷ - پاش، ۴۸ - نش ترش پھل، ۴۹ - پربت ورشا استر، ۵۰ - ناگ ورشا استر ۵۱ - برکش ورشا استر، ۵۲ - وایو استر، ۵۳ - ورشا استر، ۵۴ - دِویہ استر ۵۵ - میگھ استر، ۵۶ - اگنی استر، ۵۷ - وشنو استر، ۵۸ - موگھ استر

بالمیکی رامائن بال کانڈ میں اندر دھنش، نندک کھڑگ اور سارنگ دھنش کا ذکر آیا ہے لکھا ہے کہ یہ اندر دھنش وہ دھنش نہیں جو راجہ اندر سے منسوب کیا جاتا ہے - دراصل یہ سارنگ دھنش تھا جو شری وشنو جی نے پرس رام جی کو دیا تھا - اور پرس رام جی نے نندک نام تلوار کے ساتھ شری رام چندر جی کی خدمت میں پیش کیا - رام چندر جی نے برن جی کو دے دئے - برن جی نے اندر کے حوالے کر دئے - اور کہا کہ یہ رام چندر جی کی امانت ہیں - جب رام چندر جی بن میں تشریف لائیں - تو اُن کے حوالے کر دینا -

بھیشم پاٹن جی کے "دھنر وید" میں لکھا ہے کہ لڑائی کے دھنش دو قسم کے ہوتے ہیں -

۱ - سارنگ دھنش - جس کو جانوروں کے سینگ گلا کر بناتے ہیں -

۲ - بانس کی کمان - بانس سے بنتی ہے -

یہاں پر یہ بھی خیال رہے کہ جانوروں کے سینگ گلا کر دھنش بنانا حیرت انگیز نہیں - ولایت میں جس کانچ کا نام "بون گلاس" ہے وہ بھی اسی ترکیب سے بنائی جاتی ہے -

سارنگ دھنش ساڑھے تین ہاتھ کا ہوتا تھا - اس کو گھوڑے یا ہاتھی پر سوار ہو کر چلاتے تھے - رتھ سوار اور پیادہ کے لئے بانس کا دھنش تھا -

دھنش ودیا میں اہلِ ہند نے کمال کر دکھایا تھا - ہاتھی یا گھوڑے

کو دوڑاتے ہوئے تیر چلا سکتے تھے - ایک ہی بان سے متعدد جانیں لے سکتے تھے - دروپدی کے سوئمبر میں ارجن کا مچھلی کے عکس پر دھیان رکھ کر مچھلی کی آنکھ میں تیر مارنا - مہا بھارت یُدھ میں ارجن کا بانوں کی سیج بنا کر بھیشم پتامہ جی کو اُوپر لٹانا - زمین میں بان مار کر پانی نکالنا اور خشک کوئیں میں گری ہوئی گیند کا تیروں کے ذریعے باہر کھینچنا - راجہ بیر باہن کا ایک ہی بان سے درخت کے سارے پتے چھید ڈالنا حیرت انگیز نہیں تو اور کیا ہے -

تیر بھی کئی قسم کے ہوتے تھے - آگ برسانے والے - پانی برسانے والے مثلاً اگن بان، برہم استر، برہم شکتی وغیرہ - چنانچہ کھر دوکھن اور ترسرا کی چودہ ہزار فوج کے مقابلے میں بھگوان رام چندر جی نے جو تیر چلائے وہ تین قسم کے تھے -

۱- نالک بان - (وہ تیر جن کی کاٹنی (انی) لوہے کی تھی -

۲- ناراکش بان - جو بالکل آہنی تھے

۳- بکرلی - جن سے دو زخم لگتے تھے - اور جسم سے نکالو تو تیسرا زخم اور بھی گہرا ہوتا تھا -

بعض تیر ایسے بھی تھے جو نشانے پر نہ بیٹھنے کی صورت میں واپس ترکش میں آجاتے تھے - اس امر کے ثبوت کے لئے پروفیسر "ولسن" لکھتے ہیں کہ "ان امور کو خلاف قیاس سمجھنے والے لوگ آسٹریلیا کے باشندوں کو اپنا "بومرنگ" استعمال کرتے ہوئے دیکھیں -

رامائن اور مہا بھارت میں عجیب و غریب ہتھیاروں کے علاوہ ومانوں (ہوائی جہازوں) کا بھی ذکر ہے - جو بغیر آواز کے چلتے تھے - راجہ بھوج کے زمانے میں پارے سے چلنے والا ہوائی جہاز استعمال میں آتا تھا جس کی شکل گھوڑے سے ملتی تھی - اس لئے اس کا نام ہی اشو مکھی تھا - اس قسم کی ہزاروں حیرت انگیز چیزیں پرانی کتابوں میں موجود ہیں - لیکن قدیم کتب کے نایاب و تباہ ہو جانے کے باعث یہ سب کچھ طاقِ نسیاں کی زینت ہو چکا ہے - اور نئی روشنی کے نوجوان یا موجودہ سائنس کے دلدادگان پرانوں میں مذکور فنونِ جدال و قتال کو محض افسانہ سمجھتے ہیں -

"تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان جنت نشان شروع ہی سے غیر ممالک کے حملہ آوروں کی جولان گاہ رہا ہے - ترک تازانِ حوادث کی لکد کوبی کا صریحی و حکمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے علمی و فنی خزانے جو مخطوطاتِ نادرہ میں لباس الفاظ میں ملبوس تھے - یا تو جلا دئے گئے یا ضائع کر دئے گئے - چنانچہ تکشلا (ٹیکسلا) نالندہ - پاٹلی پتر (پٹنہ) کی لائبریریوں کی کتابیں کئی مہینوں تک حملہ آوروں کے باورچی خانوں میں ایندھن کا کام دیتی رہیں - کہتے ہیں پاٹلی پتر کے نزدیک ایک بہت بڑی لائبریری متواتر چھ مہینے تک جلتی رہی - حملہ آوروں کی دست بُرد کے علاوہ ہماری قدامت پسندی اور دقیانوسی ذہنیت بھی اس علمی تباہی کی بہت کچھ ذمہ دار ہے - کیونکہ ہم اپنی نایاب و نادر کتابوں کو دوسرے کی تحویل میں دینے کی بجائے ضائع کر دینا بہتر سمجھتے تھے - چنانچہ جنوبی ہند کے ایک عالم و فاضل برہمن کے پاس "لوہ سار" نامی کتاب تھی - جس میں لوہے کا سفوف بنا کر دوسری دھاتوں میں ملانے کے طریقے درج تھے - جن لوگوں نے دہلی میں پرتھوی راج کا مندر دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے عین وسط میں وشنو کی لاٹھ اسی طریق سے پانچ دھاتوں کو ملا کر بنائی گئی ہے - دورِ حاضرہ کے سائنس دان اس کی طرزِ ساخت پر حیران ہیں - کہتے ہیں ایک انگریز سائنس دان نے اس کتاب کے عوض زرِ کثیر کی پیش کش کی - لیکن پنڈت صاحب موصوف نے کتاب مذکور کو ہون کنڈ میں ڈال کر جلانے کو فروخت کرنے پر ترجیح دی - اسی طرح سونا چاندی وغیرہ بنانے کے قلمی نسخے یوگیوں اور سنیاسیوں کے پاس سینہ بسینہ چلے آتے ہیں لیکن ان سے عوام کو ذرہ بھر بھی فائدہ نہیں پہنچ سکا -

حال ہی میں "مہرشی بھاردواج" کا ایک قدیم ترین قلمی نسخہ موسوم بہ "ینتر سرو سو" دست یاب ہوا ہے - جس کے چوتھے ادھیائے کا نام ہی "ومان شاستر" ہے - اس میں ہوائی جہازوں کی تیاری - پرزوں کی تفصیل - ایندھن کی جگہ استعمال میں آنے والے تیل اور رس، ہوائی حادثات کے اسباب اور ان کا تدارک درج ہے - بھاردواج جی لکھتے ہیں کہ اس ادھیائے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں پرانی چھ کتابوں سے مدد لی گئی ہے - ۱- ومان چندر کا مصنف نارائن رشی ۲- ویو بان تنتر مصنفہ شونک رشی ۳- ینتر کو مصنفہ مہرشی گرگ، ۴- بان بندھو مصنفہ واچسپتی، ۵- کھیٹ بان پردیپکا مصنفہ چکرائنی، ۶- دیوم یا نارک پرکاش مصنفہ ڈھونڈی ناتھ - اسی ضمن میں زمانۂ قدیم کے ہوائی جہازوں کے ماہروں اور انجینئروں کے نام بھی درج ہیں - اس کتاب پر "تیشور بودھانی" کا لکھا ہوا ایک بھاشیہ (شرح) بھی ملا ہے -

کتاب مذکور میں مرقوم ہے کہ ہوائی رستے پانچ قسم کے ہوتے ہیں اور ومانوں کو دورانِ پرواز میں پانچ ہی قسم کے خطرے پیش آسکتے ہیں - خطرے کو سنسکرت میں آورت یا آورت کہتے ہیں - ۱- شکتی آورت - جب کہ انجن میں

خرابی پیدا ہو جائے ۔

۲ ۔ داتاورت ۔ جب طوفانِ باد و باران سے ومان کی رفتار رُک جائے ۔

۳ ۔ کرناورت ۔ جب ریڈیائی لہروں سے ہوائی جہاز کی لہروں میں رکاوٹ پیدا ہو جائے ۔

۴ ۔ شیت ورت ۔ جب ہواباز کے ہاتھ پاؤں سردی سے ٹھٹھر کر ناکارہ ہو جائیں یا تیل جم جانے کا خطرہ لاحق ہو ۔

۵ ۔ گھرشن آدرت ۔ جب پرزوں کے گھس جانے یا ناکارہ ہو جانے سے جہاز میں کوئی خلل آ جائے ۔

خطرات کی پانچ قسمیں بیان کر کے بتایا گیا ہے ۔ کہ فضائے آسمانی میں ایسی کون سی طاقتیں ہیں جن کے اثر انداز ہونے سے جہاز بے قابو ہو جاتا ہے یا ٹوٹ پھوٹ کر نیچے گر پڑتا ہے ۔ اور کون سی برقی لہریں ہیں جو ریڈیائی لہروں کو بے اثر کر دیتی ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی پندرہ قسم کے زہروں کا ذکر ہے جو ہواباز اور مسافروں کے حق میں مہلک ثابت ہوتے ہیں ۔ مزید برآں ہر زہر سے بچنے کا طریقہ بھی ساتھ ساتھ دیا گیا ہے ۔

اس نادر کتاب میں مہرشی نے ومان شاستر کے علاوہ ریڈیوگرافی، وائرلیس ٹیلی گرافی، فوٹوگرافی کا ذکر بھی کیا ہے ۔ کتاب کے پچیسویں ادھیائے میں آواز کے ذریعے چلنے والے ایک ومان کا ذکر ہے ۔ نیز سب سے زیادہ دلچسپ دل کش اور حیرت خیز بات یہ بھی درج ہے کہ انتہائی بلندی پر اُڑنے والے ہوائی جہازوں میں بیٹھے ہوئے آدمی ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے ہیں ۔ ایک ہوائی جہاز کے مسافر دوسرے ہوائی جہاز میں بیٹھے مسافروں اور اُن کے سامان کی تصویریں دیکھ سکتے ہیں ۔ بٹن دبانے سے ایک دروازہ کھولا جا سکتا ہے ۔ جس سے دریا، پہاڑ، شہر اور دیگر نظارے بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں ۔ کتاب کے اس حصے کا نام "اُپکار ینتر" ہے ۔ اسی کتاب میں "دشا پال ینتر" نامی ایک باب ہے جس میں ایسے طریق مندرج ہیں کہ اُن پر عمل کرنے سے دھند یا کُہر کی صورت میں بھی سمت اچھی طرح نظر آتی ہے ۔ الغرض یہی ایک نسخہ موجودہ سائنس دانوں کو انگشت بدنداں کرنے کے لئے کافی ہے ۔ میسور سنسکرت پریشد کے ودوان مغربی سکالروں کی مدد سے اس کتاب کی مزید ریسرچ کر رہے ہیں ۔ امید ہے اگر اسی طرح تجسس و تفحص کے میدان میں جولانیاں جاری رہیں تو بہت کچھ گوہر ہائے آب دار اور دُر ہائے نادرہ سے دامن ملک و قوم مالا مال ہو گا ۔

ہندو یدھ ودیا گرنتھوں میں سب ہتھیاروں کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔

۱ ۔ "ینتر مکتا" ۔ جو کسی آلے یا کسی انجن سے پھینکے جائیں ۔ مثلاً تیر، بم، توپ، بندوق وغیرہ ۔

۲ ۔ "ہست مکتا" ۔ جو صرف ہاتھ سے پھینکے جائیں ۔ مثلاً پتھر، برکش، چکر، کمند، موسل وغیرہ

۳ ۔ جو پھینکنے کے بغیر ہی ہاتھ میں رکھ کر وار کیا جائے ۔ مثلاً ترشول، تلوار، سنگین، گدا

۴ ۔ قدرتی ہتھیار ۔ گھونسہ، لات، تھپڑ، ٹھوکر

۵ ۔ خوفناک ہتھیار جیسے بھنڈی پال، شکنی، تومر، نراچ، پرسا، رشٹی، کشینی وغیرہ

ان پانچ قسموں کے علاوہ آتش بار آلات کا ذکر بھی ملتا ہے ۔ آگ اور بجلی کی مدد سے چلنے والے ہتھیار موجودہ دور کی خاص ایجاد سمجھے جاتے ہیں مگر ہمارے یہاں پرانے گرنتھوں بلکہ ویدوں میں بھی اُن کا مفصل حال درج ہے ۔ یجروید میں ان ہتھیاروں کے اصول بیان کئے گئے ہیں ۔ پراچین گرنتھوں کا ذکر تو درکنار پرتھوی راج راسا تک میں ان کا تذکرہ موجود ہے ۔ چنانچہ دربار اودھ کے مؤرخ راجہ کندن لال لکھتے ہیں ۔ کہ شاہان اودھ کے ہاں "پچھا" نام کی ایک توپ تھی جو مہاراجہ پرتھوی راج کے توپ خانے کی کہی جاتی تھی ۔

کتاب "ایشیا پوجو گیا" کی پہلی جلد کے دوسرے حصے اور پانچویں باب میں "ماریا سوزا" نے سنہ ۱۵۰۰ء میں گجرات کے ایک جہاز پر سے پرتگیزوں پر کئی توپوں سے گولے برسائے جانے کا ذکر کیا ہے ۔ اور ساتویں باب میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۵۰۳ء میں زمورن کے بیڑے میں ۳۸۰ توپیں تھیں ۔

پروفیسر ولسن لکھتے ہیں کہ پراچین بھارت کے ہتھیاروں میں "وجر" یعنی بجلی کا ذکر بہت آتا ہے ۔ جو کوئی دھماکا پیدا کرنے والا ہتھیار تھا ۔ ہندوؤں کی طبی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے ۔ کہ وہ گندھک لکڑی کے کوئلے اور شورے کے استعمال سے بخوبی واقف تھے جو بارود کی بنیادی میں کام آتے ہیں ۔ مسٹر ڈیوٹی اپنی کتاب "زمانہ حال کی ایجادات" کے صفحہ ۱۹۷ پر لکھتے ہیں "سکندر نے ارسطو کو لکھا تھا کہ ہندوستان میں اپنی فوجوں پر میں نے آگ کے خوفناک شعلے

برستے ہوئے دیکھے"۔ راماین میں مذکور ہے کہ رشی وشوامتر جی نے شری رام چندر جی کو جو ہتھیار دئیے تھے اُن میں سے ایک ہتھیار کا نام "اگنیے یہ" اور دوسرے کا نام "شکھرا" تھا۔

مسٹر گیری اور مادرش میں نے شکھرا کو بھک سے اُڑ جانے والا ہتھیار بتایا ہے۔

مہاراجہ دشرتھ سے کئی پشت پہلے مہاراجہ سگر نے بھارگو رشی سے آتشیں ہتھیار حاصل کئے۔ اور اُن سے "تال جنگ" اور "ہے ہے" نسل کے راجاؤں کا خاتمہ کیا۔

"ایم سی انگ لاٹس نے لکھا ہے کہ یہ ہتھیار بھارگو رشی کے خاندان میں ایک عرصے سے موجود تھے۔ مندرجہ بالا خونخوار اوزاروں کے علاوہ مہابھارت میں "ماہیندر دھنش، یام دیو دھنش، گانڈیو دھنش، اشونی کمار دھنش، وشنو دھنش، ودّیہ دھنش، جمراج دھنش، رودر دھنش، اگنی دھنش بلدیو دھنش کا بھی ذکر ملتا ہے۔

مہابھارت، بھاگوت پران کے مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ قدیم ہند میں فوج کے اعداد وشمار اکشوہنی کے حساب سے تھے۔ اکشوہنی کا پیمانہ گرنتھوں میں حسب ذیل طریق سے ملتا ہے۔

ایک اکشوہنی کا پرمان	ہاتھی	=	۲۱۸۷۰
	رتھ	=	۲۱۸۷۰
	گھوڑ سوار	=	۶۰۰۰۰
	پیدل	=	۱۰۹۳۵۰

والمیکی راماین ایودھیا کانڈ میں ایودھیا کی قلعہ بندی کا ذکر کرتے ہوئے والمیک جی لکھتے ہیں کہ جس طرح ایک عورت بیش قیمت زیوروں سے سجی ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایودھیا کے بیتار بڑی بڑی تباہ کن شیلنوں سے آراستہ تھے۔ سنسکرت گرنتھوں میں "شت گھنی" اور "سہسر گھنی" کا بار بار ذکر آتا ہے اول الذکر کے لغوی معنے ہیں ایک ہی وار میں سو جانوں کو نابود کر دینے والی۔ اور دوسرے ہتھیار کے معنی ہیں ایک ہی وار میں ہزار جانوں کو تلف کر دینے والی۔ پورانوں میں وشوامتر جی کو شت گھنی اور سہسر گھنی کا موجد بتایا گیا ہے "امرکوش" اور "شبد کلپدرم" میں جہاں اگنی استر کا ذکر ہے وہاں یہ بھی درج ہے کہ اگنی استر چھوٹتے ہی دشمنوں کی فوج میں پہنچ کر کئی کئی آتشیں ندیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور کسی طرح بھی نہیں بجھایا جا سکتا۔

پروفیسر ولسن کا بیان ہے کہ یورپینوں کے ہندوستان میں آنے سے صدیوں پہلے ہندوستانی لوگ جنگی ہوائیاں ایجاد کر چکے تھے اور یورپ میں ان کا استعمال بالکل حال ہی میں ہونے لگا ہے۔ چنانچہ یورپ میں راکٹ کا استعمال سب سے پہلے سنہ ۱۸۰۷ء میں ڈنمارک کی راجدھانی کوپن ہیگن کے محاصرے میں کیا گیا ہے۔

یونانی مصنفوں نے ہندوستانیوں کے تیار کردہ ایک عجیب وغریب تیل کا ذکر کیا ہے۔ جو شہروں کی فصیلوں اور قلعوں کی دیواروں کو گرانے میں کام دیتا تھا۔ اور اس تیل سے لگی ہوئی آگ بجھائی نہیں جا سکتی تھی۔

راماین مہابھارت میں دیگر ہتھیاروں کے علاوہ وایو استر، ورن استر، میگھ استر اور موہنی استر کا ذکر آتا ہے۔ پہلے دونوں ہتھیاروں کے چلتے ہی آندھی کا طوفان بپا ہو جاتا تھا۔ چوتھے کے چلتے ہی دشمن کے آدمی بے ہوش ہو جاتے تھے۔ تیسرے ہتھیار سے میدان میں پانی ہی پانی ہو جاتا تھا۔ زمانہ حال میں اس ہتھیار کو اشک آور گیس یا دیگر نو ایجاد گیسوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ ان استروں کے چلائے جانے پر دشمن اپنے آپ کو آگ کے زبردست شعلوں، بجلی کی لہروں، پانی کے سیلاب یا گہرے اندھیرے زہریلے اور دم گھٹنے والے دھوئیں سے گھرا ہوا پاتے تھے۔ یا آنکھوں کے سامنے سانپ، بچھو، شیر، چیتے وغیرہ خوف ناک جانور آ آ کر انھیں خوف زدہ کرتے تھے۔ اس وقت ان کے جوابی استر چھوڑ کر اپنی حفاظت کی جا سکتی تھی۔

مشہور امریکی تھیوسوفسٹ کرنیل اسکاٹ لکھتے ہیں۔ کہ اس استر ودّیا کی ہمارے موجودہ زمانے کے پروفیسروں اور اسکالروں کو ہوا تک بھی نہیں لگی۔ جس کا ایک ایک ماہر ایک بڑی حملہ آور فوج کو چند منٹوں میں ہی بھاگنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ غرض اس طرح ہزاروں حیرت انگیز ہیبت اثر اور خوف ناک ہتھیاروں کا ذکر قدیم گرنتھوں میں ملتا ہے۔

آج کل لوگ پرمانو بم یا ہیڈروجن بم ہی کو سب سے آخری ترقی یافتہ ایجاد کہہ رہے ہیں۔ ذرا غور کریں تو زمانۂ قدیم کی ادنیٰ ترین ایجاد کے سامنے یہ پرمانو شکتی ہیچ ہے۔

شہناز ہاشمی

ناشپاتی کا درخت

(کیتھرین مینسفیلڈ کی ایک کہانی سے ماخوذ)

اگرچہ برتھا تیس سال کی ہو چکی تھی، پھر بھی کبھی کبھی ایسے لمحے آئے جب اُس کا جی چاہتا تھا کہ بچوں کی طرح دوڑنے بھاگنے لگے۔ سڑک پر ناچ ناچ کر قدم رکھے، ہواؤں میں کوئی چیز اُچھالے، یا پھر آپ ہی آپ خوب ہنسے ——— بلاوجہ ——— بلا مقصد ——— !

کوئی کیا کرے جب اس کی عمر تیس سال کی ہو چکی ہو کہ ایک دن اپنے گھر کے سامنے کی سڑک پر پہونچ کر اُس کا دل یکایک ایک مسرت کے احساس سے لرز اُٹھے ——— مکمل اور بھرپور مسرت ——— جیسے ابھی ابھی اس نے سورج کا ایک ٹکڑا نگل لیا ہو اور وہ اس کے سینے میں جل رہا ہو۔ رگ رگ میں شعلوں کی پھوار برسا رہا ہو . . . .

کیا کسی طرح اس نامعلوم مسرت کا اظہار کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس کے اظہار کے لئے شراب کے نشے میں چور ہونا ضروری ہے؟ آخر یہ جسم دیا ہی کیوں گیا؟ کیا اسی لئے کہ ہماری سارنگی کے خانے کی طرح ہر احساس اس میں چھپا کر رکھا جائے؟

"نہیں۔ یہ سارنگی کی مثال ٹھیک نہیں رہی" برتھا نے سوچا۔ "میرا مطلب نہیں تھا" اور برتھا سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ اس کی انگلیاں بیگ میں کنجی تلاش کر رہی تھیں، جیسے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی بھول گئی تھی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا کیونکہ ———" میری نے دروازہ کھولا اور برتھا ہال میں داخل ہوئی۔

"کیا نرس واپس آگئی؟"

"جی ہاں"

"اور پھل آگئے؟"

"جی ہاں۔ سب چیزیں آگئی ہیں"

"پھل کھانے کے کمرے میں لے آؤ۔ میں اوپر جانے سے پہلے میز پر پھل سجاتی جاؤں" کھانے کے کمرے میں اندھیرا تھا، اور سردی بھی۔ پھر بھی برتھا نے کوٹ اتار کر پھینک دیا۔ اُس کے بازوؤں نے ٹھنڈی ہوا کی لذت محسوس کی۔ اس کے سینے میں اب بھی چنگاریوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ یہ مسرت اس سے سہی نہ جاتی تھی۔ وہ سانس لیتے بھی ڈرتی تھی کہ کہیں یہ آگ اور تیزی سے نہ بھڑک اٹھے۔ پھر بھی وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی ——— وہ آئینے کی طرف دیکھتے ڈرتی تھی۔ پھر بھی اس نے آئینے کی طرف دیکھا۔ آئینے میں اسے ایک عورت نظر آئی، جو مسکرائے جا رہی تھی۔ جس کے ہونٹ کانپ رہے تھے جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کچھ سننے کے انداز میں اٹھی ہوئی تھیں۔ کسی چیز کی منتظر تھیں ——— کسی زبردست واقعے کی ——— !

میری کشتی میں پھل لئے ہوئے آگئی۔ ساتھ ہی ایک شیشے کا پیالہ اور ایک نیلے رنگ کی بہت خوشنما پلیٹ بھی لائی جس پر ایسی عجیب سی چمک تھی، جیسے ابھی ابھی دودھ میں ڈبوئی گئی ہو۔

"کمرے میں روشنی کر دوں بی بی؟"

"نہیں۔ مجھے اچھی طرح نظر آ رہا ہے"

کشتی میں چند سنترے تھے، اور کچھ سیب۔ تھوڑی سی زرد ناشپاتیاں، ریشم کی طرح ملائم۔ کچھ سفید انگور، اور ارغوانی رنگ کے انگوروں کا ایک خوشہ۔ یہ اس نے کھانے کے کمرے کے نئے قالین کی مناسبت سے خریدے تھے۔ بڑی بے معنی سی بات معلوم ہوتی تھی۔ اسے دوکان پر کھڑے ہو کر خیال آیا تھا "کیوں نہ کچھ ارغوانی رنگ کے انگور بھی لے لوں۔ تاکہ قالین میز سے گھلتا ملتا ہوا معلوم ہو" اور اس وقت یہ خیال بڑا با معنی معلوم ہوا تھا۔

اس نے ان تازے تازے پھلوں کے دو مینار بنائے، اور دور سے کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ سچ مچ ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ان ارغوانی انگوروں نے ——— سیاہ میز شام کی دھندلی روشنی میں گھلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، اور نیلی پلیٹ اور شیشے کی پیالی ہوا میں تیر رہی تھی ——!

اس موڈ میں برتھا کو یہ منظر بڑا اچھا لگا ——— وہ ایک دم سے ہنسنے لگی۔

"نہیں، نہیں، نہیں، میں خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی ہوں"! ——

اس نے اپنا بیگ اٹھایا، اور دوڑتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر نرسری میں پہونچ گئی۔

نرس بی کو غسل کرا چکی تھی اور اب اسے کھانا کھلا رہی تھی۔ بچی سفید فراک اور نیلا گرم کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے سیاہ بال ایک گچھے کی طرح گندھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی ماں کو آتے دیکھا تو اچھل پڑی۔

"نہیں بی، پہلے کھانا کھا لو۔ اچھے بچوں کی طرح" نرس نے کہا اور اپنے ہونٹ اس انداز سے دبائے جس کا مطلب تھا کہ برتھا غلط وقت پر نرسری میں آئی ہے۔

"اس نے کوئی شرارت تو نہیں کی؟"

"جی نہیں، یہ ساری دوپہر بڑی پیاری بچی بنی رہی" نرس نے آہستہ سے کہا "ہم پارک میں ٹہلنے گئے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور بی کو گاڑی میں سے اتار دیا۔ ایک کالا کتا آیا اور میرے گھٹنے پر اپنا سر رکھ دیا اور بی اس کے کان کھینچتی رہی۔ آپ دیکھتیں تو وہ منظر"

برتھا کہنا چاہتی تھی کہ کالے کتے کے کان کھینچنا بڑا خطرناک کھیل تھا۔ مگر اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ خاموش کھڑی ان دونوں کو دیکھتی رہی۔

بی نے پھر برتھا کی طرف دیکھا اور کچھ اس طرح ہنسی کہ برتھا بے اختیار چیخ پڑی۔

"نرس، لاؤ میں اسے کھانا کھلاؤں۔ جب تک تم اس کے نہانے کا سامان ہٹا دو"

"بہت اچھا۔ مگر کھانا کھاتے وقت اسے کھیل میں مت لگائیے گا، جیسے آپ ہمیشہ کرتی ہیں۔ بعد میں مجھے بڑی مصیبت ہوتی ہے"

کیسی فضول بات تھی یہ۔ بچے کی ماں بننے سے فائدہ ہی کیا جب بچہ سارنگی کی طرح ایک خانے میں ——— نہیں۔ دوسری عورت کے بازوؤں میں رکھا جائے؟

"نہیں۔ تم جاؤ۔ میں اسے کھانا ضرور کھلاؤں گی"

نرس تولیہ اٹھا کر بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

"اب تو میرے پاس ہے میری جان" برتھا نے بی کو گود میں بٹھا لیا۔

بی نے خوب مزے لے لے کر کھانا کھایا۔ کبھی تو چمچے کو منہ میں لیا دباتی کر چھوڑتی ہی نہ تھی اور کبھی چمچہ منہ کے قریب آنے سے پہلے ہی اس کو ہوا میں اچھال دیتی۔

بی کھانا ختم کر چکی تو برتھا آتشدان کی طرف گھوم گئی۔

"تم بہت پیاری ہو بی ——— بہت ہی پیاری" اس نے بچی کے گرم گرم چہرے پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ وہ واقعی بی پر جان دیتی تھی۔ ایک نامعلوم مسرت پھر اس کی رگ رگ میں دوڑنے لگی، اور پھر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا اظہار کس طرح کرے۔

"آپ کے نام ٹیلی فون آیا ہے" نرس کمرے میں داخل ہوئی اور فاتحانہ انداز سے اپنی بی کو گود میں لے لیا۔

برتھا بھاگی ہوئی نیچے آئی۔ فون پر ہیری کی آواز آئی "تم ہو برتھا؟ اچھا دیکھو۔ میں ذرا دیر سے گھر آؤں گا۔ کوئی ٹیکسی پکڑ کر جلد سے جلد پہونچنے کی کوشش کروں گا۔ پھر بھی احتیاطاً کھانا دس منٹ دیر سے شروع کرنا۔ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ——— ہیری!"

"کہو ——— ؟"

وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں۔ صرف ایک لمحے کے لئے ہیری کی قربت محسوس کرنا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ پاگلوں کی طرح چیخ نہیں سکتی تھی "آج کا دن کتنا مقدس تھا، اور کتنا خوبصورت"

"کیا بات ہے برتھا؟" ہیری کی آواز آئی۔

"کچھ نہیں ہیری" برتھا نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ سوچنے لگی۔ "کس قدر بے وقوف ہے یہ دنیا، اور کس قدر حماقت آمیز ہے یہ تہذیب ——— یہ کلچر"

رات کے کھانے پر کچھ مہمان آنے والے تھے۔ نارمن نائٹ جو ایک تھیٹر کھولنے کی اسکیم بنا رہا تھا۔ مسز نارمن نائٹ جو گھر سجانے

میں بڑی مشتاق تھیں۔ ایک نوجوان ایڈی وارن جس کی نظموں کا ایک مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا تھا، اور جس کو آج کل ہر شخص اپنے یہاں مدعو کر رہا تھا، اور ایک مس پرل فلٹن جس کو برتھا نے کہیں سے ڈھونڈ نکالا تھا۔ پرل فلٹن کی سرگرمیوں کا برتھا کو کوئی علم نہیں تھا۔ ان کی ملاقات ایک کلب میں ہوئی تھی اور برتھا کو وہ بہت پسند آئی تھی کیونکہ اسے وہ سب خوبصورت عورتیں پسند آتی تھیں جن میں کوئی نہ کوئی انوکھی بات ہو۔

سب سے زیادہ پُراسرار چیز یہ تھی کہ حالانکہ وہ کئی دفعہ ایک دوسرے سے مل چکی تھیں اور برابر باتیں بھی کرتی رہتی تھیں، لیکن برتھا ابھی تک اس کو سمجھ نہ سکی تھی۔ ایک حد تک پرل بہت بے تکلف تھی۔ لیکن صرف ایک حد تک ——— اور اس حد کے آگے وہ کبھی نہ بڑھتی۔

اس حد سے آگے بھی کوئی چیز تھی؟

"نہیں" ہیری ہمیشہ یہی جواب دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ پرل بھی تمام سفید فام عورتوں کی طرح بے حس اور کند ذہن ہے، اور شاید کسی دماغی کمزوری کا شکار بھی ہے۔ لیکن برتھا اس سے متفق نہیں تھی، کم از کم ابھی تک تو نہیں تھی۔

"اس کی مسکراہٹ اور اس کی گردن کی خم کے پیچھے ضرور کوئی بات ہے اور مجھے یہی معلوم کرنا ہے کہ وہ کیا بات ہے۔"

"غالباً صحت مند معدہ!"

ہیری اس قسم کے جوابوں سے ہمیشہ برتھا کو چھیڑا کرتا تھا: "یہ جگر کی خرابی کی نشانی ہے۔ برتھا"، یا "یقیناً کوئی گردے کی شکایت" برتھا کو یہ چھیڑ خانی اچھی لگتی تھی اور ہیری چھیڑتے وقت اس کو اور بھی اچھا معلوم ہوتا تھا۔

وہ ڈرائنگ روم میں چلی گئی اور آتش دان میں آگ روشن کی۔ پھر ایک ایک کرکے سارے کشن کرسیوں اور صوفوں پر جما دیئے۔ کمرے میں جان سی پڑ گئی۔ ڈرائنگ روم کے دریچے ایک بالکونی پر کھلتے تھے جہاں سے چمن نظر آتا تھا۔ چمن کے آخری سرے پر دیوار کے پاس ایک ناشپاتی کا ہرا بھرا درخت تھا۔ نیلے آسمان کے سائے تلے خاموش کھڑا تھا۔ اتنی دور سے بھی برتھا یہ دیکھ سکتی تھی کہ اس درخت پر ایک بھی مرجھائی کلی یا خشک پتہ نہیں ہے۔ درخت بالکل مکمل تھا اور بالکل خاموش ——— باغ میں سُرخ اور زرد پھولوں کے تختے شفق کو چھوتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ایک سفید بلی لان میں رینگ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک سیاہ بلی ——— اس کا سایہ۔ ان بلیوں کو دیکھ کر برتھا کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

کمرہ نرگس کے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا ——— کتنی تیز خوشبو ——— برتھا کوچ پر لیٹ گئی اور انگلیوں سے آنکھوں کے پپوٹے دبانے لگی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹوں پر ناشپاتی کا درخت تھرتھرا رہا تھا۔ یہ شاداب درخت اسے اپنی زندگی کا نشان معلوم ہوتا تھا۔

سچ مچ اس کی زندگی بڑی شاداب تھی۔ اس کے پاس کس چیز کی کمی تھی۔ وہ نوجوان تھی۔ وہ اور ہیری ایک دوسرے سے بہت خوش تھے، بڑی اچھی زندگی گذار رہے تھے۔ ان کے گھر میں ایک خوبصورت بچی کے قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ روپے کی فراوانی تھی۔ یہ آرام دہ مکان اور باغ تھا۔ دوستوں کا ایک حلقہ تھا ——— ہم مذاق دوست۔ جدید خیالات کے لوگ۔ ادیب اور مصور، شاعر اور سماجی کاموں میں دلچسپی لینے والے نوجوان۔ سب سے بڑھ کر ان کے پاس کتابوں کی دولت تھی، موسیقی کی دولت تھی۔ اچھے اچھے لباس۔ اب کی گرمیوں میں وہ دنیا کی سیر کو جانے والے تھے۔ ان کا باورچی بہترین آملیٹ بناتا تھا۔

برتھا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس پر نشہ سا چڑھا ہوا تھا ——— شاید موسم بہار کا اثر۔

ہاں یہ بہار کا موسم تھا۔ وہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ کپڑے بدلنے کے لئے اوپر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

سفید لباس۔ زمرد کا ہار۔ سبز جوتے اور موزے۔ یہ اسکیم اس نے بہت پہلے سے بنائی تھی۔ اس کا ریشمی لباس ہال میں سرسرایا اور اس نے آگے بڑھ کر مسز نارمن نائٹ کا استقبال کیا جو اپنا نارنجی رنگ کا کوٹ اُتار رہی تھیں جس کے حاشیوں پر سیاہ بندروں کا جلوس تھا۔

"کیوں، آخر کیوں؟ متوسط طبقہ اتنا غبی اور اتنا ٹُھس کیوں ہے۔ مزاح سے یکسر خالی۔ بالکل اتفاق ہی ہے کہ میں یہاں صحیح سلامت پہونچ گئی۔ نارمن میرا محافظ تھا۔ میرے بندروں نے بس کے مسافروں کو اتنا

بوکھلا دیا کہ وہ سب کے سب مجھے کھانے کو چڑھ دوڑے ـــــ ذرا بھی لطف اندوز نہیں ہوئے ـــــ اگر وہ ہنستے تو میں خوش ہوتی ۔ بس وہ حیرت سے تکتے رہے اور مجھے بور کرتے رہے ۔"

"لیکن سب سے دلچسپ چیز یہ تھی" نارمن نے کچھوے کی کھال کی فریم والی ایک شیشے کی عینک آنکھ پر جماتے ہوئے کہا "بتا دوں فیز ؟" (وہ دونوں گھر میں اور بے تکلف دوستوں کے سامنے ایک دوسرے کو فیز اور مگ کہہ کر پکارتے تھے) "سب سے دلچسپ بات وہ تھی جب فیز کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اس نے مڑ کر اپنے قریب والی عورت سے کہا "کیا آپ نے کبھی کوئی بندر نہیں دیکھا ہے ؟"

مسز نارمن کی آواز بھی قہقہوں کی گونج میں شامل ہوگئی "ہاں بھئی ۔ یہ تو انتہا تھی" اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ مسز نارمن اپنا کوٹ اتارنے کے بعد بالکل ایک ذہین بندر معلوم ہو رہی تھیں ۔ وہ کیلے کے چھلکے کے رنگ کا ریشمی لباس پہنے تھیں اور عنبریں آویزے کانوں میں جھول رہے تھے ۔

"خوب واقعہ رہا" مگ نے ہال میں آکی گاڑی کے پاس رکتے ہوئے کہا ۔ گھنٹی بجی ۔ ایڈی وارن داخل ہوا ۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح زرد اور افسردہ تھا ۔

"ٹیکسی والے نے بڑا پریشان کیا ۔ آندھی کی طرح ٹیکسی چلا رہا تھا ، اور جتنا میں چیختا اتنی ہی اور تیز کرتا جاتا ۔ بڑی ڈراؤنی شکل تھی اس کی ۔ چاندنی رات میں بہ عجیب سی صورت ۔ چپٹی سی ٹوپی پہنے ہوئے ......"

وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا سفید ریشمی مفلر اتارنے لگا ۔ برتھا نے دیکھا کہ اس کے موزے بھی سفید تھے ، بہت خوش نما ۔

"تو یہ کیسا خوفناک تجربہ !" وہ چیخی

"بہت خوفناک" ایڈی نے اس کے پیچھے پیچھے روم میں جاتے ہوئے کہا "ایسا لگتا تھا میں قیامت تک اس ٹیکسی ڈرائیور کے پنجے سے رہا نہیں ہوں گا "

وہ نارمن نائٹ سے واقف تھا ۔ اس کے لئے ایک ڈرامہ بھی لکھنے والا تھا ۔ اگر تھیٹر کی اسکیم کامیاب ہوگئی ۔

"ایڈی ۔ ڈرامہ کہاں تک پہونچا" نائٹ نے عینک آنکھ پر سے ہٹاتے ہوئے پوچھا ۔ مسز نارمن نائٹ چیخیں "اہا ۔ کتنے خوبصورت موزے !"

"آپ کو پسند آئے ؟" وہ اپنے پیروں کی طرف دیکھنے لگا ۔

"چاند نکلنے کے بعد سے یہ اور بھی زیادہ سفید معلوم ہوتے ہیں "

اس نے اپنا اداس چہرہ برتھا کی طرف پھیرا "چاند نکلا ہوا ہے نا ؟"

"ہاں ۔ ہاں" برتھا زور زور سے چلانا چاہتی تھی "اکثر نکلتا ہے ـــــ اکثر ......"

ایڈی کی شخصیت بہت دل کش تھی ۔ فیز کی بھی جو آتش دان کے پاس جھکی ہوئی تھی ۔ مگ کی بھی جو سگرٹ پی رہا تھا اور کہہ رہا تھا "دولہا نے اتنی دیر کیوں لگادی ؟"

"لو وہ آگیا"

دھڑ سے دروازہ کھلا اور بند ہوا ۔ ہیری نے آواز دی "ہیلو ، ہیلو ۔ پانچ منٹ میں نیچے آیا" اور وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا ۔ برتھا مسکرانے لگی ۔ وہ ہر کام عین وقت پر کرتا تھا ۔ پانچ منٹ ادھر یا ادھر سے فرق ہی کیا پڑتا ہے ۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ پانچ منٹ بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ پھر وہ بڑے سکون اور اہمیت کے احساس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ۔

ہیری کتنا زندہ دل تھا ۔ برتھا کو ہیری کی زندہ دلی بہت پسند تھی ۔ اسے لڑنے کا کتنا شوق تھا ـــــ وقت بے وقت اپنی قوت آزمانے کا ـــــ حالانکہ جب کبھی وہ بغیر لڑائی کے لڑائی پیدا کرتا تو دوسروں کی نظروں میں کیسا مضحکہ خیز دکھائی دیتا تھا ۔ برتھا باتیں کرتی رہی اور ہنستی رہی ، اور یہ بالکل بھول گئی کہ ابھی پرل فالٹن نہیں آئی ہے ۔ ہیری کمرے میں داخل ہوا تو اسے پرل فالٹن کا خیال آیا ۔

"کہیں پرل بھول نہ گئی ہو "

"خیال تو ایسا ہی ہے "

"لو ۔ ایک ٹیکسی آئی ہے " برتھا مسکرائی ۔ برتھا کوئی نئی دوست بناتی تو ہمیشہ اسی طرح مسکراتی تھی ، خاص کر جب وہ دوست پراسرار بھی ہو وہ ٹیکسیوں میں رہتی ہے "

"ٹیکسیوں میں رہے گی تو بھول کر گیا ہو جائے گی " ہیری نے کھانے کے لئے گھنٹی بجاتے ہوئے کہا "سفید رنگت والی عورتوں کے لئے ٹیکسی

بڑی خطرناک چیز ہے"

"یہ مت کہو ہیری" برتھا اس کی طرف منہ اٹھا کر ہنسنے لگی۔

سب اطمینان سے باتیں کرتے رہے اور انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ پرل اندر داخل ہوئی۔ روپہلا لباس۔ بالوں میں روپہلا ربن۔ سر ایک طرف جھکا ہوا۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟"

"بالکل نہیں" برتھا نے کہا۔ "آؤ" اور اس کا بازو تھام لیا۔ سب لوگ کھانے کے کمرے کی طرف چلے۔ اس ٹھنڈے بازو کے لمس میں کیا چیز تھی جس نے برتھا کے سینے میں مسرت کی آگ اور تیز کر دی؟

پرل نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ کسی کی طرف بھی نہیں دیکھتی تھی۔ اس کی بوجھل پلکیں آنکھوں پر جھکی رہیں۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلتی اور غائب ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ دیکھنے کے لئے نہیں محض سننے کے لئے زندہ ہے۔ لیکن یکایک برتھا کو احساس ہوا جیسے ابھی ان دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا ہے۔ پرل سفید پلیٹ میں تیرتے ہوئے سرخ شوربے میں چمچہ ہلا رہی تھی۔ برتھا کو یقین تھا کہ اس وقت اس کے بھی احساسات بالکل وہی تھے جو برتھا کے تھے۔

اور دوسرے لوگ؟ فیز اور مگ۔ ایڈی اور ہیری۔ چمچے اٹھاتے اور رکھتے، رومالوں سے بار بار اپنے ہونٹ چھوتے۔ کانٹوں اور گلاسوں سے کھیلتے، باتیں کئے جا رہے تھے۔

"میں اس سے الفا شو میں ملی تھی۔ اس کی شخصیت جادو کا سا اثر کرتی ہے۔ اس نے نہ صرف اپنے بال کاٹ لئے ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اپنی ٹانگوں اور بازوؤں اور گردن اور ناک پر سے تھوڑا تھوڑا سا گوشت بھی کاٹ لیا ہے۔"

"وہ مائیکل اوٹ پر بہت مہربان ہے نا؟"

"وہی مائیکل اوٹ جس نے "مصنوعی دانتوں کا رومان" لکھا ہے؟"

"وہ میرے لئے ایک ڈرامہ لکھنا چاہتا ہے۔ ایک ایکٹ۔ ایک کردار۔ خودکشی کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ سارے اسباب بتاتا ہے کہ کیوں اسے خودکشی کرنا چاہیئے اور کیوں نہیں، اور ٹھیک اسی لمحے جب وہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اپنا فیصلہ کرتا ہے —— پردہ! —— خیال تو برا نہیں ہے؟"

"اس ڈرامے کا نام کیا ہوگا —— معدہ کی خرابی؟"

"مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے اس قسم کا پلاٹ ایک فرانسیسی ڈرامے میں دیکھا تھا، انگلستان میں لوگ اس سے واقف نہیں ہیں۔"

یہ سب بڑے اچھے لوگ تھے۔ برتھا کو ان کی صحبت بہت پسند تھی۔ وہ ان کے سامنے لذیذ کھانے اور شراب پیش کرتی۔ وہ ان کو بتانا چاہتی تھی کہ کہ وہ سب کتنے اچھے تھے۔ کیسا سجا سجایا اجتماع تھا۔ ان سب کو دیکھ کر اسے چیخوف کے ایک ڈرامے کا خیال آ جاتا تھا!

ہیری مزے لے لے کر کھانا کھا رہا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ کھانے کی میز پر زیادہ تر کھانے ہی کی باتیں کرتا تھا۔ "مچھلی کے سفید گوشت" کے لئے اپنی حرص کا اظہار کرتا۔ سبز رنگ کے پھولوں کا ذکر کرتا —— سبز اور ٹھنڈے جیسے مصری رقاصاؤں کی آنکھیں ——

جب اس نے برتھا کی طرف مڑ کر کہا "برتھا، بڑی لذیذ مٹھائی بنوائی ہے" تو برتھا خوشی کے مارے تقریباً رو پڑی۔ آج اسے ساری دنیا اتنی حسین کیوں دکھائی دے رہی تھی۔ مسرت کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔

اس کے دماغ کے کسی کونے میں ناشپاتی کا درخت کھڑا تھا —— مکمل اور ساکن۔ ابھی وہ روپہلا ہو جائے گا۔ ایڈی کے چاند کی روشنی میں، پرل کے لباس کی طرح —— پرل کے ہاتھ میں ایک نارنگی تھی۔ اس کی نازک انگلیاں اتنی زرد تھیں کہ ان میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی معلوم ہو رہی تھیں۔

ایک بات برتھا کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس نے پرل کے احساسات کا اتنا صحیح اندازہ کیسے لگا لیا تھا —— ہاں اسے یقین تھا کہ اس کا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ "میرا خیال ہے دو عورتوں میں اتنی یگانگی شاذ و نادر ہی ہوتی ہے، مردوں میں تو کبھی نہیں۔ میں جب ڈرائنگ روم میں کافی بناؤں گی تب شاید وہ مجھے کوئی اشارہ دے گی۔"

اس سب کا مطلب کیا تھا، برتھا خود بھی نہیں جانتی تھی اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ —— برتھا کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ اس کے آگے کچھ سوچ ہی نہ سکتی تھی۔

وہ یہ سب سوچتی رہی اور باتیں کرتی رہی اور ہنستی رہی: "آج اگر میں جی بھر کر نہ ہنسی تو مر جاؤں گی" اس نے فیرز کی طرف نظر اٹھائی تو اس کا چہرہ آتش دان کے قریب جھکا ہوا اتنا مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا کہ برتھا نے ہنسی روکنے کے لئے اپنی ہتھیلیوں میں ناخن گڑو دئے۔

کھانا ختم ہوا: "آئیے میری کافی کی نئی مشین دیکھئے" برتھا نے کہا

"ہم ہر پندرھویں دن ایک نئی کافی کی مشین لیتے ہیں" ہیری نے کہا۔ فیرز نے برتھا کا بازو پکڑ لیا اور ڈرائنگ روم کی طرف چلی۔ پرل سر جھکائے اُن کے پیچھے چلنے لگی۔

ڈرائنگ روم میں آگ کی سُرخ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فیرز نے کہا، "ابھی کمرے میں بتیاں روشن مت کرنا۔ آگ کی روشنی کتنی حسین ہے" وہ آتش دان کے قریب بیٹھ گئی۔ اسے ہمیشہ سردی لگتی رہتی تھی: "سیاہ بنارس اور سرخ کوٹ اتارنے کے بعد۔ تو سردی ضرور ہی لگے گی" برتھا نے سوچا۔

اسی وقت پرل نے اشارہ دیا۔

"آپ کے یہاں باغ ہے؟" مدھم سوئی ہوئی آواز نے پوچھا اس قدر نازک تھا یہ لمحہ۔ برتھا اُٹھی۔ پردے ہٹا کر لمبے لمبے دریچے کھول دئے۔

"دیکھو" اس نے گہری سانس لی۔

دونوں عورتیں پاس پاس کھڑی تھیں۔ دونوں کی نظریں پھولوں سے لدے ناشپاتی کے درخت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ درخت بالکل خاموش تھا۔ پھر بھی چراغ کی لو کی طرح لرزتا چمکتا، بڑھتا اور ہواؤں کا نپتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا، جیسے ابھی چاند کے نرم حاشیے کو چھو لے گا۔

دونوں کتنی دیر تک وہاں کھڑی رہیں؟ ——— جیسے دونوں آسمانی روشنی کے ایک دائرے میں کھڑی ہوں ——— ایک دوسرے کو مکمل طور پر سمجھتی ہوئی، اور سوچتی ہوئی کہ وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہیں۔ اس دنیا میں ان کا کیا کام ——— خوشیوں کے خزانے لئے ہوئے، جو ان کے سینوں میں جل رہے تھے، اور رو پہلے پھولوں کی شکل میں ان کے بالوں سے جھڑ رہے تھے!

ہمیشہ کے لئے؟ ——— صرف ایک لمحے کے لئے؟ ———

کیا یہ پرل کی آواز تھی؟ ——— "ہاں بالکل یہی!" یا محض برتھا کا خواب تھا؟

کمرے میں روشنیاں جل اُٹھیں۔ فیرز نے کافی بنائی اور ہیری نے کہا۔ "مسز نائٹ، مجھ سے میری بچی کے متعلق کچھ نہ پوچھئے۔ میں اسے کبھی نہیں دیکھتا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو گی جب تک اس کی شادی کے پیغام نہ آنے لگیں" مگ نے ذرا دیر کے لئے اپنی آنکھ سے عینک ہٹائی۔ ایڈی وارن نے کافی پینے کے بعد اُداسی کے ساتھ پیالہ رکھ دیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ نوجوانوں کے لئے ایک عمدہ سا کھیل پیش کروں۔ لندن ذہین ڈرامہ نویسوں سے بھرا پڑا ہے۔ میں ان سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں" یہ ہے تھیٹر ——— بڑھو آگے"

"تمھیں معلوم ہے میں جیکب ناتھن کے لئے ایک کمرہ سجانے والی ہوں؟ میری اسکیم ہے کہ کرسیوں کی پشت فرائی پان کی شکل کی ہو اور پردوں پر آلو کے قتلوں کی شکلیں کڑھی ہوئی ہوں"

"ہمارے نوجوانوں کے ساتھ بڑی مشکل یہ ہے کہ ان کی ذہنیت ابھی تک بڑی رومان پسند ہے"

"ایک خوفناک سی نظم ایک لڑکی کے بارے میں جس کو جنگل میں ایک نکٹا فقیر ملا تھا ......"

پرل سب سے نیچی کرسی پر بیٹھ گئی، اور ہیری نے سب کو سگریٹ پیش کئے۔ وہ چاندی کا سگرٹ کیس ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا "مصری؟ ترکی؟ ورجینین؟ ——— سب گڈ مڈ ہیں" اور برتھا کو خیال آیا کہ وہ نہ صرف پرل کی موجودگی سے اُکتا چکا ہے بلکہ اس کو سخت ناپسند بھی کرتا ہے، او جس انداز سے پرل نے کہا "جی نہیں شکریہ۔ میں سگرٹ نہیں پیوں گی" برتھا سمجھ گئی کہ پرل نے اپنی توہین کو محسوس کر لیا ہے۔

"نہیں نہیں ہیری۔ اسے اتنا بُرا مت سمجھ۔ تم نے اس کے بارے میں بالکل غلط رائے قایم کرلی ہے۔ وہ بہت غیر معمولی عورت ہے، اور پھر تمھاری رائے میری رائے سے اتنی مختلف کیسے ہو سکتی ہے؟ میں آج رات کو تمھیں سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ آج ہم دونوں میں قربت کا احساس کتنا شدید ہو گیا ہے" آخری الفاظ کے ساتھ کوئی عجیب سی چیز برتھا کے دماغ میں کود پڑی۔ اور اس عجیب سی چیز نے مسکرا کر اس کے کان میں کہا: "تھوڑی دیر میں یہ سب لوگ چلے جائیں گے ——— صرف

تم اور ہیری رہ جاؤ گے ___ گھر میں خاموشی چھا جائے گی ___"

وہ کرسی سے اُچھل پڑی اور پیانو کی طرف دوڑی۔

"کوئی پیانو کیوں نہیں بجاتا؟" وہ چیخی "آخر کوئی پیانو کیوں نہیں بجاتا؟"

برتھا اور اس کا شوہر آپس میں بڑے گہرے دوست تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہیری بہت سی باتوں میں اس سے مختلف ہے۔ پھر بھی وہ بے تکلف دوستوں کی طرح اپنی ہر بات ایک دوسرے سے کہہ دیتے تھے۔ وہ ایک ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ یہ نئے زمانے میں پیدا ہونے کی سب سے بڑی نعمت تھی۔ ان کی یہ قربت بڑی قیمتی چیز تھی۔

کیا اس کی بے پناہ مسرت کا یہی سبب تھا؟ مگر پھر؟ ......

"برتھا" مسز نارمن نائٹ نے کہا "تم جانتی ہو ہم وقت اور بس کے غلام ہیں ___ آج کی شام بڑی اچھی گذری"

"میں آپ کے ساتھ ہال تک چل رہی ہوں" برتھا نے کہا "آپکے ساتھ کتنا اچھا وقت گذرا۔ لیکن آپ کی آخری بس نہیں نکلنی چاہیئے"

"نائٹ، جانے سے پہلے ایک گلاس وسکی پیتے جاؤ" ہیری نے پکار کر کہا

"بس ہیری، اب نہیں، شکریہ"

"خدا حافظ۔ خدا حافظ" برتھا برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑی کہتی رہی۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں واپس آئی تو باقی لوگ بھی جانے کے لئے اُٹھ رہے تھے۔

"آپ آدھے راستے میری ٹیکسی میں چل سکتے ہیں"

"بہت بہت شکریہ۔ مجھ میں ٹیکسی کا ایک اور خوفناک تجربہ برداشت کرنے کا دم نہیں ہے"

"آپ سڑک کے آخری سرے پر اُتر جائیے گا۔ وہاں سے صرف چند قدم کا فاصلہ ہے۔

"بس ٹھیک ہے"

پرل ہال کی طرف چلی اور برتھا اس کے پیچھے جانے ہی والی تھی کہ ہیری اُسے دھکا دے کر آگے نکل گیا۔

"لایئے میں آپ کو کوٹ پہنا دوں"

برتھا سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنی بدتمیزی کی تلافی کر رہا تھا۔ کس قدر لڑکپن تھا اس میں اور کتنی سادگی۔ وہ ایڈی کے ساتھ آتشدان کے پاس بیٹھی رہ گئی۔

"آپ نے بل کی نئی نظم دیکھی ہے؟" ایڈی نے آہستہ سے پوچھا "بہت عمدہ نظم ہے۔ آخری مجموعے میں ہے۔ آپ کے پاس کوئی نسخہ ہے؟ میں وہ نظم آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ دیکھئے پہلا مصرع کتنا خوبصورت ہے۔ ع

آخر ہمیشہ ٹماٹر کا شوربہ ہی کیوں؟

برتھا ایک میز کی طرف بڑھی، اور ایڈی خاموشی سے اس کے پیچھے چلا آیا۔ ایک چھوٹی سی کتاب اٹھا کر ایڈی کو دے دی۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔

ایڈی کتاب پڑھنے لگا اور برتھا نے مُڑ کر ہال کی طرف دیکھا۔ ہیری کے ہاتھ میں پرل کا کوٹ تھا اور پرل اس کی طرف پیٹھ کئے کھڑی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ یکایک ہیری نے کوٹ پھینک دیا اور پرل کا چہرہ اپنی طرف گھما لیا۔ پرل کے چہرے پر سوئی سوئی مسکراہٹ لہرائی۔ ہیری نے دھیرے سے کہا "کل" اور پرل نے جواب دیا "اچھا"۔

"یہ رہی وہ نظم" ایڈی کہہ رہا تھا "آخر ہمیشہ ٹماٹر کا شوربہ ہی کیوں؟ ___ کیا حقیقت پسندی ہے"

"اگر آپ کہیں" ہیری کی آواز ہال میں گونجی "تو میں آپ کے لئے گاڑی منگوا دوں"

"جی نہیں، شکریہ۔ اس تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں" پرل نے جواب دیا۔ پھر وہ برتھا کے پاس آئی، اور اپنی ٹھنڈی انگلیاں برتھا کے ہاتھ میں دے دیں۔

"خدا حافظ"

"خدا حافظ" برتھا نے کہا

پرل کچھ دیر تک برتھا کا ہاتھ تھامے رہی۔

"تمہارا خوبصورت ناشپاتی کا درخت" اُس نے آہستہ سے کہا۔

پھر وہ چلی گئی، اور اس کے پیچھے ایڈی۔ جیسے سفید بلی کے پیچھے سیاہ بلی۔

"آؤ بھئی اب دوکان بڑھا دیں" ہیری نے اطمینان کا سانس لے کر برتھا سے کہا لیکن برتھا کے کانوں میں پرل کے الفاظ سرسرا رہے تھے۔

"تمہارا خوبصورت ناشپاتی کا درخت ___ ناشپاتی کا درخت ___ ناشپاتی کا درخت" برتھا دوڑ کر کھڑکی کے پاس گئی۔

"اب کیا ہونے والا ہے؟ ___ اب کیا ہوگا؟"

لیکن ناشپاتی کا درخت اتنا ہی خوبصورت تھا، اتنا ہی شاداب، اور اتنا ہی خاموش ___

شیخ فرید

ولی بُرہان پور میں

(ایک استفسار)

دارالسرور برہان پور اپنی تاریخی عظمت اور قدامت کے لحاظ سے ایک ممتاز تاریخی حیثیت کا مالک ہے۔ اُس کے آثارِ قدیمہ میں سلاطینِ فاروقیہ اور شاہانِ مغلیہ کی عام معاشرتی زندگی اور قابلِ رشک تہذیب و تمدن کی تاریخ مضمر ہے۔ فاروقیوں کے الم انگیز زوال کے بعد اس کی آنکھوں نے مغلیہ دَور کی عظمت و جبروت کے مناظر بھی دیکھے، اور ان کے شیرازۂ سلطنت کے بکھرے ہوئے اوراق کا بھی مشاہدہ کیا۔ عہدِ قدیم میں اِس شہر کی علمی و ادبی اہمیت مسلّم تھی۔ یہی وہ گہوارۂ علم و فضل ہے جس نے دُور دراز کے علماء اور فضلاء کو اپنے دامنِ تربیت میں جگہ دی، اور اُن کی ترقیِ جاہ و منصب کا زینہ بنا رہا۔ مغلیہ دور میں عبدالرحیم خان خاناں کا عہدِ صوبگی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ اس معارف پرور اور علم دوست صوبے دار کے عہد میں ایران، گیلان اور شیراز کے شعراء، ذی کمال اور مشہورِ زمانہ اہلِ فن کشاں کشاں برہان پور آتے رہے، اور علم و ہنر میں اس شہر نے اس قدر ترقی کی کہ "سوادِ برہان پور" رشکِ بہشت بن گیا۔

دکن اسکول نے اردو شاعری کی نشوونما اور ارتقاء میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں محتاجِ بیان نہیں۔ دارالعیار برہان پور کا اُن میں خاص حصّہ ہے۔ شعراء کے تذکروں اور تاریخی کتب میں اِس کے کافی شواہد موجود ہیں۔ دہلی، اورنگ آباد اور احمد آباد سے دکن کی دلّی — برہان پور — کا خاص علمی، ادبی، سیاسی اور معاشرتی تعلق رہا ہے۔

اُردو کا مایۂ ناز شاعر — ولی — ایک مدّت تک یہاں سکونت پذیر رہا۔ اِس قیام کا مفصّل ذکر کسی تذکرے میں نہیں۔ گلشنِ گفتار میں صفحہ ۸ پر صرف اس قدر مرقوم ہے۔

"نیز در بلدۂ دارالسرور مدّتے سکونت داشت۔"

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اُردو کے اِس عظیم المرتبت شاعر کے تفصیلی حالاتِ زندگی کے متعلق ہمارے تذکرے خاموش ہیں۔ اُن میں جو کچھ بیان درج ہے اُس میں کافی تضاد پایا جاتا ہے۔ اُس کے نام، وطن، تعلیم و تربیت اور سیر و سیاحت کے متعلق مختلف بیانات پائے جاتے ہیں۔ اِن اختلافات سے ہمیں بحث نہیں[1]۔

گلشنِ گفتار کے علاوہ کسی اور تذکرے میں 'ولی' کے برہان پور آنے کا ذکر نہیں ہے۔ 'کلیاتِ ولی' کے فاضل مُرتّب احسن مارہروی نے بھی ولی کے سفر و قیام کے متعلق مستند شہادتوں کی عدم موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ ولی کے دیوان میں داخلی طور پر کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ ولی نے برہان پور میں قیام کیا؟

لہٰذا برہان پور میں ولّی کے قیام کے متعلق مستند شہادتوں کی عدم موجودگی میں حقیقتِ حال سے چہرے کی نقاب کشائی ایک مشکل مرحلہ بن گئی ہے۔ 'سلکِ گہر[2]' کے فاضل مقدمہ نویس اور قابل مورخ کوثر چاندپوری صاحب نے لکھا ہے، کہ

"اُردو زبان کے اوّلین شاعر ولی دکنی[3] سعد اللہ گلشن کے مرید اور شاگرد تھے، اور اس نسبت سے عرصے تک اُن کا قیام برہان پور میں رہا۔"

---

[1] استاد محترم ڈاکٹر ظہیر الدین صاحب مدنی نے (ولی گجراتی) میں اور قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی نے ولی ایک تصحیح و استدراک (مسلم علی گڑھ) میں مستند معلومات پیش کی ہیں۔

[2] سلکِ گہر۔ شعرائے برہان پور کا تذکرہ۔ مؤلفہ جاوید انصاری برہان پوری۔

[3] ولی گجراتی میں ولی کے گجراتی الاصل ہونے کے متعلق مستند و مدلّل شواہد موجود ہیں۔

صاحبِ "جامِ جہاں نما" کو وَلی کے قیام برہان پور کا سبب سعد اللہ گلشن کی مریدی اور شاگردی کے آئینے میں نظر آیا۔ راقم السطور اُن کی رائے سے بصد ادب اختلاف کی جرأت کرتا ہے۔

ولی کے قیام برہان پور کے متعلق ذیل کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ ولی برہان پور کب اور کیوں آئے؟

۲۔ ولی کا قیام برہان پور میں کتنے عرصے تک رہا؟

۳۔ کیا ولی نے شاہ گلشن کی وجہ سے یہاں قیام کیا؟

۴۔ شاہ گلشن سے ولی کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟

اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی اختر صاحب جوناگڈھی نے اپنے کرم نامے میں تحریر فرمایا ہے۔

"ولی کے خاندان کے بزرگ ولی سے تقریباً سو سال پہلے احمد آباد سے برہان پور اور بیجا پور جا کر وہاں سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ حضرت شاہ وجیہہ الدین کے برادرِ حقیقی برہان پور میں مقیم تھے اور اُنھوں نے وہیں وفات پائی۔

خود حضرت شاہ وجیہہ الدین کے فرزندوں میں سے بعض نے آپ کی عینِ حیات میں سلاطینِ فاروقی کے عہد میں برہان پور اور بعض نے خاندیش میں سکونت اختیار کی تھی۔

خود ولی کے رشتہ دار چچا زاد بھائیوں کا خاندیش اور برہان پور میں بود و باش رکھنا پایا جاتا ہے۔ بلکہ بعض کی شادیاں بھی سلاطینِ فاروقی کے خاندان میں ہوئیں۔

ولی کے استاد سعد اللہ گلشن بھی گجراتی الاصل تھے۔ اُن کے اجداد میں سے کوئی بزرگ[1] سلاطینِ گجرات کے عہد میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔

شاہ صاحب کا آبائی وطن گجرات تھا۔ اس لئے وہ بھی احمد آباد میں رہا کرتے تھے۔ برہان پور میں بھی احمد آباد میں رہا کرتے تھے — برہان پور میں بھی اُن کا قیام رہا ہے" (ریاض الشعراء قلمی ص ۲۷)

غالباً احمد آباد اور برہان پور کے زمانۂ قیام میں ولی کے اِن تعلقات قائم ہوئے ہوں گے"۔

تحریر بالا کی روشنی میں ولی کے قیام برہان پور کے زمانے کا تعین مشکل ہے۔ وہاں وہ کب آئے اور کتنے عرصے تک رہے؟ یہ بتانا مشکل ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ ولی کا قیام برہان پور میں زیادہ تر اپنے اعزّا کی وجہ سے تھا۔

غالباً برہان پور ہی میں ولی کی ملاقات ناصر علی سرہندی سے ہوئی تھی، اور وہیں ولی نے اُس کے متعلق یہ شعر لکھا تھا۔

اُچھل کر گر پڑے جوں مصرعِ برق
اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں

اور مؤخر الذکر نے اس کا یہ جواب دیا تھا۔

یا عجب زِ سخن گر اُڑ چلے وہ
ولی ہرگز نہ پہونچے گا علی کوں

لیکن مولانا آزاد صاحب کا بیان ہے کہ یہ شعر عزیز دکنی کا ہے، اور اس کے دیوان میں موجود ہے۔ غالباً اُس نے ناصر علی کی طرف سے یہ جواب دیا جو ناصر علی کے نام سے مشہور ہوگیا۔

ولی کے جواب میں فضل خاں سرخوش نے ایک رباعی لکھی، جو ناصر علی کی تعریف میں ہے۔ ایک مصرعہ ولی کے شعر کا جواب ہے۔

در مُلکِ سخن بود جہانگیر علی
در مشربِ دل ولی علی پیر علی
با شعر علی نمی رسد شعرِ ولی
زاں ساں کہ خط نمی رسد بخطِ میر علی

عزیز دکنی کا شعر رباعی کے مصرعۂ سوم کا ترجمہ ہے۔

شاہ گلشن سے ولی کی پہلی ملاقات کے زمانہ اور مقام کے متعلق بھی تمام تذکرے خاموش ہیں۔ سعد اللہ گلشن وَلی سے پہلے دہلی آ چکے تھے، اور اُن کا فضلا میں شمار ہونے لگا تھا۔ دہلی آنے سے قبل وہ بائیس سال تک احمد آباد، اورنگ آباد اور برہان پور کی سیاحت کرتے رہے۔ قرینِ قیاس ہے کہ احمد آباد میں سعد اللہ گلشن سے وَلی کی ضرور ملاقات ہوئی ہوگی۔

---

[1] شاہ گلشن کے جدِ بزرگ: دار السلام خاں، گجرات میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ (نور المعرفت ص ۲۵)

احمد آباد کے ایک بزرگ زادے سید ابو المعالی سے ولی کی دوستی غیر معمولی محبت اور شیفتگی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اُن کے ساتھ ولی نے ۴۴ جلوس عالمگیری (۱۱۱۲ھ) میں دہلی کا سفر کیا، اور یہاں سعد اللہ گلشن سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ اور یہیں آپ نے ولی کو سادہ اور یہیں شعر لکھنے کی ہدایت کی۔

قایم چاندپوری اور میر صاحب کا بیان ہے کہ شاہ صاحب ہی نے ولی کو ریختہ گوئی کی ترغیب دی۔

"این ہمہ مضامینِ فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختۂ خود بکار ببر۔ از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت" (نکات الشعرا)

میر حسن، علی ابراہیم اور قدرت اللہ خاں نے اپنے تذکروں میں لکھا ہے کہ ان سے استفادہ کیا۔ فائق نے رسالہ نور المعرفت صفحہ ۲۸ کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ شاہ صاحب کے شاگرد تھے۔

بقول صاحبِ آبِ حیات، ولی نے دیوان کی ترتیب فارسی کے طور پر یقیناً اُن کے اشارے سے کی۔

ایک جگہ مصحفی نے اپنے تذکرے میں شاہ حاتم کی زبانی یہ بیان کیا ہے کہ

"روزے پیشِ فقیر نقل می کرد کہ درسنِ دوئم فردوس آرامگاہ دیوانِ ولی در شاہ جہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ"

بعض لوگوں نے غلط فہمی سے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ ولی نے دوبارہ محمد شاہ کے عہد میں دہلی کا سفر کیا، اور وہ اپنے خیال کی تائید میں یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

اس گدا کا دل لیا دتی نے چھین
جا کہے کوئی محمد شاہ سون

گلشنِ گفتار اور چمنستانِ شعرا میں یہ شعر "مضمون" نامی شاعر کا ہے۔

لہٰذا دہلی میں شاہ گلشن اور وَلی کی ملاقات کے زمانے کا تعین ہو جاتا ہے۔ مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ وَلی کی ملاقات احمد آباد اور برہان پور میں شاہ گلشن سے کب ہوئی؟

قاضی اختر صاحب کا خیال ہے کہ ناصر علی کے قیام برہان پور کا ذکر ریاض الشعرا میں ہے، اور ممکن ہے کہ اُس زمانے میں شاہ صاحب اور وَلی بھی وہاں قیام پذیر ہوں گے۔

نوٹ:۔ راقم السطور کو اپنی بے بضاعتی، علمی تہی مائگی اور مضمون کے تشنۂ بحث ہونے کا احساس ہے۔ یہ حقیر کوشش ایک استفسار ہے۔ امید ہے کہ وَلی دوست اور وَلی پرست حضرات اس مسئلے پر روشنی ڈالیں گے۔

بھاکڑا ننگل ہائیڈرو الیکٹرک پروجیکٹ

اس پروجیکٹ کا فوری اور مستقل مقصد پنجاب، پیپسو، راجستھان، دہلی اور ہماچل پردیش میں بجلی کی ضروریات پورا کرنا ہے۔

گنگووال کا بجلی گھر چالو ہونے سے چوبیس ہزار کلوواٹ بجلی پیدا ہوا ہوگی اور اگلے برس تک جب کہ پاور ہاؤس بھی چالو ہو جائے گا۔ پیداوار ستر ہزار کلوواٹ ہو جائے گی۔ بجلی کی سپلائی کے لئے مستقل لائنیں تیار کر دی گئی ہیں۔ جوں جوں بجلی کی کھپت بڑھے گی پیداوار بھی بڑھتی چلی جائے گی۔ ننگل بند پر ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ بجلی کی پیداوار کو ایک لاکھ بیس ہزار کلوواٹ تک بڑھایا جا سکے گا۔ لیکن جب بھاکڑا ننگل بجلی گھر مکمل ہو جائے گا تو دو نئے بجلی گھر اس بند پر بنائے جائیں گے۔ جن سے مجموعی طور پر ایک لاکھ چھیاسی ہزار کلوواٹ بجلی پیدا ہوگی۔

حکومت کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ پنجاب اور نواحی علاقوں کے دور دراز گوشوں تک بجلی مہیا کر دی جائے۔ پنج سالہ منصوبے کی مدت کے دوران میں بجلی کی پیداوار میں ہر سال اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اور دوسرے پنج سالہ منصوبے کے عرصے کے ختم ہونے تک یعنی ۶۲-۱۹۶۳ء میں ان علاقوں میں صنعتی کاموں پر بجلی کی کھپت دو لاکھ اسی ہزار کلوواٹ تک پہنچ جائے گی۔ (تصاویر ۲۵ تا ۲۸ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں)

بھارت اور ایران کا باہمی رِشتہ

بھارت اور ایران کا باہمی تعلق زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے مُسلّمہ طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے تعلّقات بھارت کی تاریخ میں آریوں کے عہد سے قبل کے زمانے سے چلے آتے ہیں۔ گذشتہ کچھ برسوں میں آثارِ قدیمہ کی کھوج کرنے والی کئی مہموں نے جو دریافتیں کی ہیں، ان کے نتیجے کے طور پر "بھارتی ایرانی" الفاظ کو نئے اور مخصوص معنی حاصل ہو گئے ہیں۔ ایرانی مؤرّخوں نے اپنے ملک کی قدیم تاریخ کی کھوج کے دوران میں یہ دریافت کیا ہے کہ ان کی تہذیب کے بہت سے خدوخال ایک طرف وادیٔ سندھ کی تہذیب سے اور دوسری طرف عراقی سمیریا تہذیب سے قریبی رشتہ رکھتے ہیں۔

رِگ وید سے قبل کے زمانے سے لے کر دونوں ملکوں کے عوام کے مابین مسلسل اور غیر متناہی تعلّق چلا آیا ہے۔ آریوں کے بعد یونانی بھی ایران کے راستے بھارت میں آئے۔ بُدھ مت کے زمانۂ عروج میں بھارت میں وادیٔ گنگا کے میدانوں سے ہر طبقے کے لوگوں کی اُتر پچھم اور اُتر پورب کے ملکوں کی جانب نمایاں نقل و حرکت جاری رہی۔ ایران کے راستے بھارتی ریشم کی تجارت نے پچھمی ملکوں میں جو فروغ حاصل کیا اُس سے نہ صرف تجارتی بلکہ آرٹ اور کلچر کے تعلقات بھی زیادہ گہرے ہو گئے۔ اس کے بعد مغلوں کے زمانے میں دونوں ملکوں کے لوگوں میں قریبی رشتہ قایم ہو گیا بلکہ بھارتی تاریخ کے برطانوی دور میں بھی سیاسی اور دیگر وجوہ کے زیرِ اثر ایران کے ساتھ خاصی دلچسپی بنی رہی۔

باہمی اثرات

بھارت اور ایران میں علم و ادب کی جو دستاویزات اور تصانیف اور آرٹ کی جو مختلف شکلیں پائی گئی ہیں، وہ اس بارے میں کافی روشنی مہیا کرتی ہیں کہ دونوں ملکوں کے علما، دستکاروں اور عام لوگوں نے ایک دوسرے پر بہت گہرے اثرات ڈالے۔ ایک بھارتی تاریخ داں کے لئے اور خاصکر جسے مغل عہد کی تاریخ سے دلچسپی ہو، یہ لازمی ہے کہ اسے فارسی زبان میں دسترس حاصل ہو۔ اسی طرح ایرانی مورخوں کے لئے اپنے ملک کی دورِ قدیم کی تاریخ کو سمجھنے کی غرض سے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ سنسکرت اور پراکرت جانتے ہوں۔ بھارت کے لوگوں کو یہ جان کر فخر و مسرّت حاصل ہوگی کہ تہران یونی ورسٹی میں لسانیات کے ماہرین کا ایک گروپ پروفیسر پُورِ داؤد کی زیرِ رہنمائی ویدوں اور اوستا کے متن کے بارے میں کھوج کا کام کر رہا ہے۔ اس کام میں وہ سنسکرت کے مشہور عالم ڈاکٹر کُنہان راجا کے تعاون اور رہنمائی سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔

پارسیوں کا رشتہ

پارسی لوگ دراصل ایران سے ہندوستان میں آئے تھے۔ بعد میں اُنھوں نے یہاں جائے پناہ حاصل کر کے سکونت اختیار کر لی۔ دونوں ملکوں کی تاریخ اور تہذیب کے مابین پارسی ایک نہایت اور مفید کڑی کا کام دیتے ہیں۔ نہ صرف اِکّا دُکّا الفاظ اور جُملے بلکہ ہندوؤں کے ویدوں اور پارسیوں کی "اوستا" کے پورے کے پورے بند اس امر کی واضح شہادت دیتے ہیں کہ سن عیسوی کے آغاز سے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس قبل کے قدیم زمانے سے بھی پہلے جب ہندو اور ایرانی ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور دونوں نے اپنی اپنی علیحدہ حیثیت اختیار کر لی تھی، دونوں کے آبا و اجداد کے مابین گہرے تعلّقات موجود تھے۔ فارسی الفاظ اور جملوں کے ماخذ و مخارج اور اُن کی اہمیت کی تشریح کرنے کی غرض سے فرہنگ اور لغت مرتّب کرنے کے لئے ایران میں قابلِ قدر کام ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں بھارت

اور ایران کی قدیم مستند کتابوں کا معائنہ کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ بعض الفاظ وغیرہ جو عربی اور اسلامی معدنوں سے ماخوذ ہیں، اُن کے موجودہ مفہوم پر نظرثانی کی جائے۔ اس کام کی تکمیل دونوں ملکوں کے کلچر کو بہتر طریق پر سمجھنے میں زبردست معاون ہوگی۔

اُردو زبان

اُردو زبان صاف طور پر فارسی اور ہندی زبانوں کے ملاپ کی یاد دلاتی ہے۔ اس کے ماخذ اور ترقی کا مطالعہ نہ صرف فارسی اور ہندی الفاظ بلکہ دونوں ملکوں کے عوام کے فکر و تخیل کے باہمی ارتباط کا مظہر ہے۔ اس کے علاوہ یہ مطالعہ بھارتی لوگوں کے لئے فردوسی، سعدی، حافظ اور رومی جیسے ایرانی شعرا کے بلند پایہ کلام کو سمجھنے کے لئے ایک نہایت مفید ذریعہ بنتا ہے۔

بھارت اور ایران پر البیرونی کا احسان

دونوں ملکوں کے مورخ ابوریحان البیرونی کے بیحد ممنون ہیں، اس کی تصانیف "قدیم اقوام کا تاریخی شجرہ" اور "بھارت" دونوں ہی بھارتی، اسلامی اور یونانی علوم اور کلچروں سے متعلق بیش قیمت معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ البیرونی نے تحصیل علم کی خاطر کئی مقامات کی سیاحت کی تھی، اپنے سفر کے دوران میں وہ علاوہ دیگر مقامات کے بنارس اور کشمیر بھی گیا تھا، جہاں اسے اہم سنسکرت کتب کے مطالعے کرنے کا بہت کافی موقعہ حاصل ہوا۔ چونکہ وہ علم نجوم میں دلچسپی رکھتا تھا اور سلطان محمود کے دربار میں جیوتشی کی خدمات بھی سرانجام دیتا رہا۔ اس لئے البیرونی نے "برہم سدھانتا" اور اسی قسم کی دیگر نہایت مشکل اور پیچیدہ سنسکرت کتب کا گہرا مطالعہ کیا، اور ان میں دسترس حاصل کی۔

دربارِ اکبری

اکبر کے عہد میں مہابھارت اور رامائن جیسی رزمیہ کتب کے علاوہ علمِ ریاضی سے متعلق بھاسکر آچاریہ کے رسالے "لیلاوتی" جیسی سنسکرت کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ چودھویں صدی میں فارسی تصنیف "طوطی نامہ" نے "شکاسپتتی" (طوطے کی ستر کہانیاں) اور "کتھاسرت ساگر" (کہانیوں کا سمندر) جیسی سنسکرت تصانیف سے دنیا کو روشناس کرایا۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو اس حقیقت کی مظہر ہوں گی کہ بھارت اور ایران کے درمیان وسیع علمی اور ادبی تعلقات برابر قایم رہے۔ یہ تعلقات صرف شعر و سخن اور ادبی کتب ہی تک محدود نہ رہے بلکہ ان کا دائرہ فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر تک پھیلا ہوا ہے۔

ایرانی اخبار نویسوں کے تاثرات

کچھ عرصہ پہلے ایرانی اخبار نویسوں کا ایک وفد بھارت آیا تھا، اس وفد کے لیڈر نے اس حقیقت پر اظہارِ مسرت کیا تھا کہ بھارت کے لوگ فارسی کے مطالعے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ "ہمارا ادب بھارتی کلچر کے ساتھ گھُل مِل گیا ہے، اور اس کی مثالیں ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ لائبریریوں، یونیورسٹیوں، محلات، مسجدوں، مندروں اور عمارتوں میں ہمیں فارسی علم و ادب اور آرٹ کا حُسن جلوہ نما نظر آتا ہے۔"

تجدیدِ تعلقات

حصولِ آزادی کے بعد بھارت کے لوگوں میں قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی رہی ہے کہ ایران کے ساتھ ثقافتی تعلقات کی تجدید کی جائے اور ان کو بڑھایا جائے، اس مقصد کے حصول کے لئے فارسی ادب کے بارے میں مذاکرات کی محفلیں منعقد کی گئیں جن میں بھارتی اور ایرانی دونوں شامل ہوئے۔ بہت عرصہ نہیں گذرا جب بھارت نے فردوسی اور البیرونی دونوں کی برسی منائی تھی۔ دونوں ملکوں کی تہذیب و ثقافت کے علم کی توسیع اور استواری کے لئے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (ثقافتی تعلقات کی بھارتی کونسل) قایم کی گئی ہے۔ بھارت نے دسویں صدی عیسوی کے عظیم المرتبت فارسی سائنسدان بوعلی سینا کی برسی منانے میں بھی سرگرمی سے شمولیت کی۔

گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی رفتارِ ترقّی

حکومت ہند کی طرف سے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے کہ گھریلو دستکاریوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی اور فروغ حاصل ہو۔ چنانچہ زیر نظر سال میں حکومت ہند کی طرف سے اس مقصد کے لئے دس کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی تھی جس میں سے اب تک آٹھ کروڑ روپیہ صرف ہو چکا ہے۔ جب کہ ۵۰-۱۹۴۹ء سے ۵۳-۱۹۵۲ء تک چار سالوں میں صرف ۵۰ لاکھ روپیہ بطور گرانٹ و قرضہ صرف کیا گیا تھا۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں اس مد میں ۵ کروڑ ۴۴ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا۔

ہمارے ملک میں سرمایے کی کمی ہے اور بہت سے افراد ایسے ہیں جنھیں سارا سال کام نہیں ملتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ پیداوار اور روزگار میں اضافے کے لئے گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی پر توجہ کی جائے۔ یہ مقصد اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ پیداوار کی تکنیک اور انتظامیہ امور کے علاوہ بجلی کا استعمال اور قرضہ جات کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ اگر یہ صنعتیں امداد باہمی کے اصولوں پر منظم کی جائیں تو جدید ترین سامان خریدنے اور چالو سرمایہ فراہم کرنے کے متعلق عوام کو بہت سی سہولتیں میسر آ سکتی ہیں۔

مرکزی حکومت کی طرف سے مالی امداد ریاستی حکومتوں کی معرفت دی جاتی ہے۔ البتہ ان کے امداد و رہنمائی کے لئے حکومت ہند کی طرف سے خاص خاص صنعتوں کے بورڈ قائم کئے گئے ہیں جن میں سے آل انڈیا کھادی اینڈ ویلج انڈسٹریز بورڈ۔ آل انڈیا ہینڈلوم بورڈ۔ سنٹرل سلک بورڈ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لئے ٹیکنالوجی کے ریجنل انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کئے جا رہے ہیں

امداد میں اضافہ

یہ امداد زیادہ پرانی دیہاتی صنعتوں مثلاً کھادی وغیرہ کو دی جاتی ہے۔ جدید ساز و سامان کے استعمال کو مقبول بنانے کے لئے کھادی کی فروخت پر تین آنہ فی روپیہ کے حساب سے سرکاری امداد دی جاتی ہے۔ جدید ساز و سامان کے استعمال کو مقبول بنانے کے لئے آل انڈیا ویلج انڈسٹریز بورڈ کی طرف سے مراکز قائم کئے جا رہے ہیں۔ ۱۹۵۳ء سے اب تک کھادی کی صنعت کو تقریباً ۵ کروڑ روپے کی مالی امداد دی جا چکی ہے جبکہ دوسری دیہاتی صنعتوں کو صرف نوّے لاکھ روپے کی امداد دی گئی۔

گھریلو صنعتوں میں سے دستی کرگھوں کی صنعت ہماری سب سے بڑی صنعت ہے اور حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ اس صنعت کو امداد باہمی کے اصولوں پر منظم کیا جائے چنانچہ گزشتہ دو سالوں میں حصص اور چالو سرمایے کے طور پر ایسے اداروں کو ڈھائی کروڑ روپے سے زیادہ کے قرضہ جات دئے گئے ہیں یہ ادارے اس بات کی ذمہ داری لیتے ہیں کہ وہ جولاہوں کو نہ صرف مناسب نرخوں پر دھاگا تقسیم کریں گے بلکہ پیداوار کی فروخت کے انتظامات بھی کریں گے۔ جولاہوں کو دھاگا تقسیم کرنے کے لئے کلکتہ میں دو کارخانے قائم کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اڑیسہ اور مدراس میں بھی دو یونٹوں کے قیام کی منظوری دی گئی ہے نیز رنگ سازی اور جدید ترین مشینوں کے حصول کے سلسلے میں بھی امداد دی جاتی ہے۔ پیداوار کی فروخت کے لئے ڈپو اور سفری دوکانیں کھولی گئی ہیں۔ مزید برآں برآمدی تجارت کو فروغ دینے کے پیش نظر ایکسپورٹ مارکٹینگ آرگنائزیشن قائم کی گئی ہے۔ چنانچہ عدن، کولمبو اور رنگون میں ایمپوریم قائم کئے گئے ہیں۔

کھادی کی صنعت کے علاوہ لوہار کے کام۔ اوزار سازی۔ بائیسکلوں کے پرزے بڑھئی کے کام، لکڑی اور چمڑے کے کام۔ ظروف سازی وغیرہ کی صنعتوں کی ترقی پر بھی پوری پوری توجہ کی جا رہی ہے۔ اور اس مقصد کے لئے تربیتی مرکز قائم کئے گئے ہیں

صنعتوں کے متعلق امداد باہمی کے اداروں کا قیام۔

گھریلو صنعتوں کی ترقّی کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ امداد باہمی کے اصولوں

پر ایسے کارخانے قائم کئے جا رہے ہیں جن کے کارکن نہ صرف اس ادارے کے ممبر ہوتے ہیں بلکہ پروجیکٹوں میں حصہ بھی لیتے ہیں ۔ ہینڈلوم صنعت کے ایسے دو ادارے حال ہی میں مدراس کے لئے منظور کئے گئے ہیں اور توقع ہے کہ دوسری صنعتوں کے بھی ایسے ادارے قائم کئے جائیں گے ۔ فورڈ فاؤنڈیشن ٹیم کی سفارشات کے مطابق فرید آباد، بمبئی، کلکتہ اور مدراس کے مقامات پر ٹیکنالوجی کے چار ریجنل انسٹی ٹیوٹ قائم کئے گئے ہیں جہاں چھوٹے صنعت کاروں کو کاروبار، مالیات، پیداوار کی فروخت وغیرہ سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں ۔ اس مقصد کے پیش نظر ہر ایک انسٹی ٹیوٹ میں ایک مارکیٹنگ افسر اور ایک الیکٹریکل انجنیر مقرر کیا جائے گا ۔ ان انسٹی ٹیوٹوں کے افسران مذکور آپس میں رابطہ قائم رکھیں گے ۔ اس کے علاوہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ایک کارپوریشن بھی قائم کی جائے گی جو بڑی صنعتوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے درمیان توازن قائم رکھے گی ۔ اس کے علاوہ قرضہ جات کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں گی ۔ اور غیر ممالک میں دستکاریوں اور ہاتھ سے بنی ہوئی دوسری اشیاء کی فروخت کے لئے نیو یارک میں ایک تجارتی مرکز قائم کیا جائے گا ۔

سمندر میں روشنی کے میناروں کی تعمیر

ہندوستان ایک عظیم ملک ہے اور اس کا ساحل چار ہزار چار سو چالیس میل لمبا ہے ۔ حصول آزادی سے پہلے بھی ساحلی جہاز رانی کوئی کم نہ تھی لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد تجارت میں ترقی کی وجہ سے اس میں نمایاں اضافہ ہوا ہے ۔ سمندر میں جا بجا خطرناک چٹانیں پوشیدہ ہیں اس لئے جہازوں کی راہنمائی کے لئے لازمی طور پر روشنی کے مینار نصب کرنے پڑتے ہیں اور جہازوں کو خطرے سے بروقت آگاہ کرنے کے لئے اس وقت ایک ہزار کے قریب عملہ جن میں انجنیر ٹیکنیکل ماہرین اور دیگر افراد شامل ہیں ۔ یہ اہم فرائض انجام دے رہا ہے ۔ اس طویل ساحل کے ساتھ ایک سو پینسٹھ روشنی کے میناروں کے علاوہ متعدد قسم کے پیراک پیپے اور تیرتے روشنی کے جہاز بھی ملاحوں کی راہنمائی کرتے ہیں ۔

اس خطرناک مگر اہم کام کی نگرانی کے لئے مرکزی حکومت کی طرف سے سنٹرل لائٹ ہاؤس کا محکمہ قائم ہے مگر بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ یہ محکمہ نہ صرف خود مکتفی ہے بلکہ اپنی آمدنی میں سے بہت سا روپیہ سرمایہ پروجیکٹوں اور ترقیاتی اسکیموں پر صرف کرتا ہے ۔ یکم اپریل ۱۹۵۴ء کو اس محکمہ کے ریزرو فنڈ میں چھیالیس لاکھ روپیہ جمع تھا ۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس محکمہ کی طرف سے جہازوں میں تین آنے فی ٹن کے حساب سے محصول وصول کیا جاتا ہے ۔ آجکل ان روشنی کے میناروں کو جدید ترین ساز و سامان مثلاً صوتی سگنل، ریڈیو بیکن اور ان گی وغیرہ فراہم کیا جا رہا ہے جس میں ایک باضابطہ اور جامع پروگرام مرتب کیا گیا ہے اور اس کی تکمیل پر ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ صرف کیا جائے گا ۔ دوسرے پانچ سالہ پلان میں روشنی کے میناروں کے لئے پانچ کروڑ روپے کی رقم منظور کی گئی ہے ۔

اس وقت تک کوٹل تھانم چینکا ۔ جزیرہ راس اور دسکا ٹپ نام کے قریب ڈالفن نوز کے مقامات پر مینار پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں ۔ بیس میناروں کو جدید ترین سامان فراہم کیا گیا ہے اور بارہ زیر تعمیر ہیں ۔ ان کے علاوہ دور دراز میناروں تک رسد و سامان پہنچانے اور خطرے میں گھرے ہوئے لوگوں کو بچانے کے لئے دو لائف بوٹ بھی فراہم کی گئی ہیں جن کی تعداد میں جلد اضافہ ہونے والا ہے ۔ بندرگاہوں میں راڈر کنٹرول کے انتظامات کئے جا رہے ہیں ۔ بندرگاہ اوکھا کے قریب سمندر کے اندر ایک چٹان پر مینار تعمیر کرنے کی تجویز زیر غور ہے ۔

میناروں میں زندگی بسر کرنا جان جوکھوں کا کام ہے ۔ عملے کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ تنہائی میں زندگی گزارنا کوئی آسان کام نہیں لیکن حکومت ہند کی طرف سے ان کے لئے تفریح کا سامان مہیا کیا جا رہا ہے ۔ ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے مالی امداد اور بھتہ بھی دیا جاتا ہے ۔

رفتارِ زمانہ

بھارت کے پردھان منتری کا ممالک غیر کا دورہ

بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو سال رواں میں برطانیہ، فرانس، مصر، رُوس، انڈونیشیا اور ایران کا دورہ کریں گے۔ اس امر کا امکان ہے کہ شری نہرو ماہ جون میں روس جائیں گے حکومت ایران نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ شری نہرو ماسکو جاتے وقت یا وہاں سے واپس آتے وقت چند دن تہران میں ضرور قیام کریں — تہران ایران اور روس کے درمیان راستے میں پڑتا ہے۔ تہران میں قیام کے دوران میں شری نہرو کو ایران کے سیاسی لیڈروں سے براہ راست بات چیت کا موقع ملے گا۔ برطانیہ میں کامن ویلتھ ممالک کی کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد پردھان منتری کا مصر جانے کا بھی پروگرام ہے۔ دراصل دیکھا جائے تو اس وقت دُنیا بھر کی نگاہیں شری نہرو پر مرکوز ہیں، اور دُنیا محسوس کرتی ہے کہ اس وقت اگر کوئی فرد امن کے راستے پر گامزن رہ کر تباہی اور بربادی کو روکنے میں اپنی تمام تر کوششیں صرف کر رہا ہے تو وہ بھارت کے پردھان منتری ہی ہیں۔

بعض بنک اور بیمہ کمپنیوں کو قومی ملکیت بنانے کی سفارش

بھارت کے وزیر خزانہ شری چنتامن دیش مُکھ نے مدراس میں اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ امپیریل بنک کو قومیانے کے متعلق بات چیت ہو رہی ہے۔ ریزرو بنک نے اس امر کی سفارش بھی کی ہے کہ جن بنکوں میں مختلف پردیشوں کے حصہ جات ہیں اُنہیں قومی بنا دیا جائے، علاوہ ازیں بعض بیمہ کمپنیوں کو بھی قومی بنانے کی تجویز پر غور کیا جا رہا ہے۔

وزیر خزانہ کشمیر کا ایک جواب

ریاست جموں و کشمیر کے وزیر خزانہ شری گردھاری لال ڈوگرہ نے معترضین کو جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ بھارت کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کا الحاق نامکمل ہے۔ جب ریاست کی آئین ساز اسمبلی نے اس حقیقت پر اپنی منظوری کی نہ ٹوٹنے والی مُہر ثبت کر دی ہے، اور بھارت سرکار اور جنتا نے اُسے عملی جامہ پہنا دیا ہے تو اس کو نامکمل کہنے والے صریحاً غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں، اب تو پوزیشن یہ ہے کہ بھارت کے آئین کا ریاست پر اطلاق ہو گیا ہے۔ ریاست کی سب سے بڑی عدالت بھارت کی سپریم کورٹ ہے، اور معاہدہ دہلی پورے طور سے عمل میں آگیا ہے۔ اس لئے اب یہ کہنا سو فی صدی درست ہے کہ ریاست جموں و کشمیر ہند یونین کا ایک جزو ہے۔

صدر یوگوسلاویہ مارشل ٹیٹو کا بیان

یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو نے رنگون کے ایک اخبار نیوٹائمز آف برما کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ پُرامن پڑوسیوں جیسی زندگی بسر کرنے کا اصول بین الاقوامی جھگڑوں کو حل کرنے کا ایک جدید طریقہ ہے، اور یہی طریقہ ہے جو مسلح طاقت کے استعمال کو روک سکتا ہے۔

آپ سے سوال کیا گیا کہ کیا امریکہ اور روس میں پُرامن سمجھوتے کا امکان ہے؟ جواب میں مارشل موصوف نے کہا کہ کوئی وجہ نہیں کہ پُرامن پڑوسیوں کی طرح رہن سہن کا اصول امریکہ اور روس کے مابین نہ اپنایا جا سکے۔ آپ نے کہا کہ شری نہرو اور میں نے پُرامن پڑوسیوں جیسی زندگی بسر کرنے کے متعلق جو اصول وضع کیا ہے وہ تمام ممالک پر حاوی ہوتا ہے۔

بھارت کے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے برابر مراعات

بھارت سرکار کے نوآبادکاری کے وزیر شری مہرچند کھنہ نے کلکتے میں پارلیمنٹ کے ممبروں کی کانفرنس میں اعلان کیا کہ نوآبادکاری کے سلسلے میں اُن مسلمانوں کو بھی وہی مراعات دی جائیں گی جو غیر مسلموں کو حاصل ہیں، جو ملک کی تقسیم کے وقت اپنے گھربار چھوڑ گئے تھے لیکن بھارت سے باہر نہیں گئے۔ شری کھنہ نے بتایا کہ قریباً اڑھائی ہزار

کنبوں کو بے دخل کیا گیا ہے جنھوں نے مسلمانوں کی جائدادوں پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ یہ جائدادیں مسلمانوں کو واپس کردی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی مسلمانوں کو دوکانوں کی تعمیر کے لئے قرضے بھی دیئے گئے ہیں۔

تحریک بھودان کی کامیابی

آچاریہ ونوبا بھاوے کی بھودان تحریک کی کامیابی اس امر سے ظاہر ہے کہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۵۴ء تک ان کو ۵۳۹،۲۷۸۷ ایکڑ بھومی دان میں مل چکی ہے۔ اس میں سے ۱۰۹۹۰۰ ایکڑ زمین کاشتکاروں میں تقسیم کی جا چکی ہے۔ بھودان کی تحریک بتدریج ہر دلعزیز ہوتی جا رہی ہے اور سارا ملک اس کی حمایت پر ہے۔

بھارت کی متعدد نامور ہستیوں کا سانحۂ ارتحال

ماہ جنوری ۱۹۵۵ء اس لحاظ سے نہایت منحوس رہا کہ ملک کے بہترین سائنسدان، سیاست داں، ادیب اور حکیم ہمیشہ کے لئے ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے۔ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر بھارت کے بہترین سیاست دان تھے اور اس وقت ملک کے طول و عرض میں سائنسی اداروں کا جو جال بچھا ہوا ہے وہ زیادہ تر سورگیہ ڈاکٹر بھٹناگر کی انتھک کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔ کرنل رگھبیر سنگھ پیپسو کے وزیر اعظم تھے اور ریاست کے پیچیدہ سیاسی مسائل کی گتھی سلجھانے میں وہ بہت کامیاب ثابت ہوئے تھے۔ سر سعد اللہ آسام کے سابق وزیر اعظم تھے اُن کا شمار دیش کے بڑے سیاست دانوں میں ہوتا تھا اور ۱۹۴۷ء کے بعد اُنھوں نے بھارت کی بہترین خدمات انجام دیں۔ شاردا ایکٹ کے مصنف و مجوز شری ہربلاس شاردا بڑے دوربین سیاست دان اور ریفارمر تھے۔ حال ہی میں آپ کا اجمیر میں انتقال ہوگیا۔ پنڈت کشن پرشاد کول سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر اور انجمن ترقی اردو اتر پردیش کے صدر تھے۔ اردو کے تئیں اُن کی خدمات کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ حکیم مخمور لکھنوی ایک فاضل طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ سرزمین بھارت اور پاکستان کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی وفات حسرت آیات افسانوں میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے ایک صدمۂ جانکاہ ہے۔ ہر خاص و عام اُن کے افسانے چٹخارے لے لے کر پڑھتا تھا۔ طنز اور جنسیات میں جو ملکہ منٹو صاحب کو حاصل تھا اس کا مقابلہ بہت کم افسانہ نگار کر سکتے ہیں۔ شری پریم ناتھ پردیسی کشمیر کے مشہور افسانہ نگار تھے اور بحیثیت افسانہ نگار اُنھوں نے ایک بہت بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان تمام حضرات کے جدا ہونے سے ملک میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جسے آسانی سے پُر نہیں کیا جا سکتا۔

ترکی اور عراق کے مجوزہ معاہدے سے حکومت حجاز کی ناراضگی

سعودی عرب نے ترکی اور عراق کے مجوزہ دفاعی معاہدے کی نہایت پُر زور الفاظ میں مذمت کی ہے سرکاری طور پر معلوم ہوا ہے کہ شاہ سعود نے عرب کے صدر دفتر کو مطلع کیا ہے کہ وہ اس معاہدے کی مذمت کرتے ہیں اور اسے عرب ممالک کے لئے بہت مضر تصور کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر عرب ممالک بھی اس معاہدے کی شدید مخالفت کر رہے ہیں۔

بین الاقوامی نگران کمیشن کی کارکردگی پر پنڈت نہرو کا اظہار پسندیدگی

مدراس میں کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے شری نہرو نے بتایا کہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی کانفرنس ۱۳ر سے کر ۲۴ر اپریل تک کے درمیانی عرصے میں انڈونیشیا کے شہر بین ڈنگ میں منعقد ہوگی۔ پردھان منتری نے ہندچین کے متعلق بین الاقوامی نگران کمیشن کی کارکردگی پر بھی پسندیدگی کا اظہار کیا جو ان کی رائے کے مطابق جنیوا کانفرنس کے فیصلوں کے مطابق بہترین خدمات انجام دے رہا ہے۔

کشمیر کے بکروال قبیلے کا حکومت کشمیر پر اعتماد

جموں و کشمیر کے بکروال قبیلے کے تین لاکھ نمائندوں نے رام نگر میں منعقدہ اپنے ایک اجلاس میں بخشی غلام محمد کی حکومت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اجلاس میں ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا جس میں اعلان کیا گیا کہ نیشنل کانفرنس ہی ایک ایسی جماعت ہے جو کشمیر کی صحیح نمائندگی کر سکتی ہے۔

نہرو، محمد علی ملاقات

اس امر کا قریب قریب فیصلہ ہوگیا ہے کہ نہرو، محمد علی ملاقات مارچ کے آخری ہفتے میں ہوگی۔ اس سلسلے میں پاکستان نے تجویز کی ہے کہ ہر دو حکومتوں کی سٹیئرنگ کمیٹی کی میٹنگ پہلے بلائی جائے جو یہ فیصلہ کرے کہ کن کن معاملات کو وزرائے اعظم کی میٹنگ میں زیر بحث لایا جائے۔ اس ملاقات میں ہند پاک متنازعہ مسائل کے طے ہونے کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔



بچوں کا آج کل



جیتا جاگتا ہیرا

حامد اللہ افسر



جگ مگ جگ مگ کرتا نکلا   میرے چمن کا تارا رے
پھولوں کا دم بھرتا نکلا   ٹھنڈا اک انگارا رے

(۲)





ننّا سا اک دِیا جلایا   چاروں اور اُجیارا رے
جھپ سے پھر وہ دیا بجھایا   چھا گیا پھر اندھیارا رے

(۳)



جگنو آیا جھم جھم کرتا   کتنا پیارا پیارا رے
جیتا جاگتا ہیرا میرا   دُنیا بھر سے نیارا رے

اشرف یوسف

سندری کا کارخانہ

پیارے بچّو! آؤ آج تمھیں ایک عجیب و غریب کہانی سنائیں۔ یہ کہانی تمھیں ایک نئی جگہ کی سیر کرائے گی۔ یہ ایک چھوٹے سے قصبے شہر پورہ کی کہانی ہے جو آج ساری دُنیا میں اپنے کارناموں کی وجہ سے مشہور ہے۔ آج اس کی گود میں ایشیا کا ایک سب سے بڑا کارخانہ سانس لے رہا ہے۔

صوبہ بہار کو تو تم جانتے ہی ہو اس میں دھنباد نام کا ایک شہر ہے اس شہر سے سولہ میل کی دُوری پر سندری کا کارخانہ دس مربع میل تک پھیلا ہُوا ہے۔

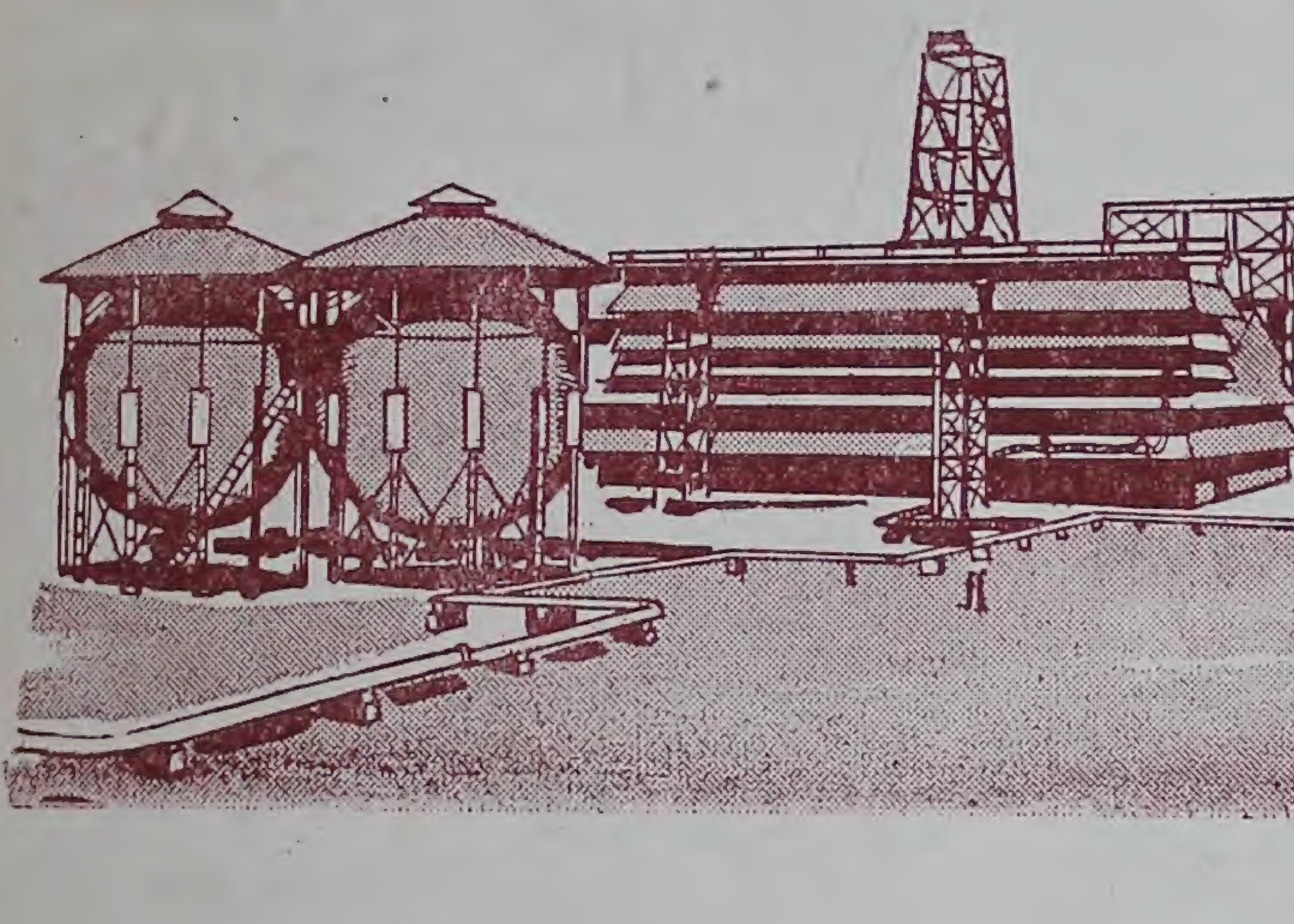
اس کارخانے کے لئے حکومت ہند نے سترہ ۱۷ کروڑ روپے لگانے کا پلان بنایا تھا۔ مگر یہ کارخانہ چند دشواریوں کی وجہ سے تئیس ۲۳ کروڑ روپے میں مکمّل ہو سکا۔ تم اسی رقم سے اندازہ لگاؤ کہ یہ کتنا بڑا کارخانہ ہو گا۔

اس کارخانے کا افتتاح ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اگست ۱۹۵۱ء میں کیا تھا۔ ان کے ہمراہ مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی (مرحوم) بھی تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے وزراء اور جرمن، آسٹریلیا، امریکہ اور چین کے مہمان دوست بھی تھے۔

اگست ۱۹۵۱ء سے اس کا کھاد تیار ہو کر ملک کے ہر حصّے میں جانے لگا۔

تمھیں معلوم ہے کہ یہ کیوں، کیسے اور کن چیزوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ لو سنو!

کھاد کو تیار کرنے میں Coke, Coal اور Gypsum کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئلہ تو تم سب جانتے ہی ہو۔ اس کا استعمال تو تمھارے گھروں میں بھی ہوتا ہے۔ Gypsum یہ ایک قسم کی مٹی ہوتی ہے۔ سندری سے



جھریا صرف دس میل کی دُوری پر واقع ہے ۔ اور سندری کے آس پاس دوسری بھی بہت سی کانیں ہیں اس لئے سندری کے لئے کوئلہ اور کوک بآسانی مہیا ہو جاتا ہے۔

تیسرا Gypsum, Raw ہے ۔ یہ راجپوتانہ سے آتا ہے۔ یہ ایک قسم کی مٹی ہے جس کا رنگ ہلکا سرمئی ہوتا ہے ۔ راجپوتانے میں اس کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے ہوتے ہیں اس کی کھپت اس کارخانے میں تقریباً دو ہزار ٹن روزانہ ہوا کرتی ہے ۔ اسے پہلے مشینوں کے ذریعے سے سفوف بنا دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ایمونیم ایک ہزار ٹن روزانہ پیدا کیا جاتا ہے ۔ جو سیمنٹ کے تیار کرنے میں مدد دیتا ہے۔



تمہیں اگر کبھی اس کارخانے میں جانے کا اتفاق ہو تو وہاں بہت سے شعبے پاؤگے جہاں مختلف قسم کے اوزاروں کے ذریعے سے کام ہوتا ہے ۔ کہیں تمہیں یہ کھاد پانی کی طرح بہتا ہوا ایک حصّے سے دوسرے حصّے تک نظر آئے گا ۔ آگے چل کر یہ مشین کے ذریعے سے سکھا دیا جاتا ہے اور یہ سوکھ کر دانے دار چینی کی طرح ہو جاتا ہے ۔ اس طرح یہ سارا کھاد ایک جگہ جا کر خزانے میں جمع ہو جاتا ہے اور پھر وہاں سے خود بخود تھیلے میں بھر جاتا ہے ۔ جوں ہی وہ بھر جاتا ہے ایک مشین اوپر سے آتی ہے اس کے ذریعے سے اس کا منھ سل جاتا ہے اس کے بعد اس کا وزن ہوتا ہے ۔ صرف دو آدمیوں اور مشین کے سہارے مال گاڑیوں میں بند ہو کر دوسری جگہوں کو بھیجا جاتا ہے ۔

ایک دن میں تقریباً بیس ہزار سے تیس ہزار تک تھیلے تیار کئے جاتے ہیں۔

اس کارخانے کی پیداوار سات سو ٹن کھاد روزانہ ہے ۔ اس کی پیداوار کو دو انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعے سے فروخت کیا جاتا ہے گذشتہ سال اس کھاد کی قیمت ۳۸۰ روپے فی ٹن تھی ۔ چونکہ اس کی پیداوار بہت تیزی سے بڑھائی جا رہی ہے اس لئے اس کی قیمت ۲۸۰ روپے فی ٹن ہو گئی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں اس کی قیمت اور بھی کم کی جا سکے گی تاکہ ہمارے کسان اسے آسانی سے خرید کر اپنے کھیتوں کی پیداوار بڑھا سکیں

اس کارخانے میں پانچ ہزار تین سو مزدور کام کرتے ہیں اور تین غیر ممالک کے ماہرین بھی کام کر رہے ہیں جن میں دو جرمن اور ایک آسٹریلین ہے ۔

امریکہ کے کچھ ماہرین کو ہند آنے کی دعوت دی گئی ہے ۔ تاکہ اس کارخانے کا کام اور بھی وسیع کیا جا سکے ۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ سندری کے کارخانے سے تیار شدہ کھاد ہمارے غلّے کی پیداوار میں دس لاکھ ٹن کا اضافہ کر سکے گا جس کی قیمت کم از کم چالیس کروڑ روپے ہوگی۔ اس طرح ہمیں باہر سے غلّہ منگوانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

سجّاد قادری

دشمن سے دوستی کا پھل

(۱)





ایک جنگل میں کہیں اک چاہ تھا
اِس میں رہتا مینڈکوں کا شاہ تھا

اس کے نوکر اور اس کے تھے امیر
فوج تھی، لشکر تھا، اس کے تھے وزیر

اک رہٹ کے ڈول میں یہ بیٹھ کر
روز آجاتا زمین کی سطح پر

گھوم پھر کر کچھ نہ کچھ کھاتا ہوا
راجدھانی کو پھر اپنی لوٹتا

ایک دن یہ سیر میں مصروف تھا
راہ میں اک ناگ راجہ مل گیا

پیڑ اک بڑ کا تھا جنگل میں کھڑا
اس کی کھوکھر میں وہ رہتا تھا سدا

رفتہ رفتہ دوستی ان میں ہوئی
خوب گاڑھی دونوں میں چھننے لگی

یعنی وہ اک جان دو قالب ہوئے
الغرض مطلوب اور طالب ہوئے

ایک دن وہ جبکہ نکلا چاہ سے
ناگ نے پُوچھا یہ مینڈک شاہ سے

اے نصیبِ دشمناں کیا ہوگیا
آپ کا چہرہ ہے کچھ اُترا ہُوا

گول گول آنکھیں ہیں اندر کو دھنسی
ہونٹ پر ہیں پپڑیاں سی کچھ جمی

آپ کا چہرہ بہت غمگین ہے
ہو نہ ہو کچھ واقعہ سنگین ہے

سُن کے یہ سب بولے شاہِ مینڈکاں
پوچھئے کیا ہوا رے مجھ سے میاں

آگ وہ اس وقت ہے دل میں لگی
بجھ سکے گی جو نہ شاید اب کبھی

تم تو ہو اس بات سے واقف بڑے
ہم رعیت کو بھی کتنا چاہتے

کتنی ہم اس پر عنایت کرتے تھے
ہر طرح اس کی حفاظت کرتے تھے

پر کہیں کیا آج کتنی ہے خلش
باغیانہ ہوگئی اس کی روش

کچھ دنوں سے بک رہی ہے بے شعور
اس کے دل میں آگیا شاید فتور

(۲)

ناگ راجہ نے سنی جب شاہ کی — ہاتھ رکھ کر سینے پر اک آہ کی
شدّتِ غم سے گیا چہرہ سکڑ — ناگ راجہ بن گئے جیسے ربڑ
سر اُٹھا کر گفتگو کی اس طرح — غم میں کوئی بولتا ہے جس طرح
ہے بغاوت شومیٔ تقدیر سے — روکئے اس کو کسی تدبیر سے

(۳)

اس بغاوت کو دبانے کے لئے — دیر تک دونوں رہے کچھ سوچتے
آخر اک صورت سمجھ میں آگئی — جو بہت سی گتھیاں سلجھا گئی
منھ بنا کر ناگ سے شہ نے کہا — اس زمینِ خشک پر کیا ہے دھرا
ساتھ میرے چاہ کے اندر چلو — ایک مینڈک ناشتے کو روز لو
رفتہ رفتہ ایک دن وہ آئے گا — آپ ہو جائے گا ان کا خاتمہ
ناگ کی سُن کے یہ باچھیں کھل گئیں — سب مرادیں دل کی جیسے مل گئیں
جُھک کے بولا مینڈکوں کے شاہ سے — حکم سے باہر نہیں ہیں آپ کے

(۴)

الغرض سورج لگا جب ڈوبنے — ڈول سے دونوں کنوئیں میں آگئے
کچھ کنوئیں کے پانی سے اوپر ذرا — پہلے سے اک چھوٹا سا سوراخ تھا
اس کے اندر ناگ کا گھر بن گیا — اور مزے سے اس میں وہ رہنے لگا
اس طرح جبکہ گئے کچھ دن گزر — مینڈکوں کی تب لگا لینے خبر
روز اک مینڈک کا کرتا ناشتا — پھر خوشی سے جھومتا اور ناچتا
مینڈکوں کا جب صفایا ہو گیا — اور رہا نہ کچھ برائے ناشتا
بیٹوں پوتوں کو لیا پھر شاہ کے — دھیرے دھیرے ختم وہ بھی ہو گئے
ایک دن ایسا بھی آخر آگیا — تھا نہ کوئی شاہ و بیگم کے سوا
اب پریشانی ہوئی ان کو بڑی — باری اگلی صبح کو بیگم کی تھی
رات بھر یہ مشورے کرتے رہے — راستہ لیکن نہ کوئی پا سکے





شاہ سے پھر رو کے بیگم نے کہا ۔۔۔ آپ خود لائے ہیں گھر میں یہ بلا
ناگ کنبہ پرجا کو چٹ کر چکا ۔۔۔ تاج کو اور تخت کو ہپٹ کر چکا
اب ہماری موت کے سامان ہیں ۔۔۔ ہم بھی تھوڑی دیر کے مہمان ہیں

(۵)

بولے شہ بیگم سے گھبراؤ نہیں ۔۔۔ تم خدائے پاک پر رکھو یقیں
ہیں بہر قیمت بچانے کی ہمتیں ۔۔۔ جان سے دل سے کروں گا کوششیں
صبح ہوتے ہوتے آخر ناگ سے ۔۔۔ بچنے کی تدبیر سوچی شاہ نے
ناگ راجہ کی وہ خدمت بن گیا ۔۔۔ ہاتھ رکھ کر سینے پر اس سے کہا
آج ہم باہر ٹہلنے جائیں گے ۔۔۔ دھرتی پر پرجا سے مل کر آئیں گے
ساتھ بیگم بھی ہمارے جائیں گی ۔۔۔ مینڈکوں کو وہ وہاں سمجھائیں گی
تاکہ اندر چاہ کے یہ آ سکیں ۔۔۔ ناشتے میں آپ ان کو کھا سکیں
ناگ یہ سن کر کے کچھ ایسا ہنسا ۔۔۔ جیسے سب اس کی سمجھ میں آگیا
بولا تنہا جاؤ شاہِ مینڈکاں ۔۔۔ چھوڑ جاؤ اپنی بیگم کو یہاں
مینڈکوں کے شاہ اس پر ہنس دئے ۔۔۔ بولے یہ تو آپ بھی ہیں جانتے
کتنا بیگم کو ہے پرجا چاہتی ۔۔۔ وہ فدا کرتی ہے ان پر جان بھی
اک اشارہ وہ اگر فرمائیں گی ۔۔۔ کام اک جادو کا بس کر جائیں گی
کھنچ کے مینڈک سب یہاں آجائیں گے ۔۔۔ عمر بھر پھر آپ ان کو کھائیں گے

(۶)

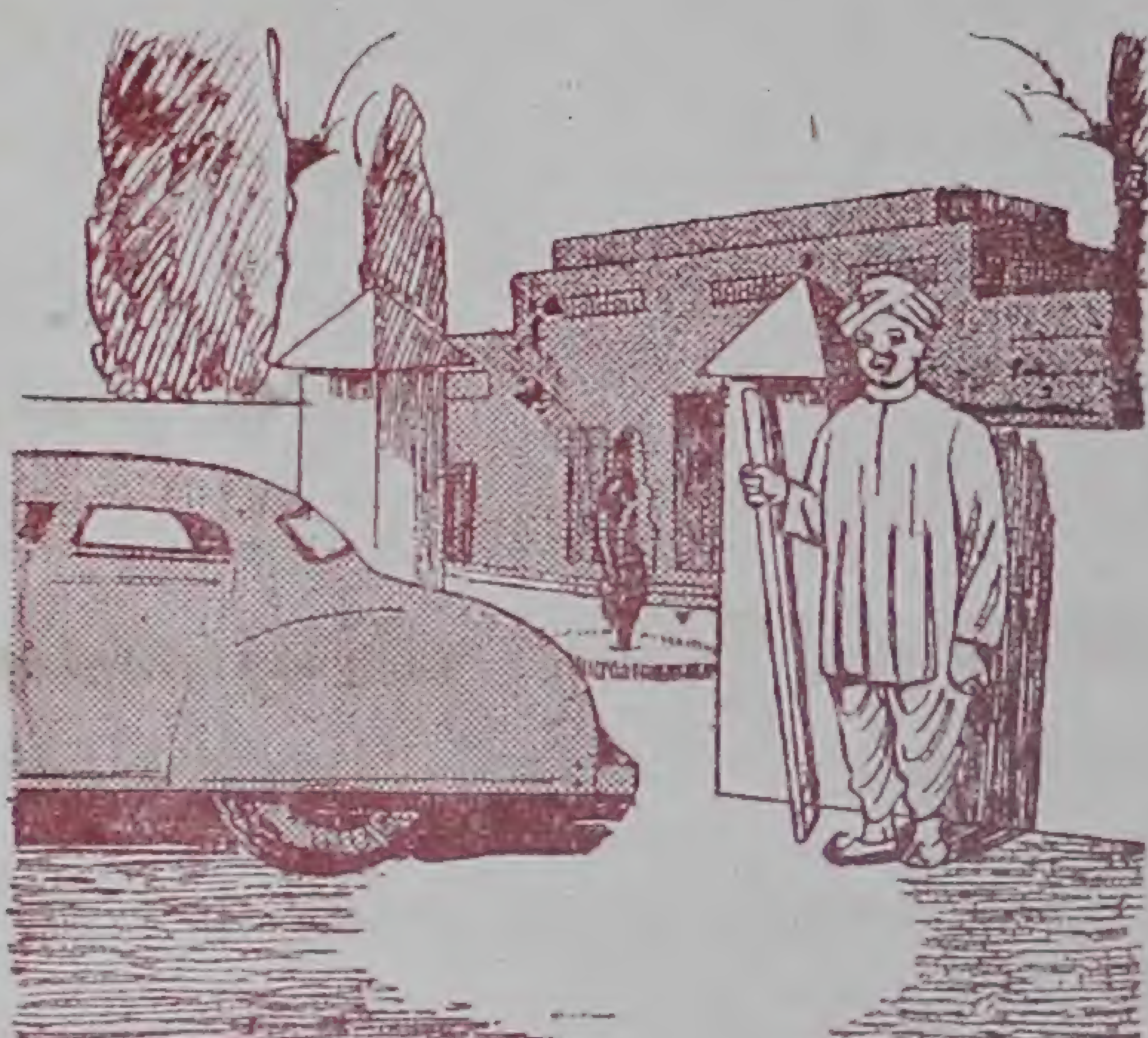
شاہ سے جب ناگ یہ سب سن چکا ۔۔۔ ڈال کے ماتھے پہ بل کہنے لگا
مینڈکوں سے دھوکے کتنے کھائے ہیں ۔۔۔ دکھ انھوں نے اس قدر پہنچائے ہیں
اٹھ گیا ہے آپ پر سے بھی یقیں ۔۔۔ جا نہیں سکتے ہو دیکھو اب کہیں
کہہ کے یہ جا پکڑا اس نے شہ کو جھٹ ۔۔۔ اور اسی دم کر گیا بس اس کو چٹ
اور بیگم کو ہڑپ پھر کر گیا
دوستی کا پھل یہ دشمن سے ملا





محمود پرویز کاکوی

وُہ باپ تھا



جاڑے کی ایک رات تھی۔ سردی کافی پڑ رہی تھی میں اپنے لحاف میں سویرے ہی سے دبک گیا تھا۔مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ طبیعت گھبرائی گھبرائی سی تھی۔ آخر کچھ سوچ کر اُٹھا اور سیدھا نانا جان کے کمرے میں جا پہنچا۔ نانا جان لحاف اوڑھے حقّہ پی رہے تھے۔میں جھٹ پلنگ پر چڑھ کر ان کے لحاف میں گھس گیا۔نانا جان بہت نیک اور بزرگ انسان تھے۔ وُہ مجھے بہت مانتے تھے۔

"نانا جان! آج کوئی کہانی سنائیے!" میں نے ان کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگے۔ پھر بولے۔

"لو سنو! آج تمھیں ایک سچّا واقعہ سناتا ہوں۔یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ میں جوان تھا۔ اور ان دنوں نوکری کی غرض سے پٹنے میں میرا قیام تھا۔تم تو جانتے ہی ہو سفر میں بہت سے دوست بن جاتے ہیں۔ میرے بھی بے شمار دوست تھے مگر احمد سے میری دوستی گہری تھی اور میں کبھی کبھی اس کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔

احمد ایک تاجر تھا۔ اور بڑی شان و شوکت سے رہا کرتا تھا۔ بہترین کار، عمدہ فرنیچر، نوکر چاکر! اکیلا دم تھا۔ شادی اب تک نہیں کی تھی۔ اس لئے بڑی آزادی اور بے فکری سے زندگی گزارتا تھا۔

میں جب بھی اس کے گھر جاتا اس کے ایک بوڑھے نوکر پر میری نظر پڑتی جو سائبان میں دروازے کے قریب چھوٹی سی تپائی پر اداس بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے حسرت و یاس ٹپکتی تھی۔ بال بڑے بڑے اور سفید تھے۔ داڑھی گھنی اور دراز تھی۔ کپڑے بالکل میلے اور پُرانے تھے۔ یہ کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ اس کو اس حال میں دیکھ کر مجھے بڑا ترس آتا تھا۔

میں نے بارہا دیکھا کہ احمدؔ اس بوڑھے کو بُری طرح جھڑکتا، بات بات پر ڈانٹتا اور پیٹتا۔ بے چارہ بوڑھا چپ چاپ اس کے ظلم سہتا۔ مجھ سے یہ دیکھا نہ جاتا۔ مگر کچھ کہنے کی ہمّت نہ ہوتی۔ لیکن دل میں سوچتا۔

" دیکھو تو بھلا۔ اتنا بوڑھا انسان اور اس پر اتنا ظلم۔ صرف اس لئے کہ چائے میں دو منٹ کی دیر کیوں ہوئی۔ پاس کیوں کھڑا ہے۔ کھانے کو کیوں گھورتا ہے۔"

" محمود!" ناناجان غم ناک آواز میں بولے۔ "جب مجھ سے یہ باتیں برداشت نہ ہو سکیں تو میں نے اس کے یہاں آنا جانا بند کر دیا۔

ایک روز شام کے وقت احمدؔ اپنی بہترین کار پر آیا۔ اور بڑی شکایتیں کرنے لگا کہ کیوں نہیں آتے؟ میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس کی بات کو ٹال دیا۔ چلتے وقت احمدؔ بولا۔

" بھئی! کل رات تو ضرور آنا۔ پارٹی ہے۔ میں نے کُل دوستوں کو مدعو کیا ہے دیکھنا۔ بھولئے نہیں۔ اس کے اصرار پر دعوت قبول کرنا پڑی۔

دوسرے روز شام کے وقت احمد کے گھر پہنچا۔ وہاں دوستوں کی کافی چہل پہل تھی۔ بہت اچھا انتظام تھا۔ آج تمام ملازم صاف ستھرا لباس پہنے تھے۔ مگر وہ بوڑھا تو اُسی لباس میں تھا۔ پھٹا۔ پُرانا۔ میلا کچیلا۔ کھانے کا وقت ہوا۔ عمدہ عمدہ کھانے دستر خوان پر چنے جانے لگے۔ احمدؔ نوکروں کو ہدایت دے رہا تھا اور نوکر اس کے اشارے پر کام کر رہے تھے۔

" چھن!" ایک آواز آئی۔ بے چارے بوڑھے کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا تھا۔ "تڑاخ!" ایک اور آواز بڑے زور کی آئی۔ احمدؔ نے اس بوڑھے کے ایک تھپڑ رسید کیا تھا۔ بوڑھا بے چارہ ذلیل ہو کر باہر چلا گیا۔

یہ منظر دیکھ کر میرے دل پر چوٹ لگی اور میں بے قرار ہو کر باہر نکل آیا۔ بوڑھا سائبان میں بیٹھا رو رہا تھا۔ اُسے روتے دیکھ کر میرے بھی آنسو نکل آئے میں نے اُس سے تمام حال دریافت کیا۔ بوڑھے نے ہچکیاں لیتے ہوئے اپنی درد بھری داستان سنائی۔ میری چیخ نکل گئی۔ اور میں بے تحاشا وہاں سے اپنے گھر بھاگا اور رات بھر بستر پر پڑا روتا رہا۔

" محمود جانتے ہو وہ کون تھا۔ ناناجان نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

" نہیں تو ناناجان آپ ہی بتائیے۔"



"وہ..... احمدؔ کا باپ تھا۔" ناناجان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

" باپ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

" ہاں! احمدؔ کا بوڑھا اور غریب باپ!"

سوم ناتھ سادھو

لطیفے

اُستاد۔ اُس آدمی کو کیا کہیں گے جو ہر وقت بولتا ہے چاہے کوئی سُنے یا نہ سنے۔

جاوید۔ اس آدمی کو ماسٹر جی کہیں گے۔

سریندر۔ کسی چیز کا نام کیوں رکھا جاتا ہے؟

ویریندر۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ یہ تو کوئی پاگل بھی بتا دے گا۔

سریندر۔ اسی لئے میں نے آپ ہی سے پُوچھا۔

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

خواجہ غلام السیدین ایڈیشنل سکریٹری
وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند

میں 'آج کل' کو ہمیشہ بہت دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور اس میں اکثر قابلِ قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کی لکھائی چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔

محمد اجمل خاں پرائیویٹ سکریٹری مولانا ابوالکلام آزاد
وزیر تعلیمات حکومتِ ہند

'آج کل' میں نہ صرف اُردو کی بلند پایہ نظم و نثر کا مجموعہ پایا جاتا ہے بلکہ تنوعِ مضامین کے باوجود اس کی حسنِ ترتیب اسے ایک گلدستہ بنا دیتی ہے۔ اسی لئے اسے صرف "مقبولِ عوام" کہنا کافی نہیں بلکہ "یہ مقبولِ انام" ہے۔

ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زور
حیدرآباد دکن

'آج کل' میری نظر میں ہندستان کا واحد علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں ایک معتدل اور سلیقہ مند روش عرصہ سے قائم اور ترقی پذیر ہے۔ اس کے مقالے اور افسانے اور نظمیں تینوں معیاری ہوتے ہیں اور انتخاب کرنے میں خاص ذوق اور جستجو کو دخل رہتا ہے۔

سیّد احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

'آج کل' اردو کا مطالعہ کئی سال سے باقاعدہ کر رہا ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو رسالہ برسوں سے ایک ملکی زبان کے ذریعے سے علم و ادب کی خدمت کر رہا ہو وہ ذہن میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور پڑھنے والے اس کا انتظار بے تابی سے کرتے ہیں۔ 'آج کل' کے لئے بھی میں نے لوگوں کو بیتاب پایا ہے۔



ڈاکٹر عبدالستار صدیقی
میور روڈ الہ آباد

پچھلے دس گیارہ برس سے 'آج کل' کو میں برابر پڑھتا رہا ہوں۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ملک کے سارے ماہانہ رسالوں میں 'آج کل' سب سے بہتر اور بالاتر ہے۔ اس کے مقالوں اور اس کی نظم و نثر کا معیار بہت اونچا ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری
صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

'آج کل' اردو کے موجودہ رسالوں میں سب سے اچھا رسالہ ہے اور اپنے ادبی اور علمی معیار کے لحاظ سے ایک بلند پایہ رسالہ ہے۔ اس رسالے کی جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند ہے، وہ اس کا نہایت سنجیدہ لب و لہجہ ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور
صدر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی

'آج کل' اُردو کے اُن چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے، ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے

کرشن چندر — بمبئی

رسالہ 'آج کل' ایک عرصے سے اُردو ادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کے ادارے سے جناب جوش ملیح آبادی اور جناب عرش ملسیانی منسلک ہیں جن کی روشن خیالی اور فنی بلوغت کے سبھی قائل ہیں۔ 'آج کل' کے کئی ایک خاص نمبر اُردو داں طبقے میں شرفِ قبولیت حاصل کر چکے ہیں

نوّاب جعفر علی خاں اثر لکھنوی
کشمیری محلہ لکھنؤ

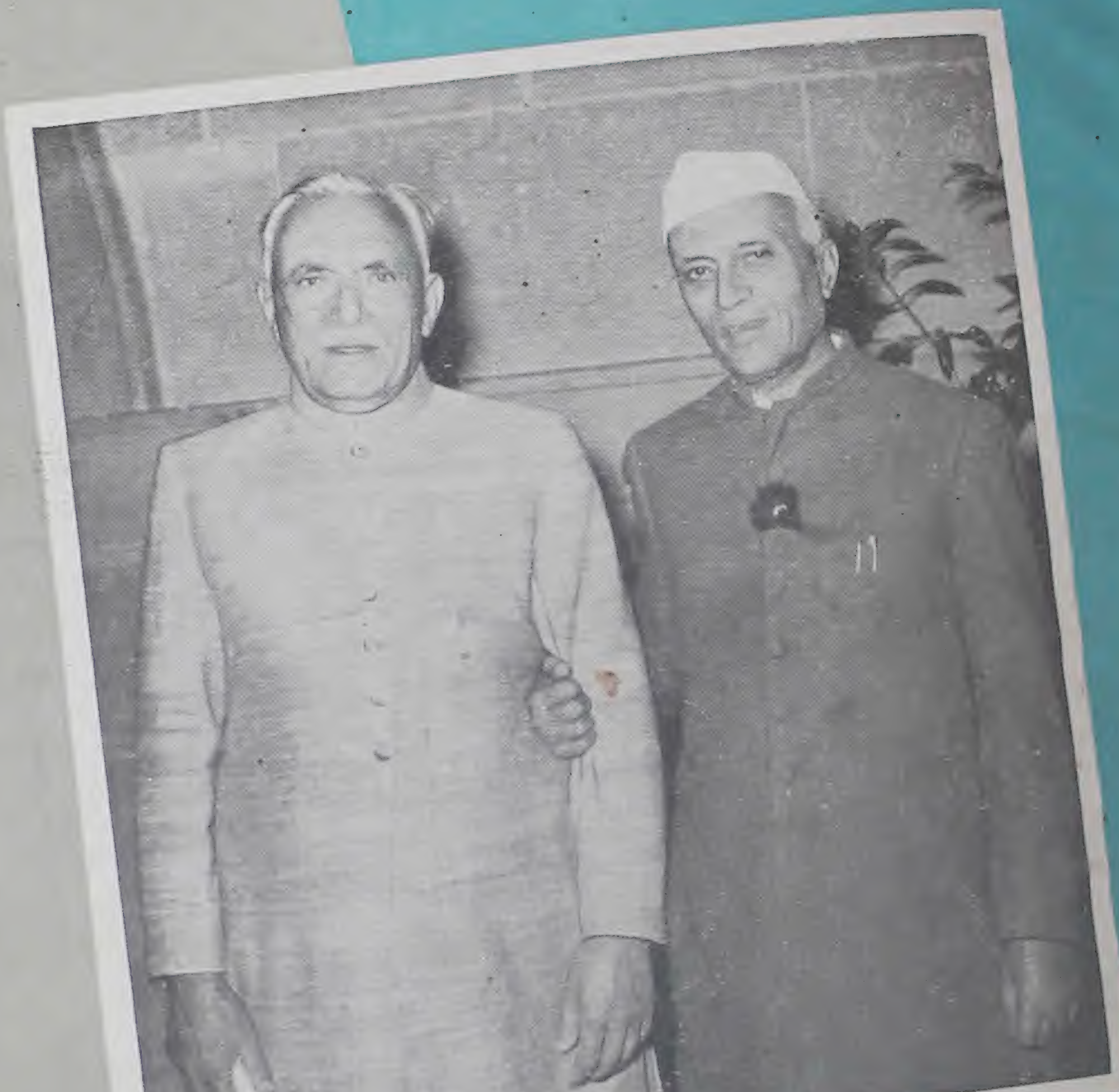
'آج کل' کا بجا طور پر اُردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامین نثر پر مغز اور دلچسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھناؤنے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ نظم کے حصّے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔

فی پرچہ آٹھ آنے — **بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی** — سالانہ چھ روپے

gd. No. D—509

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

آج کل



اپریل ۱۹۵۵ء

آٹھ آنے

ہمارے مطبوعات

آسان پنج سالہ پلان

۲۰ صفحات کی یہ خوبصورت کتاب
بچّوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ زبان نہایت
آسان ہے اور ہر صفحہ فوٹو بلاک کے
ذریعے سے چھاپا گیا ہے۔ جابجا متعدد
تصویریں ہیں جن کی وجہ سے کتاب زیادہ
مفید اور زیادہ دلکش ہو گئی ہے۔
قیمت آٹھ آنے

پنج سالہ پلان سوالات و جوابات

زیر نظر ۲۰ صفحات پر مشتمل
کتاب میں تمام اہم مسائل اُردو
سوال و جواب کی صورت میں بیان کر
دئے گئے ہیں۔ کتاب مرتب کرتے وقت
اس امر کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ
اصل پلان کا نچوڑ اس کتاب میں آجائے
قیمت چار آنے — "قومی آواز" لکھنؤ

معاوضے کی درمیانی اسکیم

یہ ایک بہت مفید کتابچہ ہے جس میں
بے گھر لوگوں کے لئے معاوضے کی درمیانی
اسکیم کے بارے میں قیمتی معلومات جمع
کر دی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت
جو کچھ کرنا چاہتی ہے اُس کی پوری
تفصیل اس کتابچے کے مطالعے سے
معلوم ہو سکتی ہیں — "الجمعیۃ" دہلی
قیمت دو آنے

اپنے شہر کے
کتب فروشوں
سے طلب کیجئے
یا
براہ راست
مندرجہ ذیل
پتے سے
منگوایئے

نئے ہند کی تعمیر

یہ توضیحی پمفلٹ حکومت ہند کی
وزارتِ اطلاعات نے شائع کر کے ایک اہم خدمت
انجام دی ہے۔ حکومت کے کارناموں اور اسکیموں
سے اُردو خواں پبلک کو واقف کرنا نہایت
ضروری ہے۔ اس پمفلٹ کی زبان بہت سلیس
اور دل نشیں ہے۔ تصویریں اور طباعت سب اعلیٰ
درجے کی ہیں۔ — "سیاست" کانپور
قیمت آٹھ آنے

بزنس مینجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

ترتیب

سرورق:۔ پنڈت نہرو ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ یومِ جمہوریت کے موقعے پر دہلی میں

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:۔ —— جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر —— بال مُکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۹

سالانہ چندہ:۔ —— ہندوستان میں:۔ چھ رُپے / پاکستان میں:۔ چھ رُپے (پاک)

غیر ممالک سے:۔ —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:۔ —— ہندوستان میں:۔ آٹھ آنے / پاکستان میں:۔ آٹھ آنے (پاک)

اپریل ۱۹۵۵ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱۔ دہلی

یحییٰ اعظمی

مستقبل کا ہندوستان

منصوبہ تعمیر و ترقی کے بعد

اُجڑی ہوئی خاکِ وطن بننے کو ہے پھر گلستاں   دشت و بیابان و دمن ہونے کو ہیں پھر گل فشاں
ہر گانوں، ہر دیہات پھر بننے کو ہے رشکِ جناں   ہونے کو ہے باغِ ارم ہر قریۂ ہندوستاں
ہوں گی یہاں پھر کوثر و تسنیم کی نہریں رواں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

اُگلے گی گنجِ سیم و زر پھر ہر طرف خاکِ وطن   پھر لہلہائے گا ہجومِ رنگ و بو سے یہ چمن
جوئے روانِ زندگی ہر سمت ہوگی موج زن   امرت کی نہریں ہر طرف دوڑائیں گے گنگ و جمن
کھیتوں کو مل جائے گا پیغامِ حیاتِ جاوداں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

ہر سبزۂ پامال بن جائے گا فردوسِ نظر   آبِ رواں سے لہلہا اُٹھے گا ہر اک دشت و در
برگ و ثمر کے بار سے جھک جائے گا ہر نخلِ تر   نشو و نمو کے کیف سے جھومے گی ہر شاخِ شجر
گائیں گی رنگیں زمزمے موجِ رواں جوئے رواں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

دہقاں کا ہر اک غم کدہ بن جائے عشرت کدہ   مزدور کا ہر جھونپڑا ہو جائے گا راحت کدہ
پھر غیرتِ کاشانہ بن جائے گا ہر عسرت کدہ   ہوگا ہجومِ نور سے معمور ہر ظلمت کدہ
ہر کلبۂ دہقاں میں موجِ برق ہوگی ضو فشاں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

چھائیں گی ہر چہرے پہ جامِ عیش کی سرمستیاں   خرم نظر آئیں گی پھر پامالِ عسرت ہستیاں
صدیوں کے بعد اُبھریں گی پھر جمہور کی یہ بستیاں   پھر سرفرازِ اوج ہوں گی مدتوں کی پستیاں
روندی ہوئی یہ خاک ہو جائے گی اک دن آسماں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

ہوگا فروزاں آفتابِ نو دمیدۂ زندگی   ہر ذرۂ افسردہ پھر ہوگا شہیدِ زندگی
پائے گی پھر جمہور کی دنیا نویدِ زندگی   پھر ہر لبِ مزدور پہ ہوگا نشیدِ زندگی
عیش و طرب کے زمزمے گائے گی دہقاں کی زباں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

پیڑوں کے سایے کے تلے کھل جائیں گے حکمت کدے　　ہر خار و خس کے جھونپڑے بن جائیں گے صنعت کدے
غربت کدے جمہور کے ہو جائیں گے دولت کدے　　مزدور کے بے مایہ گھر بن جائیں گے نعمت کدے
ہوں گی رواں ہر سمت شہد اور دودھ کی نہریں یہاں
اِک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

پھوٹیں گے چشمے زندگانی کے ستارِ برق سے　　پانی کے دھارے ہر طرف دَوڑیں گے تارِ برق سے
دشت و دمن رشکِ چمن ہوں گے بہارِ برق سے　　پھر جمع ہوں گے ہر طرف خرمن شرارِ برق سے
ہر سبزہ و گُل میں حیات افروز ہوں گی بجلیاں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

اُبلیں گے پانی اور بجلی کے خزانے سُو بہ سُو　　ہو جائیں گے برقی چراغوں سے منوّر کُو بہ کُو
سوکھی زمین بن جائے گی مے خانۂ نشو و نمو　　بھر جائیں گے پھر بادۂ گُل رنگ سے جام و سبو
پھر جگمگا اُٹھے گا اک دن یہ شبستانِ جہاں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

پھولوں کی رگ رگ میں چمک اُٹھے گی برقِ رنگ و بُو　　پَودوں کی نس نس میں تڑپ اُٹھے گا رلیانِ نمو
لہرائے گی سبزوں کی اک دُنیا کنارِ آبِ جُو　　ہو جائے گی سُوکھی ہوئی کھیتی نہال و سرخرو
سب نونہالانِ چمن ہو جائیں گے اک دن جواں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

چمکیں گے تعمیر و ترقّی کے مظاہر ہر طرف　　ہوں گے فروغِ زیست کے آثار ظاہر ہر طرف
مستِ طرب کر دیں گے قدرت کے نوادر ہر طرف　　کھینچیں گے دل فطرت کے جاں پرور مناظر ہر طرف
ڈھک جائے گی فرشِ زمرّد سے بساطِ خاکداں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

خاکِ وطن کا کوکبِ تقدیر ہے پھر اَوج پر　　قصرِ ترقّی کی نئی تعمیر ہے پیشِ نظر
مٹ جائیں گے ماضی کے پارینہ نشاں پھر سربسر　　ہوگا بساطِ دہر پر اک نقشِ تازہ جلوہ گر
ہر گانوں میں تعمیر ہوگا اک نیا ہندوستاں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستان جنّت نشان

مانع نہ کوہ و دشت ہیں حائل نہ سنگِ راہ ہے　　گرمِ سفر ہے قافلہ راہِ طلب میں پے بہ پے
پیہم رواں، پیہم دواں، ہر اک جواں، ہر ایک شے　　منزل جو ہے پیشِ نظر اک روز ہو جائے گی طے
بڑھتا ہی جاتا ہے سوئے منزل وطن کا کارواں
اک روز ہو جائے گا یہ ہندوستاں جنّت نشاں

نور الحسن ہاشمی

جانِ عالم واجد علی شاہ کے خطوط - بنام شیدا بیگم

اپریل ۱۹۵۲ء کے رسالہ "آج کل" میں نصیر الدین ہاشمی صاحب کا ایک مضمون بعنوان "جانِ عالم واجد علی شاہ اور اُن کے بیگمات کے غیر مطبوعہ خطوط" شائع ہوا تھا جس میں موصوف نے "مخزن اسرار سلطانی" نامی ایک قلمی کتاب کا ذکر کیا تھا جس میں ۷۵ خطوط بیگمات کے لکھے ہوئے اور ۲۰ خطوط واجد علی شاہ کے لکھے موجود ہیں۔ نصیر الدین صاحب ہاشمی کو غلط فہمی ہوئی کہ یہ کتاب طبع نہیں ہوئی۔ حالانکہ متذکرہ بالا نسخے میں خود "تاریخ طبع یوں درج ہے۔

سالِ طبعش اندریں مصراع گفتم اے ادیب
نیکو و زیبا خطوطِ بیگماتِ لکھنؤ (۱۳۲۰ھ)

یہ مطبوعہ کتاب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

اسی کتاب میں منجملہ دیگر بیگمات کے ایک بیگم کا نام شیدا بیگم ہے — "مخزنِ اسرار سلطانی" میں اِن بیگم کے ۳۳ خطوط بنام واجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے ۱۲ خطوط بنام شیدا بیگم موجود ہیں۔ لیکن ابھی حال میں ایک قلمی نسخہ یہاں لکھنؤ میں میری نظر سے گزرا جس میں صرف واجد علی شاہ کے وہ خطوط ہیں جو اُنھوں نے مٹیا برج کلکتہ سے شیدا بیگم کو ۱۲۷۲ھ و ۱۲۷۳ھ میں لکھے تھے۔ ہر سال کے خطوط ترتیب وار نمبر دے کر درج کئے گئے ہیں۔ کل خطوں کی تعداد ۳۸ ہے۔ لیکن یہ نسخہ ناقص الطرفین ہے۔ شروع کا ایک صفحہ اور آخر کے نہیں معلوم کتنے صفحے غائب ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آخر میں کتنے خطوط اور رہوں گے۔ ان ۳۸ خطوں میں سے بھی ۸ ناقص ہیں اور ۸ غائب۔ اس لئے کہ اس کے بیچ کے بعض صفحے بھی غائب ہیں۔ اس طرح مکمل خطوں کی تعداد ۳۰ رہ جاتی ہے۔

یہ نسخہ ۷۵ فل اسکیپ سائز کے صفحات پر مشتمل ہے اور زرنگاری کی اپنی آپ مثال ہے۔ میں نے اب تک کسی کتاب کا قلمی نسخہ اس قدر زرنگار نہیں دیکھا۔ تفصیل اِس اجمال کی یوں ہے کہ اس نسخے کے ہر صفحے پر تین طرف جدول میں کوئی ڈھائی انچ کی چوڑی بیلیں آبِ زر سے بنائی گئی ہیں۔ ہر چوتھے صفحے پر بیل کا ڈیزائن بدل دیا گیا ہے۔ اور یہ بیلیں کسی اُستاد فن کار کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ یہ سب بہت خوبصورت اور بہت متناسب ہیں۔ نقوش میں کہیں پھول ہیں کہیں پھل، کہیں وحوش و طیور اور رنگینیاں اور کہیں محلات اور لکھنؤ کی مشہور عمارتوں کی عکاسی۔ متن صرف ۷ سطروں کا ہے۔ اور بین السطور میں بھی سونے کا پانی بھرا گیا ہے۔ اجزا کی سلائی کی جانب بھی کسی نہ کسی وضع کی تپلی بیل آبِ زر سے بنائی گئی ہے۔ غالباً یہ نسخہ خود شیدا بیگم کی ملکیت ہوگا۔ کیونکہ اس قدر مطلا اور مذہب نسخہ اور کون تیار کروا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ نسخہ اچھی طرح محفوظ نہیں کیا گیا اور نہ اس کی جلد ہی بندھوائی گئی ہے۔ اس لئے مجھے ڈر ہے کہ اگر کسی واقعی قدردان کے ہاتھ نہ لگ گیا تو چند سال کے عرصے میں بالکل خراب ہو جائے گا۔

ذیل میں اس نسخے سے تین خطوط نمونتہً پیش کئے جاتے ہیں۔ پہلا خط منظوم ہے۔ دوسرے خط سے معلوم ہوگا کہ شیدا بیگم کے والد کا نام حسین علی خاں تھا اور یہ بھی کہ واجد علی شاہ کی طرف سے اُن کی والدہ، بھائی اور ایک بیٹے لندن گئے تھے، تاکہ وہاں کے ممبرانِ پارلیمنٹ اور با اثر لوگوں سے مل کر واجد علی شاہ کی اپیل کو منظور کرائیں، اور اس طرح اُنھیں بادشاہت پھر مل جائے۔

اس کے متعلق تفصیل "گزشتہ لکھنؤ" مصنفہ عبد الحلیم شرر سے بخوبی معلوم ہو سکتی ہے۔ تیسرا خط محض انشا پردازی کا نمونہ ہے اور ہجر و فراق کی داستان کا حامل۔

۱۔ محبت نامۂ ہفتم

نواب شیدا بیگم صاحبہ کو جانِ عالم کی طرف سے معلوم ہو نظم

جو گزری ہے مجھ پر کروں کیا بیاں | بہت روئے گی سُن کے اُس کا بیاں
ستم کون سا مجھ پہ گزرا نہیں | بیاں اُس کا کرنا اب اچھا نہیں
بھلا کس سے کہتا میں یہ واردات | کہاں میں کہاں ہجر، ہے طرفہ بات
ہمارا تو اب کچھ نہیں دسترس | فقط غم زدوں کا ہے آنکھوں پہ بس
بڑے عشق میں دُکھ اُٹھاتے ہیں ہم | شب و روز آنسو بہاتے ہیں ہم
مصیبت میں اک اک گھڑی سہتے ہیں | رُخِ زرد پر اشکِ خوں بہتے ہیں
عجب سینے میں عشق کا جوش ہے | تمھارے سوا سب فراموش ہے
یہ کھانے نہ پینے کے مجھ کو حواس | قسم لو جو بدلا ہو میں نے لباس
مگر اپنے خالق پہ ہوں میں نثار | کہ ہیں نا اُمید اُس سے اُمیدوار
اُسی کا ہمیشہ رکھا آسرا | اُسی نے سُنی میری آخر دُعا
کہ خط تیرا آپہنچا لب کے پاس | و یا رُوح آپہونچی قالب کے پاس
ہے اِس دم کی کیا نیک اک اک گھڑی | کہ اک اک گھڑی میں خوشی ہے بڑی
بس اب جبرِ غم سے نکالو مجھے | تم اپنے گلے سے لگا لو مجھے
نہیں اور باتوں کا جویا مزاج | گلے ملنے کی ہے فقط احتیاج
مری جان کو اب نہیں دھیان ہجر | ہم آغوش ہونے کا ارمان ہے
جو ایذا ابھی ہے ٹھکانے لگے | مزا روح دونوں کی پانے لگے
محبت کا سب حال آئینہ ہے | لبوں پر لب اور سینے پر سینہ ہے
مگر اے فلک تیرا خانہ خراب | دکھاتا ہے تو ہر زماں انقلاب
مگر چرخ کا کیا گلہ کیجیے | نصیبا بُرا ہو تو کیا کیجیے
یہ اور ایک تازہ مصیبت ہوئی | کہ معشوق عاشق میں فرقت ہوئی
بلا لو مجھے اب تم اے جانِ جاں | سنبھالو مجھے اب تم اے جانِ جاں
کدھر ڈھونڈوں گا اور کدھر جاؤں گا | بس اب تیری فرقت میں مرجاؤں گا
نہ چلتے ہوئے بھی پکارا مجھے | غرض جیتے جی تو نے مارا مجھے
نظر میں نہ کیوں کر ہو عالم سیاہ | نہاں تم ہو آنکھوں سے اے رشکِ ماہ
دلِ شاہ کا بھی بُرا حال ہے | کہ درد و الم سے وہ پامال ہے
یہ جب والیٔ شہر کو غم رہے | بپا شہر میں کیوں نہ ماتم رہے
مگر چرخ ہے درپئے انتقام | کہ کیوں دو ہوئے تھے وہاں شادکام
فلک کا بہت تنگ ہے حوصلہ | کہ دو کو بٹھاتا نہیں ایک جا
پھرا ہوں میں اُلفت کے میدان میں | بگولا بنا ہوں بیابان میں
غرض تیرا خستہ ہے صحرا نورد | ہر اک آنکھ ہے سُرخ چہرہ ہے زرد
درختوں کو حسرت سے تکتا ہوں میں | تو دیوانہ وار اُن سے بکتا ہوں میں

تمھیں میرے ہو جاؤ حامی ذرا
مرے سرو کا تم بتاؤ پتا

راقم بے وطن، اسیرِ محن، جانِ عالم
۱۲۔ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ

۲۔ محبت نامۂ نہم

پیاری شیدا بیگم جینیاں کو معلوم ہو، دو رقعے تمھارے بھیجے ہوئے، ایک میں طلب نسخۂ شفا ہم سے اور دوسرے میں ایک غزل اور احوال غلام حسین علی خاں درج تھا، کنیز الدولہ بہادر کی معرفت چوتھی تاریخ ماہ حال کی ہمیں پہنچے۔ جانِ من جو دوائیاں تم نے لکھی ہیں وہ تو اب عنقا صفت ہوگئی ہیں۔ ہاں "حنظلِ غم" ہر جا موجود ہے۔ اور غزل کی تعریف میں کیا لکھوں، زبان ادائے وصف میں اُس کے قاصر ہے اور تو کیا نذر کروں جان حاضر ہے۔ مگر اے ماہِ خوبی، غلام حسین علی خان کون ہیں جنھوں نے خواب دیکھا ہے۔ اگر تمھارے باپ ہیں وہ فقط حسین علی خاں ہیں۔ لفظ "غلام شاید آدا" لکھا ہو۔ بہرحال اُس کی تصریح کرکے لکھنا، اور اب ہم بڑے صدمات اور آلام میں گرفتار ہیں۔ خارش اور چھینٹے، اور داد و قُلّ اور داتوں کا نہایت زور ہے، تمام بدن سُرخ بانات رہتا ہے، ایک ایک دانے سے پیپ لہو بہتا ہے۔

لندن میں یہ حال ہے، بھائی صاحب یہ چاہتے ہیں مجھے سلطنت ہو، صاحبزادے یہ چاہتے ہیں کہ مجھے ہو، چچا بھتیجے میں قرار واقعی جوتا چل رہا ہے۔ ہم یہاں علیل پڑے ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں پوچھتا۔ خدانخواستہ اگر وہاں یہی حال ہوا تو کمپنی مجھے جیتا نہ چھوڑے گی۔ خدا جانے کیا گت اور نوبت میری ہوگی۔ اب تو یہ مدعی قرار واقعی دشمن ہو چکے ہیں[1]۔ مگر اے گلِ خوبی افسو

---

[1] ڈنبل نے واجد علی شاہ کا وہ مقدمہ جو واپسی سلطنت کی بابت لندن میں چل رہا تھا جب تقریباً طے ہو چکا اور شاہ کے مصاحبوں کو اس کا علم ہوا (بقیہ نوٹ صفحہ ۶ پر)

رشک محل کو حوالے کرو۔ یہ کوئی میری فریاد نہیں سنتا۔ مجھ سے لڑکا کلیجے کا ٹکڑا نہیں دیا جاتا۔ باقی اور حال اگر سنو گی سوائے ملال کیا ہاتھ آئے گا۔ اب ہمیں زندوں میں نہ سمجھنا، ہم مُردوں میں ہیں۔ برس چھ مہینے کے اور مہمان ہیں۔ اُمید ہے کہ جب تک جیتا ہوں رقعہ بھیجا کرنا۔ فقط

مرقوم چہارم ربیع الاول ۱۲۷۳ھ   راقم بسمل جانِ عالم عاشق شیدا

۳۔ محبت نامہ بستم

نُور تمثال، پری جمال، قمر طلعت، آفتاب صورت، تابِ گیسوئے خُوبی، مُشک نافۂ محبوبی، آہوئے ختنِ دلبری، غزالِ چینِ سروری، دلدار وفا شعار، شیریں گفتار، کبک رفتار، نازک بدن، یاسمن تن، لیلیٰ ناز، عذرا انداز، نواب شیدا بیگم صاحبہ کو جانِ عالم تصوّر میں گلے لگا کر پیار کرکے یہ کہتا ہے اور گُلِ تقریر اس طرح مہکتا ہے۔ غرہ جمادی الاولیٰ کو چکیدۂ خامۂ کرشمہ نگار یعنی نامۂ عنبر بار تمہارا منشی صفدر کی معرفت پہونچا۔ غم دُور ہوا، عاشقِ دُور افتادہ بہت مسرور ہوا۔

من از ترانۂ این تازہ نغمہ بشگفتم
چو لب ز خندہ و جام از شراب و گل ز بہار

حال مندرجہ اُس کا کھُلا۔ خیر و عافیت سن کر غنچۂ خاطر نسیم مسرّت سے کھلا۔ طبیبوں کے مقرر کرنے میں تم کو اختیار ہے۔ ملازموں سے جو مزاج داں ہو اور تمہارا اس نے اکثر علاج کیا ہو، اُس کو علاج کے واسطے محمد محبوب علی خاں ناظر سے کہہ کر بلوا بھیجو، کوئی عذر نہیں کرے گا جس کو کہو گی بجان و دل قبول کرے گا۔ اپنے والد کو جو ممانعت کی بہت اچھا کیا۔[1] خدا سے دعا مانگیں کہ ہم جلد مظفر و منصور وہاں آویں۔ جس طرح سے جی چاہتا ہے اُس طرح سے دیکھیں۔ برخوردار نواب نگین آرا بیگم[2] کو ہماری طرف سے دعا پہنچے۔ زیادہ شوق وصل لکھنے میں بہت طول ہے۔

رقم زدہ غرہ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۳ھ   راقم جان عالم

اور ہم نے سنا کہ تمہارے مکان سکونت میں آسیب کا خدشہ ہے اور وہ مکان اچھا نہیں ہے۔ لہٰذا تم اور کسی مکان کو تجویز کرکے لکھ بھیجو۔ تا وہاں جانے کا حکم ہو اور ہمارا تردد اور خفقان جاتا رہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵) تو انھوں نے اس خیال سے کہ اب ہماری قدر و منزلت نہ ہوگی، واجد علی شاہ کو اُکسایا کہ وہ اپنا مقدمہ واپس لے لیں۔ اور ان کو طرح طرح کے وہم دلائے، اور آخر مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل کے لئے "گزشتہ لکھنؤ" از عبد الحلیم شرر ملاحظہ فرمایئے۔ (ن)

[1] پہلے خطوط میں درج ہے کہ شیدا بیگم کے والد واجد علی شاہ کو دیکھنے کلکتے جانے کا قصد رکھتے تھے۔ واجد علی شاہ نے آنے کو منع کیا، اسی کی طرف اشارہ ہے۔

[2] واجد علی شاہ کی نوزائیدہ بیٹی۔ شیدا بیگم کے بطن سے۔

یومِ جمہوریت کا مشاعرہ

۲۵۔ جنوری ۱۹۵۵ء کی شب کو جشنِ جمہوریت کے سلسلے میں جو مشاعرہ لال قلعے میں منعقد ہوا تھا، اس میں جگن ناتھ آزاد۔ جوش ملیح آبادی۔ روش صدیقی۔ ساغر نظامی۔ عرش ملسیانی۔ فراق گورکھپوری۔ سکندر علی وجد نے اپنا کلام سنایا۔ اس مشاعرے کے لئے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے درج ذیل پیغام بھیجا تھا: "مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ یومِ جمہوریت کی تقریب کے سلسلے میں لال قلعے میں ایک مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ ہم اس بات کو نہیں بھول سکتے کہ جنگِ آزادی میں مختلف زبانوں کے شعرا نے اپنے اپنے طریقوں سے ملک کو بیدار کرنے میں قوم کی بڑی خدمت کی تھی۔ اور اب جب ہم آزاد ہو گئے ہیں اور ملک کی بہتری اور ترقی کے لئے کوشش کر رہے ہیں ہمیں یہ لازم ہے کہ ہم شعرا کو برابر موقع دیتے رہیں کہ وہ علم اور فن سے ملک کی خدمت کرتے رہیں۔ سخن میں جو قوت ہے وہ تلوار میں نہیں، اور ہم تو سخن کے پجاری ہیں، نہ کہ تلوار کے۔ لہٰذا آزاد ہندوستان کو اس بات کا فخر ہونا چاہیئے کہ آج بھی اس ملک میں رائج مختلف زبانوں کے شعرا میں اپنے فرائض ادا کرنے اور ہمیں سچے راستے پر لے جانے کی لگن ہے۔ اس موقعے پر میں سب کو مبارک باد دیتا ہوں، اور اس تقریب کی کامیابی کے لئے دُعا کرتا ہوں"

نیاز مند — راجندر پرشاد

ہُما ہرنالوی

پنجابی کا ایک ممتاز شاعر

میرے ادبی ذوق کی یہ محرومی بجز لاعلمی کے اور کس چیز پر مبنی رہی ہوگی کہ میں پنجابی نژاد ہونے کے باوجود ایک عرصے تک دورِ حاضرہ کی پنجابی شاعری سے لطف اندوز نہ ہو سکا - اور کبھی اس کے تیرِ کشش کا نشانہ نہ بن سکا - کچھ ایسا ہی اتفاق ہوتا رہا کہ مختلف کتابوں یا رسالوں کے توسّل سے جتنی بھی چیزیں میری نگاہوں سے گزر رکیں - وہ نہ تو حُسنِ ظاہر ہی کی مظہر تھیں - اور نہ حسنِ باطن کی آئینہ دار - یہی کیفیت ان منظومات کی بھی تھی - جنھیں میں پنجابی مشاعروں میں وقتاً فوقتاً سُنتا رہا - ان اتفاقات کا تو اثر آخر یہ رنگ لایا - کہ میری طبیعت پنجابی شاعری سے قطعاً بے زار اور نفور ہو گئی -

مگر آج سے کچھ برس پہلے میرے ایک عزیز دوست نے پنجابی نظموں کا ایک مختصر سا مجموعہ کہیں سے لا کر میری تحویل میں دیا - اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا - کہ اس کتاب کو پڑھ کر آپ پنجابی شاعری کے متعلق اپنی رائے بدل دینے پر مجبور ہو جائیں گے - اُن کا یہ دعوےٰ میرے لئے کچھ کم اشتیاق انگیز نہ تھا - چناں چہ جب وہ تشریف لے گئے - تو میں نے کتاب مذکور کو جستہ جستہ دیکھنا شروع کیا - سب سے پہلے جو نظم میرے سامنے آئی - اس کا عنوان تھا "رب" - خدا گواہ ہے کہ محض اس نظم کے مطالعہ نے مجھے اتنا محظوظ اور اتنا متاثر کیا - کہ میری تمام سابقہ محرومیوں کی تلافی ہو گئی - اور میں یہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا - کہ اگر کسی شاعری کو حقیقی معنوں میں شاعری کہا جا سکتا ہے - تو وہ یہی شاعری ہے باقی نظموں کو دیکھا - تو ان میں بھی صوری و معنوی خوبیوں کا وہی اجتماع نظر آیا پھر تو اس کتاب نے مجھے ایسا گرویدہ بنایا - کہ ناصحِ دوست کی طرح ہر وقت میری آنکھوں کے مقابل رہنے لگی - اس موقع پر یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے - کہ تقسیم پنجاب کے دنوں میں راول پنڈی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہتے وقت میں نے اپنے ذاتی کتب خانے میں سے جو دس بارہ کتابیں ہم راہ لے جانے کے لئے منتخب کی تھیں - اُن میں یہ صحیفۂ رنگیں بھی شامل تھا - اور اس کی موجودگی آج تک میرے لئے غیر معمولی دل چسپی کا سامان بنی ہوئی ہے - یہ گراں مایہ کتاب ۱۹۴۷ء میں "ساوے پتر" یعنی برگ ہائے سبز کے نام سے منظرِ عام پر آئی تھی - اسے تصنیف کرنے کی سعادت پروفیسر موہن سنگھ ماہر ایم - اے کو حاصل ہے - ان کے اس مجموعے کو جو نظموں کی تعداد کے لحاظ سے بہت مختصر مگر معنویت کے اعتبار سے بہت جامع حیثیت رکھتا ہے - اس ہلکے پھلکے طبلۂ عطّار سے تشبیہ دی جا سکتی ہے - جس میں ہزاروں پھولوں کی روح کشید کر کے بند کر دی گئی ہو - پروفیسر صاحب نے دَورِ موجودہ کے عام ترقّی پسند شاعروں کی طرح زندگی کے کسی ایک ہی پہلو کو موضوعِ سخن بنا کر "ادب برائے زندگی" کے نہایت بلند اور نہایت وسیع نظریے کی توہین نہیں کی - بل کہ بزمِ کائنات کی ہر چیز کو زندگی کا ایک پہلو سمجھ کر اسے بہت قریب سے دیکھا ہے - اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے - اس سے ہم کلام ہوئے ہیں - اور پھر اس رازدارانہ گفت و شنید کو بڑے رنگین اور دل نشیں پیرایے میں نظم کر دیا ہے - ان کے کلام میں کیا المیہ کیا طربیہ اور کیا رزمیہ تینوں قسم کی شاعری کے بہترین نمونے دست یاب ہوتے ہیں - اُن کی طبع رسا نے جس چیز کو بھی عنوانِ بیان بنایا ہے - اس کے ظاہر و باطن کی ایک مکمل تصویر کھینچ کے رکھ دی ہے - اور پھر اس تصویر میں جدّت اور تنوع کی ایسی عجیب و غریب رنگ آمیزی کی ہے - کہ دل سے بے اختیار داد نکلتی ہے

دلِ شاعر کے ساز میں یہ انوکھی تخصیص دیکھی گئی ہے - کہ جب تک وہ شکستہ نہیں ہو جاتا - اس کے نغموں میں کوئی کیف کوئی اثر یا کوئی سوز و گداز پیدا نہیں ہوتا - کسی بھی حقیقی شاعر کے واقعاتِ زندگی پر نظر ڈالی جائے - تو ان میں سے ایک نہ ایک ایسا الم انگیز اور حسرت ناک واقعہ ضرور ملے گا - جس نے اس کے دل و دماغ کو انتہائی شدّت کے ساتھ متاثر کیا ہو - یہی غیر فانی تاثر وہ آگ ہے - جس کی تیز آنچ اس کے ایک ایک شعر

ہیں۔ ایک ایک مصرعے ہیں اور ایک ایک لفظ میں سرایت کر جاتی ہے۔ پروفیسر صاحب بھی چوں کہ ایک وہبی شاعر ہیں۔ اس لیے قدرتی طور پر انھیں بھی اپنی زندگی میں ایک عظیم صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ یہ صدمہ اُن کی رفیقۂ حیات کی ناگہانی موت کا صدمہ تھا۔ اور اس کا جتنا اثر اُن کی طبیعت پر ہوا ہے۔ اُتنا ہی ان کی شاعری پر بھی ہوا ہے۔ اُنھوں نے خود بھی اپنی ایک نظم میں یہ اعتراف کیا ہے۔ کہ دراصل اسی صدمے نے مجھے شاعر بنایا ہے۔

پروفیسر صاحب کی شاعری کے متعلق میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُن کی صداقت کے ثبوت میں صاحبِ موصوف کی بعض نظموں کا اقتباس آزاد اُردو ترجمے کی شکل میں یہاں درج کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے وہ نظم ملاحظہ فرمائیے۔ جو "رب" کے عنوان سے فکر کی گئی ہے۔ اور جسے پڑھ کر میں ہمیشہ کے لئے پروفیسر صاحب کی سحر بیانی کا مدّاح بن گیا تھا۔

خدا کو جاننے کے لئے بے شمار تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ مگر وہ پھر بھی ایک رازِ سربستہ بنا رہتا ہے۔ دیکھئے اس خیال کو کس خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

"تیری تلاش میں پرواز کرتے کرتے طائرِ عقل کے تمام بال و پر گر گئے۔ تیرا سُراغ لیتے لیتے خیال عاجز آ گیا۔ لاکھوں اُنگلیوں نے تیری زُلفوں کے پیچ کھولنے کی کوشش کی۔ مگر کسی کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ روتے روتے ناقوسوں کی آواز بیٹھ گئی۔ گھڑیال اپنا سینہ پیٹ پیٹ کر بے حال ہو گئے۔ تیرا افسانہ کہتے کہتے قلم کی زبان چھٹ گئی۔ مگر تیری ہستی کا معمّہ پھر بھی حل نہ ہو سکا"۔

معاذ اللہ! کیا شاعرانہ اندازِ بیان ہے۔ ناقوسوں کا رونا۔ گھڑیالوں کا سینہ پیٹنا۔ قلم کی زبان کا پھٹ جانا۔ یہ تمام ٹکڑے نہ صرف زورِ تخیل ہی کے اعلےٰ ترین نمونے ہیں۔ بل کہ حقیقت کی پوری پوری ترجمانی بھی کرتے ہیں۔

"کسی نے تیری جُدائی میں کانوں کو چھید ڈالا۔ کسی نے اپنے بال بڑھا لئے۔ کسی نے دروازے بند کر کے چلّہ کشی کی۔ کسی نے شارعِ عام پر بیٹھے بیٹھے راتیں گزاریں۔ کسی نے اپنے آپ کو کنوئیں میں اُلٹا لٹکایا۔ کسی کو دھونی رمانے کی دُھن سوار ہوئی۔ غرضے کہ تیرے عاشقوں نے تیرا ایک جلوہ دیکھنے کے لئے کیا کیا مصیبتیں نہ جھیلیں۔ مگر تُو نے کبھی اپنے رُخِ روشن سے زُلفیں نہ ہٹائیں۔ لاکھوں تشنہ کاموں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی مگر تُو نے کسی کو شرابِ وصل کا ایک جُرعہ عطا نہ فرمایا۔ ہزاروں سسّیاں بیابانوں کی خاک چھانتے چھانتے خاک میں مل گئیں۔ مگر تیرے ناقے کا نشان بھی کسی کو نظر نہ آیا"۔

"کسی نے قرآن کی تلاوت کی۔ کسی نے کتابِ دل کی ورق گردانی کی۔ کسی نے اپنی آنکھوں کے سمندر خالی کر ڈالے۔ کسی نے زُلفوں کی شبِ تار میں رُخساروں کی نورانی شمعیں لے کر تجھے ڈھونڈھا"۔

"تیرے غم میں رونے والوں کی آنکھیں آنسو بن بن کر بہہ گئیں۔ مگر تیرے دل پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اور تو نے کبھی کسی سے ہنس کر بات نہ کی۔ وہ گریہ بھی کتنا بے لطف اور حسرت ناک گریہ ہے۔ جس میں کوئی آنسو پونچھنے والا نہ ہو"۔

خدا کی ذات اپنی غیر معمولی لطافت کی وجہ سے حواسِ خمسہ کی رسائی سے یکسر بعید ہے۔ اس حقیقت کو دنیا کے تمام مذاہب نے تسلیم کیا ہے۔ یہی وہ پُراسرار بُعد ہے۔ جسے خدا کی بے نیازی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خدا کے تجسّس میں وقف رہنے والے اس بُعد کی بنا پر برسوں کی جد و جہد کے باوجود حصولِ مدّعا میں سراسر ناکام رہتے ہیں۔ اور اُن کے شوق و اضطراب کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا۔ جب تک اُنھیں کسی عارفِ کامل کی رہنمائی نصیب نہیں ہوتی۔ اس درمیانی وقت میں اُن کے دلوں پر جو جو عالم گزرتے ہیں۔ اشعارِ مندرجۂ بالا میں اُنھیں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر پہلے اُن عاشقانِ الٰہی کے ذوقِ تجسّس اور صبر و استقلال کا اندازہ کیجئے۔ جنھوں نے اپنی تمام زندگی طاعت و ریاضت کی ایسی دشوار ترین منزلیں طے کرنے میں صرف کر دی ہو۔ اور پھر اُن کی اس دلی کیفیت کا تصوّر باندھئے۔ جس کا رُوح فرسا تصوّر اُنھیں اپنی یاس و ناکامی کا یقین ہو جانے پر ہوا ہو۔ اس مقام پر حضرتِ مومن دہلوی کا ایک لاجواب مطلع جس میں یہ ساری تفصیل چھپی ہوئی ہے۔ بے اختیار یاد آتا ہے۔ ؎

ہاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

سسّی اور پنّوں کا غیر فانی عشق سرزمینِ پنجاب کا ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے۔ اشعارِ زیرِ بحث میں سسّیوں اور ناقے کا تلمیحی استعارہ اس واقعے کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اہلِ نظر اس پُر لطف اور پُر جدّت استعارے

کی داد ضرور دیں گے ۔ شدّتِ گریہ کے بیان میں اظہارِ خیال کا یہ طریقہ بھی کچھ کم قابلِ تحسین نہیں کہ رونے والوں نے اپنی آنکھوں کے سمندر خالی کر ڈالے ۔ یا ان کی آنکھیں آنسو بن بن کر بہہ گئیں ۔ اور پھر ایسے گریہ میں بھی اگر کوئی اشک شوئی کرنے والا نصیب نہ ہو ۔ تو اس کی بے لطفی اور حسرت ناکی میں کیا شک ہو سکتا ہے ۔ علاوہ ازیں زلفوں کی شبِ تار میں رخسار کی نورانی شمعیں لے کر محوِ تلاش ہونے کا مضمون بھی نہایت رنگین و دل آویز اور وجدانی کیفیت کا حامل ہے ۔

"ہم تیری جُدائی کی آگ میں جل کر خاک ہو گئے ۔ مگر اتنی قربت کے باوجود تجھے اس آگ کی آنچ تک محسوس نہ ہوئی "۔

خُدا کی ذات کو رگِ جاں سے بھی قریب تر مانا گیا ہے ۔ مگر اس قربت کا راز فاش نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو اس کی موجودگی کا وہم و گمان تک نہیں ہو سکتا ۔ رنجِ فرقت کی یہ انوکھی صورت واقعی عذابِ جہنّم سے کم نہیں ۔ کہ مطلوب رگِ جاں سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی نظر نہ آ سکے ۔ اور اسے اس آگ کی آنچ تک محسوس نہ ہو سکے ۔ جو اس کے طالبوں کو جلا کر خاک کر ڈالے ۔

"کسی نے کاسۂ سر کا جام بنا کر تجھے پیش کیا ۔ مگر تو نے اُسے اپنے ہونٹوں سے نہ لگایا ۔ کسی نے اپنے دل کا رنگین پلنگ بچھایا ۔ مگر تیری بے پروائی نے اُسے قبول نہ فرمایا "۔

"تجھے سجدے کرتے کرتے جبینوں پر داغ پڑ گئے ۔ مگر پھر بھی تیری رحمتیں نازل نہ ہوئیں ۔ تیری رنجشوں نے ہمیں تباہ کر دیا ۔ تیری بے نیازی نے ہمیں مار ڈالا ۔ ہماری جان لے کر بھی تو نے اپنے رُخِ زیبا سے پردا نہ اٹھایا ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔ کہ تو اس سے بھی زیادہ اور کون سی رونمائی چاہتا ہے "۔

پیشِ نظر اقتباس کے ابتدائی حصّے کو اگرچہ شاعرانہ مبالغہ آرائی پر محمول کیا جا سکتا ہے ۔ مگر بہ نظرِ غائر دیکھنے سے معلوم ہو گا ۔ کہ اسی مبالغہ آرائی کے پردے میں شاعر نے حقیقت نگاری اور عکاسیِ جذبات کا وہ کرشمہ دکھایا ہے کہ طبیعت داد دینے کو بے قرار ہو اٹھتی ہے ۔ شروع کے تینوں ٹکڑوں سے جس بے پایاں خلوص و ارادت اور جس بے پناہ عجز و شکستگی کا اظہار ہو رہا ہے ۔ وہ محتاجِ تشریح نہیں ۔ رونمائی کے سلسلے میں انواع و اقسام کے اشعار آپ نے پڑھے ہوں گے ۔ مگر یہ اچھوتا مضمون کہیں بھی نظر نہ آیا ہو گا ۔ کہ ہماری جان لے کر بھی تو نے اپنے رُخِ زیبا سے پردا نہ اُٹھایا ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تو اس سے بھی زیادہ اور کون سی رُونمائی چاہتا ہے"۔ خط کشیدہ الفاظ نے اس مضمون میں ایک عجیب نکتہ پیدا کر دیا ہے ۔ اور وہ نکتہ یہ ہے کہ جان دے دینے کے بعد پھر کوئی ایسی چیز باقی رہتی ہی نہیں ۔ جسے رونمائی کے طور پر پیش کیا جائے ۔

"اگر تو اپنے چہرے سے زُلفیں ہٹا دے تو سارا عالم حیرت زدہ ہو کر تیری طرف دیکھتا رہ جائے ۔ پجاری کے ہاتھوں میں ناقوس پکڑا ہوا رہ جائے ۔ مؤذن کے گلے میں اذان رُکی ہوئی رہ جائے ۔ برہمن کا قشقہ کھلا ہوا رہ جائے ۔ صوفی کا جامِ وحدت بھرا ہوا رہ جائے ۔ فلسفی کے ہاتھ سے قلم گر جائے ۔ منکر ٹکٹکی باندھ کر تیری صورت دیکھنے لگے "۔

"اگر تو ایک بار صرف ایک بار ہمہ تن عیاں ہو کر اپنا دیدار دکھا دے ۔ تو ہمارے ہر روز کے اختلافات معدوم ہو جائیں ۔ ہمارے دل یکساں طور پر تیری محبّت سے معمور ہو جائیں ۔ اور دیر و حرم کا انتیاز ہمیشہ کے لئے اٹھ جائے "۔

یہ اس نظم کے آخری اشعار ہیں ۔ ان اشعار میں خدا کے ناگہانی ظہور (انکشاف) سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو جس محاکاتی انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ اُسے دیکھتے ہوئے شاعر کی قادر الکلامی کا ایک نمایاں ثبوت ملتا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی کتنی پُر صداقت ہے کہ خدا کے متعلق انسان کی ناواقفیت اور لاعلمی ہی جملہ مذہبی اختلافات کی بنیادی وجہ ہے ۔

مضمون کی طوالت کا خوف مجھے باقی نظموں کا تبصرہ سپردِ قلم کرنے سے روکتا ہے ۔ لہٰذا یہ کام ناظرینِ کرام کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتے ہوئے چند خاص خاص نظموں کا ترجمہ ہی درج کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں ۔

انار کلی

"تو انار کی ایک ایسی پاکیزہ کلی تھی ۔ کہ تجھ سے محبّت کرنے کا حق بھومرو[1] کے سوا اور کسی کو حاصل نہ تھا ۔ تو نے بلا وجہ ان معصوموں کا یہ حق چھین کر بے مروّت انسان کو دے دیا ۔ تیرے دل کی پاک مسجد میں مرد جیسے شیطان کا کیا کام تھا ۔ تجھے تو جنگلوں ہی میں رہنا مناسب تھا ۔ تیری طبیعت شاہی

---

[1] سکھوں کے گوردوارے کا منتظم اور محافظ

محلات پر کیوں مائل ہوئی - تو نے عرش مقام ہو کر ایک مرد کی خاکِ پا بننا کیوں گوارا کیا
سلیم ایک تو مرد تھا - دوسرے بادشاہ اور تیسرے اکبر کا بیٹا - ایسے مغرور و سرکش آدمی کو تیری زلف کی زنجیر کیوں کر جکڑ سکتی تھی - مردوں کی بے وفائی کوئی نئی بات نہیں ہے - یہ ہمیشہ اسی طرح دھوکا دیتے آئے ہیں - جب تک حُسن کا چراغ جلتا رہتا ہے - یہ پروانوں کی طرح اسے سجدے کرتے رہتے ہیں - مگر جونہی وہ گُل ہوتا ہے - یہ کسی اور چراغ کی تلاش میں مصروف ہو جاتے ہیں" -

"جب دریاؤں میں طغیانی آتی ہے - اور وہ چھلکنے لگتے ہیں - تو اُس وقت بڑے بڑے نامی تیراک بھی غرقاب ہو جاتے ہیں - حیرت ہے کہ تیری محبت کے وسیع اور عمیق چناب (پنجاب کا ایک دریا) میں سلیم کا دل کیوں کر نہ ڈوب سکا" -

"ظالم دنیا نے محبت کے دل فگاروں کو دیوار میں چنواتے وقت اینٹوں اور پتھروں کو ایسا ملا ملا کر لگایا کہ تڑپنے کے لئے بھی کوئی جگہ نہ چھوڑی" -

اگر تو نے اپنے گلے میں پھولوں کا ہار پہنا - تو نزاکت کی وجہ سے تیری کمر بل کھا گئی - اگر تو نے اپنے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائی - تو اس کے بوجھ سے تیرے لئے حرکت کرنا دشوار ہو گیا - موتیوں کی مالا کا بوجھ اُٹھانا تو ایک طرف رہا - تجھ سے کسی کی بات بھی نہ اُٹھ سکتی تھی - خدا جانے تو نے سنگ و خشت کا یہ بارِ گراں کیوں کر برداشت کر لیا" -

"حج کرنے والوں کو مکّہ اور مدینہ کی زیارت مبارک ہو - اور شاعر کو تیرے مزار کی زیارت مبارک ہو" -

"تیرے دل کو تو بڑے بڑے اولیا بھی نہ پرکھ سکے - تیری قدر و قیمت تو بڑے بڑے اوتار اور پیغمبر بھی نہ جان سکے - پھر اگر جہاں گیر تیری محبت کی گہرائی سے بے خبر رہا تو اس بے چارے کا کیا قصور" ؟

"اچانک انار کلی کی قبر میں سے مجھے یہ آواز آئی - کہ اے شاعر! خدا کے لئے میری آنکھوں کے سامنے کھڑا ہو کر میرے سلیم کی مذمت نہ کر

ماں

"ماں جیسا گھنی چھاؤں والا درخت مجھے کہیں نظر نہیں آتا - خدا نے جنّت بنانے کے لئے شاید اسی درخت کی چھاؤں مستعار لی تھی - دنیا میں اور جتنے بھی درخت ہیں - وہ صرف اسی وقت خشک ہوتے ہیں - جب ان کی جڑیں سُوکھ جاتی ہیں - مگر اس درخت میں عجیب بات دیکھی گئی ہے کہ جب اس کے پھول (یعنی بچّے) مرجھانے لگتے ہیں - تو ان کے ساتھ اس کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے" -

بچّہ

"جب زن و شوہر کے درمیان کوئی رنجش پیدا ہو جاتی ہے - تو بچّہ ثالث بن کر اُن میں صُلح کرا دیتا ہے - جب وہ دونوں کثرتِ کار کی وجہ سے افسردہ خاطر ہو جاتے ہیں - تو اس کا ایک بوسہ ان کے لئے شگفتگی اور تازگی کا پیام لاتا ہے - بچّے جیسا کوئی میوہ دیکھنے میں نہیں آیا - کہ یہ جتنا زیادہ خام ہوتا ہے - اتنا ہی زیادہ شیریں ہوتا ہے -

خموشی

"بلبل نے پھول سے پوچھا - یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی - کہ تو کیوں کر گلے کا ہار بنا - اور میں کیوں کر پنجرے میں قید ہوئی -

پھول نے جواب دیا - تیری صرف ایک زبان ہے - اور تو اُسے بھی قابو میں نہ رکھ سکی - اور میں نے سو زبانیں رکھتے ہوئے بھی اپنے دل کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا" -

اندھی لڑکی

"یا رب! تو نے یہ کیا ستم ڈھایا - کہ اتنا خوب صورت مندر بنا کر اس میں ایک چراغ تک روشن نہیں کیا" -

تو نے حُسن کا اتنا خوش نما باغ لگایا - اور اسے چمپا اور گلاب - لالہ اور شبّو وغیرہ پھولوں سے مزیّن کیا - مگر وہ باغ بھی کس کام کا - جس میں نرگس کے پھول نہ ہوں" -

اندھی لڑکی اور موہن - تیری بنائی ہوئی یہ دونوں تصویریں بڑی دل کش اور جاذب نظر ہیں - ان میں سے ایک تو حسن کی تصویر ہے - اور دوسری شاعری کی تصویر - بہت مدّت پہلے تو نے ان دونوں کو بنانا شروع کیا تھا - مگر یہ آج تک مکمّل نہیں ہو سکیں - یا رب! تو میری ان دونوں آنکھوں کو نکال کر اس اندھی لڑکی کو دے دے - تاکہ ان تصویروں میں سے ایک تصویر تو پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے -

خودی

"چھوٹے چھوٹے مہین تار سے سورج کے پگھلے ہوئے سونے میں

تخیل ہو کہ اپنا نام و نشان کیوں مٹا دیتے ہیں ۔
آسمان سے اتری ہوئی گوہر نما شبنم ہوا کے دامن میں کیوں روپوش ہو جاتی ہے ۔ موجیں مارتی ہوئی آب جو سمندر سے واصل ہو کر کیوں نیست و نابود ہو جاتی ہے ۔
مجھے تو اگر خدا بھی کہے کہ آ ۔ اور میری لامحدود وسعتوں میں سما جا ۔ تو میں صاف انکار کر دوں ۔ اور کبھی اپنی جگہ سے نہ ہلوں ۔
خدا کی ذات میں فنا ہو کر پھر میں بزم کائنات کے رنگا رنگ جلوؤں سے کیوں کر لطف اندوز ہو سکتا ہوں ۔
وہ انسان بھی کیا ہے ۔ جس میں خودی کا جوہر نہ ہو ۔ اور جو دنیا میں اپنی جداگانہ شخصیت کو برقرار نہ رکھ سکتا ہو ۔"

بھارت میں کلیدی صنعتوں کی شاندار ترقی

ہندوستان کیبل فیکٹری ۔ یہ فیکٹری وادیٔ دامودر کے صنعتی علاقے میں چترنجن کے نزدیک قائم کی گئی ہے جس کی افتتاحی رسم اس سال کے دوران میں ادا کی گئی ۔ اس فیکٹری میں ہر سال ۵۰۰ میل لمبے ٹیلیفون کے تار تیار کئے جائیں گے ۔ اور اس لحاظ سے ڈاک اور تار کا شعبہ خود مکتفی ہو جائے گا ۔ اس فیکٹری پر ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ صرف ہو گا ۔ فیکٹری کے قیام کے بعد ماہ نومبر تک ۳۰ میل لمبے دھاتی تار تیار کئے گئے ۔

ہندوستان شپ یارڈ ۔ ہندوستان شپ یارڈ میں "جل" قسم کے آٹھ ہزار ٹن وزنی دو بحری جہاز اور سات ہزار ٹن وزنی ایک ڈیزل جہاز تیار کیا گیا ۔ ان کے علاوہ ایک اور جہاز عنقریب سمندر میں اتارا جائے گا ۔ ترقیاتی پروگرام کی تکمیل سرگرمی سے ہو رہی ہے ۔ پہلے پانچ سالہ پلان کی مدت میں اس پر تقریباً دو کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا ۔ پیشتر ازیں اس ادارے کو ایک ۳۵ ٹن کا سفری کرین فراہم کیا گیا اور اب ۱۲۵ ٹن کا ایک اور کرین نصب کیا گیا ہے ۔ اس ادارے کے پاس کام اتنا ہے کہ دو سال تک وہ اپنا کام پوری صلاحیت کے مطابق چالو رکھ سکے گا ۔

وساکھاپٹم میں جہازوں کو ٹھہرانے کی غرض سے خشک گودی تعمیر کی جا رہی ہے اور اس مقصد کے لئے حکومت کی طرف سے کم شرح سود پر ایک کروڑ روپے کا قرضہ دیا جائے گا ۔ خشک گودی کی تکمیل کے بعد وہاں جہازوں کی مرمت کا کام بھی شروع ہو جائے گا ۔

مشینی اوزار سازی کی فیکٹری واقع جلاہالی ۔ یہ فیکٹری بنگلور کے نزدیک قائم کی گئی ہے اور اس میں مشینی اوزاروں کی تیاری کا کام شروع ہو گیا ہے ۔ خرادوں کے پرزے تیار کئے جا رہے ہیں اور فروری ۱۹۵۵ء تک انھیں جوڑ کر خراد تیار کئے جا سکیں گے ۔ اس کے علاوہ مشینوں کے دوسری قسم کے اوزار عنقریب تیار ہونے لگیں گے ۔

صنعتِ فولاد ۔ رڑکلا (اڑیسہ) میں ہندوستان سٹیل لمیٹڈ کے تحت فولاد تیار کرنے کی فیکٹری زیر تعمیر ہے اور وہ ابتدائی مرحلوں سے گزر چکی ہے اس فیکٹری کے نزدیک خام لوہے کی کانوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور زمین کے متعلق سروے جاری ہے ۔ موسمیات کی ایک عارضی لیبارٹری بھی قائم کی جا رہی ہے ۔ نیز جرمن کمپائین کرپ ڈیماگ کے ماتحت مغربی جرمنی میں تربیت کی غرض سے ہندوستانی ٹیکنیکل ماہرین کا انتخاب عمل میں آ چکا ہے توقع ہے کہ اس سال کے آخر تک مشینیں نصب کرنے کے متعلق عملی کام شروع ہو جائے گا ۔ اس کے علاوہ ایک اور فیکٹری کے قیام کی تجویز زیر غور ہے چنانچہ اس سلسلے میں تفصیلات طے کرنے کی غرض سے روسی ماہرین کا ایک وفد ہندوستان پہنچ چکا ہے اور حالات کا جائزہ لے رہا ہے ۔

پنسلین اور ڈی ڈی ٹی ۔ نئے کارخانوں کے سلسلے میں صحت عامہ ایسے اہم مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا گیا اس ماہ کے دوران میں ڈی ڈی ٹی کی ایک فیکٹری دہلی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی اور توقع ہے کہ اسی سال ماہ مارچ میں ڈی ڈی ٹی تیار ہونے لگے گی ۔ بچوں کے بین الاقوامی ایمرجنسی فنڈ کی مالی و ٹیکنیکل امداد سے پمپری میں پنسلین سازی کی فیکٹری قائم کی جا رہی ہے ۔ جس میں پنسلین کی تیاری کا کام عنقریب شروع ہو جائے گا ۔

روشؔ صدیقی

افسانۂ خویش

مدہوش ہیں ہم لوگ نہ ہشیار ہیں ہم لوگ — حیرت زدۂ جلوہ گہِ یار ہیں ہم لوگ

ہنس بول لیا کوئی، تو ہیں بندۂ بے دام — آزاد ہیں ہم لوگ، گرفتار ہیں ہم لوگ

تیرا ہی تغافل ہو کہ بیدادِ زمانہ — صد شکر کہ اے دوست سزاوار ہیں ہم لوگ

صدیوں سے ہیں آشفتۂ گیسوئے نگاراں — اسرار شناسِ رسن و دار ہیں ہم لوگ

ہنگامہ گری محفلِ خوباں کی ہے ہم سے — شام و سحرِ کاکل و رخسار ہیں ہم لوگ

ہے جیب یہ جبیں وقت کہ ہم کوہِ گراں ہیں — سمجھا تھا کہ گرتی ہوئی دیوار ہیں ہم لوگ

اب تک وہی سودا ہے ہمیں جنسِ وفا کا — بازار میں اپنے ہی خریدار ہیں ہم لوگ

اُس انجمنِ ناز میں کیا کام ہمارا — تہمت زدۂ شوخیٔ گفتار ہیں ہم لوگ

اے شیخ و برہمن سے روشؔ! دل نہیں ملتا

کیا کیجیے، کافر ہیں نہ دیندار ہیں ہم لوگ

کشمیری لال ذاکر

چراغ کی لَو

پچھلے چار سالوں میں یہ جھگڑا کئی بار ہوا تھا جس روز مہندر ناتھ کی بیوی مری تھی اُس کے ٹھیک ایک ماہ بعد ہی یہ خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی۔ مہندر ناتھ کی ماں، اُس کا بھائی پُورن اور بہن جاگرتی ایک طرف تھے اور اُن کے سماج کی سب روایات اور رواج اور تجربے ہتھیار بند سینا کی طرح اُن کے ساتھ تھے۔ اور اُدھر مہندر ناتھ اکیلا۔ اکیلا ہی نہیں تہی دست، ہاتھ میں صرف ایک چراغ لئے۔ اپنے وشواس کا دیپک۔ دیوانہ کہیں کا، بھلا چراغ بھی کوئی ہتھیار ہے جس سے جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ اس سے تو ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کا اندھیرا بھی نہیں کٹ سکتا دشمنوں کی ڈھالیں کیا کٹیں گی۔ فوج کی رہنمائی مہندر ناتھ کی ماں کر رہی تھی۔ وہ ایک قدم اُٹھاتی تو پُورن اور جاگرتی ساری سینا کو کُوچ کا حکم دے دیتے اور جب سینا پورے طمطراق سے آگے بڑھتی تو اُس کی دُھول سارے میدان پر چھا جاتی اور مہندر ناتھ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چراغ کی روشنی ایک دم مدّھم ہو جاتی جیسے دُھول کے ذرّوں نے اُس کی روشنی کو چُوس کر اُسے بے جان کر دیا ہو۔ لیکن پھر تھوڑی دیر میں دُھول چھٹ جاتی۔ گرد کے چھوٹے چھوٹے بادل زمین کے سینے سے لگ جاتے۔ فضا صاف ہو جاتی اور مہندر ناتھ کا چراغ ایک بار پھر اپنی پوری تابانی سے چمک اُٹھتا۔

اس خانہ جنگی کو چار سال ہو گئے تھے۔ فوجیں ڈیرہ ڈالے پڑی تھیں۔ فوج کے رہنما ہر دم چوکس رہتے تھے۔ جانے کب مہندر ناتھ غافل ہو اور اُس پر دھاوا بول دیا جائے۔ لیکن وہ کم بخت غافل ہوتا ہی نہ تھا۔ رسنا مری تھی تو اُسے ایک بچّی دے گئی تھی۔ وہی بچّی اُس کی زندگی بن گئی تھی۔ اُس نے بچّی کا نام سمرتی رکھا تھا۔ جب وہ اُسے سمرتی کہہ کر پکارتا اور اُس کے پتلے پتلے گورے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی تو وہ اُس معصوم مسکراہٹ کی لہروں میں کھوئے ہوئے یادوں کے گہرے ساگروں میں اُتر جاتا اور رسنا کے ساتھ گذرے ہوئے دن سیپ میں پڑے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے۔ سیپیاں کھُل جاتیں اور اَن گنت موتی بکھر جاتے، وہ ان موتیوں کو سمیٹنے لگتا، اور جب اُس کی جھولی بھر جاتی تو ایک زوردار لہر آتی اور اُس کے تمام موتی اپنے ساتھ بہا لے جاتی، اور اُسے اُٹھا کر کنارے پر پٹک دیتی اور پھر وہ کنارے کی ریت سے اُٹھتا اور دیکھتا سمرتی اُس کی باہوں کا سہارا لئے اونگھ رہی ہے اور اُس کے ہونٹوں کے گلاب اپنی خوشبو میں منہ چھپائے سو گئے ہیں۔

رسنا سے جب اُس کی شادی ہوئی تھی تو وہ اُس کے متعلق کچھ بھی نہ جانتا تھا، اُس نے اُس کی تصویر تک بھی نہ دیکھی تھی۔ ماں نے بیاہ کی بات پکّی کر لی اور اُس نے انکار نہ کیا۔ لیکن جب شادی ہو گئی تو اُس نے جانا کہ ماں کا چناؤ غلط نہیں تھا۔ رسنا بہت اچھی لڑکی تھی۔ اُس نے آتے ہی یہ محسوس کر لیا کہ مہندر ناتھ کے جیون میں بے انتہا انتشار تھا۔ کہیں کوئی ترتیب یا سلیقہ نہ تھا۔ سب کچھ بکھرا ہوا، اور جب رسنا نے ایک آدھ چیز کو اُٹھا کر سلیقے سے رکھنا چاہا تو مہندر ناتھ بوکھلا اُٹھا، جیسے وہ بے ترتیبی اور انتشار اُس کی زندگی کا ایک حصّہ بن گیا تھا اور اُس میں اُسے کوئی بھی تبدیلی گوارا نہ تھی۔ رسنا نے اُس کی جھلاہٹ کو محسوس کر لیا۔ اُس نے جہاں چیزیں پڑی تھیں وہیں پڑی رہنے دیں۔ صرف دُور سے دیکھتی رہی اور اپنے ذہن میں اُن کی جگہ کا تعین کرتی رہی۔ اُس نے یہ جان لیا کہ مہندر ناتھ کی زندگی کو اگر بدلنا ہے تو وہ صرف اس طرح سے کہ اُسے پتہ نہ لگے کہ اس کے اِردگرد کچھ ہو رہا ہے۔ اُسے محسوس نہ ہونے دیا جائے کہ اُس کی بکھری ہوئی قوّتوں کو کوئی اکٹھا کر رہا ہے۔ رسنا نے ایسا ہی کیا۔ اُس نے اُسے اپنے رُوپ کی گھنی چھاؤں میں تھپک کر سُلا دیا، اور

خود ماحول کو سنوارنے میں لگ گئی۔ وہ سویا رہا اور رسنا جاگتی رہی۔ وہ اپنے ایک ہاتھ سے چھندر رناتھ کے بالوں کو سہلاتی رہی، اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے جیون کو نکھارتی رہی اور ایک صبح جب وہ ایک گہری اور پُرسکون نیند سے جاگا تو اُس کے من میں بے پناہ شانتی اور اُس کے ذہن میں بے حد طمانیت تھی۔ اور جب اُس نے بھرپور نظر اپنے ماحول پر ڈالی تو رسنا کا دل دھڑک اُٹھا۔ وہ اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور اُس کے چہرے کی کیفیت کا اندازہ کر رہی تھی۔ رسنا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھرنے لگے اور جسم کانپنے لگا۔

"تمہارا جسم کیوں کانپ رہا ہے رسنا؟" اُس نے پوچھا

"ٹھنڈ لگ رہی ہے؟" رسنا نے اپنے دل کی دھڑکن کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے جھوٹ بولا۔

"اور یہ پسینہ؟"

"یہ میری محنت کی شبنم ہے" رسنا نے اپنے پلّو سے ماتھا پونچھتے ہوئے کہا۔

اور چھندر رناتھ نے اپنے کندھے پر رکھے ہوئے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور مسکراتے ہوئے کہا

"یوں لگتا ہے جیسے جیون کا سارا انتشار ایک دم مٹ گیا ہے"

"کیسا لگ رہا ہے آپ کو؟"

"بڑا پیارا، بڑا سندر، بڑا خوبصورت" چھندر رناتھ نے یہ کہتے ہوئے رسنا کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کیا، اور پھر اُس کے گالوں پر اپنی انگلیاں پھیرنے لگا جیسے کوئی شخص آنکھیں بند کرکے کسی مجسّمے کے خدوخال پرکھ رہا ہو۔ اور رسنا کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جان توڑ محنت کے بعد وہ ایک دم تازہ ہو گئی تھی۔

رفتہ رفتہ چھندر رناتھ اس نئے جیون کا عادی ہو گیا۔ ایک بندھی ہوئی رفتار، ایک ٹھہرا ہوا بہاؤ، گرہستی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں جن میں خلوص اور پیار تھا جس میں ماں کی ممتا تھی۔ بھائی کا احساس تھا، بہن کی محبت تھی، اور رسنا کی لگن کی مٹھاس۔ سب کچھ بہت اچھا تھا جیون جس سے چھندر رناتھ کبھی مطمئن نہ تھا ایک دم پُرکشش بن گیا تھا، اور اُسے یوں لگنے لگا تھا جیسے جیون میں کہیں کوئی خامی نہ تھی۔ کہیں کوئی کمزور پہلو نہ تھا، کہیں کوئی کچا پن نہ تھا۔ جیون ایک دم مکمل شکتی شالی اور سندر تھا۔

اور پھر ایک شام رسنا اُن سب سے روٹھ کر یوں چلی گئی جیسے اس گھر سے اُسے کبھی کوئی لگاؤ ہی نہ تھا۔ جیسے اُس نے چھندر رناتھ کو کبھی پیار نہ کیا تھا۔ جیسے ماں، پُورن اور جاگرتی کو وہ کبھی جانتی ہی نہ تھی۔ دو سال کا طویل وقفہ سمٹ کر ایک نقطہ بن گیا۔ زندگی کی ندی صحرا میں آ کر یوں ایک دم سوکھ گئی تھی جیسے اس کا کبھی کہیں وجود ہی نہ تھا۔ برسات کی ایک شام کو جب چھاجوں پانی برس رہا تھا رسنا اُن سب کو چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ اور اپنے پیچھے سمرتی کو چھوڑ گئی۔

رسنا

برسات کی ایک شام

اور سمرتی!

چھندر رناتھ کی زندگی کا محور مسلسل بارشوں سے کمزور پڑ چکی چٹان کی طرح لڑھک گیا۔ ماں، پُورن اور جاگرتی نے تھوڑے ہی سمے میں گھر کی ٹوٹی ہوئی دیواریں دوبارہ بنا لیں، کواڑ مرمّت کرائے اور صحن کے گڑھے بھر ڈالے۔ ڈیوڑھی کے ساتھ لگی ہوئی چمبیلی کی بیل نے دوبارہ پھول دینے شروع کر دئے اور سب بھول گئے کہ کبھی رسنا ان پھولوں کو اپنے بالوں میں لگایا کرتی تھی۔ ایک چھندر رناتھ تھا جسے یہ کبھی نہ بھولتا تھا۔ جب بھی چمبیلی کی بیل میں کوئی پھول کھلتا اُسے فوراً رسنا کے لمبے لمبے کالے بال یاد آ جاتے اور اُس کا ہاتھ آپ سے آپ چمبیلی کی ڈالیوں تک پہونچ جاتا، اور پھر پھول کو لئے کچھ لمحوں تک وہ جانے کیا سوچتا رہتا، اور اسی لمحہ سمرتی کسی کمرے سے نکل کر آنگن میں آ جاتی، اور چھندر رناتھ کے چہرے پر آسودگی اُبھرنے لگتی، وہ سمرتی کو بازوؤں میں اُٹھا کر چوم لیتا اور پھر اُسے اندر لے جاتا اور اُس کے بالوں میں کنگھی کرتا، اُن میں سُرخ سُرخ ربن باندھتا اور پھر چمبیلی کا سفید پھول اُس کے بالوں میں لگا دیتا، اور پھر لے بازوؤں میں اُٹھائے سارے گھر میں گھومتا۔

"سمرتی اچھی لگتی ہے نا جاگرتی؟"

"ہاں بھیّا"

"اچھی لگتی ہے نا پُورن؟"

"ہاں"

"ہاں، اچھی لگتی ہے نا سمرتی"؟
"ہاں، پر تو شادی کیوں نہیں کر لیتا اب؟" ماں کہتی
"سمرتی کے بال اور خوبصورت ہو جائیں گے۔"
"چمیلی کا پھول اور زیادہ مہک دے گا۔"
"تمہارا جیون سکھی ہو جائے گا۔"

اور جاگرتی، پورن اور ماں تینوں اُس پر برس پڑتے۔ ایسے ہی سمے میں وہ اپنے آپ کو کمزور پانے لگتا تھا اور اُس کے سامنے کھڑی فوجیں پوری طاقت سے اُس پر حملہ کر دیتی تھیں۔ یہی وہ لمحہ ہوتا تھا جس سے وہ ڈرتا تھا اور ایسا لمحہ کبھی نہ کبھی آ ہی جاتا تھا۔

اس لمحے وہ سوچنے لگتا۔ جاگرتی کا اگلے چھ مہینوں میں بیاہ ہو جائے گا، اور وہ اپنے گھر چلی جائے گی۔ پُورن اپنا گھر بسا کر الگ ہو جائے گا۔ رہ جائیں گے وہ اور اُس کی ماں اور سمرتی۔ ماں بوڑھی ہو گئی ہے، اب بے چاری سے گھر نہیں سنبھالا جا سکتا۔ سمرتی کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ وہ کہاں تک کر سکتا ہے۔ ایک بالوں میں کنگھی کر دینے اور فراک بدل دینے سے تو تمام ذمہ داریاں ختم نہیں ہو جاتیں۔ ایک معصوم بچّے کو تو ماں کا بھرپور پیار اور وشواس چاہیئے۔ ایک جوان عورت کی محبت جس میں حرارت اور زندگی ہے۔ اُس کی ماں کے پاس محبت اور پیار کی کمی نہیں۔ لیکن اس پیار میں اب تھکن آ گئی ہے، اُس میں وہ حرارت نہیں، زندگی دینے والی وہ قوت نہیں، اور پھر اُس کے نظریے نصف صدی پیچھے کے نظریے ہیں، جو اگلی صدی میں جینے والی نسل کے کام نہ آ سکیں گے۔ سمرتی اگلی نسل کی نمائندہ ہے اور ماں گذری ہوئی صدی کی امانت دار۔ دونوں کا یہ بنیادی اختلاف نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن پھر بھی وہ اِن سب باتوں کو نظر انداز کئے ہی جا رہا تھا۔

جب کہیں کسی رشتے کی بات چلتی وہ ایک دم بھنّا اُٹھتا، اور گھنٹہ بھر کی چخ چخ اور گرما گرمی کے بعد معاملہ ختم ہو جاتا، اور پھر ایک دن جاگرتی کا بیاہ ہو گیا اور وہ چلی گئی اور جاتے سمے اُس نے سمرتی کو بے حد پیار کیا، اب وہ اُسے چھوڑ جو رہی تھی، اور پھر پورن تبدیل ہو کر کانپور چلا گیا اور جانے سے پہلے سمرتی کو دن بھر بازار کی سیر کراتا رہا اور اُس کے لئے کھلونے خریدتا رہا۔ جیسے اپنے کسی ضروری فرض کی آخری کڑیاں جوڑ رہا ہو۔

اور جب جاگرتی اور پورن چلے گئے تو گھر ایک دم سُونا اور ویران ہو گیا۔ اُسے پہلی بار اس شدت سے احساس ہوا کہ رسنا واقعی اُسے سدا کے لئے چھوڑ گئی تھی۔ اُس کی بچی بے ماں کے تھی اور خود وہ ایک ساتھی کے پیار اور خلوص سے محروم ہو گیا تھا۔

پورن اور جاگرتی کے جانے سے وہ فوجیں بھی کمزور پڑ گئیں جو اُس پر اکثر حملہ کر دیا کرتی تھیں۔ اب ماں نے بھی اُن کی رہنمائی کرنا چھوڑ دی تھی۔ اُس نے اب یہ سمجھ لیا تھا کہ مہندر ناتھ اُس کے کہنے سے بیاہ نہ کرے گا۔ یوں روز روز کی جھک جھک سے کیا لابھ۔ مہندر ناتھ کالج میں پروفیسر تھا۔ صبح سویرے کالج چلے جاتا اور شام کو واپس آتا۔ کالج کھلے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کام زیادہ تھا۔ جانے کی پابندی تو تھی لیکن واپس آنے کا کوئی وقت نہ تھا۔ وہ شام کو گھر لوٹتا تو سمرتی اُس کی راہ دیکھ رہی ہوتی۔ مہندر کو دیکھ کر اُس کے اُداس چہرے پر ایک دم رونق آ جاتی۔ مہندر ناتھ اُسے گود میں اُٹھا کر خوب پیار کرتا اور پھر چائے پی چکنے کے بعد اُسے باہر گھمانے لے جاتا۔ اُس سے جو کچھ بن پڑتا وہ کرتا۔ لیکن پھر بھی اُسے محسوس ہوتا کہ سمرتی کو کسی چیز کی ضرورت تھی، جو وہ اُسے نہیں دے سکتا تھا۔ جاگرتی کے ہوتے وہ اتنی کھوئی کھوئی سی نہ رہتی تھی۔ اب جانے اُسے کیا ہو گیا تھا تو کیا صرف جاگرتی کے جانے سے ایسا ہوا تھا۔ یا ایک جوان عورت کے پیار سے محروم ہو جانے کا نتیجہ تھا۔ کچھ لگتا تھا جیسے وہ سمجھ نہ پا رہا تھا۔

آج کالج کا پہلا کانووکیشن تھا اور دیش کے ایک بہت بڑے نیتا سندیں تقسیم کرنے آ رہے تھے۔ آج وہ دن بھر کالج میں مصروف رہا۔ شام کو تھوڑی دیر کے لئے گیا۔ وہ بھی اس خیال سے کہ سمرتی کو دیکھ آئے، بے چاری اُداس رہے گی۔ گھر گیا تو سمرتی نے بھی اُس کے ساتھ کالج چلنے کی ضد کی۔ موسم اچھا نہیں تھا اور بارش کے آثار تھے۔ وہ اُسے ساتھ لے جانا چاہتا تو نہ تھا، لیکن سمرتی نے جب رونا شروع کر دیا تو اُسے لے ہی جانا پڑا۔

کالج کے کھلے میدان میں جلسے کا انتظام تھا۔ شامیانے لگے تھے۔ اسٹیج تیار تھی اور مہمانوں کے لئے کُرسیاں لگی تھیں۔ اُس نے سمرتی کو پہلی قطاروں میں ایک کُرسی پر بٹھا دیا، اور پاس ہی بیٹھے ہوئے

اپنے ایک دوست سے اُس کا دھیان رکھنے کو کہہ دیا اور خود پرنسپل کے ساتھ پروگرام مرتب کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ بارش ہونے لگ گئی۔ اُس نے اسٹیج پر کھڑے کھڑے ہی دیکھا کہ مسٹر اور مسز کپور پنڈال میں داخل ہوئے تھے۔ مسٹر کپور یہاں کے ایک مجسٹریٹ تھے اور اُسے اچھی طرح جانتے تھے۔ کرسیاں تقریباً بھر چکی تھیں۔ مسز کپور نے سمرتی کو اُٹھا کر اپنی گود میں لے لیا اور خود وہاں بیٹھ گئی، اور اُس کے ساتھ والی کُرسی ایک صاحب نے مسٹر کپور کے لئے خالی کر دی۔ بارش ایک دم زور پکڑ گئی اور اس زور کی بارش میں ہی صاحب صدر جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ اب اسٹیج پر زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ پرنسپل نے اسٹیج کو خود ہی سنبھالا اور مہندر ناتھ کسی خالی کرسی کی تلاش میں قطار کے آخری سرے پر قنات کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ بارش کا زور اور بھی بڑھ گیا تھا اور شامیانوں میں سے پانی ٹپکنے لگا تھا۔ میدان میں پانی بھر گیا تھا، اور لوگوں کے پاؤں گیلے ہونے لگے تھے۔ مہندر ناتھ کے آس پاس بھی بوچھاڑ پڑ رہی تھی۔ وہ وہیں کھڑا مسز کپور کو دیکھ رہا تھا جس نے سمرتی کو اپنی گود میں بٹھا رکھا تھا۔

مسز کپور خاصی خوبصورت عورت تھی۔ اُس کے تین بچے تھے۔ لیکن جسم کی بناوٹ میں ذرہ بھر فرق نہ پڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ جسم کو استعمال کرنے سے زیادہ اُسے سنبھالنے کی قائل تھی۔ مسٹر اور مسز کپور کی کرسیوں کے اوپر اب تک پانی نہ ٹپکا تھا۔ ورنہ ان کے اِرد گرد بیٹھے لوگ خاصے پریشان ہو رہے تھے۔ مہندر ناتھ غور سے دیکھ رہا تھا مسز کپور کو۔ اُس نے دائیں بازو کے حلقے سے سمرتی کو سنبھالا ہوا تھا۔ اسی سمے شامیانے سے بوندیں ٹپکنے لگیں اور ساری بوندیں سمرتی کے سر پر گرنے لگیں۔ مہندر ناتھ کو خیال آیا کہ وہ آگے بڑھ کر سمرتی کو مسز کپور سے لے لے اور اُسے خود محفوظ کر لے۔ پھر جانے وہ کیوں رُک گیا۔ اسٹیج پر پروگرام شروع تھا۔ کالج کی ایک لڑکی ملہار گا رہی تھی اور آسمان سے خوب پانی برس رہا تھا۔ سمرتی نے ایک بار حیران نظروں سے شامیانے کی طرف دیکھا جہاں سے پانی گر رہا تھا اور پھر اُس کی آنکھیں مسز کپور کے چہرے کی طرف اُٹھیں جیسے پوچھ رہی ہوں کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ مسز کپور نے سمرتی کو اپنی دائیں ران سے سرکا کر بائیں ران پر بٹھا لیا۔ اب شامیانے سے ٹپکتا ہوا پانی سمرتی پر نہیں مسز کپور پر گر رہا تھا۔ مہندر ناتھ نے دیکھا اُس نے بائیں بازو سے سمرتی کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ بارش اسی تیزی سے ہو رہی تھی۔

پروگرام چل رہا تھا۔

بارش ہو رہی تھی۔

اور مسز کپور بنا یہ جانے کہ سمرتی کون تھی، اُسے بارش سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں خود بُری طرح بھیگ گئی تھی۔ سمرتی مسز کپور کے سینے سے لگے لگے ہی سو گئی تھی۔ اُسے مسز کپور کے بھیگے ہوئے کپڑوں اور اس کی اجنبیت کا قطعی خیال نہ تھا۔ وہ ماں سے محروم تھی۔ لیکن ممتا کی چاہ اُس کے معصوم سینے میں اُسی شدت سے تھی۔

مہندر ناتھ نے دیکھا مسٹر کپور اپنی بیوی سے کچھ کہہ رہے تھے۔ شاید پُوچھ رہے تھے کہ وہ لڑکی کون تھی جسے وہ اس طرح اپنی گود میں بٹھائے ہوئے تھی۔ معلوم ہوتا تھا مسز کپور نے اپنے خاوند کی بات کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ مسٹر کپور نے گردن گھما کر آس پاس کی کرسیوں پر بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا، یہ جتانے کے لئے کہ اُس لڑکی کے والدین میں سے کوئی ہو تو اُسے لے لے۔ مسز کپور نے شاید اسے بُرا سمجھا اور اپنے خاوند کو غصیلی نظروں سے دیکھ کر سمرتی کو تھپکنے لگی۔

نئے گریجویٹ لڑکے اور لڑکیوں کو سندیں تقسیم ہو چکیں تو مہندر ناتھ کا دوست جس کے ذمے وہ اپنی بچی کو لگا کر آیا تھا اُٹھ کر اُس کے پاس آیا۔ اب بارش بہت ہلکی ہو چکی تھی، پر شامیانوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

"اب تو اپنی بچّی کو سنبھالو، بے چاری مسز کپور کے کندھے بھی دُکھنے لگے ہوں گے" مہندر ناتھ کے دوست نے کہا، اور جب وہ کرسیوں کی اُس قطار کی طرف بڑھنے لگا تو پردھان نے اپنی تقریر شروع کر دی، وہ پھر رُک گیا۔

سمرتی مزے سے سو رہی تھی۔

تقریر ختم ہوئی تو وہ مسز کپور کے پاس گیا۔

"آپ کو بہت تکلیف ہوئی مسز کپور، شکریہ"

"تو یہ بچّی آپ کی ہے؟" مسز کپور نے پوچھا، اور مسٹر کپور بھی مسکرا دئے۔

"ہیلو، کیا حال ہیں مہندر جی؟"

"عنایت ہے!"

"اچھا تو یہی وہ بچی ہے جس کی خاطر آپ شادی نہیں کر رہے" مسز کپور نے پوچھا۔

"آخر کیوں؟"

"میرا وشواس ہے کہ کوئی بھی عورت کسی غیر کے بچے سے پیار نہیں کر سکتی۔

"کیوں نہیں۔ ہر نارمل عورت ہر بچے سے پیار کر سکتی ہے۔ پیار کرنا اُس کی فطرت ہے۔" مسز کپور نے کہا

"اب کر ڈالئے شادی مہندر صاحب!" مسٹر کپور مسکرائے۔

مہندر ناتھ نے سمرتی کو مسز کپور کے بازوؤں سے لیا تو اُس کی معصوم بھینچی ہوئی انگلیوں میں مسز کپور کی ساڑھی کے پلّو کا کچھ حصّہ پکڑا ہوا تھا۔ مہندر ناتھ نے چھڑانا چاہا تو مسز کپور نے ٹوک دیا۔

"ایسے نہیں" مسز کپور نے بڑی آہستہ سے دھیرے دھیرے اُن پتلی پتلی اُنگلیوں میں سے اپنے گیلے پلّو کو کھسکا لیا اور پھر دھیرے سے مسکراتی ہوئی مسٹر کپور کے ساتھ پنڈال سے باہر نکل گئی۔

مہندر ناتھ وہیں الگ شامیانہ کے ایک بانس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ لوگ پنڈال سے باہر نکل رہے تھے۔ بارش رُک گئی تھی۔ پردھان اسٹیج سے اُتر کر اپنی کار کی طرف چلا گیا تھا۔ مہندر ناتھ ابھی تک وہیں کھڑا تھا اور مسز کپور کی بات کے متعلق سوچ رہا تھا: "ہر نارمل عورت ہر بچے کو پیار کر سکتی ہے۔ پر کیا ہر عورت نارمل ہو سکتی ہے؟" اور کیا وہ اپنے طبقے کے غیر صحت مند ماحول میں کبھی کسی نارمل عورت کو ڈھونڈ سکے گا؟ سمرتی اس کے کندھے سے لگی سو رہی تھی، اور وہ غیر ارادی طور پر اُس کی پیٹھ سہلائے جا رہا تھا۔

اُس کا چہرہ یوں بُجھ گیا تھا جیسے جلتے ہوئے چراغ پر کسی نے پانی اُنڈیل دیا ہو۔

پدُورن سنگھ شہزؔ

غزل

حُرمتِ اہلِ خرابات کہاں تک پہنچی
چشمِ ساقی کی کرامات کہاں تک پہنچی

ایک چُلّو سے شروعات کہاں تک پہنچی
بخششِ پیرِ خرابات کہاں تک پہنچی

تختۂ دار کہیں، برقِ سرِ طور کہیں
شدّتِ شوقِ ملاقات کہاں تک پہنچی

دامنِ صبح قیامت سے بندھا ہے دامن
کیا کہوں ہجر کی یہ رات کہاں تک پہنچی

حالِ آغازِ مراسم کو نہاں ہے اب تک
خبرِ ترکِ ملاقات کہاں تک پہنچی

رازِ سربستہ تھی جب تک تھی تمنّا دل میں
آ گئی لب پہ تو یہ بات کہاں تک پہنچی

عرش بھی عالمِ حیرت نظر آیا ہم کو
تیری دُنیائے طلسمات کہاں تک پہنچی

کٹ گئی اہلِ طرب کی شبِ عشرت پل میں
غم کے ماروں کی بسر رات کہاں تک پہنچی

غلام احمد فرقت

اور جب ہم بی اے پاس ہوئے

آپ چاہے مانیں یا نہ مانیں، اور اس حقیقت کو تسلیم کریں یا نہ کریں مگر موجودہ دورِ جمہوریت کا یہ ایک اٹل اور متفقہ فیصلہ ہے کہ علم و ادب کے تمام مدارج طے کر لینے کے بعد بھی سب سے بڑا جاہل وہ ہے جو گریجویٹ نہیں، اور اپنی جملہ جہالتوں کے باوجود سب سے بڑا عالمِ وقت وہ ہے جسے کسی یونیورسٹی سے بی۔ اے کی سند حاصل ہے۔

بات یہ ہے کہ اب سے چالیس پچاس برس قبل بی۔ اے کی ڈگری ایک ایسا کارآمد تعویذ اور ایک ایسی جادو کی پڑیا ثابت ہو چکی ہے کہ آپ نے اِدھر اُس کو استعمال کیا اُدھر کھل جا سم سم کی آواز کے ساتھ ملازمت کے دروازے کھل گئے اور آپ نے مٹھیاں بھر بھر کر اپنے دامنِ افلاس کو رشوتوں اور مقررہ تنخواہوں سے پُر کرنا شروع کر دیا بی۔ اے کی ڈگری معیارِ علم، معیارِ قابلیت اور معیارِ ذہانت تصور کی جاتی تھی۔ یہی ڈگری گھر والوں اور بزرگوں سے ہر معاملے میں مشورہ طلب کرواتی تھی اور اِسی پر سوسائٹی میں عزت اور ذلت کا دارومدار تھا۔ والدین نے صاحبزادے کے ہاتھ میں بی۔ اے کی ڈگری دیکھی اور سمجھ گئے کہ صاحبزادے اپنی جملہ جہالتوں کے باوجود قابل ہو گئے۔ اس کے بعد اگر خاندان میں کوئی کٹھن سے کٹھن مسئلہ پیش ہوا تو سب نے آنکھ بند کر کے مشورہ دیا کہ شفاءُ الملک حکیم بی۔ اے پاس صاحب سے رجوع کیجئے۔ اِس معاملے میں صحیح مشورہ وہی دے سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ بی۔ اے پاس ہیں۔ چنانچہ اُن کو بُلا کر سب سے پہلے اُن کی بی۔ اے پاس رائے دریافت کی جاتی تھی، وہ باوجود گھریلو اور شادی بیاہ کے معاملے میں ناتجربہ کار اور ناواقف ہونے کے معاملے کو آنکھیں بند کر کے اس طرح سننے کہ گویا سمجھ بھی رہے ہیں۔ پھر وہ ایک مرتبہ مفکرانہ انداز میں سر کھجاتے اور شادی کے معاملے کو بجائے عقل سے بتانے کے علمِ ریاضی سے حل کر کے کہ اگر لڑکی فلاں فلاں خاندان اور فلاں فلاں امتحان پاس ہے اور اِن اِن صلاحیتوں کی حامل ہے تو اُس کو فلاں فلاں لڑکے کے گلے منڈھا جائے تو اِس سے اُس کی آئندہ زندگی خوش حالی اور فارغ البالی سے بسر ہوگی، اور اُس سے ایک ایسا مرکب بن جائے گا جو ہر کانٹے کا متحمل ہوگا۔ چنانچہ ان کی اِس رائے کو ایک فلسفی، ایک مفکر اور ایک نجومی کی رائے سمجھ کر قبول کر لیا جاتا، اور ہر شخص واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں بلند کرتا۔ رفتارِ زمانہ نے اِس چیز کو ایک رسم کی شکل دے دی، اور اب اِس دورِ جہالت میں بھی وہ جُوں کی تُوں سینہ بسینہ چلی آ رہی ہے اور آج کل بھی بی۔ اے پاس صاحبزادے کی دستار بندی اُسی پُرانی ڈگر پر ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بی۔ اے پاس لڑکیاں اور لڑکے اپنے آپ کو افلاطونِ وقت اور سقراطِ دوراں سمجھتے ہیں اور بی۔ اے پاس کرنے کے بعد اُن کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اب سے پندرہ سال قبل جب ہم نے بی۔ اے پاس کیا تو اُس وقت بی۔ اے کی ڈگری ایک بھاری بھرکم چیز سمجھی جاتی تھی۔ بی۔ اے پاس کی شہرت کسی طرح اُس زمانے میں ملیح آباد کے آموں کی شہرت سے کم نہ تھی۔ اِسی لئے اُس وقت سے پہلے کے بعض گریجویٹ اب تک اپنے نام کے آگے بی۔ اے لکھنا فخر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب ہمارے بی۔ اے کا نتیجہ شائع ہوا اور ہمارا نام اخبارات میں آیا تو دل چاہا کہ اس اخبار کا ایک بش شرٹ بنوا لیں اور درزی کو ہدایت کر دیں کہ دیکھ اخبار میں جس جگہ ہمارا نام چھپا ہے وہ ہمارے سینے کے بیچوں بیچ آئے تاکہ چلتے پھرتے لوگوں کو اندازہ ہو کہ یہ انسان کم اور بی۔ اے زیادہ ہے۔ گھر میں ہفتوں جب کوئی ہمارا اکہرا نام لے کر ہم کو پکارتا اور بی۔ اے کا لفظ چھوڑ دیتا تو ہم اُس شخص کی آبرو کے درپے ہو جاتے۔ دل چاہتا

کہ کس طرح ہم اُس کا منہ کھسوٹ لیں۔ اُس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں، اُس کی زبان کھینچ لیں، اور اُس کو یقین دلادیں کہ اِس زمین و آسمان کے نیچے اور اِس چمکتے اور جگمگاتے سورج کی روشنی میں جس کی چمک سے چمگادروں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، اُس اخبار کو پڑھے جس میں ہمارا بی۔ اے کا نتیجہ شائع ہوا ہے۔ اور آئندہ سے بغیر بی۔ اے کے ہم کو پکارنا ایک بہت بڑا اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور سماجی جرم ہے اور آخراب کون سی چیز مانع ہے جو وہ ہم کو یہ کہہ کر مخاطب نہیں کرتا کہ جناب بی۔ اے صاحب سلام عرض کرتا ہوں۔ مجرا قبول ہو تسلیمات بجا لاتا ہوں۔

غرض امتحان کا نتیجہ کیا شائع ہوا، مراد آباد میں مردہ زندہ ہوگیا، ہم نے سب سے پہلے بازار جا کر ایک نہایت نازک اندام قسم کی چھڑی خریدی، اور روزانہ شام کو چھڑی لے کر ایک خاص مفکرانہ اور بی۔ اے پاس انداز میں چھڑی گھماتے بھرے مجمعوں میں چیرتے پھاڑتے ایک خاص شانِ استغنا کے ساتھ نکلنے لگے۔ اِس اُمید پر کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ دوست یا ملاقاتی ہم کو بی۔ اے کہہ کر پکارے، اور ہم بڑے رعب سے اُس کی آواز پر لبیک کہہ کر دنیا پر واضح کردیں کہ اگر کسی بی۔ اے کو اس طرح کھُلی حالت میں دیکھنا ہو تو دیکھ لو۔ ورنہ اِس زیارت کو ترس جاؤ گے۔ بی۔ اے پاس آواز کی بھنک اور چمک دمک سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤ گے۔

برسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب ہم سا کوئی بی۔ اے اس ارض پر ہوئے ہے

شروع شروع میں دل چاہا کہ اگر ہمارے بی۔ اے پاس کے پوسٹر یا ہینڈ بل شہر کے ہر در و دیوار پر چسپاں ہو جاتے تو اچھا تھا، اور اگر یہ نہیں تو اخبارات اور رسائل میں ہمارا فوٹو ہی شائع ہو جاتا کہ آپ سے ملئے جنھوں نے امسال بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ آپ بی۔ اے ہیں اور بہت ہی بی۔ اے ہیں۔ غرض دو ڈھائی مہینے ہم پر یہی کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد مختلف جگہوں کے لئے ہم نے درخواستیں دینے پر غور کرنا شروع کیا۔ تنہائی میں کاغذ پر اپنے نام کے ساتھ بی۔ اے لکھ کر اور کاغذ کو نوٹ کی طرح گھما کر پورب پچھم اور اتر دکھن کرکے دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ جب ہم کو یہ چیز اتنی بھلی لگتی ہے تو نہ جانے دوسروں کا اِس کو پڑھ کر کیا حال ہوتا ہوگا۔

خاص پائے تخت لندن سے نکلنے والے انگریزی اخبارات میں وانٹس کے کالموں کو پڑھ کر بڑی بڑی جگہوں کو اپنی بی۔ اے کی ڈگری پر منطبق کرکے دیکھتے رہے کہ کس پر ہماری بی۔ اے کی ڈگری پوری اُترتی ہے۔ مگر اس مقابلے میں بیشتر جگہیں ہم کو سبک اور ہلکی محسوس ہوئیں۔ کوئی واحد جگہ ہم کو اپنی ڈگری کی متحمل نہیں دکھائی پڑی۔ اِس کے بعد کسی اردو اخبار میں ایڈیٹر یا جوائنٹ ایڈیٹر ہونے کے خیال نے ہمارے دل کو گدگدانا شروع کیا۔ اخبار کا خیال اِس وجہ سے آیا کہ اس میں ہمارے نام کے ساتھ بی۔ اے شائع ہوتا رہے گا، اور کبھی ہم اور کبھی ہماری بی۔ اے کی ڈگری یکے بعد دیگرے ضربیں لگاتی ہوئی پبلک کے دل و دماغ پر مسلط ہوتی رہے گی، اور دنیا ہمارے بارے میں یہ رائے قایم کرنے پر مجبور ہوگی کہ یہ آدمی کم اور بی۔ اے زیادہ ہے۔ مگر تین چار سال اسی اُدھیڑ بُن میں گذر گئے، اور ہم بی۔ اے کی ڈگری اپنے کھرّے پلنگ پر لئے پڑے رہے۔ اب ہم نے سوچا کہ چلو اِس بی۔ اے کی ایٹمک انرجی کو کسی اُردو اخبار پر جا کر آزمایا جائے۔

سب سے پہلے ہم نے اپنا وزیٹنگ کارڈ چھپوایا، اور پریس کے کمپوزیٹر کو ہدایت کردی کہ دیکھو ہمارے نام سے زیادہ جلی حروف میں بی۔ اے کا لفظ رہے گا، ورنہ ہم ایک پیسے کے روادار نہ ہوں گے۔

ان وزیٹنگ کارڈوں کا ایک پورا پیکیٹ جیب میں ڈال کر ہم ایک اُردو روزنامے کے دفتر پہنچے، اور ایڈیٹر صاحب کو بہ آواز بلند گڈ مارننگ کہہ کر ہم نے اونچے انداز میں اپنا تعارفی کارڈ پیش کیا اور بغور دیکھتے رہے کہ ہماری بی۔ اے کی کرنٹ اُن کے کتنی زور سے لگتی ہے۔ مگر ہم کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُن پر کوئی اثر ہی نہ ہوا۔ دل نے کہا کہ یا تو یہ لکڑی پر بیٹھنے کا اثر ہے یا وہ ہمارے کارڈ میں بی۔ اے کا لفظ پڑھنے سے قاصر رہے۔ انھوں نے قدرے معذرتی انداز میں ہم سے یہ ضرور کہا کہ تشریف رکھئے، یہ فقرہ ختم کرلوں تو آپ سے بات کردوں۔ اس کا مفہوم ہم یہ سمجھے کہ یہ تشریف رکھنے کا لفظ اُنھوں نے ہم سے مرعوب ہو کر کہا ہے، اور نصف حصّہ کارڈ یعنی صرف ہمارے نام ہی سے جب یہ شخص اتنا زیادہ مرعوب ہے تو "مع بی۔ اے کے" اگر وہ پورا کارڈ

پڑھ لیتے تو نہ جانے اُن پر کیا اثر ہوتا۔ غالبًا سہما سہا کر اُنھوں نے متحمل ہونے کی کوشش میں یہ سب کچھ کہا۔ انسان جب گرم گرم چائے پیتا ہے تو بھی بہت پھُوک پھُوک کر پیتا ہے۔ پھر ہماری صلاحیتیں کسی طرح آتشِ نمرُود سے کم نہیں۔ بہرصورت ہم نے اُن کے اُس فقرے کو اُن کے نخیف الجثہ ہونے پر محمول کیا اور بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے ہم سے ہمارا صحافتی تجربہ پوچھا جس میں ذرا ہم رعب کھا گئے۔ مگر ایسا رعب نہیں جس سے ہماری بی۔اے کی ڈگری پر خدانخواستہ آنچ آتی ہو۔ ہم اُن کے ہر سوال کے جواب میں اپنے بی۔اے پاس ہونے پر زور دیتے رہے۔ آخر میں اُنھوں نے ہم سے کہا کہ ہم کو ایک مترجم کی ضرورت ہے، آپ دو ایک روز کام کرکے دیکھئے، پھر معاوضے کے بارے میں آپ سے گفتگو ہو جائے گی۔ دل نے اندر سے کہا کہ دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ آدمی بی۔اے پاس ہو، ایڈیٹر صاحب پر رعب پڑا نا۔ غالبًا دفتر تنخواہ کا بیک وقت متحمل ہوتے اور اس کا یقین کرتے ڈرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کس اُردو اخبار میں دم ہے جو ایک بی۔اے پاس ہاتھی ایکا ایکی باندھے گا۔ یہ سوچ کر ہم نے دفتر کے اوقات دریافت کئے اور گھر واپس آئے۔

دوسرے روز نوک پلک سے درست، پان اور سگرٹ کی ڈبیا جیب میں ڈال کر ہم منٹ منٹ پر سگرٹیں سلگاتے اور کش پر کش لگاتے مقررہ وقت پر دفتر پہنچے۔ اس دفتر کا ادارۂ تحریر تین افراد پر مشتمل تھا۔ ایک ایڈیٹر صاحب خود، دوسرے ایک ریشائیل بزرگ جو شاہ صاحب کہلاتے تھے۔ یہ شاہ صاحب حضرت نوح کے ہم عمر محض مڈل تک انگریزی پڑھے تھے۔ تیسرے صاحب ادھیڑ عمر اور ہائی اسکول تھے۔ صرف ایڈیٹر صاحب جو عمر میں پچاس پچپن کے لگ بھگ ہوں گے۔ بی۔اے تھے۔ گویا ہمارا مدِمقابل اگر کوئی اُس دفتر میں تھا تو وہ ایڈیٹر صاحب تھے، اور وہ بھی کیا عمر سے ڈھلے اور اِدھر اُدھر سے نکلے۔ چونکہ ہم یونیورسٹی سے تازہ ولائت تھے اس لئے اردو زبان میں انگریزی بولتے تھے۔ ہر کاغذ انگریزی لب و لہجہ میں طلب کرتے۔ کاتب اور عملے کے دوسرے لوگ ہم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے اور ہم اپنی جگہ پر یہ سمجھتے کہ غالبًا ہم دوسرے بی۔اے ہیں جو آج اُن کو اِس دفتر میں اس طرح کھُلی حالت میں دکھائی پڑے ہیں۔ ورنہ عام طور پر بی۔اے برسوں گھر سے کب نکلتے ہیں۔ پہلے دن ایڈیٹر صاحب نے انگریزی اخبار میں دو تین غیر ملکی خبروں پر نشان بنا کر دیا اور کہا کہ آپ ان کا ترجمہ کیجئے۔ ہم نے قلم برداشتہ ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ مگر ہمارے ترجمے کو عام ترجموں پر یہ فضلیت حاصل تھی کہ ہمارے یہاں زیادہ وہ الفاظ انگریزی کے تھے جن کو ہم نے اُردو رسم الخط میں لکھ چھوڑا تھا۔ بقیہ اُردو کے الفاظ بھی وہ تھے جو عام طور پر اُردو اخبارات میں استعمال نہیں ہوتے۔ چونکہ اخبار میں ترجمہ کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا، اور زیادہ تر انگریزی ہی کی کتابیں زیر مطالعہ رہی تھیں، اس لئے ہم اُس ترجمے کو یہ سمجھے تھے کہ اب ہمارے ترجموں سے اُردو صحافت میں بی۔اے پاس ترقی پسند ترجموں کے ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ بہرصورت ہم نے بغیر جھجکے جھجکے کئے تینوں خبروں کے ترجمے ایڈیٹر صاحب کے حوالے کر دئے۔ ایڈیٹر صاحب ایڈیٹوریل لکھنے میں مصروف تھے۔ جب وہ اپنا کام ختم کر چکے تو اُنھوں نے ہمارے پہلے پرچے پر نگاہ کی۔ ہم آنکھیں بچا بچا کر اُن کی طرف دیکھتے جاتے تھے کہ دیکھیں ہماری ڈگری کا کس کس عنوان سے اُن پر رعب پڑ رہا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اُن کی آنکھیں جوں جوں ہمارے ترجمے کو پڑھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں وہ زیادہ سے زیادہ کھلتی اور پھیلتی جاتی تھیں، اور ساتھ ہی ساتھ اُن کے لبوں کی سنجیدگی مسکراہٹ سے ہم کنار ہوتی جاتی تھی ہم سمجھے کہ خبر ختم ہونے کے بعد وہ پرزور الفاظ میں ہماری قابلیت کا اعتراف کریں گے اور کہیں گے کہ آپ تو مادر زاد مترجم ہیں۔ مچھلی کے بچوں کو تیرنا کون سکھائے۔ مگر انھوں نے سُرخ روشنائی والا قلم اُٹھا کر ہمارے ترجمے پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا اور بقیہ دو خبروں کو بغیر پڑھے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ آپ دو ایک روز اردو اخبار پڑھ کر انگریزی کے مترادف الفاظ لکھنے کی مشق کیجئے۔ اس کے بعد صحافت کے پیشے سے ہمارا دل کھٹا ہو گیا کیونکہ ہم یہ چاہتے تھے کہ ہرا لگے نہ پھٹکری مگر رنگ چوکھا آئے۔ لہٰذا اب ہم غور کرنے لگے کہ ہماری بی۔اے کی ڈگری کہاں کہاں بغیر کسی زحمت کے پوری پوری فٹ ہو سکتی ہے۔ سوچتے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ ملازمت کا خیال ترک کرکے پہلے شادی کر ڈالو۔ شادی بیاہ میں ہماری بی۔اے کی ڈگری ہمارے حسبِ منشا براہِ راست فٹ بیٹھے گی۔ یہ خیال آتے ہی ہم اُچھل پڑے۔ ہم نے کہا کہ بس اب طے کر لیا کہ پہلے شادی کریں گے۔ اولاد کم پیدا

کریں گے اور روپیہ زیادہ ۔ مگر پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ بی ۔ اے پاس ہیں ۔ اس لئے اگر ملازمت کی صورت انگلستان میں نکلی تو یوں تو بہرصورت مزے رہیں گے ۔ مگر اُس صورت میں بیوی بچوں کا الاؤنس بھی ملتا ہے ۔ لہٰذا دوسرا خیال ترک کیا یعنی یہ کہ اولاد پیدا کرنے میں احتیاط سے کام لیں گے ۔ بلکہ چاہیئے یہ کہ شادی کرتے ہی پہلے کھچا کھچ بچے پیدا کر ڈالیں ۔ اس کے بعد غیر ملکی ملازمتوں کے لئے درخواستیں دیں ۔ اسی غور و فکر میں ہم کو نیند آگئی ، اور ہم نے خواب میں دیکھا کہ جیسے ہماری شادی ہوگئی ہے اور بچوں کا ایک کیو ہمارے پیچھے پیچھے چل رہا ہے ۔ ہمارے آگے ہماری بیوی ہے ، اور بچے پیدا کرتے کرتے وہ سوکھ کر تنکا ہو کر رہ گئی ہے اور ہم بھٹے حالوں اُس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں ۔ ہمارے ہر بچے کے منہ میں ایک چونگا ہے جس سے بی ۔ اے ۔ بی ۔ اے کی آوازیں نکل رہی ہیں ۔ ہم کو اور ہمارے بچوں کو کئی روز سے کھانا نہیں ملا ہے ۔ سب سے شیرخوار بچہ جس کو کئی روز سے دودھ نصیب نہیں ہوا ہے رو رہا ہے اور اس کو بہلانے کے لئے ہم نے اپنی بی ۔ اے کی ڈگری کی ایک بتی بنا کر اُسے دے دی ہے ۔ جسے گڑبڑا کر اُس نے چوسنا شروع کر دیا ہے ۔ اس سے اُس کا رونا بند ہو گیا ہے —— بیوی ہم سے پوچھ رہی ہیں کہ کیا کوئی چیز مل گئی ہے جو بچے نے رونا بند کر دیا ہے ۔ ہم نے کہا بولو مت ، وہ ہماری ڈگری چوس رہا ہے ۔ اس پر وہ جھپٹ کر جو بتی اُس کے منہ سے نکالنے لگیں اور ہم نے اُن کا زور سے ہاتھ جھٹکنے کی کوشش کی تو ہماری آنکھ کھُل گئی —— ہم نے کہا لاحول ولاقوۃ ، کتنا بھیانک خواب تھا ۔

پارچہ بافوں کو سرکاری امداد

مرکزی وزارت تجارت و صنعت نے کرگھے کی کوآپریٹیو سوسائٹیوں کی بستیوں کی حوصلہ افزائی کی غرض سے حکومت کی جانب سے مالی امداد دینے کی ایک اسکیم منظور کی ہے ۔

رہائشی مکانات مہیا کرنے والی بستیوں میں رہائش کے لئے پارچہ بافوں کو فرداً فرداً ایسے مکانات مہیا کئے جائیں گے جن کو وہ کرگھے لگا کر ورکشاپ کے طور[1] پر بھی استعمال کریں گے بستی میں رنگائی ، تکمیلی اصلاح اور تھان بندی وغیرہ کے لئے ایک مشترکہ مرکزی کارخانہ ہوگا ۔ جسے متعلقہ سوسائٹی چلائے گی اور یہ کارخانہ اسی کی ملکیت ہوگا ۔ علاوہ ازیں سوسائٹی تھوک خریداری ، پارچہ بافوں کو سوت کی فراہمی اور تیار شدہ مال کی فروخت کا انتظام بھی کرے گی ۔ آج کل بھی اسی نوعیت کی ایک ہاؤسنگ کالونی مینی گانور واقعہ ریاست اندھرا میں موجود ہے ۔

حکومت ہند قریب قریب فراہمی مکانات کی مالی امداد کی مرکزی اسکیم کی مانند ان بستیوں کو بھی کرگھے کے ٹیکس کی وصول شدہ رقم میں سے مالی امداد دے گی ۔ لیکن ان بستیوں کی امداد کی اوسط زیادہ رہے گی ۔ کیونکہ پارچہ باف کو جو مکان فراہم کیا جائے گا وہ اس کو ورکشاپ کا بھی کام دے گا ۔ چنانچہ ہر مکان کے لئے امداد کی رقم اصل لاگت ہوگی ۔ مگر زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار روپیہ دی جائے گی ۔ لاگت کا ۲۵ فی صدی حصہ قطعی مالی امداد کے طور پر اور ۵۰ فی صدی حصہ طویل المدت قرض کے طور پر دیا جائے گا جس پر شرح سود حسب معمول ہوگی اور ۲۵ سال کے اندر اندر قرض کی رقم ادا کرنی پڑے گی ۔

مرکزی کارخانوں کے غیر متواتر اخراجات کے سوا باقی مشینوں اور متعلقہ ساز و سامان کے لئے نصف رقم بطور قرض اور نصف رقم بطور مالی امداد دی جائے گی ، اور ان کارخانوں کے غیر متواتر اخراجات کی رقم مالی امداد کی صورت میں دی جائے گی ۔

---

[1] ہر چند یہ لفظ غلط ہے ، لیکن رائج ہو چکا ہے ۔ (ادارہ)

کیلاش ماہر

گاندھی جی کا معاشی فلسفہ

اس دور میں جبکہ ہر نظریے کو اقتصادی نقطہ نظر سے پرکھا جاتا ہے گاندھی جی کا معاشی فلسفہ بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے معاشی تخیل (Economic Thought) کے تمام مفکرین جو کہ آدم سمتھ (۱۷۷۶) سے لے کر کارل مارکس کے تنقیدی نظریوں تک یعنی (۱۸۶۵ - ۱۸۹۵) اور ان کے علاوہ معاشیات کے موجودہ مفکرین کے اصولوں کو مطالعہ کرنے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ صنعتی برتری کی دوڑ میں کسی قوم کا معاشی معیار اس وقت تک بلند نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسانی قدروں کو صحیح اہمیت نہیں دی جائیگی بڑھتی ہوئی بے اطمینانی کو روکنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ معاشی مقصدوں کو (Economic Motives) اس طرح ڈھالا جائے کہ ان سے زیادہ سے زیادہ سماجی بھلائی و بہبود ہو سکے گاندھی جی کا معاشی فلسفہ انسانی قدروں کو جائز اہمیت دینے کے حق میں ہے دوسرے الفاظ میں گاندھی بتدریج انسانی برابری (Comparative Human Equality) کے پیروکار تھے ۔

یوں تو کہنے کو گاندھی جی کوئی معاشی مفکر نہیں تھے لیکن اس کے باوجود ان کے خیالات نے مشرقی فلسفے کو ایک نئے انداز سے موڑ دیا اور یہ صحیح طور سے واضح کر دیا کہ پچھڑی ہوئی اقوام کا رہن سہن اور معیار زندگی کس طرح بلند کیا جا سکتا ہے ۔ منصوبہ بندی کا فلسفہ مغرب کی دین ہے لیکن یہ محض ایک تخیلی معیار پسندانہ نظریہ Super-Idealistic Notion ہے اگر ہم اسے ہندوستانی مزاج کے موافق اپنی ضروریات کے سانچے میں نہ ڈھال سکیں ۔ گاندھی جی کا نظریہ خیال دنیاوی تجربات کی بنا پر رکھی ہوئی وہ کسوٹی ہے جس کے ذریعے ہم اپنی روزانہ زندگی کی ضرورت (Every Day Wants) کو بہ آسانی مطمئن کر سکیں ۔ گاندھی جی کے معاشی فلسفے کو سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر کو سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے اگر ہم تاریخی حالات کا جائزہ لیں تو اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے سب سے پہلے یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہندوستان تقریباً تین سو سال تک بیرونی حکومت کے زیر اثر رہا جس کے اثرات سیاسی - سماجی، اقتصادی - مذہبی غرضیکہ ہمارے ہر شعبۂ زندگی میں اس طرح اثر پذیر ہوئے ہیں کہ آج بھی ہم بہت سے مہلک امراض میں مبتلا ہیں - آزادی کے بعد اپنے ہی ذرائع پر کھڑے ہونے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہ تھا - ہماری گھریلو صنعتیں اس دور میں مشینوں کی بھرمار اور بیرونی سرکار کی پالیسی کے زیر اثر تباہ و برباد ہو چکی تھیں - زمین اور زراعت پر آبادی کا دباؤ Pressure of Population ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا بلکہ صنعتی و حرفتی میدان میں بے روزگاری بھی برابر بڑھتی جا رہی تھی - ان سب باتوں کے علاوہ جن شعبوں میں کوئی ترقی ہوئی تھی وہ ایک مخصوص مقصد کے تحت کی گئی تھی صنعتی ترقی اور تعلیمی منصوبہ بندی (Educational Planning) حکومت کی بنیادیں مستحکم کرنے کا ایک ذریعہ سمجھی گئی تھیں . . . . . یہ تھا وہ پس منظر جس کی بنیادوں پر گاندھی جی کے معاشی فلسفے کا جنم ہوا - مندرجہ بالا مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے گاندھی جی نے جتنی بھی تحریکیں چلائیں جیسے سودیشی تحریک ڈانڈی مارچ یا نمک کا ستیا گرہ - یا عدم تعاون Non Co-operative Movement تحریک ان کا ایک خاص مقصد تھا جن کی وجہ سے قوم آنے والے انقلاب کے لئے تیار ہو گئی اور اس کی مردہ رگوں میں از سر نو شعوری بیداری پیدا ہو گئی -

گاندھی جی اور اقتصادی مقاصد

آدم سمتھ کے نزدیک کسی ملک کی اقتصادی دولت اس ملک کی زمین - مکانات اور روزانہ ضروریات کی اشیا نہیں تھی بلکہ قومی دولت کا انحصار محنت کشوں اور زمین کی پیداوار پر تھا - مگر گاندھی جی کا اقتصادی معیار (Economic Ideal) اس سے بھی بلند تھا گاندھی جی نے کہا تھا کہ علم معاشیات کا مقصد زندگی کی ضروریات کو اکھٹا کرنے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ وہ علم ہے جس کے ذریعے عوام کو اقتصادی سکون اور اطمینان حاصل ہو سکے، سکون اور اطمینان زندگی کی ضروریات (Wants) کے بڑھنے سے نہیں بلکہ ان کی کمی سے حاصل ہو سکتا

ہے۔ ان کے نزدیک جسمانی تشفی سے کہیں اہم اور ضروری روحانی تشفی تھی۔ اگر روح اور دماغی عناصر اپنی ضروری خوراک نہیں پاتے تو انسان چاہے کتنا ہی بڑا سرمایہ دار کیوں نہ ہو اطمینان کی زندگی نہیں بسر کرسکتا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر مہتہ کا خیال اس سلسلے میں گاندھی جی سے مطابقت رکھتا ہے۔ ضروریات کی تشفی اس وقت ہوسکتی ہے جب آدمی اس معیار پر پہنچ جائے جہاں اس کی کوئی ضرورت نہ رہے (State of Wantlessness) یا کم سے کم ضرورتوں کا احساس ہو کسی ضرورت کو پورا کرنے سے وقتی تشفی تو ضرور ہوجاتی ہے مگر ہمیشہ کے لئے اس ضرورت سے نجات نہیں ملتی۔ یہی گاندھی جی کے فلسفے کا خاص مقصد ہے کہ ہر انسان اپنی اقتصادی زندگی کا منصوبہ اس انداز سے بنائے جس میں اسے اپنے ذرائع اور طاقت کے مطابق (Resources and Power) زیادہ سے زیادہ تشفی اور اطمینان حاصل ہوسکے۔

گاندھی جی اور اقتصادی جمہوریت

میں نے اپنے ایک مضمون گھریلو دھندوں کی اقتصادیات میں لکھا تھا کہ سیاسی جمہوریت کا تصور اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اس کی بنیاد اقتصادی جمہوریت پر نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں جب تک جمہوری طریقے سے اشیاء (Goods) کی پیداوار نہیں کی جائیگی۔ اور گاندھی جی کا بھی یہی خیال تھا پیداوار میں مرکزیت (Centralisation in production) کے برعکس گاندھی جی نے چھوٹی چھوٹی اکائیوں (Units) کو جو اہمیت دی تھی اس کی پشت پناہ ایک اقتصادی فلسفہ ہے یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے "گرام" یا گاؤں کو اپنی تمام سیاسی سماجی اور معاشی تحریکوں کا مرکز بنایا تھا "گرام راجیہ" اور "پنچایت راجیہ" اسی سلسلے میں دو مختلف نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پنچایتوں کو اہمیت دینے کا خاص سبب تعاون کے فلسفے سے (Theory of Co-operation) وابستہ ہے۔ صحیح معنوں میں کسی جمہوریت کی اقتصادی کامیابی اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ ہر اکائی خود مختار نہ ہو اور آرتھک بندھنوں سے آزاد نہ ہو۔ گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن مورخہ ۲۶/۷/۴۲ میں تحریر کیا تھا.....

"گاؤں کے سوراج سے میرا مطلب اس جمہوریت سے ہے جو اپنی ضروریات کے لئے اپنے پڑوسیوں کا محتاج نہ ہو اور اپنے دیگر معاملات میں پوری طرح آزاد ہو..... اس طرح ہر گاؤں میں جمہوریت کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ اپنے کھانے کے لئے اناج اور کپڑوں کے لئے روئی خود پیدا کرے..... اس کے پاس اپنے مویشیوں کی خوراک ہو اور اپنے بچوں کے لئے کھیل کا میدان..... وغیرہ وغیرہ"

گاندھی جی اور مشین کا نظریہ

اس مسئلے پر علماء میں کافی اختلاف رائے ہے اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ گاندھی جی مشین کے مخالف نہیں تھے بلکہ ان کو مشینی تمدن (Mechanical Civilization) سے نفرت تھی۔ مشین جسمانی اور دماغی سکون حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ معاشیات کے ماہر Sismondi کی طرح سے شاید گاندھی جی کا بھی یہی نظریہ تھا کہ مشینیں اور ایجادات بذات خود نقصان دہ نہیں ہیں بلکہ ان کے ذریعے سے جو اقتصادی نظام پیدا ہوتا ہے اس سے مزدوروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ مشینیں تمدن کے لئے مضر ہیں اس ملک کے لئے جہاں ذرائع کی کمی ہے اور جہاں آبادی پیداوار سے زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہو یہ ضروری ہے کہ عوام کی ضروریات بنا بھاری مشینوں کی امداد کے پوری نہیں کی جاسکتیں۔ تاہم گاندھی جی نے مشین کو اتنی اہمیت نہیں دی کہ اس کے استعمال سے انسان بھی ایک پرزے کی مانند بن جاتا ہے اور اس کی انفرادیت ختم ہوجاتی ہے جس حد تک ملک میں پیداوار (Production) اور تصرف (Consumtion) متواتر ایک نسبت سے ترقی کرتے جاتے ہیں گاندھی جی کو مشینری کے استعمال سے گریز نہیں تھا۔ مگر جب مشینوں کو سماج کی دولت کو کھسوٹنے اور اپنا ادھیکار جمانے کے لئے استعمال کیا جانے لگا اور اس کے ساتھ انسان کی شخصیت محض ایک پرزے کی مانند رہ گئی تو گاندھی جی نے جائز طریقے سے مشین کی مخالفت کی ہے۔ مزدوروں کے استحصال (Exploitation) اور عام بیکاری کی بہت کچھ ذمہ داری مشینوں پر ہے۔

انفرادی جائیداد اور گاندھی جی کا نظریہ

سروودے کے فلسفے سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ گاندھی جی نے ایک ایسے سماج کا تصور کیا تھا جو کہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی بندھنوں سے آزاد ہو۔ ہندوستان کے لئے سب سے پہلے اور نہایت اہم کام سیاسی آزادی کا تھا ملک کو بیرونی طاقتوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے بعد سماجی اور اقتصادی غلامی سے نجات پانے کا سوال اٹھتا ہے۔ لیکن گاندھی جی اپنے کام کو تکمیل تک پہنچا سکے اور صحیح معنی میں ان کی شہادت قبل از وقت ہوئی۔ بات بہت دور نکل گئی۔ معاشی

مفکر (Proudhon) نے جائیداد (Property) کی اس لئے مخالفت کی تھی کہ اس دولت کے ذریعے اس کے مالک کو اس "منافع" کا حق مل جاتا ہے جس کا وہ صحیح معنوں میں جائز حقدار نہیں ہے مگر گاندھی جی نے انفرادی جائیداد Private Property) کو ایک وقف کی صورت میں دیکھا تھا اور دولت کے مالکوں کو ایک طرح سے ان کے اخلاقی فرائض کی طرف سے چیتاونی دی تھی تاکہ وہ ان غریبوں اور مظلوموں کے حقوق سے غافل نہ ہو جائیں جن کی پرورش ان کا سماجی اور اخلاقی فرض ہے اس خیال کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے Trustee Ship کے اصولوں کی ایجاد کی تھی۔ کوئی بھی دولت، ذرائع یا جائیداد اس لئے ہے کہ اس سے غریبوں کی امداد کی جا سکے جن کی ضرورتیں سماجی اعتبار سے زیادہ اہم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے جائیداد کو سرمایہ داروں اور زمینداروں کے ہاتھ میں ایک پاک وقف Sacred Trust کی حیثیت دی تھی۔ اور سرمایہ دار طبقے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی موجودہ انفرادیت برقرار رکھنے کے لئے اپنی تمام ذمہ داریوں سے باخبر رہیں تاکہ سماج میں ان کا وقار یونہی بنا رہے۔ اگر اس کے برعکس ہوتا ہے تو دیوار پر لکھی ہوئی وقت کی سرخیاں اپنا رنگ ضرور لائیں گی۔

آج کے دور میں دنیا نے یہ بخوبی سمجھ لیا ہے کہ دنیاوی طاقت کے مقابلے میں روحانی طاقت زیادہ عظیم ہے روحانی طاقت نے ہمیشہ تواریخی حیثیت سے بھی صداقت کا ساتھ دیا ہے وہ نظریہ جو گاندھی جی نے اب سے تیس سال پہلے عوام کے سامنے رکھا تھا آج اپنی عظمت کے ساتھ ہماری آنکھوں کے روبرو آرہا ہے۔ دنیا کی طاقتوں کے درمیان غریب عوام کے کیا فرائض ہیں جن کی بنیاد پر وہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھ سکتے ہیں یہ سب آج بھی گاندھی جی کے اصولوں سے ظاہر ہے۔ کہ مشرق اور مغرب کے دو متضاد نظریوں میں ہندوستان کی اہمیت اور برتری کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم آج بھی آپس غیر جانب داری اور صداقت پر قائم ہیں جو ہمیں گاندھی جی سے ورثے میں ملی تھی۔

اعداد و شمار

۱- ہندوستان میں ۱۹۵۳-۵۴ء میں روئی کی ۳ کروڑ ۹۰ لاکھ گانٹھیں استعمال ہوئیں

۲- ہندوستان میں رنگ اور وارنش کی سالانہ ضرورت تینتیس ہزار ٹن ہے۔ اور یہ سب کی سب یہیں پیدا کی جاتی ہے۔

۳- ہندوستان میں گورنمنٹ کے استعمال کے لئے وباؤں کو دور کرنے والی دوائیوں کی سالانہ ضرورت کا اندازہ ۷،۸۴۰ ٹن ہے جس میں ۷،۵۰۰ ٹن کیڑے مار دوائیاں شامل ہیں۔

۴- ہندوستان میں کروم کے ذخائر کا اندازہ ۲۰ لاکھ ٹن ہے۔

۵- ۱۹۵۳-۵۴ء میں ۱۷،۹۸۰ ہنڈرڈ ویٹ بناسپتی گھی جس کی قیمت کا اندازہ ۲۱،۱۰،۰۰۰ روپے لگایا جاتا ہے۔ ہندوستان سے باہر بھیجا گیا۔

۶- ہندوستان میں مچھلی کے نرخ کا اوسط فی کس صرف ۳ء۹۸ پاؤنڈ ہے جبکہ اس کے مقابلے میں جاپان میں ۳۳ء۸ پاؤنڈ، برما میں ۷۰ پاؤنڈ، اور لنکا میں ۱۶ پاؤنڈ فی کس ہے۔





انڈین ایئرفورس راشٹرپتی کو سلامی دے رہی ہے

جلوس میں نیشنل کیڈٹ کور کی لڑکیاں

دہلی میں جشن جمہوریت

جلوس میں بحری فوج

ہندوستانی فوج سلامی دے رہی







پانڈی چری کی جھانکی - کشتی اور روشنی کا مینار

اترپردیش کی جھانکی - گھریلو دستکاریاں





مدراس کی جھانکی - چولا راجاؤں کے زمانے میں شاعرہ

پنجاب کا گتا ناچ



پردھان منتری شری نہرو لوک





کشمیر کي جھانکي - ایک شکارا اور کشمیري گھریلو صنعتیں



فوٹو - موتي رام جین

یادت میں امن کا وفد

بمبئي کي جھانکي - دیش کي چھوٹي بڑي صنعتیں



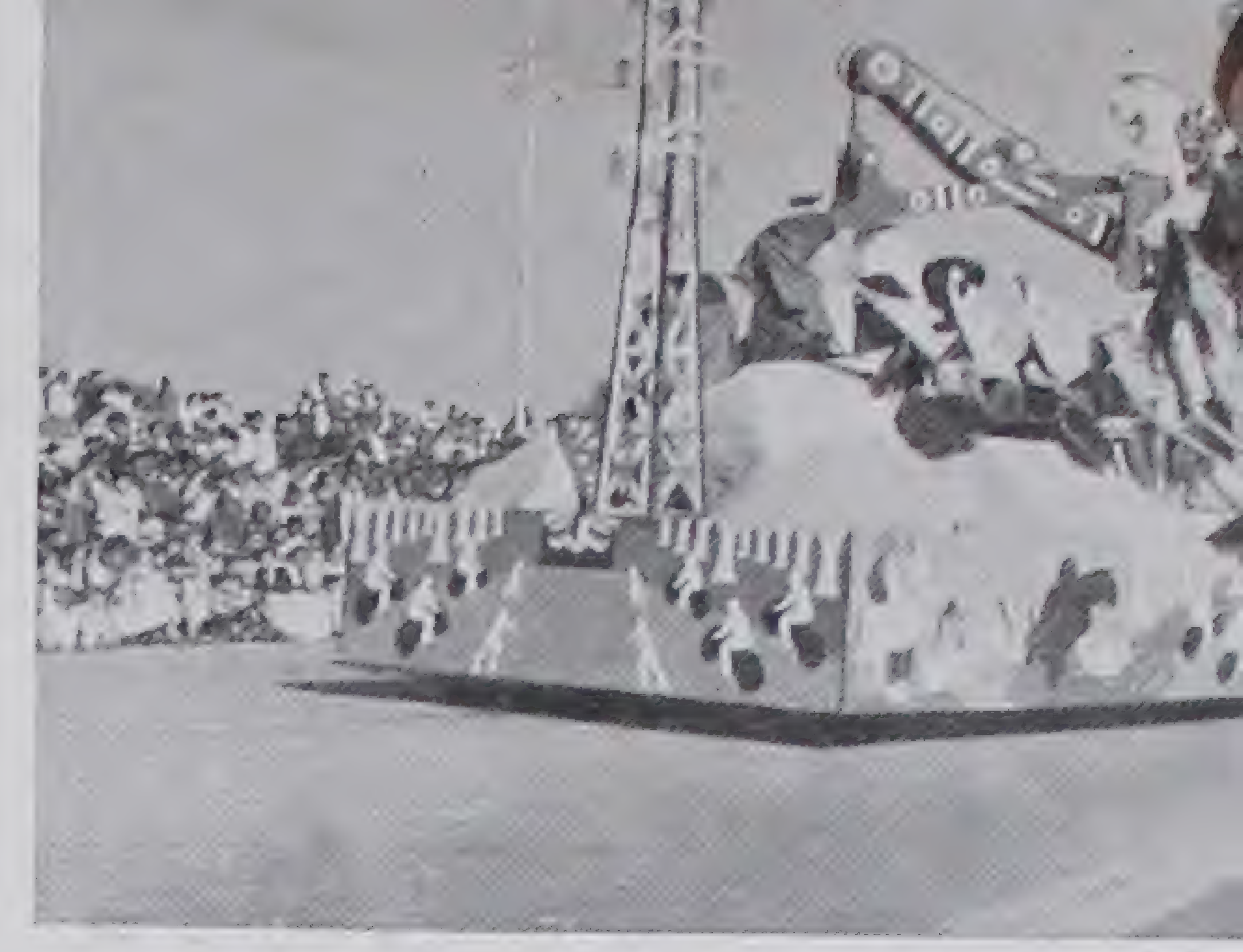
پیپسو کا لوک ناچ



حصہ لینے والی خواتین کے ساتھ







اوپر - نیشنل اسٹیڈیم میں جنوبي هند
کا پنال کولاٹم ناچ

اوپر دائیں - پنجاب کا منظر - بھاکڑا ننگل



پانڈي چري کا لوک ناچ

کشمیري روف ناچ



علی منظور

نظر کُشا

ہندی زیرک عرب کے معقول پسند — سمجھائیں حکیموں کے مقاماتِ بلند
نیچا میں دکھاؤں اِن سرفرازوں کو — اپنوں کی مخالفت کرے دانشمند

دیکھا نہیں وہم و علم کا دوراہا — روشن علم الیقیں کو رکھنا چاہا
ہیں فلسفہ دُشمن! آپ مجھ سے بدظن — منظور سکونِ دل ہے عالی جاہا

نظّارے کی حد ہے آسماں، کہتا ہے — نظّارے کی حد ہی کو دُھواں کہتا ہے
آئینے میں عکس دیکھتا ہے جس کا — لاشَے اُسے یہ فلسفہ داں کہتا ہے۔

ہے فلسفہ ڈارون کا اتنا معصوم — آتی ہے ہنسی سمجھ کے اس کا مفہوم
اب دایرۂ شعر و سخن چھوڑے کون — معلوم حدِ فلسفہ دانی معلوم

لاشَے ہے کبھی کبھی دُھواں کیا کہنا — ہے حدِّ نظر یہ آسماں کیا کہنا
پانی میں نظر سایۂ حدِّ نظر آئے — اے ”ہیچمدانِ فلسفہ داں“ کیا کہنا

ناداں! عُرفائے دیدہ ور سے چشمک — ضدِّ عین الیقیں ترا ”اندھا شک“!
جی چاہے تو ربط پاکبازوں سے بڑھا — اے فلسفہ داں فلسفہ بازی کب تک

تمکین کاظمی

وامق و عذرا

افسانۂ وامق و عذرا بھی اُن قصّوں میں سے ہے جن کی اصلیت کے متعلق اختلاف ہے، بعض ان قصوں کو "منیژہ و بیژن" "ویس و رامین" کی طرح قدیم ایرانی افسانہ سمجھتے ہیں، اُن کی دلیل یہ ہے کہ دولت شاہ سمرقندی نے اس قصّہ کی ایک منظوم کتاب کا تذکرہ کیا ہے جو انوشیرواں کے نام پر لکھی گئی تھی اور اس کا ایک نسخہ عبد اللہ بن طاہر کے زمانے (۲۳۰ - ۲۱۳) میں جو فرماں روائے خراسان تھا موجود تھا -

بعض اربابِ ادب کا خیال ہے کہ اس قصّے کی اصل "عروہ و عفرا" "لیلیٰ و مجنوں" اور اسی قسم کے دوسرے افسانوں کی طرح عربی ہے جنھیں سہیل بن ہارون سے نسبت دی جاتی ہے جو عہد مامون الرشید کے مشاہیر سے تھا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہ قصّے ہیں جو قرنِ دوم ہجری میں تصنیف ہوئے - ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں قصص "ثعلہ و عفرا" "نمر و ثعلب" "وامق و عذرا" کو سہل بن ہارون کی تصانیف میں شمار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وامق و عذرا نام سے سب سے پہلے سہل ہی نے عربی میں قصّہ لکھا ہے جس سے فارسی میں ترجمہ ہوا ہے -

بعضوں کا بیان ہے کہ افسانۂ وامق و عذرا وغیرہ قصّے یوسف زلیخا، سلامان و ابسال وغیرہ کی طرح باہر سے لئے گئے ہیں اور ان کی اصل یونانی ہے چنانچہ مولفِ مجمل التواریخ و القصص نے لکھا ہے کہ "عہد دارابن داراب میں قصہ وامق و عذرا یونانی زبان میں موجود تھا"

حمد اللہ مستوفی نے بھی تاریخ گزیدہ میں ان عاشق و معشوق کو معاصرین سکندر اعظم ظاہر کیا ہے، ان اسماء و اعلام سے جو عنصری کے منظوم نسخے میں پائے جاتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قصے کی اصل یونانی ہی تھی جس کا ترجمہ مشرقی زبانوں میں ہوا -

ابو القاسم عنصری نے سلطان محمود غزنوی کے حکم سے تین قدیم قصے "شاد بہر و عین الحیواۃ" "خنک بت و سرخ بت" اور "وامق و عذرا" بحر متقارب و خفیف میں نظم کئے اور حسب روایتِ عوفی یہ تینوں بدایع و حکم کا خزانہ تھے جن میں معانی دقیق اور امثالِ رقیق تھے مگر افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی مثنوی بھی آج نہیں ملتی البتہ بعض رسائل اور منشات میں اُن کے چند شعر نقل ہوئے ہیں،

قصۂ وامق و عذرا دوسرے تمام قصّوں سے زیادہ شہرت پا چکا ہے اور بیشتر شعراء و ادبا نے تتبع و تقلید نقل وغیرہ کی ہے چنانچہ شعیب جوشقانی نے اس قصّے کی شہرت کے متعلق یہ حکایت نظم کی ہے -

حدیثِ وامق و عذرا است مشہور[1] — بود در ہر زباں ایں قصہ مشہور
ولے اول چو دانائے نخستیں — کہ گلکش کرد عالم نشکر آگیں
ز آتش از ثریا تا ثری بود — گہر پیرائے معنیٔ عنصری بود
ولی آں جامۂ کا شاد آراست — نیامد بر قدِ موزوں او راست
نیابی زاں ہمہ شعر خجستہ — در اوراقِ کہن جز جستہ جستہ
نہ از وے ہیچکس دارد نشانی — نہ در دستِ زمانہ داستانی
ہمانا بودہ یک دفتر در آں حال — کہ دست روزگارش کردہ پامال

ابو ریحان بیرونی وہ شخص ہیں جنھوں نے (۴۴۰ - ۳۶۲) وامق و عذرا نام سے عربی میں ترجمہ کیا ہے غالباً انھوں نے عنصری کی مثنوی یا کسی پہلوی کا قصہ پیشِ نظر رکھا ہے

دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ فصیحی جرجانی نے جو امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس کے دربار سے متوسل تھا قصۂ وامق و عذرا کو نظم کیا ہے یہ نظم بڑی اچھی ہے میں نے اس کے

---

[1] قافیہ غلط ہے -

چند ورق دیکھے ہیں ایک شعر مجھے یاد رہ گیا، اس میں فصیحی نے اپنا حال خاندان کا حال ملک قابوس کی حکومت کا ذکر کیا ہے جو شعر مجھے یاد رہ گیا وہ یہ ہے ؎

چو فرخ وجودے کہ از ہمتش   بمیرد بیپائے دلی نعمتش

ٹامس ولیم بیل نے "فرہنگِ مشاہیرِ شرق" میں لکھا ہے کہ امیر فرخاری نے جو شعراء عہد امیر کیکاؤس کیخسرو (۶۱۰ - ۶۰۹) سے تھا قصۂ وامق و عذرا کو نظم کیا ہے"

چونکہ ہماری نظر سے نہ تو فصیحی کا منظومہ گزرا نہ فرخاری کا اور نہ عنصری کا اس لئے ہم ان تینوں مثنویوں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے مگر یہ تحقیق ہو چکا ہے کہ وامق عذرا کے قصوں میں سے عنصری کا قصہ آخر قرنِ دہم تک شہر ہرات اور مملکت ترکی میں موجود تھا کیونکہ حافظ اوبہی (اوبہ ہرات کا ایک قصبہ تھا) نے اصل فارسی نسخہ اور لامعی عثمانی نے اس کا ترکی ترجمہ دیکھا ہے کیونکہ فرہنگ تحفۃ الاحباب میں اس مثنوی کے بہت زیادہ شعر بطریقِ مثال نقل کئے ہیں اور اس ترکی منثور ترجمہ کو بھی ترکی زبان میں نظم کیا گیا ہے۔

مرزا سنگلاخ مشہدی نے تذکرۂ خطاطین میں ذکر کیا ہے کہ میں نے چند ورق عنصری کے منظوم وامق و عذرا کے علاء الدین گلستانہ کے قلم کے لکھے ہوئے دیکھے ہیں۔ نویں اور دسویں صدی ہجری کے چار لغت نویس لطف اللہ حلیمی، حسین وفائی، محمد قاسم سروری، اور ابراہیم شعوری نے اس مثنوی کے بہت سے شعر اپنی فرہنگوں میں نقل کئے ہیں، ہم نے زیادہ تر شعر عنصری ہی کے اکھٹا کئے ہیں جن میں اسمائی بلاد و اشخاص پائے جاتے ہیں مثلاً"

جزیرہ یکے بد بیونان زمیں   کرونیس بد نام و شہر گزیں

کرونیس اس جزیرے کا نام ہے جہاں کا رہنے والا وامق تھا۔

کہ مکذیطس آں جایگہ داشتے   بشاہی در و تخت گہ داشتے

وامق کے باپ کا نام مکذیطس تھا۔

یکے دوستش بود ترفان نام   بسے آزمودہ بنا کام کام

ترفان وامق کا دوست تھا جس کو ساتھ لے کر وامق نے فرار کیا تھا

بفرمود تا آستناں بگاہ   بیامد بنزدیک رخشندہ ماہ

آستناں نام تھا وامق کے خسر کا جو وامق کے ہاتھ سے مارا گیا۔

ابا دیگراں ماند وامق بجنگ   نہ روئے گریز و نہ رائے درنگ

بداں راہ ازاں دزد جوینده نام   یکے مہترے بود پانوشس نام

پانوشں نامی ایک چوروں کا سردار تھا جو وامق و عذرا کے زمانے میں دریائی راستہ روک کر لوٹ مار کرتا تھا۔

بافرنجہ افراطشں نامدار   یکے بادشاہے بدی ہوشیار

افرنجہ شہر کا نام تھا جو دریا کے کنارے واقع تھا جہاں کی رہنے والی عذرا کی ماں تھی جس کا نام تطیش تھا اور افراطش اس کا شوہر تھا جو عذرا کی لڑائی میں مارا گیا۔

پدر دادہ بودش گہہ کودکی   بآذارطوس آں حکیم ملکی

بمرگ خدا وند آذارطوس   تبہ کرد مرخویشتن را فسوس

آذارطوس نام اس شخص کا تھا جس کو عذرا کی ماں دی گئی تھی۔

فلاطوس برگشت وآمد ز راہ   بہ حجرۂ وامق نیک خواہ

فلاطوس نام ایک حکیم تھا جو عذرا کا استاد تھا،

بد از کینہ عذرا چو شیر تژند   بزد دست وچشم ادانوش کند

ادانوش اس شخص کا نام تھا جو ایلچی بن کر اندروس کی طرف سے عذرا کے پاس آیا تھا اور عذرا نے غصے میں آکر اس کی آنکھیں اپنی انگلیوں سے نکال لی تھیں۔

نہ من اندروستم بکین و بمہر   نہ ہارو و نہ نیز عذرا بچہر

اندروس ایک شخص تھا جو ہارو کا عاشق تھا اور جزیرے میں رہتا تھا اور راتیں کو جزیرے کا راستہ اندروس کو معلوم کرانے کے لئے ہارو آگ جلایا کرتی تھی تاکہ آگ دیکھ کر اندروس اس کی سمت تیرتا ہوا پہنچ سکے مگر ایک رات ہوا اتنی تیز چلی کہ آگ بجھ گئی اور اندروس سمت معلوم نہ کر سکا اور دریا میں ڈوب مرا۔

فگندش بیک زخم گردن زگفت   چو افگندہ شد دست عذرا گرفت

نہ پیچید عذرا چو مرداں جنگ   نہ پیچید برباد کے تنگ تنگ

یکے تیز پائی و دانوشس نام   گزشتہ براو بر بسی گام و دام

دانوش نام اس شخص کا تھا جس نے عذرا کو فروخت کیا تھا

دل دمخیلنوس بشد ناشکیب   کہ در کار عذرا چہ سازد فریب

دمخیلنوس ایک سوداگر تھا جو عذرا کو منقلوس کے پاس سے چرا کر بھگا لے گیا تھا

بشد از پس رنج ہائے دراز   بیک جا جزیرہ رسیدند باز

کجا نام او بود طرطانیوس   ورا او پادشا نام او تزکیوس

طرطانیوس جزیرے کا نام ہے جہاں عذرا پہنچی تھی اور وہاں سے چھوٹ گئی تھی۔

زدریا بخشکی بردں آمدند　　　زبربر سوی زیفنوں آمدند

زیفنوں شہر تھا جہاں عذرا کو لے جاکر اسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر وہ بچ کر بھاگ نکلی -

نویں صدی ہجری کے آخر سے دسویں صدی ہجری کے وسط تک چار عثمانی شاعروں نے جو صاحب خمسہ تھے اپنی اپنی مثنویوں کے نام وامق وعذرا رکھا ہے، غریبی شاعر نے اپنے ترکی تذکرے میں جو شاہ طہماسپ اول کے نام پر ۹۵۵ھ میں لکھا گیا ہے لکھا ہے کہ قاضی سنان بن سلیمان امراء سلطان بایزید خان ثانی (۸۸۶ - ۹۱۸) اور حمزوی شاعر جو صوفی زادگان بورسہ سے تھا ہر ایک نے پانچ پانچ مثنویاں لکھی ہیں جن میں سے ایک وامق وعذرا ہے -

کشف الظنون اور دوسرے تذکروں میں ہے کہ محمود بن عثمان لامعی جو شعراء دور سلطان سلیمان ثانی (۹۲۶ - ۹۷۴) سے تھا اور سعیدی نے جو اہل قانقاد سے تھا پانچ پانچ مثنویاں لکھی ہیں جن میں سے ایک وامق وعذرا ہے

محمود بن عثمان لامعی تخلص بورسہ کے رہنے والے تھے جنھوں نے مولانا عبدالرحمن جامی کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اور جامی روم کے نام سے مشہور ہیں نے ۹۳۱ھ میں انتقال کیا ان کی پانچ مثنویاں ۱- گوئے وچوگان، ۲- فرہاد نامہ ۳- ابسال وسلاماں، ۴- ویس ورامین، ۵- وامق وعذرا ہیں، ان کی یہ وامق و عذرا ترجمہ ہے عنصری کی وامق وعذرا کا چنانچہ لامعی نے مقدمہ میں لکھا ہے -

سابقاً بو قصہ خوش منظری　　　نظم ایدوپ یازمش نگم کیم عنصری

رومہ دوشمس آخر اول جوری لیاس　　　ترکی دیلدن حلا سیبن قیلمش پلاس

نہ معارفدن تیامی لالہ زار　　　نہ قوافی ایاغی موزہ دار

خاکسار چشمی کور دباشی کل　　　خوار وزار دپائے لنگ ودستی شل

اشبو لوردن ایدرک یوز بین سلوک　　　خاک پاک شاہ ایرشمی لنگ دلوک

ترجمہ - مجھ سے پہلے ایک شخص نے افسانۂ وامق وعذرائے عنصری کو بغیر رعایت قافیہ و وزن و ردیف ترکی زبان میں ترجمہ کیا تھا، میں نے سلطان کے حکم سے اس ترجمہ کو نظم کیا ہے -

لامعی نے اس مثنوی میں عذرا کے "فانوس شباب" کی تعریف اس طرح کی ہے

اول ایکے پستہانہ قیلدی بر نظر　　　صاقدی جان چشمی در اول ایکے گہر

دیدی یارب بو ایکی سیمیں حباب　　　عالمک عینین بجوں ایلمہ پر آب

بکور ایکے ماہی در خورشید　　　ہر نہ تشبیہ الیسم لیذ اولجہ دُر

مقیاس الشباب کی اتنی صاف، ستھری، پاکیزہ، سیمین، خورشید قریحۂ آب شیریں، نہالِ استادہ اور غنچۂ ناشگفتہ جیسی تشبیہیں دیکھنے میں نہیں آئی تھیں -

نویں صدی ہجری کے آخر تک وامق وعذرا کا افسانہ بالکل اسی طرح رہا جس طرح کہ یونانی سے آیا تھا مگر نویں صدی ہجری کے ختم ہوتے ہی جتنی بھی مثنویاں اس نام سے لکھی جانے لگیں وہ بدلتی گئیں اور بعد کو اصل قصے سے بہت دور جا پڑیں اور ہر افسانہ دوسرے افسانے سے جدا ہوتا گیا -

نویں صدی ہجری ہی کے آخر میں ایک شاعر قتیلی نے سلطان یعقوب کے عہد (۸۸۴ - ۸۹۶) میں ایک قصہ وامق وعذرا کے نام سے منظوم کیا ہے جس کے تقریباً چھ ہزار شعر ہیں اس مثنوی کا پہلا شعر ہے -

اے نام تو ورد ہر زبانی　　　وے زندہ بنام تو جہانی

اس قصے میں وامق کو ایک امیر عرب یمن کا بیٹا بتایا گیا ہے اور عذرا کو بھی ایک حکمرانِ حجاز کی لڑکی بتایا گیا ہے جس کا سلسلۂ نسب سلاطین کیان سے ملتا ہے -

کمال الدین حسین متخلص بہ ضمیری (متوفی ۹۷۳ھ) نے جو شعراء عہد شاہ طہماسپ سے تھا چھ مثنویاں ۱- ناز و نیاز، ۲- بہار وخزاں، ۳- لیلیٰ ومجنوں ۴- وامق وعذرا، ۵- جنتہ الاخبار، ۶- اسکندر نامہ نظم کی ہیں مگر ان سے سوائے مثنوی راز و نیاز کے اور کوئی مثنوی نظر نہیں آتی -

امیر ابوالقاسم قاضی خلف قاضی مسعود متخلص بہ اسیری نے جو سادات طہران سے تھے خمسہ نظامی کے جواب میں ایک خمسہ کہا ہے جس میں مثنوی وامق وعذرا بھی ہے اور اس مثنوی کا وامق ماآن شاہ ساسانی کا بیٹا ہے جو سرحد خطہ کا حاکم تھا اس مثنوی کا بہترین حصہ وہ ہے جو ان چار قصروں کی تعریف میں کہا گیا ہے جو وامق کے لئے بنائے گئے تھے اس کے چند شعر جو دریا کی تعریف میں ہیں نقل کئے جاتے ہیں -

سحرگہ بہ لب دریا رسیدند　　　بجائے خرم وزیبا رسیدند

نگہ دریا خروشاں اژدہاے　　　زدہ حلقہ نہ سر پیدا نہ پائے

خروش ونعرہ او رفتہ تا اوج　　　چو چین اژدہا ظاہر بر او موج

بلب آوردہ کف چو اشتر مست　　　شدہ کوہانش از امواج پیوست

ز آئیں بہر طرف طبعی رواں بود　　ہزار انش زبان از ماہیان بود
لب دے چوں لب خوبانِ دلجو　　ز سبزہ کردہ لب ظاہر خط او
چو وامق را نظر بر مجہ افتاد　　بر آورد از دلِ پر درد آواز
کہ اے بحر از چہ نیساں بیقراری　　بگو تلخی و شوری از کہ داری

یہ مثنوی اسیری نے ۹۵۴ھ میں نظم کی ہے، طہران سے اسیری نے سفر حج کیا اور حج سے فارغ ہو کر عبدالرحیم خان خاناں کی ملاقات کی غرض سے دہلی آئے اور عرصے تک دہلی میں رہے ہیں اور قیام دہلی کے زمانے میں بھی ایک مثنوی کہی ہے جس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں ۔

مرا یک چند لب قفل سخن بود　　خموشی پاسبان گنج من بود
زبس زد شوق معنی بر دلم جوش　　نمکدان سخن شد حلقۂ گوش
جواں بودم زلیخائے سخن را　　گرفتم یوسف خورشید تن را

خانخاناں کی تعریف یوں کی ہے ۔

جہاں جز خندہ در رویش ندیدہ　　جبینش چیں در ابرویش ندیدہ
ز چیں است اینکہ در پیشانی اوست　　زلال چشمۂ خورشید در جوست
ز ہر خورشید ایامی کہ ایام　　نگیرد جز بکامت دامن شام
زہے خوبی کہ در دفع گزندت　　گل آرد بلبل و سوزد سپندت
معاذ اللہ ز تیغ جاں گزایت　　کزو سرہاست غلطاں زیر پایت
چہ ابرست آنکہ برقش آفتابست　　چہ برقست آنکہ خورشیدش سحابست
ازاں ابراست روح فتح گلگوں　　کہ می خندد درو می گرید خوں
اگرچہ مرگ دشمن را برانست　　ولیکن دوست را آب حیاتست

خانخاناں کے لطف و کرم نے اسیری کو ایسا جکڑ لیا تھا کہ وہ ہندوستان ہی میں بمقام چنیاپور فوت ہوئے اور ۹۹۲ھ میں وہیں دفن ہوئے

شیخ یعقوب کشمیری صرفی (متوفی ۱۰۰۳ھ) نے بھی ایک خمسہ کہا ہے جس میں پہلی مثنوی وامق و عذرا ہے اس کا ایک شعر آپ بھی سن لیجئے ۔

خداوندا حجاب از پیش بکشائے　　بمشتاقاں جمالِ خویش بنمائے

یہ مثنوی ۱۸۸۹ء میں لکھنؤ میں طبع ہو چکی ہے

گیارہویں صدی ہجری میں شعیب جوشقانی نے جو شاہ عباس کبیر کے عہد کے شاعر تھے ایک مثنوی وامق و عذرا شاہ عباس ہی نام پر کہی ہے جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے ۔

الٰہی مخزن اسرار بکشائے　　فروغ مطلع انوار بنمائے

اشعار کی تعداد اور سنہ تالیف یوں ظاہر کیا ہے ۔

قلم ایں نامۂ نیکو سرانجام　　کہ نیم شہر شعباں یافت انجام
نہد چوں تاج دولت بر سر آں　　شود تاریخ نیم شہر شعباں (۱۰۲۸)
دگر خواہی شمار نقد ایں گنج　　ہزار آمد سہ بار و سی صد و پنج (۳۳۰۵)
پئے ایں نو رسیدہ نام لایق　　نمودم وامق و عذرا موافق

قصہ اس طرح شروع کیا ہے

خبر گوئے حدیث باستانی　　چنیں آرد قلم در زندخوانی
کہ بود از نسل دولت بخت اوکوس　　فلاطوں دانشے نامش فلاطوس
چو شد نخل امید او برومند　　خدا دادش یکے فرزانہ فرزند
فزوں تر حسنش از چندی و چونی　　چو ماہ نو جمالش در فزونی
چو شیریں ساختند از زند کامش　　پدر وامق مقرر کرد نامش

بود در حد مشرق پادشاہے　　سکندر دولتے دارا سپاہے
نسب از تخمۂ افراسیابش　　نہاں در سایہ چتر آفتابش
سعادت یار و دولت رام دارد　　قضا قدرت قدرخاں نام دارد
بود او را یکے پاکیزہ دختر　　ندارد غیر از و فرزند دیگر
بخوبی چہرہ اش ماہ تمام است　　بپاکی چوں گل و عذراش نامست

ظہیر اصفہانی معاصر شاہ سلیمان صفوی (۱۰۷۷ - ۱۱۰۵) نے بھی مثنوی وامق و عذرا کہی ہے چونکہ انھیں نجوم، رمل، موسیقی وغیرہ پر بھی کامل عبور تھا اس لئے ان فنون کی اصطلاحات بھی اس میں آگئے ہیں نمونۃً ملاحظہ ہو ۔

نہاں تنخواہ دوامق زاں پری چہر　　ز تقویم رخ او گردشِ مہر
بخواند از بر دانش سطر احکام　　دراں تقویم شمسی فتنۂ عام

بجست از خواب محنت با صد اندوہ　　فروغ مہر تاباں دید بر کوہ
برو سے ریگ خود را دید چوں نمل　　چو اشکال طریق (...) افتادہ بر رمل
بقبض و بسط شکل بست و نجم　　دو چشمش در پریدن چوں دو انجم
چو دید از اجتماع آں خانہ خارج　　باستقبال ماند از آں اعلیٰ مدارج
چو حمرہ چاک ریزہ بر گریباں　　کلاہ از سر فگندہ ہمچو لحیاں

نشد ممکن صعودش نزد برجیس   بخاک غم فرو شد ہم چو انکیس

مرزا محمد صادق متخلص بہ نامی نے جو کریم خاں زند کے وقائع نگار تھے ایک خمسہ کہا ہے جس میں حسب ذیل مثنویاں ہیں ۱ - درج گہر، ۲ - خسرو شیریں، ۳ - لیلیٰ مجنوں، ۴ - وامق و عذرا، ۵ - شاہنشاہ نامۂ نادری، اس وامق و عذرا کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے -

اے بنامت نامۂ نامی بنام   وے بنامت افتتاح ہر کلام

اے ز عشقت جملہ خوباں بیقرار   وامق تو ہمچو عذرا صد ہزار

اس قصے کا وامق شاہ یمن کا بیٹا ہوتا ہے اور عذرا ایک خیمہ نشین کی دختر، اس کا نتیجہ المناک ہے آخر میں یہ دونوں جل کر مر جاتے ہیں -

چوں بپیوستند باہم آں دو یار   نیک بگرفتند ہم را در کنار

آتش دل شعلہ تا گہ بر فروخت   پیکر زیبائے آں ہر دو بسوخت

حاجی محمد حسین شیرازی معاصر شاہ فتح علی شاہ قاچار نے بھی چھ مثنویاں کہی ہیں، جن میں ایک وامق و عذرا بھی ہے، یہ مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے -

اے بنامت افتتاح نامہ ہا   وے بیادت گرمیٔ ہنگامہ ہا

مرزا ابراہیم بیگ کرمانی نے بھی ایک وامق و عذرا کہی ہے اس کے تین شعر یہ ہیں -

سحر گہ چوں سرشک از چشم عاشق   ز دریا بر کنار افتاد وامق

بر آمد چوں بہار آں دُرِ یکتا   زمیں بالید گفتی بر ثریا

چکاں آب از دو زلفِ آں شکر لب   چو در شب دانہ ہائے تاب کوکب

اس مثنوی کا ایک نفیس ترین نسخہ کتاب خانہ برلن میں موجود تھا۔ واللہ اعلم اب بھی ہے یا جنگ میں ضائع ہو گیا، مؤلف تذکرۂ روز روشن نے لکھا ہے کہ "ملا محمد علی قسمتی نے بھی ایک مثنوی وامق و عذرا کہی ہے مگر میری نظر سے نہیں گزری" مرزا محمد ملک الکتاب شیرازی نے مشہور مثنوی سوز و گداز نوعی خبوشانی میں چند شعر اضافہ اور بیشتر شعر حذف کر کے وامق و عذرا کے نام سے بمبئی سے شائع کی ہے جو عام طور پر ملتی ہے -

---

سوشلسٹ نظام

حال ہی میں ہم نے ملک میں سوشلسٹ نظام قائم کرنے کی پالیسی اختیار کرنے کا اعلان کیا ہے - ہمارے آئین کے بنیادی ہدایت نامہ میں سوشلسٹ نظام کا لب لباب موجود ہے - لیکن اس نئے اعلان سے ہمارے مقاصد کی عملی تکمیل کے لئے زیادہ سرگرمی اور ایک نئے جہان کا دور شروع ہوتا ہے - اب ہمیں اپنی اقتصادی زندگی اور معاشی سرگرمیوں کے ہر ایک میدان میں اس پالیسی کے اثرات اور لوازم کی تفاصیل طے کرنی ہوں گی۔ حکومت کو تمام اقتصادی اور سماجی نابرابری مٹا دینی ہوگی جن لوگوں کو ماضی میں سماج میں اپنی مناسب جگہ حاصل کرنے کے مواقع حاصل نہیں بنتے انھیں موزوں مواقع مہیا کرنے ہوں گے - ہمیں فوری ترقی کے لئے ایسے حالات پیدا کرنے کے قابل ہو جانا چاہئے کہ جن میں سارا ملک مجموعی طور پر عزم راسخ سے یہ کوشش کرے کہ وہ آج ہر چیز کی کم کھپت کریں گے تاکہ مستقبل میں ان کی بہتات ہو جائے - آبادی کی اکثریت کی زندگیوں پر سوشلسٹ سماج بننے سے کیا اثر پڑے گا اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں آیندہ ترقی اور خوشحالی لانے کی خاطر آج قربانی کرنی اور سختی جھیلنی ہوگی - ملک کے نظم و نسق اور ترقیاتی کاموں میں لوگوں کی معاونت بڑھنی جانی چاہئے کیونکہ صرف ان کی امداد اور اعانت سے ہی ہماری فوری اور راشد ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ملک کے مادی ذرائع اور جن شکتی کا بہترین استعمال کیا جا سکتا ہے -

(شری گلزاری لال نندہ کی ایک تقریر کا اقتباس)

عبداللطیف اعظمی

انڈونیشیا کی سیاست کا رُخ

ابھی حال میں ۲۲ ستمبر ۱۹۵۴ء کو انڈونیشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر علی ساسترو میجویو چند اہم مسائل پر ہمارے ہر دلعزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے تبادلہ خیال کرنے کی غرض سے دہلی تشریف لائے تھے - ایشیا کے جن ممالک سے ہندوستان کے بہت گہرے تعلقات ہیں اور جن سے موت اور زیست جیسے نازک اور اہم مواقع پر بھی رفاقت کی امید ہے، ان میں سے ایک انڈونیشیا بھی ہے - انڈونیشیا کی ۹۵ فیصدی آبادی مسلمان ہے لیکن اس کے باوجود انڈونیشیا پاکستان کے تمام پروپیگنڈے کے باوجود اس سے زیادہ ہندوستان کے قریب ہے - اس کے دو اہم اسباب ہیں - ایک تو ہندوستان اور انڈونیشیا کے درمیان قدیم زمانے سے دوستی چلی آرہی ہے - چنانچہ انڈونیشیا کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور زبان پر قدیم ہندوستان کے گہرے اثرات اب تک موجود ہیں - دوسرا سبب یہ ہے کہ ہندوستان اور انڈونیشیا کی خارجہ پالیسی میں گہرا اتحاد ہے - دونوں ملکوں کے رہنما اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ دونوں ملکوں کا اور ایشیا کا فائدہ ایک ساتھ چلنے میں ہے - الگ الگ چلنے میں سب کا نقصان ہے - ہندوستان اور انڈونیشیا دونوں نے ابھی حال میں آزادی حاصل کی ہے - دونوں کے اندرونی اور بیرونی مسائل قریب قریب ایک ہیں دونوں جگہ کی حکومتیں رجعت پسندوں سے نبرد آزما ہیں - یہاں کی حکومت بعض تنگ نظر عوام اور وہاں کی حکومت مذہب کے اندھوں سے - کمیونسٹوں کی ریشہ دوانیاں یہاں بھی ہیں اور وہاں بھی اور سب سے اہم یہ کہ دونوں ملکوں کو اپنی آزادی کو مستحکم کرنے اور اس کو برقرار رکھنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے - اس لئے دونوں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور دوست رہنا چاہتے ہیں -

جہاں ان دونوں ملکوں کی بہت سی باتوں میں یکسانیت ہے - وہاں بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں - جن میں بڑا فرق ہے - مثلاً ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اور اس کے قدرتی وسائل بہت وسیع ہیں - ہمیں پنڈت جواہر لال نہرو جیسی شخصیت حاصل ہے - جو ایک طرف اپنے وطن میں انتہائی ہر دلعزیز اور مقبول ہیں جس کی وجہ سے اندرونی یکجہتی کو تقویت پہنچتی ہے - دوسری طرف بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں - جس کی وجہ سے دنیا کے سیاست دان ہندوستان کی رائے کو آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے - سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں ایک ایسی سیاسی جماعت کی حکومت ہے جس کو پارلیمنٹ میں بھاری اکثریت حاصل ہے - اس کے مقابلے میں انڈونیشیا میں کوئی ایسی سیاسی جماعت نہیں ہے جو تنہا حکومت کر سکے - ۱۹۵۱ء میں انڈونیشی حکومت نے وہاں کی سیاسی پارٹیوں کے بارے میں ایک کتابچہ شائع کیا تھا - اس کے رو سے ۲۷ سے زیادہ وہاں بااثر پارٹیاں ہیں - ممکن ہے کہ آیندہ عام الیکشن تک ان میں سے بہت سی ختم ہو جائیں لیکن وہاں کی سیاسی پارٹیوں کی کثرت اور ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر علی ساسترو میجویو کی کابینہ میں گیارہ پارٹیاں شریک ہیں اور ان پارٹیوں میں حسب ذیل تفصیل کے مطابق عہدے تقسیم کئے گئے ہیں -

(۱) انڈونیشی نیشنلسٹ پارٹی کو چار عہدے - وزیر اعظم، امور خارجہ معاشی امور، فائننس

(۲) عظیم انڈونیشی پارٹی کو تین عہدے - نائب وزیر اعظم، امور داخلہ رسل و رسائل

(۳) مسلم پارٹیوں کو دو عہدے - پبلک ورکس، ہیلتھ (صحت)

(۴) نہضۃ العلما، کو تین عہدے - دوم نائب وزیر اعظم، امور مذہبی اراضی کی جدید تنظیم -

(۵) انڈونیشی عوامی ایسوسی ایشن کو ایک عہدہ - اطلاعات

(۶) انڈونیشی کسانوں کی جماعت کو ایک عہدہ - زراعت

(۷) ترقی پسند پارٹی کو ایک عہدہ - دفاع

(۸) قومی عوامی پارٹی کو ایک عہدہ - انصاف

(۹) عظیم انڈونیشیا کی پارٹی کو ایک عہدہ - سماجی کام
(۱۰) لیبر پارٹی کو ایک عہدہ - لیبر
(۱۱) انڈیپینڈنٹ کو ایک عہدہ - تعلیم

لیکن بڑی خوبی اور تعجب کی بات یہ ہے کہ پارٹیوں کی اس کثرت اور اختلافات کے باوجود کابینہ بڑی یکجہتی کے ساتھ کام کر رہی ہے - موجودہ کابینہ ۳۰ جولائی ۱۹۵۳ء کو مرتب ہوئی تھی - اس وقت سے اب تک اس حکومت کے خلاف بارہا عدم اعتماد کی تجویز پارلیمنٹ میں پیش ہوئی اور ہمیشہ بھاری اکثریت سے مسترد ہو گئی -

ان تمام پارٹیوں میں صرف دو پارٹیاں سب سے اہم ہیں ایک مسجومی پارٹی یعنی مسلم پارٹی، دوسری ڈاکٹر سوکارنو کی نیشنلسٹ پارٹی (پی - این - آئی یعنی پارٹائی نیشنل انڈونیشیا) مسجومی پارٹی کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ یہ ملک کی سب سے بڑی پارٹی ہے - یہ سوشلسٹ خیالات کے ساتھ ساتھ نجی صنعتوں اور ملک میں بیرونی سرمایہ لگانے کی حامی ہے - ایک طرف انڈونیشیا کی خارجہ پالیسی اور روس اور امریکہ کی موجودہ سرد جنگ میں غیر جانبدار رہنے کی بھی حامی ہے - دوسری طرف اس کے بعض لیڈر مثلاً سابق وزیر اعظم سوکی مین مغربی ممالک کے بہت گہرے دوست ہیں مسجومی پارٹی کا اثر اس لحاظ سے اور بڑھ جاتا ہے کہ اس کا سوشلسٹ پارٹی سے اتحاد ہے - سوشلسٹ پارٹی اگرچہ ممبروں کے لحاظ سے بہت چھوٹی ہے - مگر اثر کے لحاظ سے بہت اہم ہے اور اس کے لیڈر سوتان شہریار جو وزیر اعظم بھی رہ چکے ہیں اور ہندوستان بھی آچکے ہیں - بڑی شہرت کے مالک ہیں -

ڈاکٹر سوکارنو کی نیشنلسٹ پارٹی انڈونیشیا کی آزادی سے قبل قریب قریب اتنی ہی مقبول تھی، جتنی ہمارے یہاں کی کانگریس پارٹی - چنانچہ ڈاکٹر سوکارنو کی پوزیشن قریب قریب وہی ہے جو ہمارے یہاں پنڈت جواہر لال نہرو کی ہے - اور جو سن یات سین کو چین میں حاصل تھی - لیکن پچھلے دو تین سال سے نیشنلسٹ پارٹی کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کافی گھٹ گئی ہے - چنانچہ اس کی تلافی اور عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اسے کمیونسٹ پارٹی (پی - کے - آئی یعنی پارٹائی کمیونسٹ انڈونیشیا) کا سہارا لینا پڑا ہے - اگرچہ ڈاکٹر علی شاسترو میجویو کی موجودہ کابینہ میں کوئی کمیونسٹ نہیں ہے، لیکن ان کی نیشنلسٹ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی کا اتحاد کوئی دو سال سے ہے - اس کے علاوہ بعض دوسری چھوٹی چھوٹی پارٹیوں سے بھی اسے اتحاد کرنا پڑا ہے، اور ان کے نمائندے کابینہ میں بھی شامل ہیں - مثلاً قدامت پرست پارٹی (پی - آئی - آر) جس کا حکومت کے ملازمین پر بہت گہرا اثر ہے، اور دو مسلم جماعتیں ایک پی، ایس، آئی، آئی - دوسری نہضۃ العلماء - ان جماعتوں کے اتحاد سے نیشنلسٹ پارٹی اس وقت حکومت چلا رہی ہے، لیکن آنے والے عام انتخابات میں جو پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں ہونے والے ہیں اس کی مسجومی پارٹی سے ٹکر ہوگی اور یہ انتخابات فیصلہ کریں گے کہ ملک کی اصلی اور با اثر جماعت کونسی ہے -

مسجومی اور نیشنلسٹ پارٹی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر خالص اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے - اسلامی حکومت کے قیام کی دار الاسلام بھی کوشاں ہے، مگر اس نے تشدد اور فوج کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہا اس لئے وہ خلاف قانون ہے اور اس کے برسر اقتدار آنے کا امکان قریب قریب بالکل نہیں ہے، لیکن مسجومی پارٹی انتخابات اور عوام کی حمایت سے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس نے عوام کے دلوں میں کافی جگہ حاصل کر لی ہے - اس کے برعکس نیشنلسٹ پارٹی اسلامی حکومت کی سخت مخالف ہے اور سیکولرزم کی قائل ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ڈاکٹر سوکارنو اور ان کے دوسرے ساتھی مذہب یا اسلام کے مخالف ہیں - بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ انھوں نے انڈونیشی حکومت کے لئے جو پانچ بنیادی اصول مقرر کئے ہیں، وہ تمام تر اسلامی اصول اور تعلیمات سے ماخوذ ہیں وہ پانچ اصول حسب ذیل ہیں -

۱- خدا کو ماننا اور ہر شہری کی مذہبی آزادی کو تسلیم کرنا -
۲- انسان دوستی
۳- قومیت — یعنی تمام انڈونیشیا کے قومی اتحاد کو تسلیم کرنا اور اس کو مستحکم کرنا -
۴- جمہوریت — نمائندہ حکومت کے اصول کو ماننا
۵- سماجی انصاف — یعنی سماجی، معاشی اور سیاسی مساوات کو ماننا اور ہر شہری کے لئے اس کے مواقع بہم پہنچانا -

نیشنلسٹ پارٹی کے ان پانچوں اصولوں کو پوری قوم نے تسلیم کر لیا ہے اور انھیں کی روشنی میں حکومت کا عارضی دستور مرتب کیا گیا ہے - ڈاکٹر سوکارنو اور ان کے ساتھیوں کی خدمات اور مقبولیت کی بنا پر یہ توقع کرنا کچھ بیجا اور غلط نہ ہوگا کہ عام انتخابات میں کوئی ایسی جماعت برسر اقتدار نہ آسکے گی -

جو ان اصولوں کی کھلم کھلا مخالف ہو - چنانچہ مسجومی پارٹی کو مقبولیت حاصل ہے وہ محض مذہبی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ایک تو اس لئے ہے کہ وہ معتدل خیالات کی حامل ہے، دوسرے نیشلسٹ پارٹی کا کمیونسٹ پارٹی سے اتحاد ہے اور وہاں کمیونسٹ پارٹی کے طور طریق اتنے ہی بُرے سمجھے جاتے ہیں جتنے ہندوستان میں - اگرچہ اس کا نام مسجومی یعنی مسلم پارٹی ہے - لیکن اس کا دروازہ تمام قوموں کے لئے کھلا ہوا ہے - چنانچہ اس کے ممبروں میں کرسچین اور کیتھولک پارٹی کے ممبر بھی کافی تعداد میں شامل ہیں -

تھوڑے بہت فرق کے ساتھ جو مسائل حکومت ہند کے سامنے ہیں، وہی مسائل انڈونیشی حکومت کے سامنے ہیں - مثلاً زرعی پیداوار کو بڑھانا، صنعت کو ترقی دینا، جہالت کو دور کرنا اور نظام تعلیم کی اصلاح اور بین الاقوامی سیاست میں دھڑے بندی سے الگ رہنا اور ایشیا کے مفاد کی حمایت اور تائید کرنا -

انڈونیشیا کی بنیادی غذا چاول ہے - لیکن وہاں اتنا چاول پیدا نہیں ہوتا جو وہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کافی ہو - چنانچہ امسال ڈیڑھ لاکھ ٹن چاول دوسرے ملکوں سے خریدا جائے گا - مگر اس بات کی برابر کوشش جاری ہے کہ چاول کے بارے میں انڈونیشیا خود کفیل ہو - چنانچہ جنوری ۵۵ء کے شروع میں وزیر زراعت نے اعلان بھی کیا ہے امسال ہمارا ملک چاول کے بارے میں خود کفیل ہو جائے گا اور کسی اور ملک سے چاول منگوانے کی ضرورت نہیں ہوگی - وہاں کی زرعی پیداوار کے بڑھانے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ بڑے بڑے فارم اور زرخیز علاقے کافی تعداد میں غیر ملکیوں کے قبضے میں ہیں - تازہ تخمینے کے مطابق کل زمین کا صرف ۶۹ فیصدی علاقہ مقامی باشندوں کے قبضے میں ہے، جس میں سے ۶۱ فیصدی پر چھوٹے چھوٹے کسان قابض ہیں - ۸ء۱۱ فیصدی پر بڑے بڑے فارم ہیں -

انڈونیشیا کی برآمدی اشیاء میں ربڑ، ٹن اور پٹرولیم (معدنی تیل) کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے - خاص طور پر ربڑ پر انڈونیشیا کی معیشت کی بنیاد ہے - مگر اس کی قیمت کا اتار چڑھاؤ اتنی تیزی سے ہوتا ہے کہ ملک کی معیشت اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتی - دوسرے اب تک انڈونیشیا کی ان چیزوں کا مارکٹ محدود تھا، مگر نئے حالات نے نئی نئی راہیں پیدا کر دی ہیں - چنانچہ ابھی حال میں انڈونیشیا اور چین کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ ہوا ہے - جس کی رو سے انڈونیشیا چین کو ربڑ، ٹن اور کھوپرا سپلائی کرے گا -

بڑی بڑی صنعتوں کا قیام، بیرونی امداد کے بغیر مشکل ہے - اور بیرونی امداد حاصل کرنے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ وہاں امن و امان ابھی تک پوری طرح سے قائم نہیں ہو سکا ہے - وہاں آئے دن اچھے خاصے پیمانے پر فوجی حملے ہوتے رہتے ہیں - اس حملے میں ایسے افراد بھی شامل ہیں، جو پہلے انقلابی جماعت سے تعلق رکھتے تھے - موجودہ سیاسی پالیسی سے اتفاق نہ رکھنے کی بنا پر تشدد کی راہ انھوں نے اختیار کر لی ہے - ان کے حملوں کے اصل نشانہ تو غیر ملکی ہوتے ہیں لیکن حملے کے وقت جو کہ اندھا دھند ہوتا ہے ملکی اور غیر ملکی سرمایے میں فرق کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے - دوسرے ڈاکوؤں کی وہاں بڑی کثرت ہے، ان سے جانی اور مالی دونوں نقصان بہت زیادہ ہوتا ہے - اگرچہ حکومت نے ان دونوں قسم کے گروہوں پر کافی قابو حاصل کر لیا ہے - مگر جو ملک تین ہزار جزیروں پر مشتمل ہو اور وہ جزیرے ایک بہت وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے ہوں اور جہاں کی فوج بھی کافی اصلاح طلب ہو، وہاں مکمل امن و امان قائم کرنے کے لئے آزادی کے پچھلے پانچ سال کافی نہیں ہیں - ان پانچ سالوں میں اب تک جتنا کچھ ہوا ہے، وہی بہت ہے - مختصر یہ کہ بڑی صنعتیں تو نہیں - مگر چھوٹی چھوٹی صنعتیں بہت تیزی سے قائم ہو رہی ہیں اور ہندوستان کی طرح دیہاتوں کی ترقی اور دیہی صنعتوں کی ترقی کی طرف کافی توجہ ہے -

جہالت دور کرنے کے سلسلے میں بہت کافی کام ہوا ہے - آزادی سے قبل وہاں ۹۰ فیصدی جہالت تھی اور اب اندازہ یہ ہے کہ گھٹ کر ۶۰ فیصدی رہ گئی ہے - ایک طرف حکومت خواندگی کو بڑھانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کر رہی ہے - دوسری طرف اعلیٰ تعلیم اور ٹکنیکل تعلیم کے لئے کثرت سے تعلیم گاہیں کھول رہی ہے - ان کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا ہے - سوشل ایجوکیشن کا کام بھی کافی تیزی سے ہو رہا ہے - اس کام کے لئے شروع میں جامعہ کے ہر دلعزیز کارکن شفیق الرحمان صاحب مرحوم گئے تھے - جو وہاں سے واپس آنے کے بعد دہلی اسٹیٹ کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے تھے - آج کل بھی یہ کام ہندوستان کے ایک صاحب انجام دے رہے ہیں - اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان نے اپنی آزادی کے چند سالوں میں جس قدر تعمیری کام کئے ہیں، وہ دوسری جگہ کس قدر عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں -

غرض انڈونیشیا ترقی کی راہ پر مستقل مزاجی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اندرونی اور بیرونی سیاست میں وسیع النظری اور ترقی پسندی کا ہمیشہ ثبوت دیتا رہا ہے۔ ایشیا کی عزت اور آبرو کو اونچا کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ہندوستان نے اس کی آزادی میں اخلاقی مدد دی ہے۔ جس کا اس نے بار بار شکریہ ادا کیا ہے اور آج بھی وہ ہندوستان کی رہنمائی کو تسلیم کرتا ہے اسی طرح ہندوستان نے انڈونیشیا کی رفاقت اور دوستی پر بھروسہ اور اعتماد کیا ہے اور اسے سو فیصدی یقین ہے کہ اس کا اعتماد غلط ثابت نہیں ہوگا۔

ریلوے مسافروں کا کرایہ ——— نئی اور پرانی شرح

درجہ	موجودہ شرح	فاصلہ	مجوزہ نئی شرح
ایرکنڈیشنڈ	۳۰ پائی فی میل	ایک سے تین سو میل	۳۴ پائی فی میل
		تین سو ایک میل اور اس سے اوپر	۳۲ پائی فی میل
دوئم	۱۶ پائی فی میل	ایک سے ایک سو پچاس میل	۱۸ پائی فی میل
		۱۵۱ میل سے ۳۰۰ میل	۱۶ پائی فی میل
		۳۰۱ میل اور اس سے اوپر	۱۵ پائی فی میل
درمیانہ	ڈاک یا ایکسپریس ۱۰½ پائی فی میل	ایک سے ۱۵۰ میل ←	ڈاک یا ایکسپریس ۱۱ پائی فی میل
			عام گاڑی ۹½ پائی فی میل
	عام گاڑی ۶ پائی فی میل	۱۵۱ میل سے ۳۰۰ میل ←	ڈاک یا ایکسپریس ۱۰½ پائی فی میل
			عام گاڑی ۹ پائی فی میل
		۳۰۱ میل اور اس سے اوپر ←	ڈاک یا ایکسپریس ۹½ پائی فی میل
			عام گاڑی ۸½ پائی فی میل
سوئم※	ڈاک یا ایکسپریس ۶ پائی فی میل	ایک سے ۱۵۰ میل ←	ڈاک گاڑی یا ایکسپریس ۶½ پائی فی میل
			عام گاڑی ۵½ پائی فی میل
	عام گاڑی ۵ پائی فی میل	۱۵۱ میل سے ۳۰۰ میل ←	ڈاک یا ایکسپریس ۶ پائی فی میل
			عام گاڑی ۵ پائی فی میل
		۳۰۱ میل اور اس سے اوپر ←	ڈاک یا ایکسپریس ۵ پائی فی میل
			عام گاڑی ۴½ پائی فی میل

※ اس اعلان کے بعد یہ اعلان بھی ہو چکا ہے کہ ایک میل سے پچاس میل تک تیسرے درجے کے کرایے میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر تارا چند

بھارت اور ایران کا تجارتی اور بحری عہد نامہ

یہ معاہدہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس سے دنیا کے مختلف ملکوں اور خاص کر ہمارے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ ہمارے پُر امن اور دوستانہ تعلقات کے سلسلے کو وسعت دینے کے لئے ایک اور کڑی مہیا ہو گئی ہے اس عہد نامے سے ہمارے دونوں ملکوں کے ان گہرے تعلقات کو تجدید حاصل ہوئی ہے جو انتہائی قدیم زمانے سے چلے آتے تھے ۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ تاریخ عالم میں بھارت اور ایران کی مانند دو ملکوں کے لوگوں کے اس قدر قریبی تعلقات کی مثالیں خال خال ہی ملیں گی ۔ ابتدائے تاریخ سے آج تک دونوں ملک تجارتی اور ثقافتی داد و ستد کے گہرے رشتے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں ۔

پوربی ایران (بلوچستان، سیستان اور کرمان) اتری ایران (دامغان) پچھمی ایران (سوسیانہ ۔ فارس) اور بھارت میں سندھ، ستلج اور سرسوتی کی وادیوں میں آثار قدیمہ کی تلاش میں جو کھدائی کا کام ہوا ہے، اس سے انتہائی قدیم زمانے کی ایسی یادگاریں برآمد ہوئی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ ان ملکوں کے مابین کافی وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی تھی ۔ نقش و نگار والے برتن، آویزے، مہریں، سیپ کے کام والی اشیا، ہاتھی دانت کی چیزیں اور بھارتی مناظر پیش کرنے والی پرستش و عبادت کی اشیا ایران میں مذکورہ بالا مقامات پر بکھری ہوئی پائی گئی ہیں ۔ چاول، سوتی کپڑا اور روزمرہ کی ضروریات کا مال بھی ایران میں درآمد ہوتا تھا اور اس کے بدلے میں یہاں سے نیلم، فیروزے اور عقیق جیسے جواہرات، تانبہ اور کانسی جیسی دھاتیں اور دھاتوں کے بارے میں علمی واقفیت ایران سے باہر جاتی تھی ۔ اجناس میں سے جو اور گندم اور پھلوں میں آلو، خوبانی اور شاید انگور کی کاشت کا علم بھی ایران سے ہی بھارت گیا تھا ۔

ثقافتی تعلقات

کئی صدیوں تک باہمی تبادلے کا یہ سلسلہ جاری رہا ۔ اندریں اثنا بھارت اور ایران نے زمانے کے کئی انقلابات دیکھے ۔ ایران اور بھارت میں عالمگیر مذاہب نے جنم لیا اور عالمگیر سلطنتیں قائم ہوئیں ۔ مختلف ملکوں اور لوگوں کے وسیع سیاسی نظاموں کے ماتحت پُر امن طور پر اکٹھے رہنے سے تجارت اور سفر و سیاحت کو توسیع دینے کے لئے موافق اقتصادی اور مجلسی حالات پیدا ہوئے ۔ بہت سی قوموں کے بحری سیاحوں نے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی جانب سفر کئے ۔ جہازوں کے ذریعے بھارت سے سونا، سوتی اور ریشمی کپڑے، گرم مصالحے، صندل وغیرہ کی خوشبودار لکڑی، ساگوان، روزمرہ استعمال اور آرائش و آسائش کی اشیا بحری جہازوں کے ذریعے ایران جاتی تھیں جو وہاں سے دھاتیں، خلیج فارس کے موتی اور ہیرے جواہرات بھارت لے آتے تھے ۔ ان سب سے زیادہ بیش قیمت ایک اور تبادلہ بھی ان دونوں ملکوں کے مابین ہوتا رہا یعنی علوم و فنون لطیفہ، سائنس، فلسفہ اور مذہبی خیالات کا تبادلہ ۔ اسلام کے پھیلاؤ سے ایران اور بھارت کے تعلقات اور بھی زیادہ قریبی ہو گئے اور سمندری راستوں کے علاوہ قافلوں کے ذریعے ہرات، کابل اور مشہد کے راستے نیشاپور، ہمدان اور تبریز وغیرہ ایرانی شہروں بلکہ ان سے بھی پرے کے علاقوں کے ساتھ بھارت کا تجارتی تعلق قائم ہو گیا ۔ ان قافلوں کے ہمراہ علما، حکما، منجم، سنگیت کار، شاعر، مصنف، مصور، معمار اور روزمرہ استعمال کی اشیا کو حسن و خوبی عطا کرنے والے دستکار لوگ بھی ایک سے دوسرے ملک کو آنے جانے لگے ان لوگوں کی بدولت علوم و فنون، دھارمک اور اخلاقی خیالات، قصے کہانیاں اور شعر و ادب ملکی حدود سے بے نیاز ہو گئے ۔

زمانے نے کروٹ بدلی اور ایشیا کا ستارہ پچھمی سورج کے طلوع ہونے پر ماند پڑ گیا - انیسویں صدی میں ایران اور بھارت کے لوگوں کے ثقافتی تعلقات کی رَو مدّھم پڑ گئی - لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے ایشیا کے لوگوں میں پھر بیداری کا ایک نیا جذبہ پیدا ہوا اور آج وہ ترقّی و خوشحالی کے ایک نئے دَور کی دہلیز پر کھڑے ہیں -

یکساں قسم کے مسائل

بھارت اور ایران کو یکساں قسم کے مسائل درپیش ہیں - افلاس، بیماری اور جہالت ہم دونوں کے مشترکہ دشمن ہیں - ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہے - ہماری مجلسی خرابیاں بھی ایک جیسی ہیں - ہماری ضروریات اور مقاصد بھی مشترکہ ہیں - خوش قسمتی سے قدرت نے ایران کو زرعی اور معدنی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے - اس نے آگے بڑھنے، اپنی صنعتوں کو فروغ دینے اپنی زراعت کو جدید ترین معیار پر لانے اور اپنے شہریوں کا معیار زندگی بلند کرنے کا مصمم عزم کر رکھا ہے - بھارت کو ایسے ہی مواقع میسّر ہیں اور وہ بھی ایسی جد و جہد میں ہمہ تن مصروف ہے - اس لئے ہمیں دونوں ملکوں کی بہبود، خوش حالی اور دولت کو فروغ دینے کے لئے نہ صرف اپنے قدیمی تعلّقات کو از سرِ نو بحال کرنا چاہیے بلکہ ان سے بھی زیادہ گہرے اور مضبوط تعلّقات کو استوار کرنا چاہیے - میری صدق دلی سے یہ تمنّا ہے کہ یہ عہد نامہ اس مقصد کو پورا کرنے والا ثابت ہو

کاویری کے پانی کے استعمال کی تدبیریں

بھارت میں وادیٔ کاویری سب سے زیادہ گنجان آباد علاقوں میں شمار ہوتی ہے - اس لئے آبادی کی ضروریات کے تقاضے سے مجبور ہو کر کاویری کے زیادہ سے زیادہ پانی کو استعمال میں لانے کی بہت سی تدبیریں کی گئیں - ملک بھر میں کاویری ہی ایسا دریا ہے جس کے پانی کا سب سے زیادہ حصہ استعمال میں لایا جا رہا ہے - کاویری کا ساٹھ فیصدی تک پانی استعمال کر لینے کے باوجود اس وادی کی تشنگی نہیں بجھ سکی اور آبپاشی کے لئے مزید پانی حاصل کرنے کی نئی تدبیریں اختیار کرنے کے بارے میں ملک کے انجنیروں کی اختراعی قابلیت ختم نہیں ہوئی - پہلے پہل آسان اور کم خرچ تدبیروں سے اور بعد میں زیادہ محنت طلب بھاری اخراجات والی اسکیموں کے ذریعے سے کاویری کے پانی کو استعمال میں لایا گیا - کرشن راج ساگر اور میپور بند تعمیر کر کے بہت لمبی نہریں نکالی گئیں - لاکھوں ایکڑ زمین کی آبپاشی کے ساتھ ساتھ سینکڑوں مربع میل علاقے میں بجلی مہیا کر کے اس وادی کی دولت پیدا کرنے کی صلاحیت کو بڑھایا گیا -

کاویری کے معاونوں پر انجنیروں کی نگاہ - بجلی پیدا کرنے اور آبپاشی کے لئے کاویری کا پانی استعمال کر لینے پر بھی جب علاقے کی ضروریات پوری نہ ہو سکیں تو انجنیروں کی نگاہ کاویری کے معاونوں پر پڑی - دریائے بھوانی جو کاویری کا سب سے بڑا معاون ہے اس پر دو بند تعمیر کرنے کی اسکیمیں آج سے ایک سو برس سے بھی زیادہ پہلے یعنی ۱۸۳۴ء میں سوچی گئی تھیں - جن کا مقصد یہ تھا کہ طغیانی کے دنوں میں زائد پانی کو خشک موسم کے طویل عرصے میں زمینوں کی آبپاشی کے لئے جمع کرنے کا انتظام کیا جائے لیکن کئی بار تحقیقات وغیرہ ہو چکنے کے بعد اقتصادی تقاضوں کے پیش نظر ان سکیموں پر عمل درآمد نہیں کیا گیا - لیکن جب بھارت میں قومی حکومت قائم ہوئی تو ستمبر ۱۹۴۷ء میں ان میں سے ایک یعنی "لوئر بھوانی پروجیکٹ" کو عملی شکل دینے کا فیصلہ کیا گیا تا کہ زیادہ سے زیادہ علاقے کو سیراب کر کے زیر کاشت لایا جائے اور ملک میں خوراک اور کپڑے کی شدید قلّت کو دور کرنے کے لئے موثر اقدام کیا جائے -

لوئر بھوانی پروجیکٹ دریائے بھوانی دکنی بھارت کے "غلہ خیز خطہ" ضلع تنجور میں آبپاشی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے - یہ دریا مغربی گھاٹ کے پوربی ڈھلانوں میں ضلع مالا بار کی خاموش وادی کے جنگلات سے نکلتا ہے - بیس میل تک دکن پورب کی جانب بہتا ہوا ایک پہاڑی کے کونے پر چکّر کھا کر اتر پورب کا رُخ کر لیتا ہے اور کوہ نیلگری کے دکنی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ کمر بند کی طرح لپٹا ہوا چلا جاتا ہے - کوہ نیلگری کے اتری پوربی ڈھلانوں سے بارشوں کا جتنا پانی نیچے اترتا ہے وہ مویار ندی میں جا گرتا ہے یہ ندی لوئر بھوانی بند کے محل وقوع سے اوپر دریائے بھوانی میں جا ملتی ہے - دکن پچھمی اور اتر پوربی دونوں موسمی بارشوں کا پانی اسی دریا میں آ ملتا ہے -

ڈرامے

پنجابی ڈرامے کا ارتقاء

سرزمینِ پنجاب میں ڈرامے کی نشو ونما بڑی حد تک عوامی روایات کی مرہونِ منت ہے۔ یوں تو سنسکرت ڈراموں کے ترجمے بھی ہوئے لیکن ان کا اثر قطعی عبوری رہا۔ بھائی ویر سنگھ نے سکھ مت کے دھارمک مقاصد اور بنیادی خیالات کو ڈرامے کے روپ میں پیش کیا۔ لیکن یہ ڈرامے اسٹیج کرنے کی بہ نسبت پڑھنے کے لئے لکھے گئے تھے۔

بہرکیف پنجاب میں لوک ڈرامے کی روایات کے بیج ہمیشہ پائے جاتے رہے۔ گویّوں کا ایک گروہ جسے "ڈھاڈی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، گاؤں گاؤں گھوم کر رزمیہ نظموں کے سورماؤں، سکھ گوروؤں اور عوامی کہانیوں کے ہیروؤں کے بارے میں گیت سنایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ خانہ بدوش بھانڈ اور میراثی بھی تھے جو نہ صرف افسانے سُنایا کرتے بلکہ کہانیوں کو ڈراموں کے رنگ میں ایکٹنگ کے ذریعے پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے تاریخی قصے عموماً فی البدیہہ ہوا کرتے۔

جدید ڈرامے کی داغ بیل پروفیسر آئی سی نندہ کے ہاتھوں پڑی جنھوں نے ۱۹۱۴ء میں پہلا ڈرامہ لکھا۔ یہ ڈرامہ ایک نئی نویلی دُلھن اور ہمارے سماج میں اس کی قسمت کے اردگرد گھومتا ہے۔ اس کے بعد بھی موصوف نے کئی ڈرامے لکھے۔ یہ تمام کے تمام سماجی موضوعات سے بحث کرتے ہیں۔ پروفیسر نندہ نے ایک ایکٹ کے ڈرامے اور طویل ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے ان جوزیات پر ڈراموں کی پرانی روایات کی دیوار ڈھادی جن میں جابجا گیت ہوتے ہیں۔ پنجاب میں یہ چیز اردو کی خصوصیت تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان گنت تصانیف کے ذریعے ڈرامے کے رُوپ کو مقبول بنایا۔ خصوصاً کالجوں میں ان کی مقبولیت بہت بڑھ گئی۔ نندہ کے بعد ہرچرن سنگھ، موہن سنگھ، روشن لال آہوجہ، امریک سنگھ گوردیال سنگھ پھُول، بلبیر سنگھ، جی ایس کھوسلہ، اور بلونت گارگی نے ڈرامہ نویسی میں شہرت حاصل کی۔

گارگی پنجابی ڈرامہ نویسوں میں ایسی حیثیت کے مالک ہیں جن سے دوسرے ہم عصر ڈرامہ نگاروں نے خوشہ چینی کی ہے۔ گارگی نے ایکانکی ڈرامے بڑی تعداد میں لکھے ہیں۔ آدھ درجن سے زیادہ طویل ڈرامے بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ اُنھوں نے مغربی طرز اور ڈھنگ کو تو اپنا لیا ہے لیکن موضوع کے لحاظ سے وہ پنجاب کی سرزمین کا عکس پیش کرتے ہیں جن میں دیہی روایات کی خوبصورتی اور قوت کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں ان کے ڈرامے "کیسرو" اور "کنک دی بلّی" پنجاب کے دیہی علاقوں کا خوبصورت مرقع پیش کرتے ہیں۔ ان کا ڈرامہ "لوہا کٹ" گاؤں کے لوہار کے ہتھوڑوں کی صدا سے گونجتا ہے۔

پنجابی ڈرامے میں سماجی حقیقت پسندی کی روایات کے ساتھ ساتھ ایک ایکٹ کی غنائی تمثیل نگاری کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں شیلاؔ بھاٹیہ کا نام سب سے اہم ہے۔ ان کے گیتوں میں تغزل بھی ہوتا ہے اور غنائیت بھی۔ چنانچہ انھوں نے غنائی تمثیل نگاری کے ذریعے ڈرامے کے ڈھانچے میں دھرتی کی محبت اور گیت کا پریم بھر دیا ہے۔ اور پنجاب کی جنتا میں یہ خصوصیات کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہیں۔

ہندی ڈرامے کی روایت

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہندی ادب میں جدید دور کی ابتدا ڈرامے سے ہوئی جدید ہندی ادب کے پیشرو بھارتیندو ہرلش چندر (۱۸۵۰ء - ۱۸۸۵ء) اور ان کے معاصرین نے جو ادبی تخلیق کی وہ زیادہ تر ڈرامے کی شکل میں ہے۔ ان سے پہلے بھی ہندی میں چند ایک ڈرامے لکھے گئے۔ راجا لکشمن سنگھ کا لکھا ہوا ڈرامہ 'شکنتلا' ۱۸۶۲ء میں شائع کیا گیا اور اب بھی اسے کالیداس کے اس غیر فانی ڈرامے کا بہترین ہندی ترجمہ خیال کیا جاتا ہے۔ سیتل پرشاد ترپاٹھی

نے 'جانکی منگل' نامی ایک اور ڈرامہ سپرد قلم کیا جو ۱۸۶۸ء میں اسٹیج کیا گیا اور اس میں سب سے اہم پارٹ بھارتیندو ہریش چندر نے ادا کیا۔

بھارتیندو ہریش چندر کی تصانیف میں ان کی طبع زاد تحریروں کے علاوہ سنسکرت، بنگالی اور انگریزی کی کتابوں کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ انھوں نے پہلا ہندی ڈرامہ "ودیا سندر" بنگالی سے ترجمہ کیا تھا اور یہ ۱۸۶۸ء میں شائع کیا گیا۔ ان کا ڈرامہ "دُرلبھ بندھو" شیکسپیر کے ڈرامہ "مرچنٹ آف وینس" کا کامیاب ترجمہ ہے۔ انھوں نے تقریباً بیس ڈرامے لکھے اور ان کے موضوعات انھوں نے دیو مالا، تاریخ، جدید زندگی اور ذاتی تجربوں سے حاصل کئے۔ "بھارت درد شا" میں انھوں نے طنزیہ و پُرسوز انداز میں ملک کی سیاسی گراوٹ کا نقشہ کھینچا ہے۔

بھارتیندو نے اپنے ڈراموں میں بھارتی ڈرامہ کی کلاسکی اور مغربی روایتوں کے ڈرامہ کی روایات کا امتزاج پیش کیا ہے۔ ڈرامے اسٹیج کرنے میں بھی انھوں نے رہنمائی کی اور اسٹیج پر قدرتی مناظر پیش کرنے اور جدید اسٹیج کے دیگر ضروری سامان کے استعمال کو رواج دیا۔ وہ ایک کامیاب ایکٹر بھی تھے اس لئے ان کے تمام ڈرامے اسٹیج پر پیش کئے جانے کے قابل ہیں۔ ادب کے میدان میں بھارتیندو کے پیروؤں نے بنارس، کانپور اور کلکتہ کے مقامات پر شوقیہ ڈرامے کھیلنے والے نو آموز فنکاروں کی ڈرامائی سوسائیٹیاں قائم کیں۔ ان سوسائٹیوں نے بھارتیندو اور ان کے ہمعصروں کے لکھے ہوئے ڈراموں کو اسٹیج کیا۔ ڈرامہ نویسی میں بھارتیندو کی پیروی کرنے والے دیگر مصنفوں نے ہندی میں کئی ڈرامے لکھے جن میں رادھا کشن داس کا ڈرامہ "مہارانا پرتاپ" اسٹیج پر کافی کامیاب رہا۔

بھارتیندو کے زمانے کی سرگرمیوں کے بعد ہندی ڈرامے کی رفتار ترقی مدھم پڑ گئی اور جے شنکر پرشاد کے میدان میں آنے تک صرف چند ایک طبع زاد ڈرامے لکھے گئے البتہ اس دوران دوسری زبانوں کے کئی ڈراموں کا ہندی میں ترجمہ کیا گیا۔ ڈی۔ ایل رائے کے بنگالی ڈراموں کا ہندی میں ترجمہ کیا گیا اور یہ ڈرامے بہت مقبول ثابت ہوئے۔ جی۔ پی سری واستو نے مولئیر کے ڈراموں کا ترجمہ کیا اور یہ بھی بہت کامیاب ثابت ہوئے۔

جے شنکر پرساد نے زیادہ تر تاریخی ڈرامے لکھے ہیں اور ان کے ڈراموں کے موضوعات بھارت کی تاریخ کے سنہری زمانہ عہد گپتا اور عہد موریا سے متعلق ہیں۔ انھوں نے بالخصوص سماج کے اس طبقہ کے لئے ہی ڈرامے لکھے جو ثقافتی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ تاہم جے شنکر کی تصانیف نے ہندی میں ڈرامے کی روایات کی بنیادیں صحیح معنوں میں رکھ دیں۔ لکشمی نرائن مصرا نے اپنے ڈراموں میں زندگی کے مختلف مسائل کو چھیڑا ہے۔ ان کے ڈراموں میں برنارڈ شا اور ابسن کی تصانیف کا اثر موجود ہے۔ سیٹھ گووند داس نے بھی چند ایک سماجی و تاریخی ڈرامے لکھے ہیں لیکن ہندی ادب میں سماجی ڈراموں کی بنیادیں درحقیقت ایک ایکٹ کے ڈراموں کے منظر عام پر آنے سے رکھی گئی ہیں۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے کھیلنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ اس لئے یہ بہت مقبول ثابت ہوئے اور ہندی کے تقریباً سبھی جدید مصنفوں نے ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھنے پر قلم آزمایا ہے۔ بھگوتی چرن ورما، رام کمار ورما، اپیندر ناتھ اشک اور جگدیش چندر ماتھر بعض ایسے مصنفین ہیں جنھوں نے ہندی میں ایک ایکٹ کے بہترین ڈرامے لکھے ہیں اور یہ ڈرامے شوقیہ ڈرامہ کھیلنے والے فنکاروں کی ڈرامائی کلبوں میں بہت مقبول ثابت ہوئے ہیں۔ ریڈیو نے بھی ہندی ڈرامہ کی ترقی میں اپنا پارٹ ادا کیا ہے اور ہونہار ہندی مصنفین ڈرامے لکھنے کی طرف شوق سے متوجہ ہوئے ہیں۔

بنگال میں ڈرامائی روایت

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح بنگال کی قدیم ڈرامائی روایت پر بھی سنسکرت روایت اثر انداز ہوئی جس طرح آسام میں "پری جات ہرن" اور "ودیا دلاپ" جیسی تصانیف دریافت ہوئی تھیں۔ اسی طرح ہندوستان کے دوسرے مختلف حصّوں میں بھی بنگال کی قدیم ڈرامائی کتابوں کے نشانات پائے گئے۔ البتہ عہد مغلیہ میں ڈرامہ روبہ تنزل رہا اور اس کی تجدید صرف چیتنیہ کے زمانے میں ہوئی۔ ایک دھارمک ڈرامہ میں جو چیتنیہ اور اس کے ساتھیوں نے پیش کیا تھا خود چیتنیہ نے رکمین کا پارٹ ادا کیا، ان کے ایک دوست راما نند رائے نے "جگن ناتھ ولبھ" اور ان کے ایک چیلے روپ گوسوامی نے "ودھا دامادھو" اور "للت مادھو ناٹک" کے ڈرامے لکھے

چونکہ ڈراما امرا کی براہ راست سرپرستی سے محروم ہو گیا اس لئے ڈرامائی روایت کو زندہ رکھنے والے صرف یاترہ۔ کرشن کیرتن۔ کوی اور پنچالی تھے۔ کرشن یاترہ کلیا دامن کے نام سے مشہور تھے لیکن اس میں سری

کرشن کی زندگی سے متعلق دوسری کہانیاں بھی درج تھیں۔ بنگالی کرشن کیرتن کا اثر دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گیا اور آج تک بھی اس کے اثرات منی پور میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن بعد میں جاتروں کو زوال آ گیا اور عوام کی قبولیت سے محروم ہو گئے۔ بنگال میں موجودہ تھیٹر کی بنیاد کلکتہ میں انگریزی آبادکاروں نے رکھی اور وہاں تھیٹر قائم کئے۔ ۱۷۹۵ء میں ایک روسی لیبی ڈف نے اپنے ساتھی گولک ناتھ داس کی امداد سے ایک بنگالی تھیٹر قائم کیا۔ لیکن بنگالی کا پہلا حقیقی تھیٹر نوین چندر بوس نے ۱۸۳۳ء میں اپنے شام بازار والے مکان میں قائم کیا تھا۔

بنگالی ڈرامے نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی اور سیاسی ماحول کی وجہ سے اس کے ذریعے حب الوطنی کے جذبات و خیالات کی اشاعت ہوئی۔ اس سلسلے میں تھیٹر حکومت کی سختی کی زد میں آ گیا۔ ۱۸۷۶ء میں "سرندر ونودینی" کا ڈرامہ پیش کرنے والوں پر مقدمہ چلایا گیا اور اسی سال ڈراموں کے سلسلے کو دبانے کے لئے "ڈراماٹک پرفارمینس ایکٹ" بنایا گیا۔

لیکن اس سے بھی تھیٹر کو کوئی ضعف نہ پہنچا بلکہ فروغ حاصل ہوا کیونکہ گریش چندر گھوس اور ڈی ایل رائے جیسے ڈرامہ نویسوں نے اس کے لئے زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ ڈی۔ ایل رائے کے تاریخی ڈراموں کا ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا اور وہ عوام میں مقبول ہوئے۔ تاریخی ڈرامے بتدریج ایسے ڈراموں میں تبدیل ہو گئے جن میں سماجی حقیقت پسندی کا عنصر نمایاں ہوتا۔ ایبسن اور شا دبوجین اونیل اور پیرانڈلو نے دائرہ نظر کو اور بھی وسعت بخشی۔ گزشتہ بیس برس کے دوران سچین سین گپتا۔ بدیا یاک بھٹا چاریہ اور من متھا راے تے عوام میں ہردلعزیز رہے۔ بعض مشہور ناول نویسوں مثلاً تارا شنکر باندو پادیا نے اپنے ناولوں کو اسٹیج پر پیش کرنے کے لئے تھیٹر کی ضروریات کے مطابق تبدیل کر لیا۔ اسی طرح سرت چندر کے ناولوں کو بھی ایسی زبان میں ڈھال لیا گیا ہے۔

بنگال میں تھیٹر کی ترقی وارتقا میں ٹیگور کے خاندان نے بہت اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ شہزادہ دوارکاناتھ ٹیگور جو رنگی تھیٹر کے سرپرست رہے۔ ان کے فرزند دوندر ناتھ ٹیگور کے گھر کا جوراسنکو نامی تھیٹر نوعمر ڈرامہ نویسوں کا ایک مقبول عام مرکز بن گیا۔ خود رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے ڈراموں کے ذریعے ڈراماتی تکنیک اور احساسات کو پاکیزگی بخشی۔ ان کے ڈرامہ رقص اور علامتی ناٹک کو اعلیٰ پایے کی نظم اور سنگیت کی وجہ سے امتیاز کا رتبہ حاصل رہا۔

کرالا میں ڈرامے کی روایت

ڈرامے کا جو مطلب آج کل سمجھا جاتا ہے ایسا ڈرامہ کیرالا میں موجودہ صدی میں ہی ظہور میں آیا اس کا سبب یہ ہے کہ کیرالا ناٹیا ناٹک ڈراماتی روایت کے متعلق عوام کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ اس روایت کی ابتدا کلسر کے ڈراموں کے ساتھ ہوئی جن میں میلوں کے موقع پر مندروں میں قومی داستانیں رزمیہ نظموں کی صورت میں پیش کی جاتی تھیں۔ ان نظموں میں مقامی واقعات اور اہم عصروں کے حالات نہایت خوبی سے بیان کئے جاتے ہیں۔ اور شروع سے ہی ان میں حقیقت پسندی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ کنجن نمبیار نے اس روایت کو برقرار رکھا۔ انھوں نے ساٹھ سے بھی زیادہ ٹھلال لکھے ہیں۔ ٹھلال ایک طویل نظم ہوتی ہے جو ماہرین رقص ناچ کے ساتھ گاتے اور اس کے مطابق سوانگ بھرتے ہیں۔ ٹھلال روایات کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے ساتھ صرف ایک اداکار کے ذریعے تمثیل کا فن کمال کو پہنچ گیا۔ ٹھلالوں میں ہم عصروں کی زندگی بیان کی جاتی اور نمبیار مختلف طبقوں کے لوگوں پر کڑی نکتہ چینی کرتے۔ جن میں پجاریوں کا ذکر ہوتا جو ویدوں کے خزانۂ علم پر اپنا پیدائشی حق جتلاتے اور اس میں بلیک مارکیٹ کے مرتکب ہوتے تھے۔ امرا کے زوال کو جو نفس پرستی اور خودنمائی کا شکار ہو رہے تھے ان ٹھلالوں میں دلکش پیرایہ میں بیان کیا جاتا۔ نیز زیادہ قیمتیں وصول کرنے والے تاجروں کی داستانیں اور ایسے سرکاری افسروں کی کہانیاں بیان کی جاتی تھیں جو اپنے آقاؤں اور عوام الناس دونوں کو دھوکا دیتے تھے۔

کتھاکلی کرالا کے ناٹیا ناٹک کی نہایت ترقی یافتہ تصویر ہے۔ فی الحقیقت یوروپین اوپرا کی مانند کتھاکلی بھی نظم۔ ڈرامہ۔ سنگیت اور تھیٹر کے دیگر ضمنی آرٹ مثلاً میک اپ اور لباس وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ البتہ ٹھلال کی طرح اس میں صرف ایک فرد ہی سوانگ نہیں بھرتا۔ اس میں اتنے ہی ایکٹر کام کرتے ہیں جتنے کہ ڈرامے میں کیریکٹر ہوتے ہیں۔ چونکہ پلاٹوں کا ایک نمایاں اور عام پہلو نہ بھی تھا کہ مخالف کیریکٹروں میں تصادم ہو۔ اس لئے اوپرا میں عمل کا عنصر بہت زیادہ ہوتا تھا۔

ڈرامے کی موجودہ روایت' کلاسیکل روایت کے تماشاؤں اور ڈراموں

کے ترجموں کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی - کالیداس کی تصانیف کے متعلق "شکنتلا" کے چار اور "مالاولیا گنترا" "وکرم اور روسیا" کے تین تین ترجمے موجود ہیں - ہرش کی تصانیف "رتناولی" "ناگانند" اور "پریادرشیکا" کے دو دو آزادانہ ترجمے کئے گئے - نیز شدرکا کے ڈرامہ "مرچ چک تیکا" مراری کے ڈرامہ "انارگھراگھوا" اور جے دیو کے ڈرامہ "پرسن راگھوا" کا بھی ترجمہ کیا گیا - لیکن سنسکرت سے کئے گئے ان ترجموں میں پرانی روایت کے سنگیت اور ناچ موجود نہ تھے - اس لئے سنگیت ڈرامہ کی ایک الگ روایت کو فروغ حاصل ہوا - شکنتلا کا بھی اسی طریقے پر ترجمہ کیا گیا - اور ایسی مقبول عام دیگر تخلیقی روایتوں میں چکرپانی وزیر کی تصانیف "ہریش چندر چرتیا" اور اچھوت مینن کی تصانیف "سنگیت نائی شادھا" شامل ہیں -

جب سی - وی رمن پلے نے مزاحیہ ڈراموں اور پراہنساؤں کا سلسلہ شروع کیا تو لوگوں کے مذاق میں ایک نیا انقلاب پیدا ہوا - ان سے تیز و ترش سماجی حقیقت پسندی نمبیار کے ٹھلاوں کا طنز و ہجو اور چمک دمک کا سماں بندھ گیا - اور اسی وجہ سے اُسے بہت جلد مقبولیت حاصل ہوئی - ان میں سنگیت کو چھوڑ کر نثر کو ذریعۂ بیان بنایا گیا جو پائیدار ثابت ہوا -

اس زمانے کے ڈراموں نے اس روایت کو طویل زندگی دی لیکن ایک گہرا اختلاف بھی پایا جاتا ہے - سماج کے متعلق گہری واقفیت ہونے کے سبب رامن پلے کے ڈراموں کی آب و تاب اور بھی بڑھ گئی ہے - بذلہ سنجی بھی اسی طرح پُرلطف ہے لیکن اب اس کا راز براہ راست غیر سماجی عناصر اور ان کے کردار پر ہے - اس نئی روایت میں زور بھی ہے کیونکہ اس میں گہری ذمہ داری کا احساس پایا جاتا ہے - اس نئی تخلیق میں آرٹ سماجی دنیا کو دلی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی راہ نکالتا ہے -

---

چھوٹی چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی ترقی

حکومتِ ہند نے چھوٹے پیمانے اور گھریلو صنعتوں کی ترقی کے سلسلے میں مزید مالی امداد اور قرضے منظور کئے ہیں -

آل انڈیا کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز بورڈ کو ۸۹ ہزار روپے کی امداد اور ۶۷ ہزار روپے قرض دیا گیا ہے - اس رقم سے ہاتھ سے اعلیٰ قسم کا کاغذ بنانے والے پیداواری مرکزوں کے لئے ساز و سامان خریدا جائے گا - بورڈ کو کھادی کے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں دس ہزار روپیہ اور بھی دیا گیا ہے -

کھجور کے گڑ کی صنعت کی ترقی کے لئے مغربی بنگال کو ۶۵٬۷۵۰ روپے کی' اندھرا کو ۵۰۰۵۰ روپے کی' اتر پردیش کو ۳۵۹۵۰ روپے کی' اور اجمیر کو ۱۷٬۴۶۰ روپے کی مالی امداد دی گئی ہے - آہن گری کی صنعت کی ترقی کے سلسلے میں مغربی بنگال کو ۲۳۸۵۰ روپے کی امداد اور ۱۸ ہزار روپے قرض دیا گیا ہے - اڑیسہ کو آہن گری اور ویلڈنگ کا کارخانہ قائم کرنے کی غرض سے ۸۵۸۵ روپے کی امداد دی گئی - بارداہیں ناریل کے ریشے کی صنعت کے اسکول کی پختہ عمارت تعمیر کرنے کے لئے اندھرا کو ۲۹۵۰۰ روپے کی امداد دی گئی -

حکومت نے ۱۹۵۴-۵۵ء کے لئے صنعت میں فن کاری کی انڈین انسٹی ٹیوٹ کے لئے بھی امداد منظور کی ہے - یہ امداد اس رقم کے برابر ہوگی جو ریاستی حکومتوں کے سوا یہ انسٹی ٹیوٹ صنعتی اداروں اور دیگر وسائل سے جمع کرے - لیکن اس امداد کی رقم ۲۵۷۷۰ روپے سے زیادہ نہ ہوگی -

حکومت نے پانڈیچری اور کاریکل میں ہاتھ سے بنے ہوئے کپڑے کی فروخت پر کٹوتی کے سلسلے میں دس ہزار روپے کی امداد منظور کی ہے -

پنج سالہ پلان

نمبر ۶

آب رسانی

س - کاشت کار کے کھیتوں کے لئے پانی ایک بہت بڑی ضرورت ہے - آب رسانی کے سلسلے میں پلان میں اس کے لئے کیا انتظام کیا گیا ہے ؟

ج - توقع کی جاتی ہے کہ ۱۹۵۰ء میں جس قدر زمین کے لئے پانی مہیا کیا گیا تھا - موجودہ پلان اس سے ۱۹٫۷ ملین زیادہ ایکڑ زمین کے لئے آب رسانی کا انتظام کرے گی - جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ۴٫۴ ملین ٹن مزید اناج دیا اس کے برابر دوسری فصلیں پیدا ہوں گی -

س - دریائی وادیوں کے پراجیکٹوں سے جو اس وقت زیر تعمیر ہیں پلان کی مدت کے دوران میں اور اس کے بعد مکمل ہو جانے پر کن کن فائدوں کی توقع ہے ؟

ج - دریائی وادیوں کے بڑے بڑے پراجیکٹوں سے جو اس وقت زیر تعمیر ہیں توقع ہے کہ وہ پلان کے آخری سال تک ۸٫۵ ملین ایکڑ مزید رقبے کو سیراب کریں گے اور ۱٫۰۸ ملین کلو واٹ مزید بجلی پیدا کریں گے - ان پراجیکٹوں کی تکمیل اور ان کے پوری طرح چل نکلنے کے بعد مزید ۱۶٫۹ ملین ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا اور مزید ۱٫۴ ملین کلو واٹس بجلی پیدا ہوگی

س - وہ کون سے بڑے بڑے آب رسانی اور بجلی کے پراجیکٹ ہیں جو زیر تعمیر ہیں اور پنج سالہ پلان میں شامل کر لئے گئے ہیں ؟

ج - وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

بھاکڑا ننگل پراجیکٹ (پنجاب، راجستھان، پیپسو)

دامودر ویلی پراجیکٹ (پچھمی بنگال اور بہار)

ہیرا کڈ ڈیم پراجیکٹ (اڑیسہ)

تنگ بھدرا پراجیکٹ (مدراس اور حیدرآباد)

دور بھوانی پراجیکٹ (مدراس)

میور اکھشی (پچھمی بنگال)

لوئر تاپتی ویلی پراجیکٹ (بمبئی)

مچ کنڈ ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ (اڑیسہ اور مدراس)

سارد ا پاور ہاؤس (یو پی)

س - وہ کون سے بڑے ۵ پراجیکٹ ہیں جنھیں پلان میں آخری دو سال میں شامل کرنے کے لئے چنا گیا ہے -

ج - چمبل پراجیکٹ (سٹیج ۱) (مدھیہ بھارت اور راجستھان)

کوسی پراجیکٹ (سٹیج - ۱) (بہار اور نیپال)

کوئنا پراجیکٹ (سٹیج - ۱) (بمبئی)

ریہاند پراجیکٹ (یو پی)

کرشنا پراجیکٹ (مدراس اور حیدرآباد)

س - چھوٹے چھوٹے آبپاشی کے کاموں کا کیا نتیجہ نکلے گا ؟

ج - توقع یہ کی جاتی ہے کہ آبپاشی کے چھوٹے کام ۱۱٫۲ ملین ایکڑ مزید زمین کو زیر آب رسانی لائیں گے اور ۴٫۲ ملین ٹن اناج ان سے پیدا ہوگا -

س - پلان میں آب رسانی کے جو چھوٹے اور بڑے پراجیکٹ شامل کئے گئے ہیں وہ ایک دوسرے پر دارو مدار رکھتے ہیں یا اُن کا آپس میں مقابلہ ہے ؟

ج - آبپاشی کی بڑی اور چھوٹی اسکیموں میں کوئی کشمکش نہیں ہے - ہر علاقے کو اسی قسم کی اسکیم کے تحت لایا جائے گا جو اس کے لئے موزوں ترین ہے - اس لئے بڑی اور چھوٹی اسکیمیں ایک دوسرے پر دارو مدار رکھتی ہیں -

س - ایسے کون سے طریقے ہیں جن سے عوام ان پراجیکٹوں کی کامیابی میں اپنا حصہ ادا کر سکتے ہیں ؟

ج - عوام مندرجہ ذیل طریقوں سے اپنا حصہ ادا کر سکتے ہیں -

(۱) آبپاشی کے بڑے پراجیکٹوں میں روپیہ لگانے کے لئے خاص طور پر جو

قرضہ دیا جائے - اس میں اپنا روپیہ دے کر -

(۲) بہبود کی فیس اور پانی کے بڑھے ہوئے نرخ ادا کر کے -

(۳) نہریں کھودنے اور سڑکیں بنانے کی قسم کے کاموں کے لئے دیہاتی کوآپریٹو سوسائٹیاں بنا کر -

(۴) آب رسانی کے سرکاری پانی کا بکفایت استعمال کر کے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا کر -

(۵) آبپاشی کے نجی ذرائع کو ایک مناسب، اچھی حالت میں رکھنے سے -

س - ہندوستان کے قریباً ۵۶۰۰۰۰ دیہات میں سے صرف ۳۰۰۰۰ میں بجلی مہیا کی گئی ہے - دیہات تک بجلی پہونچانے کے متعلق پلان میں کیا کہا گیا ہے ؟

ج - پلان میں یہ کہا گیا ہے کہ دیہات میں بجلی پہنچانے کے کام کو بہت بڑی اہمیت دی گئی ہے - کیونکہ اس سے صرف زراعت کے طریقوں ہی میں ترقی نہیں ہو سکتی اور صرف گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی حالت ہی بہتر نہیں بنائی جاتی بلکہ دیہاتی علاقوں میں زندگی کو دلکش بھی بنایا جا سکتا ہے - یہ تجویز کیا گیا ہے کہ دیہاتوں میں بجلی مہیا کرنے اور بجلی کا سامان خریدنے کے لئے حکومت کی طرف سے کسانوں اور دیہاتی کوآپریٹو سوسائٹیوں کو قرضے دئے جائیں -

---

ریلوے بجٹ

مرکزی وزیر ریلوے مسٹر لال بہادر شاستری نے لوک سبھا کے اجلاس میں سال ۱۹۵۵-۵۶ء کے لئے ریلوے بجٹ پیش کیا - اُنھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ دوسرے، درمیانی اور تیسرے درجے کے مسافروں کے کرایے کی نئی شرحیں سفر کے فاصلے کے لحاظ سے مقرر کی گئی ہیں - مسافت کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے - ۳۰۱ میل یا اس سے زائد سفر کے لئے کرایہ گھٹ جائے گا - ۱۵۰ میل تک کے سفر کے لئے کرایے میں قدرے اضافہ ہوگا - لیکن ۱۵۱ میل سے ۳۰۰ میل کے کرایے میں کوئی ردو بدل نہ ہوگا - ایر کنڈیشنڈ کلاس کا کرایہ بھی بڑھ جائے گا - ان تبدیلیوں کے باعث مسافروں سے وصول کئے جانے والے کرایے کی کل آمدنی میں کوئی خاص اضافہ ہونے کی توقع نہیں ہے - انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ جنگ کے بعد پہلی مرتبہ چھٹیوں کے دنوں میں ریل کے رعایتی واپسی ٹکٹ جاری کرنے کا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے - آئندہ دسہرے اور دیوالی کے تیوہار پر ایسے ٹکٹ جاری ہوں گے - وزیر ریلوے نے مزید اعلان کیا کہ پلیٹ فارم ٹکٹوں کی قیمت یکم اپریل سے دو آنے کے بجائے ایک آنہ فی ٹکٹ کر دی جائے گی -

ریلوے - بجٹ ایک نظر میں

کروڑ روپیوں میں

	حقیقی ۱۹۵۳-۵۴ء	بجٹ ۱۹۵۴-۵۵ء	نظرثانی شدہ تخمینہ ۱۹۵۴-۵۵ء	بجٹ ۱۹۵۵-۵۶ء
کل تجارتی آمدنی	۲۷۴٫۲۹	۲۷۳٫۲۵	۲۸۲٫۸۰	۲۹۲٫۵۰
کاروباری اخراجات	۲۰۱٫۷۵	۱۹۴٫۵۳	۲۰۲٫۹۵	۲۰۶٫۸۰
کل متفرق اخراجات	۵٫۶۲	۸٫۰۸	۸٫۳۲	۷٫۴۹
ٹوٹ پھوٹ کے ریزرو فنڈ کے لئے رقم	۳۰٫۰۰	۳۰٫۰۰	۳۰٫۰۰	۳۵٫۰۰
میزان اخراجات	۲۳۷٫۳۷	۲۳۲٫۶۱	۲۴۱٫۲۷	۲۴۹٫۲۹
ریلوے کا کل منافع	۳۶٫۹۲	۴۰٫۶۴	۴۱٫۵۳	۴۳٫۲۱
عام محاصل کے لئے منافع	۳۴٫۳۶	۳۵٫۵۰	۳۴٫۹۶	۳۶٫۰۷
خالص بچت	۲٫۵۶	۵٫۱۴	۶٫۵۷	۷٫۱۴

بیٹیگری کرشنا شرما

گُل کدہ

ملّما کا مہابھارت ——— (کنڑا)

یہ زندگی کتنی دلچسپ اور عجیب ہے۔ اگر ہم ایک عام انسان کی زندگی کے رازوں کو غور سے دیکھیں تو رنج و مسرّت، غم و آسودگی کی کتنی تصویریں ہمیں نظر آئیں گی۔ اگر چشمِ ظاہران کو دیکھ سکتی تو ارتقائے انسانی اس قدر سست رفتار نہ ہوتا۔ ان احساسات کو چشمِ ظاہر سے پوشیدہ رکھنے میں نہ جانے اس کائنات کے خالق کا کیا مقصد ہے۔

ہمارے گھر کی ماما کا نام ملّما ہے۔ وہ پندرہ بیس برس سے اس گھر میں رہتی ہے۔ اپنی جھونپڑی میں کام ختم کرکے اور اپنے بچّے کے کھانے کا انتظام کرکے وہ ہمارے گھر پر صبح سات بجے کے قریب پہنچ جایا کرتی ہے۔

نئے شادی شدہ جوڑوں کی طرح رُکمنی اور میں بہت خوش خوش رہا کرتے تھے۔ ملّما ہماری اس مسرّت آمیز زندگی سے خود بھی خوش ہوتی اور کبھی کبھی ہمارے قہقہوں میں بھی شامل ہو جاتی۔ لیکن بعض اوقات یہ معلوم ہوتا کہ وہ کسی گہری تشویش میں مبتلا ہے۔ وہ ہماری ہنسی مذاق سے بظاہر لطف اندوز ہوتی لیکن ایک آہ بھر کر رہ جاتی۔ کئی دفعہ اُس نے رُکمنی سے کہا "ہماری کاشی بھی آپ جیسی ہی تھی"۔

میری غیر حاضری میں وہ رُکمنی سے گھریلو معاملات کے متعلق گفتگو کیا کرتی۔ میں نے دیکھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ملّما کے لئے رُکمنی کی محبت، ہمدردی اور مہربانیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

پچھلے اتوار دفتر کا کوئی کام میں گھر پر نہیں لایا تھا۔ شرارت جو سُوجھی میں نے رُکمنی کو اس طرح سے بُلایا جیسے مجھے اس سے نہایت ضروری کام ہے۔ وہ کچن سے بھاگی بھاگی اشتیاق و تشویش کا مجسّمہ بن کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ لیکن جب اُسے علم ہوا کہ یہ محض ایک مذاق تھا، وہ واپس چلی گئی۔ جاتے جاتے اُس نے ملّما کی گود میں بچّے کو محبت آمیز نظروں سے دیکھا، اور اُسے ایک ہلکی سی تھپکی دی۔

ملّما نے نہایت ادب و احترام سے مجھ سے کہا۔

"جس طرح میں آپ کو خوش و خرّم دیکھتی ہوں مجھے اپنی کاشی اور شبولنگ یاد آجاتے ہیں"۔

میں نے بار بار کاشی کا نام سنا تھا۔ آخر کار میں نے ملّما سے کہا: "یہ کاشی آخر کون"؟

"سرکار یہ شبولنگ کی بیوی کا نام ہے"۔

"اچھا تو یہ شبولنگ کون ہے"؟

"تو کیا آپ میرے بیٹے شبولنگ کو نہیں جانتے"۔

"اچھا تو تمھارے بیٹے کا نام شبولنگ ہے۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے"۔

ملّما اس سوال سے بہت سٹپٹائی۔ اس نے حسرت آمیز لہجے میں کہا: "اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ بڑی مسرّت آمیز زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد ایک ایسا سیلاب آیا کہ سب کچھ سمیٹ کر لے گیا۔ ہم لوگوں کا جینا بھی کیا جینا ہے۔ ہم محض اس لئے زندہ ہیں کہ ہمیں موت نہیں آتی"۔

ملّما کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے غم کو دیکھ کر میں خود رنجیدہ خاطر ہو گیا تھا۔ اُسے تسلّی دیتے ہوئے میں نے پوچھا: "تمھاری بہو ہے کہاں"؟

"سرکار وہ اب کہاں۔ وہ تو ایک سال ہوا مر چکی"۔

"ایشور رحم کرے۔ وہ کس طرح چل بسی"۔

"میں یہ کیا بیان کروں میری سرکار۔ میری کاشی تو لاکھوں میں ایک تھی"۔

"ملّما کیا کوئی جھگڑا ہو گیا تھا، ساس بہو میں"؟

"ایشور نہ کرے۔ وہ میرے بھائی کی لڑکی تھی۔ ہمارے ہی گھر میں پلی اور پروان چڑھی۔ میں اپنی اور اپنے بھائی کی لڑکی میں کب تمیز کر سکتی تھی۔ کاشی جیسی دیوی کو ذرا بھی تنگ کرنے والی ساس چڑیل سے کم نہیں ہو سکتی"۔

"تو کیا میاں بیوی میں کچھ ناچاقی ہوئی تھی"؟

"نہیں، کون اس طرح سوچ بھی سکتا ہے۔ کیا کوئی اس بات کا یقین کرے گا۔ اگر میں کہوں کہ آپ اور بی بی جی کی آپس میں نہیں بنتی۔ میرا بیٹا شبولنگ تو روز زار و قطار روتا ہے اور کہتا ہے کہ کاشی کے بغیر اس کی زندگی غیر دلچسپ ہو گئی ہے"۔

ملّما جُوں جُوں کاشی کی تعریف کر رہی تھی اور اسی کی خوبیاں گِن رہی تھی، میرے دل میں کاشی کی موت کا سبب معلوم کرنے کا اشتیاق بڑھ رہا تھا۔

"تو پھر تمھاری بہو پر کیا گزری؟"

"وہ تو پانڈوؤں کے بن باس کی کہانی ہے۔ آپ یہ کہانی سن کر کبیدہ خاطر ہوں گے۔"

میں نے تصوّر میں ملّما کی طرح ایک عمر رسیدہ عورت کا خیال کیا۔ یہ خیال غالبًا پانڈووں کی ماتا کُنتی کا تھا۔ میں نے ایک کُرسی کھینچی اور ملّما کے سامنے رکھ دی اور پھر اُسی سے محوِ گفتگو ہو گیا۔

"ملّما، کاشی کی کہانی سننے کے لیے اب میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا ہے۔ تم اسے جلدی بیان کرو۔"

"سرکار مجھے معاف فرمائیے، یہ دیوتاؤں یا مہاتماؤں کی کہانی نہیں لیکن جب کوئی اس کہانی کو ہمدردی اور صبر سے سنتا ہے تو مجھے ایک گونہ تسلّی ہوتی ہے۔"

میرا شولنگ اور کاشی خوش خوش زندگی گزار رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے بے انتہا محبّت کرتے تھے۔ شولنگ کھیتوں سے جب دیر کر کے آتا کاشی میرے مجبور کرنے کے باوجود اس کے بغیر کھانے کو ہاتھ نہ لگاتی۔ یہی حال شولنگ کا تھا۔ اگر کاشی نہ ہوتی تو وہ کھانے کی طرف آنکھ نہ اُٹھاتا۔ مجھے بعض اوقات اس بات سے تکلیف بھی ہوتی لیکن میں اندر ہی اندر ان کی محبّت کو دیکھ کر خوش ہوتی۔ ان دونوں کو یکجا دیکھ کر میں مسرّت سے پھُولی نہ سماتی۔

کاشی غیر معمولی طور پر خوبصورت تھی۔ وہ آرٹ کے بہترین مجسّمے سے بھی زیادہ جاذبِ نظر تھی۔ جب وہ گہرے سبز رنگ کی ساری اور بُوٹیوں والی چولی پہنتی تو اُسے بے اختیار چومنے کو جی چاہتا۔ اس کی مسکراہٹ سے اس کا چہرہ ایک شگفتہ پھُول کی طرح کھِل اُٹھتا۔

ہم کبھی اتنے امیر نہ ہوئے کہ کافی زمین اور جائداد کے مالک ہوتے۔ زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ ہماری ملکیت تھا۔ بیلوں کی ایک جوڑی سے ہم آپ ایسوں کی زمین کاشت کرتے۔ شولنگ اس زندگی سے مطمئن تھا لیکن ایشور کی مرضی کچھ اور تھی۔ تھوڑی مدّت ہی میں یہ خاندان تباہ حال اور برباد ہو گیا۔ اس وقت وہ اپنے رنج او غم کو ضبط نہ کر سکی۔ لیکن میں پورے طور پر متوجہ تھا۔

"ہماری زمین سے ملحقہ فارم رُدرایا کی ملکیت ہے، جو گاؤں کے پٹیل کا داماد ہے۔ رُدرایا کے متعلق گاؤں میں بہت سی باتیں اُڑتی تھیں لیکن چونکہ وہ ایک بڑا آدمی تھا۔ گاؤں کے لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ کاشی کاشت میں ہماری مدد کرتی۔ یا تو وہ بیلوں کے لیے چارہ لاتی یا کھیتی کی رکھوالی کرتی۔ ہماری عورتیں آپ کی بڑی عورتوں کی طرح گھر میں خالی ہاتھ نہیں بیٹھ سکتیں۔ ہمارے کھیت دُور دُور فاصلے پر تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کسی نہ کسی کھیت کی رکھوالی کرتا لیکن میں کاشی کو اپنے ذاتی کھیت کی رکھوالی کے لیے بھیجتی کیونکہ وہ گاؤں سے نسبتاً قریب تھا۔

کاشی مجھے بارہا کہتی کہ میں خود اپنے کھیت پر جایا کروں اور وہ کسی دوسرے کھیت پر جایا کرے۔ میں سمجھتی کہ وہ میری عمر کا خیال کر کے یہ تجویز پیش کرتی ہے۔ میں اس کی درخواست کو ٹھکرا دیتی۔ جس سے وہ رنجیدہ بھی ہوتی۔ وہ بغیر کوئی عذر کیے اپنے کھیت کو چلی جاتی لیکن ایک دن اس نے مجھے اور شولنگ سے کہا۔

ہمارا پڑوسی رُدرایا مجھ سے کچھ بیہودہ باتیں کرتا ہے۔ مجھے کسی دوسرے کھیت کی طرف بھیج دیجیے۔ اس وقت مجھے اس کی پہلی درخواستوں کی وجہ معلوم ہوئی۔ میں نے اور شولنگ نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی کھیت پر بھی نہ جایا کرے اور گھر پر رہے۔ یہ پچھلی فصل کٹائی کے زمانے کا ذکر ہے۔

وقت کے ساتھ ہم کتنی باتیں بھُول جاتے ہیں۔ ہم بھی رُدرایا کے متعلق سب کچھ بھُول گئے۔ کاشی ایک بچے کی ماں بننے کی امید سے بہت خوش خوش نظر آتی۔

پچھلی فصل بڑی حوصلہ افزا تھی۔ شولنگ بیلوں کے ساتھ کھیت پر تھا۔ میں ملیریا میں مبتلا بستر پر تھی پھر بھی میں سب کے لیے کھانا پکاتی۔ کاشی پرندوں کے اُڑانے کے لیے صبح کے وقت ہی اپنے کھیت پر جاتی اور دوپہر تک واپس آتی۔ کئی بار اُسے خود کھانا نصیب نہ ہوتا۔ وہ شولنگ کے لیے کھیتوں پر کھانا لے جاتی۔ بچّہ پیدا ہونے کے دن قریب آئے تو بیچاری کو نہ آرام ملا اور نہ وقت پر کھانا۔ ہم غریب آدمی نوکر رکھنے کی خواہش کے باوجود نوکر نہیں رکھ سکتے۔ کاشی اسی طرح کام کرتی چلی گئی اور شکایت کا ایک لفظ بھی زبان پر نہ لائی۔ ایک رات اس نے مجھ سے کہا۔

ماناجی وہ رُدرایا پھر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے مجھے تو خوف معلوم ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے میں کل سے باہر کھیت پر نہ جاؤں۔ میں کاشی کے ان الفاظ سے حیرت زدہ ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔

"کاشی کل تو تمھیں جانا ہو گا تاکہ شولنگ کو اطلاع ہو جائے۔ اس کے بعد تم مت جانا۔ شولنگ چاہے تو کسی کو نوکر رکھ لے۔"

اگلی صبح وہ پَو پھٹتے ہی اٹھی اور بادلِ ناخواستہ کھیت کی طرف

روانہ ہوگئی - میں چاہتی تھی کہ وہ گھر پر رہے مگر میں مجبور تھی - میں مریضہ تھی اور جانوروں اور پرندوں سے کھیتی کو بچانا ضروری تھا - اگر کھڑی کھیتی جانور کھا جائیں تو ہم سال بھر کیا کھائیں گے - یہ افلاس ہے جو یہ سب کچھ کرنے پر ہمیں مجبور کرتا ہے -

کاشی حسب سابق دوپہر تک واپس آگئی - جب وہ گھاس کا گٹھا سر سے اُتار رہی تھی میں نے اُس کے چہرے پر نمایاں تبدیلی دیکھی - اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا - بغیر کچھ کہے وہ اندر گئی اور شولنگ کے لئے کچھ کھانا باندھا - میرے پوچھنے کے باوجود وہ ایک ظاہری ہنسی کے ساتھ بھوکی پیاسی پھر گھر سے نکل پڑی - میں نے دیکھا کہ کاشی کے حواس بجا نہیں تھے - وہ شولنگ کے لئے دال سبزی لے جانا بھی بھول گئی تھی - جب میں نے اس سے کہا تو اس نے بے پروائی سے سبزی لپیٹ کر رکھ لی - میں نے اس سے کہا کہ وہ شولنگ سے کہہ دے کہ وہ کل سے کھیت پر نہیں آئے گی - لیکن وہ میری بات سُنے بغیر چلی گئی - میں بستر پر لیٹی اپنی مجبوری کا ماتم کرتی رہی -

شام ہوگئی تھی - میں کاشی کا انتظار کر رہی تھی - معاً شولنگ مکان میں داخل ہوا - میں اس کی اس غیر متوقع آمد سے متعجب ہوگئی لیکن اس نے غصے کے عالم میں کہا -

کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں آج کھانا ہی نہ کھاؤں - میں سخت حیرت زدہ ہوگئی -

یہ کیسے ہو سکتا ہے - کاشی ایک مدّت ہوئی تمھارا کھانا لے کے گئی ہے - کیا وہ کھیت پر نہیں پہنچی - شولنگ بھی حیرت زدہ ہو گیا -

تو پھر وہ گئی کہاں - میں تو انتظار کرتا رہا لیکن وہ نظر نہیں آئی -

یہ بات ایک ناگہانی مصیبت معلوم ہوئی - میں دم بخود اور خاموش تھی آبدیدہ ہو کر میں نے کہا " کاشی یہاں سے معمول کے مطابق گئی ہے - کاشی میری کاشی "—

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کھیت پر نہ پہنچی " - شولنگ یہ کہہ کے غائب ہو گیا -

میں بے حس و حرکت اس انتظار میں بیٹھی رہی کہ کاشی اب آئی کہ اب آئی - مجھے نہیں معلوم میں نے کب دیا بجھا دیا -

سارا گاؤں خوابِ راحت میں تھا لیکن میرے لڑکے اور بہو دونوں کا کچھ پتہ نہیں تھا - ذرا بھی آہٹ ہوتی تو میں سمجھتی کہ کوئی ان میں سے آ پہنچا ہے - میرے رنج کی انتہا نہ رہی - میں زار و قطار رونے لگی - میں بالکل بے حس و حرکت سی ہوگئی تھی - ایسا ہی عالم مجھ پر اس وقت گزرا تھا جب میرے خاوند کی موت واقع ہوئی تھی -

آدھی رات کے وقت دو تین آدمی شولنگ کو اپنے ساتھ لائے - وہ بے اختیار رو اٹھا اور کہنے لگا " ماں تو نے کاشی کو کہاں بھیج دیا ہے " - میں خاموش تھی - میں نے ان ہمراہیوں سے کاشی کا پتہ پوچھا - انھوں نے کہا کہ انھوں نے گاؤں کا کونہ کونہ چھان مارا ہے مگر اس کا کوئی نشان نہیں ملتا یہ صدمہ میرے لئے جانکاہ تھا - مجھے غش آ گیا -

اگلی صبح سب کاشی کی تلاش میں گئے - وہ شولنگ کو اس بہانے سے چھوڑ گئے کہ وہ میری دیکھ بھال کرے - سارا گاؤں ہماری مدد کے لئے آیا - ہم کسی کو کیا بتاتے - شولنگ تو ایک بُت کی طرح خاموش بیٹھا تھا -

چند گھنٹوں کے بعد میں نے کسی کو سڑک پر زور سے کہتے ہوئے سُنا -

شولنگ کی بیوی کاشی ہمارے باغ کے کنوئیں میں کود پڑی -

شولنگ یہ سُن کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا -

میری کاشی اور کنوئیں میں کود پڑی -

وہ تیر کی طرح گھر سے نکلا اور بہت سے آدمی اس کے پیچھے ہو لئے - مجھے نہیں معلوم مجھ میں طاقت کہاں سے آگئی - میں بھی کنوئیں تک آ پہنچی -

کتنا بھیانک نظارہ تھا - کاشی کا سر اپنی گود میں لئے شولنگ دھاڑیں مار کر رو رہا تھا - بڑا دردناک منظر تھا - میں بھی بچے کی طرح رو اٹھی - لیکن کاشی کسی طرح واپس نہ آسکی - وہ مر چکی تھی اور اس کا نازک جسم پانی سے پھول چکا تھا اس کی آخری رسوم " پنچ نامہ " تو ادا کرنا ایک فرض تھا اور ادا کر دیا گیا - پٹیل آیا - شنو بھوگ اور پنچ بھی آئے - گاؤں کے چپڑاسی تو وہیں تھے - وہ اسی طرح جمع ہوئے تھے جیسے شادی پر آئے ہیں - وہ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور مزے سے پان تمباکو اُڑا رہے تھے - ٹرداپا کا خسر گاؤں کا پٹیل آیا اور بیڑی پیتا ہوا اراپا سوداگر سے کہنے لگا " آج کل بہوؤں کا یہی حشر ہوتا ہے یہ بے فائدہ اپنی جان گنواتی ہیں - گھر کے دوسرے افراد ان کی زندگی میں تو انھیں تنگ کرتے ہیں اور ان کی موت پر شور اور واویلا مچاتے ہیں - یہ دنیا بہت نرالی ہے "

(مارچ آف انڈیا)

نئی کتابیں اور رسالے

رُباعیاتِ محرُوم

منشی تلوک چند محروم دنیائے ادب میں تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی رباعیات کا مجموعہ پہلے ۱۹۴۷ء میں چھپا تھا۔ اب دوبارہ زیورِ طبع سے آراستہ ہُوا ہے۔ کتاب نہایت حسین و جمیل چھپی ہے۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۵۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت فی جلد تین روپے بارہ آنے۔ طبع ثانی کا دیباچہ علّامہ دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے۔ ابو سعید ابوالخیر، خیام، اور سرمد فارسی کے مشہور زمانہ رُباعی گو شاعر ہیں۔ اُردو میں اکبر، حالی، جوش، رواں اور محروم نے اس صنعت میں دادِ سخن دی ہے ۔۔۔ فلسفہ، اخلاق، مذہب، انسان دوستی اور خدا پرستی محروم صاحب کے طبعی موضوعات ہیں لیکن فکر و نظر اور شعر و شاعری کے دوسرے تمام لوازم بھی آپ کی رباعیات میں پورے طور پر موجود ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ گراں قدر مجموعہ اہلِ ملک سے پوری داد حاصل کرے گا اور ملک کی یونی ورسٹیاں جہاں اُردو پڑھائی جاتی ہے، اسے اپنے نصاب میں شامل کرنے کی سعادت حاصل کریں گی۔ ملنے کا پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی نئی دہلی۔

شاید کہ بہار آئی

سیّد علی عبّاس حسینی کا یہ ناول کتابی دنیا لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ قیمت تین روپے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ ضخامت ۲۱۲ صفحے۔ کتابت طباعت اوسط۔

علی عبّاس حسینی بہت پُرانے اور مشّاق افسانہ و ناول نگار ہیں۔ آپ کا نام ہی آپ کی تصنیف کے معیاری اور عمدہ ہونے کی ضمانت ہے۔

ملکِ ادب کے شہزادے

مصنّف ڈاکٹر اعجاز حسین الٰہ آباد یونی ورسٹی۔ ملنے کا پتہ۔ کارواں پبلشرز الٰہ آباد۔ قیمت ؏ ۔ اس کتاب میں چالیس شعراء کے مختصر نفسیاتی خاکے درج ہیں۔

امان اور دوسرے افسانے

مصنّف جیلانی بی اے۔ پبلشر مکتبۂ چراغِ راہ ۹ نوریا بلڈنگ آرام باغ روڈ۔ کراچی علے۔ قیمت تین روپے۔ ضخامت ۳۰۴ صفحے۔

ماں

میکسم گورکی کے مشہور ناول کا ترجمہ بلا ترمیم و اختصار۔ ضخامت ۴۷۰ صفحے کتابت طباعت عمدہ۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ شاہراہ دہلی

چین کی بہترین کہانیاں

مترجم ظ انصاری۔ قیمت دو روپے۔ ضخامت ۱۸۸ صفحے۔ کتابت طباعت عمدہ۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ شاہراہ دہلی۔

"تانے بانے"

از خزاں ہوشیارپوری۔ قیمت دو روپے۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۲۰ صفحے پر ایک ناکام محبّت کے خطوط کا مجموعہ۔ کتابت طباعت اوسط۔ جلد معمولی۔ ملنے کا پتہ:۔ بیر پبلشنگ ہاؤس دہلی

میری نظمیں

بلراج کومل کی نظموں کا مجموعہ۔ کتاب نہایت حسین و جمیل شائع ہوئی ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت نہایت عمدہ۔ ۱۸×۲۲/۸ سائز کے ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے، مجلد اور جلد پوش سے مزیّن ہے۔ قیمت ڈھائی رُوپے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ فن کار دہلی۔

بلراج کومل بڑے ذہین نوجوان ہیں۔ ان کی نظموں میں موضوعاتی تنوع بھی ہے اور غمِ جان، غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے اچھے نمونے بھی۔ آپ ایک پڑھے لکھے نوجوان ہیں اور سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ اس دَور میں یہ بات بڑی غنیمت ہے۔

رسالے

دستور۔ یہ ماہ نامہ مکتبۂ دستور نمبر ۱۴ ۔ کھنہ سٹریٹ برانڈرتھ روڈ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ آٹھ رُوپے۔ رسالہ حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن دونوں کا حامل ہے۔ سرورق بڑا دیدہ زیب ہے۔ لکھنے والوں میں بہت سے اچّھا لکھنے والے ملیں گے۔ نغمۂ روح، جہاں نما، تمثیل کدہ، سرودِ زندگی، گیت سنگیت، بحث و انتقاد کے تحت غزلیں، مقالات تمثیل، نظمیں، گیت اور تنقیدی مضامین بڑے سلیقے سے جمع کئے ہیں۔

المجید۔ مجیدیہ اسلامیہ کالج میگزین الٰہ آباد کا سالانہ نمبر۔ ایک تعلیمی ادارے کے لئے سال بھر کے بعد بھی ایسا رسالہ شائع کر دینا قابلِ مبارک باد ہے۔

رفتارِ زمانہ

روس کے وزیرِ خارجہ کا بھارت کو خراجِ تحسین

روس کے وزیرِ خارجہ موسیو مالوٹوف نے ماسکو کی سپریم کورٹ میں بین الاقوامی صورتِ حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے دنیا میں امن قائم کرنے کی کوششوں کے لئے بھارت کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا، اور اسے امن کو پائدار بنانے والوں کا ایک اہم ساتھی قرار دیا۔ آپ نے کہا کہ نوآبادیاتی ہندوستان کا وجود مٹ گیا ہے، اور اب اس کی جگہ آزاد بھارت نے لے لی ہے۔ آپ نے اُمید ظاہر کی کہ سیلون اور پاکستان بھی حقیقی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

کُل ہند مسلم تعلیمی کانفرنس کی تجاویز

کل ہند مسلم تعلیمی کانفرنس مدراس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے علی گڑھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین نے تجویز پیش کی کہ چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے حکومت کی طرف سے مُفت اور لازمی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہئیے۔ آپ نے بھارت کے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ فرقہ وارانہ ذہنیت کو خیرباد کہہ کر سارے دیش کی بھلائی کے لئے کام کریں اور غیر ملکی ذہنیت کو ختم کر دیں۔ گورنر مدراس مسٹر شری پرکاش نے اس موقعے پر افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ تھیوری انتہائی احمقانہ ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کی قومیت بھی مختلف ہوتی ہے۔

پہلے پنج سالہ پلان کی قبل از وقت تکمیل کے بعد دوسرا شاندار پلان

بھارت کے وزیرِ داخلہ شری گوبند ولبھ پنت نے بریلی میں ایک تقریر کے دوران میں اس امر کا اظہار کیا کہ دوسرے پنج سالہ پلان کا مقصد افلاس، بے روزگاری اور جنتا کی مایوسی اور بے اطمینانی کو ختم کرنا ہے۔ پہلا پنج سالہ پلان اپنے وقت سے پیشتر ہی مکمل ہو گیا ہے، اور وقتِ مقرّرہ سے کافی عرصہ پہلے ہی اس کا نصب العین پورا ہو چکا ہے۔ یہ ساری کامیابی عوام کے شاندار عزائم اور جدوجہد کا ہی نتیجہ ہے۔ اور مجھے اُمید ہے کہ اگر جنتا کی کوششوں اور جوش کو صحیح ڈھنگ سے استعمال کیا جائے تو بھارت یقیناً ویلفیر سٹیٹ کے قیام کی طرف تیزی سے قدم بڑھا سکے گا۔

دنیا کی سب سے بڑی فوج بنانے کے لئے چین کا قانون

چین کی گورنمنٹ نے جبری بھرتی کا ایک نیا قانون پاس کیا ہے جس کے تحت لگ بھگ آٹھ کروڑ چینیوں کو فوجی خدمات کے لئے طلب کیا جا سکتا ہے۔ اٹھارہ سال سے چالیس سال تک کے لوگ تین سال سے پانچ سال تک کے لئے طلب کئے جائیں گے اور اس طرح چین کے پاس ایک زبردست جدید طرز کی فوج تیار ہو جائے گی۔

وزیرِ اعظم مصر کرنل ناصر کا بیان

لندن میں کامن ویلتھ کے ممالک کی کانفرنس ختم ہونے کے بعد بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے قاہرہ میں مصر کے وزیرِ اعظم کرنل ناصر سے گفت و شنید کی۔ بات چیت کے خاتمے پر دونوں وزرائے اعظم نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا ہے جس کے مطابق بڑے عالم گیر مسائل پر بھارت اور مصر میں مکمل اتفاقِ رائے ہے۔ دونوں کی یہ رائے ہے کہ ایشیائی اور وسط مشرق کے ممالک کو پاور بلاکوں سے مکمل طور پر الگ رہنا چاہئیے، اور کسی دفاعی معاہدے میں شامل نہ ہونا چاہئیے۔ کیونکہ دفاعی معاہدے امن کو تقویت پہنچانے کی بجائے اُسے نقصان دینے کا موجب بنتے ہیں۔ قاہرہ کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کرنل ناصر نے بتایا کہ ہم مصر میں بیٹھے ہوئے بھارت کی اقتصادی، مجلسی اور صنعتی ترقی کا نہایت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ہمیں بھی بھارت کی تقلید میں اس طرح کے قدم اُٹھانے ہوں گے۔ شری نہرو کا ذکر کرتے ہوئے مصر کے وزیرِ اعظم نے کہا کہ میں نے پچھلے سال ہی شری نہرو سے ملاقات کی تھی۔ لیکن میں ایک عرصے سے اُن کی تحریروں اور تقریروں کو پڑھ رہا ہوں اور ہر ملاقات کے بعد میرے دل میں شری نہرو کا احترام بڑھ رہا ہے۔ میں ہندوستانی عوام کو

بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم نہایت دلچسپی سے آپ کی ترقی کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ آپ کی طرح ہم بھی غیر ملکی غلبے کے خلاف ہیں۔ ٹرکی اور عراق کے معاہدے کے سلسلے میں مصر کی مخالفت کی وضاحت کرتے ہوئے کرنل ناصر نے کہا کہ مصر بھی بھارت کی طرح دفاعی معاہدوں کے سخت خلاف ہے۔ کیونکہ اس طرح کے معاہدوں سے کمیونسٹ بھی اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں گے جس کے باعث وسط مشرق جنگ کا اکھاڑہ بن جائے گا۔

بخشی حکومت کے متعلق بھارت کے ڈیفینس منسٹر کا بیان

بھارت کے ڈیفینس منسٹر شری مہاویر تیاگی نے جموں میں اخبار نویسوں کو بتایا کہ بخشی غلام محمد کی قیادت میں ریاست جموں و کشمیر نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ میں نے یہاں آکر محسوس کیا ہے کہ بخشی گورنمنٹ کو ریاست کے عوام کا پورا اعتماد حاصل ہے۔ شری تیاگی نے اس الزام کو بھی غلط قرار دیا کہ بخشی غلام محمد کی حکومت میں کمیونسٹوں کا غلبہ ہے۔ دراصل اس طرح کے الزام وہ لوگ لگا رہے ہیں جو کشمیر گورنمنٹ کو کسی نہ کسی طریقے سے بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے اُمید ظاہر کی کہ بخشی گورنمنٹ کو وادیٔ کشمیر میں اس سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل ہوگی۔ شری تیاگی نے یہ بھی اعلان کیا کہ ۱۹۴۹ء کے بعد کشمیر کی فوج سے جو اشخاص ریٹائر ہوئے ہیں اُن کی پنشنوں میں اضافہ کیا جائے گا۔

دہلی میں مرزا غالب کی ۸۶ ویں برسی

۵ ہزار کی لاگت سے اردو کے زندہ جاوید شاعر مرزا غالب کی یادگار طیار کی گئی ہے۔ اسی مقام پر مرزا غالب کی ۸۶ ویں برسی کافی جوش و خروش کے ساتھ منائی گئی۔ جوش ملیح آبادی، امن لکھنوی اور پنڈت ہری چند اختر نے اس موقع پر مرزا غالب کی خدمت میں عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اُردو کے سرمایۂ ادب میں غالب کا کتنا بڑا حصّہ ہے اور اردو نظم و نثر میں غالب کا کتنا بلند مقام ہے۔ یہ تقریب غالب سوسائٹی کے زیر اہتمام منائی گئی۔ یہ سوسائٹی عنقریب ہی ایک غالب ہال تعمیر کرنے کا بھی ارادہ رکھتی ہے۔

فارموسا کے مسئلے پر پردھان منتری کا بیان

یورپ سے واپسی پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے کہا کہ اگرچہ فارموسا کے سوال پر کشیدگی بہت زیادہ ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس مسئلے پر جنگ شروع ہونے کا امکان نہیں۔ کامن ویلتھ پردھان منتریوں کی کانفرنس میں ہم نے اس سوال کے ہر پہلو پر غور کیا ہے۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے ہم فارموسا پر کمیونسٹ چین کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ بات چیت اس حقیقت کی روشنی میں ہی ہونی چاہیئے۔

بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر کی تقریر

ریاست جموں اور کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے جموں میں ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ جموں اور کشمیر کی جغرافیائی پوزیشن اور اس میں مسلم اکثریت کا ہونا ہی اس کے بھارت سے الحاق کا سب سے بڑا جواز ہے۔ آپ نے کہا کہ بھارت میں چار کروڑ مسلمان نہایت پُرامن اور باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور سب مذاہب کے ساتھ بھارت میں یکساں سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے عوام بھارت کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بخشی صاحب نے اس موقع پر فرقہ پرستوں کو کڑی چیتاونی دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے فرقہ پرستی کی دیوی پر پہلے بہت سی قربانیاں دی ہیں۔ اب ہم مزید خون خرابہ کبھی نہیں ہونے دیں گے۔ اور ہم نے اس امر کا تہیہ کر لیا ہے کہ تمام فرقہ پرستوں کو سختی کے ساتھ دبا دیں گے چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ آخر میں بخشی صاحب نے فرمایا کہ کشمیر کے عوام ایمانداری کے ساتھ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کا مفاد بھارت کے ساتھ رہنے ہی میں ہے۔ اور ریاست صرف سیکولر بھارت کے ساتھ رہ کر ہی ترقی کر سکتی ہے۔

زرعی پیداوار کی ترقی کے لئے ایک شاندار منصوبہ

کھاد تیار کرنے کا جو نیا کارخانہ بھاکڑا ننگل میں لگایا جا رہا ہے اس میں ہر سال دو لاکھ ٹن ایمونیم نائٹریٹ تیار ہوا کرے گا۔ یہ ساڑھے تین لاکھ ٹن ایمونیم سلفیٹ کے برابر ہوگا۔ اس سلسلے میں یہ امر یاد رہے کہ سندری کے کارخانہ میں ساڑھے تین لاکھ ٹن ایمونیم سلفیٹ تیار ہوتا ہے۔ اس طرح اس نئے کارخانے کی پروڈکشن بھی سندری کے کارخانے کے برابر ہی ہوگی۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ بھاکڑا ننگل میں لگائے جانے والے کھاد کے اس نئے کارخانے پر ۲۰ کروڑ روپے کی لاگت آئے گی۔ اور اس کارخانے کو بجلی مہیا کرنے کی غرض سے فوراً نئے چار جنریٹر لگائے جائیں گے۔ یہ جنریٹر ڈیڑھ لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کر سکیں گے۔ اس کارخانے کو جلد از جلد مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔



بچوں کا آج کل



معلّم بُھٹکلی

نیک اِرادے

محبّت کا سبق دیں گے جہاں کو
ہر اک اِنساں سے اُلفت ہم کریں گے

وہ نُورِ علم پھیلائیں گے ہر سُو
کہ ہر شیشے کو جامِ جم کریں گے

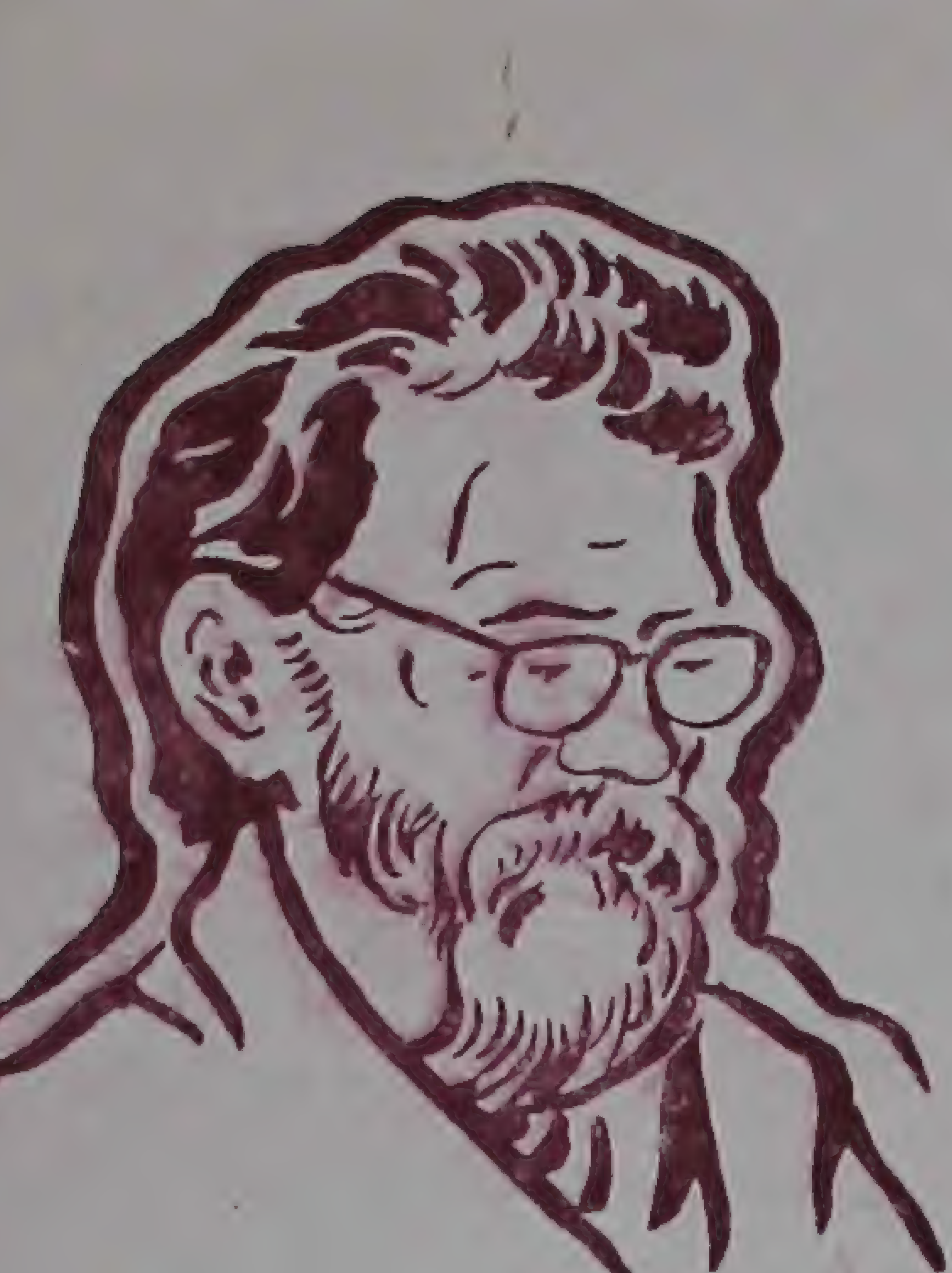
کٹھن ہے راستہ منزل کا لیکن
نہ ہم رفتار اپنی کم کریں گے

سبق ناکامیوں سے ہم نے سیکھا
ہمیشہ کوششِ پیہم کریں گے

وطن کی شان سے ہے شان اپنی
وطن کی فِکر ہم ہر دم کریں گے

سبھی روتے ہیں اپنی بے بسی پر
مگر ہم دُوسروں کا غم کریں گے

غرض اپنے طریقِ کار سے ہم
اُجاگر عظمتِ آدم کریں گے



ونوبا بھاوے

بچو! تم نے دیش کے مشہور لیڈر ونوبا بھاوے کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ آج ہم تمھیں ان کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔

ان کا پورا نام ونائیک نرہری بھاوے ہے۔ آپ ۱۱ ستمبر ۱۸۹۵ء میں کونکن کے گاؤں گونگودہ میں ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے پتا کا نام نرہری پنت تھا۔ دراصل آپ کے باپ دادا رتناگری کے رہنے والے تھے لیکن بعد میں وہ گونگودہ گاؤں میں آن بسے۔ وہ ریاست بڑودہ میں ایک محکمے کے ہیڈ کلرک تھے۔ زندگی میں اُن کی دلچسپی زیادہ تر رنگنے اور چھاپنے کے کام میں تھی۔ چونکہ ونوبا اپنے تینوں بھائیوں سے بڑے تھے اس لئے آپ کے والد کی یہی مرضی تھی کہ ونوبا بھی رنگنے اور چھاپنے کا کام کریں۔ لیکن ونوبا کے وچار کچھ اور ہی تھے۔ ۱۹۰۷ء میں ونوبا بڑودہ کے ہائی اسکول میں داخل کئے گئے۔ ۱۹۱۳ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے کالج میں داخل ہوئے۔ لیکن وہاں ونوبا کو ایسی تعلیم نہ مل سکی جیسی کہ وہ چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ کالج چھوڑ کر بنارس چلے گئے جہاں انھوں نے سنسکرت ادب کا مطالعہ کیا۔ وید، اپنشد اور برہما سوتر وغیرہ مذہبی کتابیں پڑھیں اور بنارس ہی میں اپنے گورو (مہاتما گاندھی) کے پہلی بار درشن کئے۔ اُن سے ملاقات کرنے کے بعد ونوبا جی پر باپو کا ایسا اثر پڑا کہ وہ اُن کے سابرمتی آشرم میں داخل ہو گئے۔ یہاں ونوبا بہت مدت تک بُننے اور چرخہ کاتنے کا کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں خاصی تربیت کے بعد ونوبا آشرم کے لوگوں کے ساتھ گاؤں گاؤں جانے لگے تاکہ گاندھی جی کی تعلیم کو پھیلائیں۔ ۱۹۴۰ء میں آپ ستیاگرہ کرنے کے سلسلے میں گرفتار کر لئے گئے اور پھر لگاتار تین بار جیل گئے۔ ونوبا کی والدہ رکھومائی ایک بہت ہی خداپرست عورت تھیں۔ انھوں نے ونوبا کو اچھے اچھے بھجن سکھا کر اُن کے دل میں ادب کا شوق پیدا کیا اور ساتھ ہی اُن کو بڑے بڑے مہاپرشوں کا بھگت بنا دیا۔ ایک بار جب آپ کی والدہ بیمار ہوئیں تو آپ اُن کو دیکھنے اپنے گھر گئے۔ لیکن آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کو بہت بڑا صدمہ پہنچا۔ جب آخری رسوم ادا کرنے کے لئے آپ کی ارتھی کو شمشان گھاٹ لے جانے لگے تو ونوبا نے کہا۔ کہ وہ اس شرط پر اپنی والدہ کی ارتھی کے ساتھ جائیں گے اگر اُن کی تمام آخری رسوم اُن کے ہی ہاتھ سے ادا ہوں۔ وہ کسی پنڈت کے ہاتھ سے رسوم ادا نہیں کروانا چاہتے تھے۔ آپ کے والد اس بات سے بہت ناراض ہوئے۔ اور ونوبا سے بولے کہ انھیں رسم و رواج کا احترام کرنا چاہیئے۔ اور خاندان و برادری کے لوگوں کی رائے کو رد نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن ونوبا اپنی بات پہ اڑے رہے اور ارتھی کے ساتھ

نہ گئے اور گھر ہی پر اُپنشد کے شلوک پڑھتے رہے۔

ہندوستان آزاد ہونے کے بعد ونوبا وردھا اور پَونار میں کھادی اور ابتدائی تعلیم کا کام کرتے رہے۔ لیکن جب ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ان کے گورو مہاتما گاندھی کو شہید کر دیا گیا تو ونوبا کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ایک مضبوط ارادے کے ساتھ باپوجی کے کام کو پورا کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اور آج وہ باپوجی کے اصولوں پر چل کر دلیش کی سیوا کر رہے ہیں اور سارے ملک کا پیدل دورہ کر کے اپنی چلائی ہوئی تحریک بھودان (زمین کا دان) اور شرم دان (محنت کا دان) کو گاؤں گاؤں پھیلا رہے ہیں۔ بھودان کا مطلب یہ ہے کہ اُن خوش حال زمینداروں سے جن کے پاس کافی سے زیادہ زمین ہے، فالتو زمین لے کر اُن غریب کسانوں کو بانٹ جائے جن کے پاس کاشتکاری کے لئے بالکل زمین نہیں۔ چنانچہ وہ زمین کا دان مانگنے کے لئے گاؤں گاؤں پیدل جاتے ہیں اور بڑے بڑے زمینداروں سے زمین کا دان لے کر غریب کسانوں کو بانٹ دیتے ہیں۔ آپ نے اب تک جن علاقوں کا پیدل سفر کیا ہے۔ وہ مدھیہ پردیش، مدھیہ بھارت، اُتّر پردیش اور دہلی کے علاقے ہیں۔ اس وقت تک آپ ایک لاکھ ایکڑ کے قریب زمین حاصل کر چکے ہیں۔

بچّو! دیکھنے میں ونوبا بڑے دُبلے پتلے جسم کے مالک ہیں چنانچہ ایک بار باپوجی نے ان سے پوچھا تھا کہ آپ اتنے دُبلے پتلے ہو کر اس قدر محنت کرتے ہیں؟ ونوبا نے اُسی وقت جواب دیا۔ کہ میں ایک مضبوط ارادے کے ساتھ کام کرتا ہوں۔

ونوبا بہت سی کتابوں کے مصنّف ہیں۔ آپ نے گیتا کا ترجمہ مرہٹی زبان میں گیتائی کے نام سے کیا۔ یہ کتاب بہت بڑی تعداد میں بکی۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک آپ دو ہفت روزہ مرہٹی رسالے بھی شائع کرتے رہے۔

ونوبا تقریباً تیرہ زبانیں جانتے ہیں۔ عربی فارسی کے علاوہ فرانسیسی اور دوسری یورپین زبانیں بھی جانتے ہیں۔ آپ کا دلچسپ مضمون حساب ہے۔ پچھلے دنوں ایک گاؤں میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ میں گاؤں کے ہر ایک بچّے کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ تمام بچّے خوب پڑھیں، لکھیں اور آزاد بھارت کی سیوا میں پورے جوش و خروش سے حصّہ لیں۔

بچّو! خدا سے دعا مانگو کہ ہم پر ایسے اچھے اور نیک لیڈر کا سایہ ہمیشہ قائم رہے۔

ذرا مُسکرائیے!

لیڈی ڈاکٹر

لیڈی ڈاکٹر:۔ آج کل کی عورتیں بچّوں کی ٹھیک طرح نگرانی نہیں کرتیں۔ بچّوں کے مُنہ میں جو بھی چیز ڈالی جائے وہ صاف ہونی چاہیئے جراثیم سے مبرا۔

ایک عورت:۔ مگر یہ کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ بچّے کے دانت نکلنے والے ہیں۔

لیڈی ڈاکٹر:۔ اس کے مُنہ میں اُنگلی ڈالنے سے پتہ لگ جاتا ہے۔

دوسری:۔ مگر اُنگلی پہلے اُبال لینی چاہیئے۔

احمق

بڑی بہن (خفا ہو کر) تم تو بڑی احمق ہو۔ میری کنگھی کُتّے کے بالوں میں پھیر رہی ہو۔

بہن! بے فکر رہو۔ کتّے کے بالوں میں کرنے سے پہلے میں نے کنگھی کو خوب صاف کر لیا تھا۔

ل۔م شاہد

محنت کا پھل

اصغر اس دنیا میں اکیلا تھا۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ کچھ مدّت تو وہ اپنے چچا کے گھر میں رہا لیکن مڈل پاس کرنے کے بعد اُس نے چچا کا گھر چھوڑ دیا کیونکہ وہ چچا کا ظلم برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ کافی ذہین اور خوبصورت تھا۔ وہ کچھ روز تک مارا مارا پھرتا رہا۔ ایک دن اسے محلہ اکبر پورہ میں ایک دھوبی ملا۔

"کیا کہیں مجھے نوکری مل سکے گی؟" اصغر نے کہا۔

"تم نوکری کرنا چاہتے ہو؟" دھوبی نے پوچھا۔

"ہاں میں ایک مدّت سے نوکری کی تلاش میں ہوں۔"

"میں اپنے وکیل صاحب کا پتہ تمہیں دیتا ہوں اُن کے پاس جاؤ نوکری مل جائے گی۔"



دھوبی سے وکیل کا پتہ پوچھ کر وہ اُن کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ اسے کافی بھوک لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وکیل صاحب کچہری جانے کے لئے باہر نکلے۔ وہ اصغر کو دیکھ کر رُک گئے۔ بولے۔ "تم کون ہو؟ کیا کام ہے؟"

"میں..... میں ایک غریب لڑکا ہوں، آپ کے پاس نوکری کے لئے آیا ہوں۔ آپ کے دھوبی نے مجھے آپ کا پتہ دیا ہے"۔ اصغر نے نہایت معصوم اور اُداس لہجے میں کہا۔ وکیل صاحب کو اس پر ترس آگیا۔ بولے۔ "میرا پرانا نوکر شرفو بیمار ہے اس کی جگہ میں تمہیں رکھ لیتا ہوں جب شرفو اچھا ہو جائے گا تو تمہیں یہ کام چھوڑ دینا پڑیگا کیا تمہیں منظور ہے"

"جی ہاں۔ مجھے منظور ہے۔"

وکیل صاحب اصغر کو اندر لے گئے اور بیگم صاحبہ سے بولے "آج سے یہ لڑکا شرفو کی جگہ کام کرے گا۔ جب شرفو اچھا ہو جائے گا تو یہ کام چھوڑ دے گا۔ میں کچہری جا رہا ہوں۔ تم اسے تمام کاموں کے بارے میں سمجھا دو۔"

یہ کہہ کر وکیل صاحب چلے گئے۔

"کیا نام ہے تمھارا۔؟" بیگم صاحبہ نے پوچھا

"مجھے اصغر کہتے ہیں ۔۔۔؟"

"تمھارے ماں باپ کہاں رہتے ہیں؟"

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے بیگم صاحبہ ۔ میں اکیلا ہوں۔"

اس کے بعد بیگم نے گھر کے کاموں کے بارے میں اسے سب باتیں سمجھا دیں۔

اصغر صبح چار بجے اُٹھ کر سب سے پہلے وکیل صاحب کو پلنگ پر چائے دیتا۔ نل سے پانی لاتا ۔۔ برتن دھوتا۔ کمروں کی صفائی کرتا۔ وکیل صاحب کے صاحبزادے انور کے کمرے میں منتشر کتابوں کو میز پر سجاتا۔ بازار جاتا۔ گویا تمام دن وہ ایک مشین کی طرح کام کرتا تھا۔

ایک دن رات کے دس بجے اصغر انور کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت انور کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس وقت اصغر کو دیکھ کر انور کو حیرت ہوئی۔

"کیا بات ہے اصغر، اس وقت تم یہاں کیسے، اور یہ تمھارے ہاتھوں میں کیا ہے؟"

"یہ کتابیں ہیں۔ آج اُردو، انگریزی اور حساب کی کتابیں خرید لایا ہوں۔ تنخواہ ملی ہے نا۔"

"لیکن کتابیں کس لئے خرید کر لائے ہو؟"

"اپنے لئے۔ چھوٹے سرکار۔ میں مڈل پاس ہوں۔ مجھے آگے پڑھنے کی تمنا ہے۔ اور اس سلسلے میں آپ سے مدد چاہتا ہوں۔" اصغر بولا

"یہ سُن کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم مڈل پاس ہو۔ اور تم آگے بھی پڑھنا چاہتے ہو۔ میں ضرور تمھاری مدد کروں گا۔ کل سے تم روزانہ اسی وقت آجایا کرو۔ میں پڑھا دیا کروں گا۔"

دوسرے دن سے وہ روزانہ انور سے پڑھنے لگا۔

کچھ دنوں کے بعد اس کی فیس جمع کر دی گئی۔ وہ امتحان میں بیٹھا۔



قریباً پندرہ دن کے بعد میٹرک کا نتیجہ اخباروں میں آگیا۔

"تم پاس ہوگئے اصغر ۔۔۔ دیکھو اخبار میں تمھارا نام آیا ہے۔" انور نے اخبار دکھاتے ہوئے کہا۔

"سچ ۔؟"

"تو کیا جھوٹ کہتا ہوں۔ یہ دیکھو ۔۔۔ ہے نا تمھارا نام؟"

"آج مجھے بہت بڑی خوشی ہوئی ہے سرکار۔"

"اب بھئی مٹھائی کھلاؤ۔"

"ضرور سرکار ۔۔۔" کہہ کر اصغر کمرے سے فوراً نکل گیا اور بازار سے مٹھائی خرید لایا۔

"ارے تم تو سچ مچ مٹھائی لے آئے۔ میں نے تو مذاقاً کہا تھا۔" انور بولا۔

"آپ نے میری مدد کی ہے۔ آپ امیر ہوتے ہوئے بھی ایک غریب کے بہت کام آئے ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔"

"نہیں اصغر یہ سب تمھاری محنت کا نتیجہ ہے۔ بغیر محنت کے کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔"

اس کے بعد اُسے ایک سرکاری دفتر میں نوکری مل گئی۔ آج اُسے ایک سو بیس روپے ملتے ہیں۔ آج وہ بہت خوش ہے۔ یہ سب کچھ اس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ بغیر محنت اور مستقل مزاجی کے انسان ترقّی نہیں کر سکتا۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ اس دنیا میں کسی کو ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔

جگت سنگھ

سمندر کا پانی کھاری کیسے ہوا؟

اگلے وقتوں کی بات ہے ایک گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ بڑے بھائی کے پاس بہت سا دھن تھا مگر چھوٹا کنگال تھا۔ ایک دن جب لوگ نئے سال کی خوشیاں منانے کی تیاریاں کر رہے تھے چھوٹے بھائی کے ہاں کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ وہ بڑے بھائی کے پاس ایک سیر چاول اُدھار لینے کے لئے گیا مگر اُس نے صاف انکار کر دیا۔ جب وہ واپس غمگین صورت بنائے آ رہا تھا ایک بوڑھا راستے میں ملا جس کے سر پر لکڑیوں کا ایک بھاری گٹھا تھا۔ بوڑھے نے اُس سے پوچھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تم کسی مصیبت میں مبتلا ہو۔

چھوٹے بھائی نے اپنی دکھوں بھری داستان اُسے سنائی۔ جب بوڑھا اُس کی کہانی سن چکا تو اُسے حوصلہ دیتے ہوئے کہنے لگا کہ اگر تم لکڑیوں کا یہ گٹھا میرے گھر تک چھوڑ آؤ تو میں تمہیں ایک ایسی لاجواب چیز دوں گا جس کی مدد سے تم مالامال ہو جاؤ گے۔

چھوٹے بھائی نے فوراً لکڑیوں کا گٹھا اُٹھایا اور بوڑھے کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

گھر پہنچ کر بوڑھے نے اُسے ایک مال پُوا دیا اور کہا تم اسے لے کر اس مندر کے پیچھے والے جنگل میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں ایک غار سی دکھائی دے گی اُس میں بہت سے ٹھنگنے رہتے ہیں۔ مال پوڑے اُن کا من بھاتا کھاجا ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر اُسے حاصل کرنا چاہیں گے۔ اُس وقت دھن دولت کی مانگ ہرگز نہ کرنا۔ بلکہ پتھر کی ایک چکّی مانگ لینا۔ بعد میں تمہیں اس چکّی کی کرامات معلوم ہو جائے گی۔

چھوٹا بھائی بوڑھے سے ہدایات لے کر فوراً اُس جنگل میں پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ مندر سے کچھ ہی فاصلے پر ایک غار سے بہت ہی ٹھنگنے نکلتے ہیں اور اور پھر اُسی میں واپس چلے جاتے ہیں۔ اُس وقت وہ بونے ایک بڑے درخت کے ٹہنے کو کھینچ کر اس غار کے اندر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے مگر یہ کام اُن کے لئے کسی قدر کٹھن تھا۔

چنانچہ چھوٹا بھائی اُن کے قریب جا کر کہنے لگا۔ لاؤ اس ٹہنے کو میں پہنچا دیتا ہوں۔ جب وہ غار کے قریب پہنچا تو اُس کے کانوں میں ایک باریک سی آواز سُنائی دی۔ "مجھے بچاؤ میں مر جاؤں گا۔" یہ سُن کر چھوٹے بھائی نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اُس کے پاؤں کے نیچے ایک بونا پِس چلا تھا۔ معاً اُس نے اس چھوٹے سے بونے کو جھٹ پٹ اُٹھا لیا۔ اصل میں وہ اُن ٹھنگنوں کا راج کمار تھا۔



بونے راج کمار کی نگاہ چھوٹے بھائی کے مال پُوے پر پڑی۔ وہ بولا۔ مہربانی کر کے یہ مال پُوا مجھے دے دو۔ اس کے عوض میں



آپ کو بہت سے جواہرات اور ہیرے دوں گا۔ مگر چھوٹے بھائی کو بوڑھے کی بات یاد آگئی۔ اس نے مال پوئے کے عوض راج کمار سے پتھر کی ایک چکّی کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ بونوں کے راجہ نے راج کمار کی خوشی کی خاطر چکّی کا دینا منظور کر لیا۔ جب چھوٹا بھائی چکّی لے کر واپس آنے لگا تو بونوں کے راجہ نے اس سے کہا۔ دیکھو ہمارے راجیہ کی سب سے بیش قیمت چیز یہ چکّی ہے۔ اس کا استعمال خوب سوچ سمجھ کر کرنا۔ اور سنو۔ اس چکّی کو دائیں جانب پھیرنے سے تم جس چیز کو طلب کرو گے ملے گی اور جب تک تم پھر اسے بائیں جانب نہیں پھیرو گے وہ چیز نکلتی ہی رہے گی۔

اب چھوٹا بھائی پتھّر کی چکّی لے کر گھر آگیا۔ اس کی بیوی بھوکی پیاسی بیٹھی اپنے خاوند کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے خاوند کے ہاتھ میں پتھّر کی چکّی دیکھ کر بڑی مایوسی کا اظہار کیا۔ لیکن اس کے شوہر نے آتے ہی کہا کہ جلدی سے اندر جا کر ایک کپڑا بچھا دو۔

چنانچہ کمرے کے اندر ایک کپڑے کے اوپر اس چکّی کو رکھ دیا گیا اور فوراً اسے دائیں طرف گھمانا شروع کر دیا اور کہا کہ "چاول نکالو" کہنے کی دیر تھی کہ چاولوں کا ڈھیر لگ گیا۔ پھر اس نے مچھلی کی مانگ کی۔ اس کے بعد اس نے ضرورت کی تمام چیزیں حاصل کر لیں۔

چھوٹے بھائی نے سوچا کہ اب میں امیر ہو گیا ہوں۔ اب مجھے ایک عالیشان مکان میں رہنا چاہیئے۔ پس اس نے چکّی کو دائیں جانب گھما کر نہ صرف ایک محل تیار کروا لیا بلکہ اس میں ہر قسم کی آسائش و آرائش کا سامان بھی فراہم کرا لیا۔ اب وہ پوری شان و شوکت سے رہنے لگا اس نے اپنے پڑوسیوں اور دوستوں کو ایک پُر تکلّف دعوت دی اور نئے سال کا تیوہار نہایت خوش و خرّم ہو کر منایا۔

چھوٹے بھائی کے یہاں اتنی شان و شوکت اور رونق دیکھی تو اس کا بڑا بھائی سوچنے لگا کہ یہ چند دنوں کے اندر اندر اتنا بڑا آدمی اور لکھ پتی کس طرح بن گیا۔ اس میں ضرور کوئی راز ہے۔ وہ چوری چھپے اس کے گھر داخل ہو کر ایک دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کا بھائی ایک چکّی کو گھما کر مٹھائی کے ٹوکرے بھر رہا ہے اور مہمانوں کی خاطر تواضع کر رہا ہے۔ اتنا دیکھ کر وہ باہر نکل گیا۔ اور اس چکّی کے حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

اسی رات جب سب لوگ سو گئے تو بڑا بھائی چوروں کی طرح چھوٹے بھائی کے گھر میں داخل ہوا اور چکّی لے کر فوراً نو دو گیارہ ہو گیا۔ اس چکّی کو لے کر وہ سمندر کے کنارے ایک کشتی میں جا بیٹھا یہ سوچ کر کہ میں کسی ٹاپو میں جا کر اس چکّی کے ذریعے سے لکھ پتی

بن جاؤں گا مگر ع وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت اُس نے ضرورت کی سب چیزیں اپنے ساتھ لے لی تھیں مگر نمک لانا بھول گیا تھا۔ چنانچہ کشتی میں بیٹھ کر اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ نمک حاصل کرنے کے لئے اس نے چکّی کو گھمانا شروع کر دیا اور 'نمک نکال' 'نمک نکال' کی رٹ لگا دی۔



اتنا کہنے کی دیر تھی کہ چکّی نے نمک نکالنا شروع کر دیا۔ چونکہ بڑے بھائی کو چکّی کے روکنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا اس لئے نمک کی کثرت اور اُس کے وزنی ہونے کے باعث بڑا بھائی چکّی سمیت ہی سمندر میں ڈوب گیا۔

عام لوگوں کا خیال ہے کہ اس وقت سے وہ چکّی برابر گھوم رہی ہے اور نمک نکلتا جا رہا ہے۔ اسی لئے سمندر کا پانی کھارا ہو رہا ہے۔

مالک:۔ (نوکر سے) دوکاندار نے جیبی کیسے دی؟

نوکر:۔ ترازو میں تول کر

سوم ناتھ سادھو

لطیفے

سُریندر:۔ پتاجی! ہمارے ماسٹر جی بڑے جھوٹے ہیں

پتاجی:۔ کیا جھوٹ بولا اُنھوں نے؟

سُریندر کل کہتے تھے ۹۔ اور ۹۔ اٹھارہ ہوتے ہیں اور آج کہتے ہیں کہ ۱۶۔ اور ۲۔ اٹھارہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر:۔ دیکھو تو کون ہے؟

کمپونڈر:۔ کوئی مریض ہوگا۔

ڈاکٹر:۔ نیا ہے یا پُرانا۔ دیکھ کر آؤ۔

کمپونڈر:۔ پُرانا تو کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ نیا ہی ہوگا۔

باپ:۔ بیٹیا! شریر لڑکوں سے ہمیشہ الگ ہی رہنا چاہیئے۔

بیٹیا:۔ ابا جان! اس لئے تو میں نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔

اُستاد:۔ تم نے جمنا دیکھی ہے؟

شاگرد:۔ جی ہاں! کل شام کو اماں نے اس سے آلو خریدے تھے۔

محمود:۔ میں رات کو خوفناک خواب دیکھا کرتا ہوں۔

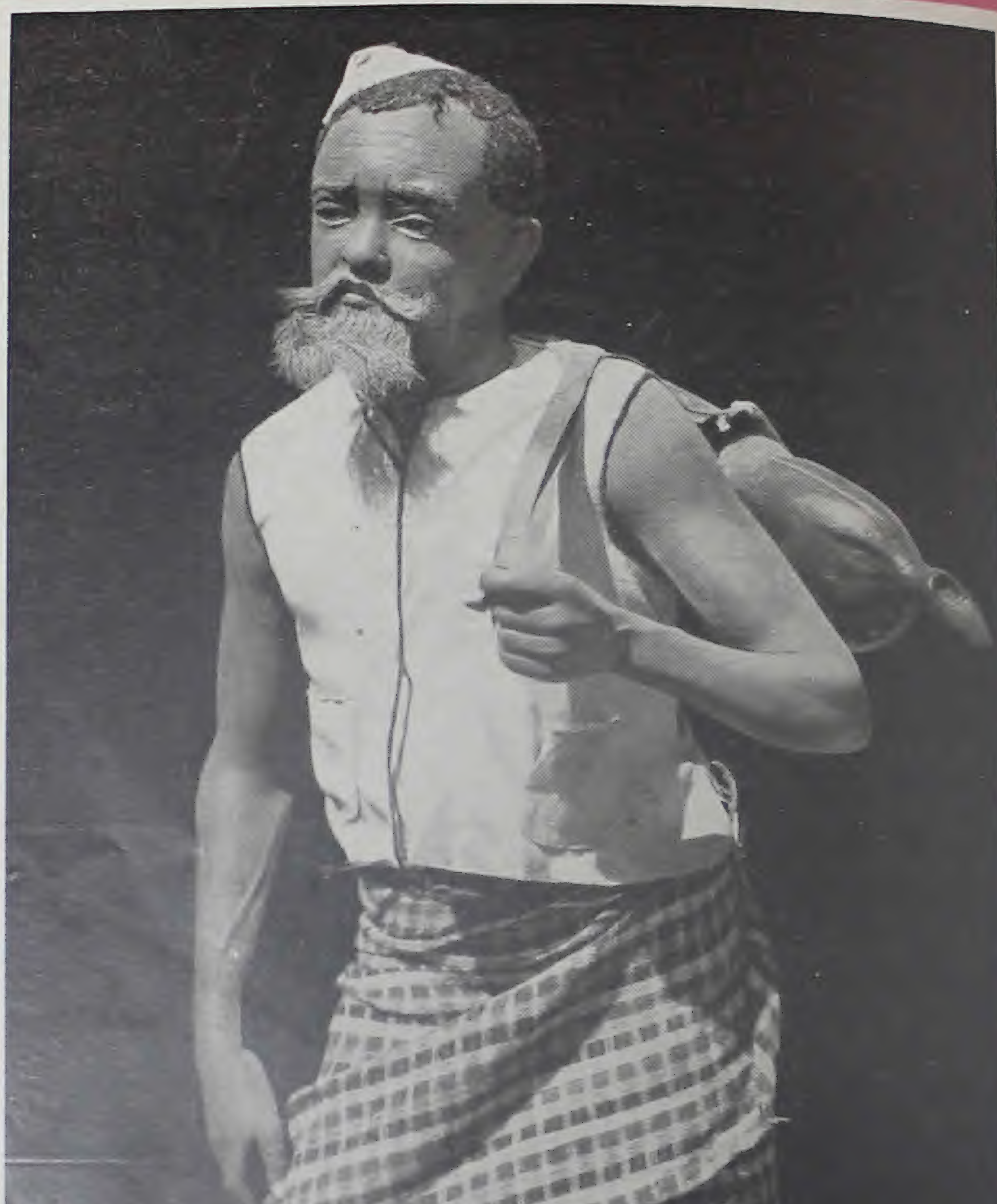
پرویز:۔ مت دیکھا کرو۔

محمود:۔ کوئی طریقہ؟

پرویز:۔ آنکھیں بند کر لیا کرو۔

آجکل

مئی ۱۹۵۵ء



آٹھ آنے

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

خواجہ غلام السیدین ایڈیشنل سیکرٹری
وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند

میں آج کل کو ہمیشہ بہت دل چسپی سے پڑھتا ہوں اور اس میں اکثر قابل قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کی لکھائی چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔

محمد اجمل خاں پرائیویٹ سیکرٹری مولانا ابوالکلام آزاد
وزیرِ تعلیمات حکومتِ ہند

'آج کل' میں نہ صرف اُردو کی بلند پایہ نظم و نثر کا مجموعہ پایا جاتا ہے بلکہ تنوّع مضامین کے باوجود اس کی حسنِ ترتیب اسے ایک گلدستہ بنا دیتی ہے۔ اسی لئے اسے صرف "مقبولِ عوام" کہنا کافی نہیں بلکہ یہ "مقبول انام" ہے۔

ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری زور
حیدر آباد دکن

'آج کل' میری نظر میں ہندستان کا واحد علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں ایک معتدل اور سلیقہ مند روش عرصہ سے قائم اور ترقی پذیر ہے۔ اس کے مقالے اور افسانے اور نظمیں تینوں معیاری ہوتے ہیں اور انتخاب کرنے میں خاص ذوق اور جستجو کو دخل رہتا ہے۔

سیّد احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

'آج کل' اردو کا مطالعہ کئی سال سے باقاعدہ کر رہا ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو رسالہ برسوں سے ایک ملکی زبان کے ذریعے سے علم و ادب کی خدمت کر رہا ہو وہ ذہن میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور پڑھنے والے اس کا انتظار بے تابی سے کرتے ہیں۔ 'آج کل' کے لئے بھی میں نے لوگوں کو بیتاب پایا ہے۔



ڈاکٹر عبدالستّار صدّیقی
میور روڈ الہ آباد

پچھلے دس گیارہ برس سے آج کل کو میں برابر پڑھتا رہا ہوں۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ملک کے سارے ماہانہ رسالوں میں 'آج کل' سب سے بہتر اور بالاتر ہے۔ اس کے مقالوں اور اس کی نظم و نثر کا معیار بہت اُونچا ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری
صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن

'آج کل' اردو کے موجودہ رسالوں میں سب سے اچھا رسالہ ہے اور اپنے ادبی اور علمی معیار کے لحاظ سے ایک بلند پایہ رسالہ ہے۔ اس رسالے کی جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند ہے، وہ اس کا نہایت سنجیدہ لب و لہجہ ہے۔

پروفیسر آل احمدؔ سرور
صدر شعبہ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی

'آج کل' اُردو کے اُن چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے، ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے

کرشن چندر بمبئی

رسالہ 'آج کل' ایک عرصے سے اُردو ادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس ادارے سے جناب جوش ملیح آبادی اور جناب عرش ملسیانی منسلک ہیں جن کی روشن خیالی اور فنّی بلاغت کے سبھی قائل ہیں۔ 'آج کل' کے کئی ایک خاص نمبر اُردو داں طبقے میں شرفِ قبولیت حاصل کر چکے ہیں

نوّاب جعفر علی خاں اثر لکھنوی
کشمیری محلہ لکھنؤ

'آج کل' کا بجا طور پر اُردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامینِ نثر پر مغز اور دل چسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھناؤنے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ نظم کے حصّے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔

فی پرچہ آٹھ آنے | **بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی** | سالانہ چھ روپے

ترتیب

بچوں کا آج کل

سرورق:- مٹی کا ایک کھلونا "بہشتی"

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- **جوشؔ ملیح آبادی**

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- **بال مکند عرشؔ ملسیانی**

جلد ۱۳ ——— نمبر ۱۰

سالانہ چندہ:- { ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- { ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

مئی ۱۹۵۵ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

آلِ احمد سرور

مزارِ غالب پر

زندہ قوموں کے لئے شعر و ادب نعمت ہے
اِن کو رکھتا ہے جواں گر، تو یہی آبِ حیات

اس کے خوابوں میں ہے جادو، تو خیالوں میں جمال
اس کی مستی میں معارف ہیں، نشے میں ہے نجات

بزمِ تہذیب چراغاں ہے اسی کے دم سے
لالہ کاری سے اسی کی ہے بہاروں کو ثبات

اس کے اک معجزۂ فکر و نظر کے آگے
سرنگوں اہلِ سیاست کے سبھی لات و منات

ناامیدی میں جلاتا ہے اُمیدوں کے دیئے
زہر کے جام کو دیتا ہے یہی کیفِ نبات

اس کے قدموں میں مچلتا ہے طلسمِ مہ و سال
اس کے ہاتھوں میں سراپردۂ اسرارِ حیات

جاوداں اس کی ہر اک نیم نگاہی کا شہید
بے اماں تیغ ہے یہ دلبرِ شیریں حرکات

اس کے ہر رمز میں فطرت کے صحیفوں کا نچوڑ
دفترِ علم پہ بھاری ہیں اسی کے آیات

یہ وہ شعلہ ہے جو مدّھم نہ ہُوا پر نہ ہُوا
یہ وہ سورج ہے کہ جس پر کبھی آتی نہیں رات

جشنِ امروز ہُوا جاتا ہے پانی پانی
آئینہ خانے میں اس کے ہے وہ ماضی کی برات

مرجعِ اہلِ بصیرت ہے مزارِ غالب
ہم بھی لے آئے ہیں کچھ جذب و جنوں کی سوغات

ضیاء الحسن فاروقی

مولانا اسلم جیراجپوری

مولانا محمد اسلم جیراجپوری کے نام سے پہلے پہل میں اس وقت آشنا ہوا جب میں نے ان کی "تاریخ الامّت" دیکھی۔ طالب علمی کے ابتدائی دور میں جب میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میرے ایک کرم فرما نے "تاریخ الامّت" کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے پوچھا۔ "کیا تم نے وہ کتاب دیکھی" میں نے کہا "جی ہاں۔" کہنے لگے "مصنف کو بھی دیکھا ہے۔" میں نے تعجب سے پوچھا "کیا وہ زندہ ہیں؟" اس تعجب میں اپنی لاعلمی بھی شامل تھی اور وہ تاثر بھی پوشیدہ تھا جو تاریخ الامّت کے پڑھنے کے بعد دل و دماغ پر طاری تھا۔

اب اسے حسنِ اتفاق کہوں یا امتدادِ زمانہ کا احسان کہ میں جامعہ کالج میں اُن کے ایک ادنیٰ ساتھی کی حیثیت سے درس دیتا ہوں۔ پہلے دن جب میں کالج پہونچا تو ایک "مردِ بزرگ" کی طرف اشارہ کر کے ایک صاحب نے فرمایا "یہ مولانا اسلم جیراجپوری ہیں۔" میں نے بڑھ کر سلام اور مصافحہ کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ خوش ہوئے اور فرمایا۔ "اچھا ہوا آپ یہاں آ گئے۔" بس۔ اس دن سے لے کر آج تک کہ ایک سال سے زیادہ کی مدّت گزر رہی ہیں ان کو بہت قریب سے چلتے ہوئے، بیٹھتے ہوئے، نماز کے لئے مسجد جاتے ہوئے، پڑھاتے ہوئے، پڑھتے ہوئے، حقّہ پیتے ہوئے، دوسروں کو حقّہ پیش کرتے ہوئے ــــ غرض مختلف انداز میں بڑے غور سے دیکھتا رہا ہوں۔

مولانا محمد اسلم جیراجپوری ۱۸۸۲ء میں اپنے وطن موضع جیراجپور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد مولانا سلامت اللہ مرحوم حج کو گئے ہوئے تھے۔ جب وہ خانۂ کعبہ کی زیارت سے واپس آئے تو اُن کو نوّاب صدیق حسن خاں مرحوم نے بُلا کر مدرسۂ وقفیہ (بھوپال) کا صدر مدرس کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ مدرسۂ سلیمانیہ کے نائب مہتمم اور پھر اس کے اور ریاست بھوپال کے صیغۂ تعلیمات کے مہتمم ہو گئے۔ نوّاب صاحب علم و فضل کے قدردان تھے، عربی و فارسی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی عربی کی تصانیف کی شہرت ممالکِ اسلامیہ تک پہونچی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ وہاں کھنچ کر پہونچتے تھے۔ عراق، شام اور نجد وغیرہ کے علماء و طلبہ بھی کبھی کبھی وہاں آتے رہتے تھے۔ مولانا سلامت اللہ صاحب مرحوم چونکہ سلیقۂ گفتگو میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے اور عربی نہایت صاف اور بے تکلّف بولتے تھے۔ اس لئے عرب مہمانوں سے گفتگو کے لئے بیشتر وہی بُلائے جاتے تھے۔

اس زمانے میں بھوپال علماء فضلاء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ عربی زبان و ادب حدیث و قرآن اور منقولات و معقولات کا ایک سے ایک جیّد عالم وہاں موجود تھا۔ قاضی عبدالحق صاحب سرحدی، شیخ حسین عرب اور مولوی بشیر احمد صاحب سہسوانی جیسے علماء جہاں جمع ہوں، اس شہر کا "عیارستانِ بازارِ علم" میں کیا درجہ ہوگا۔ اسے جاننے والے خوب جانتے ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنے وقت کا امام تھا۔ اس قسم کے لوگ اب اس زمانے کی مٹی سے نہیں ڈھالے جا سکتے۔ ان کا ذکر میں نے اس لئے ضروری سمجھا کہ بھوپال کے اس علمی ماحول میں مولانا اسلم کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ مولانا کا کہنا ہے کہ انھوں نے ان سب فضلاءِ روزگار کو دیکھا ہے۔

مولانا اسلم چھ سال کے تھے کہ ان کے والد انھیں بھوپال لے گئے اور ابھی ان کی عمر کا نواں سال ہی تھا کہ انھوں نے قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اب اس کے بعد فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

> "حفظِ قرآن کی بدولت محنت کی عادت پڑ گئی تھی اور حافظہ قوی ہو گیا تھا، جو کچھ پڑھتا تھا چند بار دہرانے سے ازبر ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گلستاں اور بوستاں دونوں کتابیں پوری پوری یاد کر ڈالیں۔ . . . . . . قواعد کی مشق لکھا کر کرائی گئی۔ چنانچہ اس نوشتہ کو "قواعدِ اسلمیہ" کے نام سے میں نے اسی زمانے میں سرکاری مطبع میں طبع کرا دیا تھا۔ ایک جزو کا مختصر رسالہ سلیس فارسی زبان میں ہے۔"

فارسی کا کل مرحلہ چار سال میں ختم ہوگیا اسی کے ساتھ ساتھ ریاضی بھی۔ پھر ایک ماسٹر صاحب سے انگریزی پڑھی۔ اس کے بعد عربی کا سلسلہ شروع ہوا۔ صرف و نحو، فقہ و اصول فقہ، منطق و فلسفہ، ادب، حدیث اور قرآن کی پوری تعلیم مولانا نے مولوی فتح اللہ صاحب اور اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ دراصل یہی دو اُستاد تھے جن کے قدموں میں بیٹھ کر مولانا نے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ مولوی فتح اللہ صاحب ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور صرف و نحو اور فقہ و اصول کے اچھے اُستاد مانے جاتے تھے ہمارے یہاں یہ بات اصول کی حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کسی عالم نے کسی عربی مدرسے سے سندِ فضیلت نہیں حاصل کی ہے تو اسے عالم نہیں مانتے اور اس کے علم کو ناقص جانتے ہیں۔

بہتوں پر آج تک یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور مولویوں کا ایک بڑا طبقہ مذہب کے معاملے میں اُن کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ مولانا مودودی کے متعلق بھی اسی قسم کی باتیں کہی جاتی ہیں ـــــ اور مولانا اسلم تو ساری عمر اسی چیرہ دستی کا شکار رہے ہیں۔ اب ان کور ذوقوں کو کون سمجھائے کہ مدرسہ و خانقاہ کے باہر بھی علم ہے اور اپنی تمام پہنائیوں کے ساتھ دعوتِ اصلاح و اجتہاد دیتا رہتا ہے۔

۱۷ سال کی عمر میں مولانا اسلم اپنی تعلیم و تربیت کے دَور سے گزر چکے تھے ۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور پیسہ اخبار (لاہور) میں مترجم کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ لیکن دوسرے سال ہی والد کی بیماری نے انھیں بھوپال بُلالیا۔ چند روز کے بعد ان کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ پھر مولانا لاہور نہیں گئے ۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں وہ علی گڑھ پہونچے اور وہاں کالجیٹ اسکول میں عربی و فارسی کا درس دینے لگے۔ چھ سال کے بعد کالج کی لٹن لائبریری میں مشرقی کتابوں کا شعبہ ان کے سپرد ہُوا۔ وہاں انھوں نے کتابوں کی فہرست مرتّب کی جو اپنی جگہ پر خود ایک بڑی علمی خدمت ہے۔ پھر وہ کالج میں آگئے اور عربی و فارسی کے پروفیسر ہو گئے ۔ سنہ ۱۹۲۰ء تک کالج سے وابستہ رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہماری قومی زندگی کا دھارا بہت تیز بہنے لگا تھا اور ایک عمومی حرکت نے ملک و قوم کے سامنے شاندار مستقبل کی راہیں کھول دی تھیں۔ تحریکِ خلافت، نان کوآپریشن اندولن اور جامعہ ملیہ کے قیام سے کون ناواقف ہے درحقیقت ہماری قومی زندگی "لذّتِ کام و دہن" کی آزمائش سے گذر چکی تھی۔ اس کی رگ و پے میں اب ایک دوسرے غم کا زہر اُتر چکا تھا۔ اب ہم اس منزل پر تھے جہاں دار و رسن کی آزمائش تھی۔ مولانا اسلم نے اس منزل پر وطن اور ملّت کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جب وہ وقت آیا تو انھوں نے علی گڑھ کالج کو خیرباد کہہ دیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ یہ گویا مادی سکون و اطمینان کو تیاگ کر بے سر و سامانی کو اوڑھنا بچھونا بنانا تھا۔ مولانا نے اسبابِ عیش سے محروم ہو جانا اور قوم کی آبرو کا محافظ بننا پسند کیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک جامعہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور باوجود پیرانہ سالی کے شاہانہ وقار کے ساتھ تعلیم و تعلّم کا کام کر رہے ہیں کہ بوریائے علم کے سامنے تخت و تاج بھی سر جھکاتے ہیں۔

مولانا عالمِ دین ہیں، حافظِ قرآن ہیں، کتابِ الٰہی کے اسرار و رموز پر نظر رکھتے ہیں، مُوَرِّخ ہیں، شاعر ہیں اور اعلیٰ درجہ کے ادیب و انشاپرداز ہیں۔ اس مضمون میں میں مؤرخ اور ادیب و انشاپرداز کی حیثیت سے ان کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں کہ یہی میرا میدان ہے۔

مولانا اسلم تاریخِ اسلام کے اچھے عالم ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی دو مشہور تصنیف تعلیمی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ تاریخ الامّت (آٹھ جلدوں میں) اور تاریخِ نجد۔ فاتحِ مصر عمرا ابن العاص کی سیرت اور حافظ و جامی کے حالاتِ زندگی اور ان کی شاعری پر تبصرہ کر کے مولانا نے سیرت نگاری اور بیوگرافی کے میدان کو بھی نہیں چھوڑا۔ ان کتابوں کے مآخذ عربی و فارسی کی مستند کتابیں ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا نے قدیم کتبِ تاریخ سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ کوئی جرم نہیں۔ تاریخ مستند ماخذوں کے سہارے ہی پڑھی اور مرتّب کی جاتی ہے۔ میں چونکہ عربی نہیں جانتا اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تاریخ الامّت کے لکھنے کے سلسلے میں مولانا نے الجزری کی کتاب سے کس طرح استفادہ کیا ہے۔

میں مولانا کو مؤرخ اس لئے مانتا ہوں کہ تاریخِ اسلام کو انھوں نے کھنگالا ہے، واقعات کے اسباب و علل اور اُن کے نتائج کو تنقیدی نظر سے جانچا ہے، زمانے کی اسپرٹ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی آئینے میں سلطنتوں کے عروج و زوال کی تصویریں دیکھی ہیں۔

آپ ان سے گفتگو کیجئے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی نگاہ کتنی دور تک پہونچتی ہے، البتہ تاریخ الامّت میں ایک چیز کی کمی مجھے نظر آئی اور وہ یہ کہ معاشی حالات کا جو اثر معاشرتی نظام پر پڑتا ہے اور بہت شدید پڑتا ہے

اسے مولانا نے نظرانداز کردیا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے مولانا سے گفتگو کی، وہ تہذیب و تمدّن کی تاریخ میں معاشی عناصر کو اہمیت دیتے ہیں، پھر نہ معلوم کیوں تاریخ اسلام پر انھوں نے اس نقطۂ نظر سے تنقید نہیں کی۔

مولانا اسلم نے شاعری بھی کی ہے اور فارسی اور اردو میں اچھے شعر کہے ہیں مگر یہ شغل زیادہ دنوں تک نہیں چلا۔ اسے موانع کار میں سے سمجھ کر ترک کردیا۔ مولانا کے اشہبِ قلم کی جولانی اور بحرِ تخیّل کی طغیانی دیکھنا ہو تو ان کے ادبی و تنقیدی مضامین پڑھئے۔ ان کی تحریروں میں آپ بے باکی بھی پائیں گے اور توازن بھی۔ وہ آج کل کے بعض خود ساختہ نقّادوں کی طرح تنقید برائے تنقید نہیں کرتے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی مثنوی اسرار خودی جب پہلی بار شائع ہوئی تو تصوّف کی بحث میں حکیم افلاطون یونانی اور خواجہ حافظ شیرازی کے متعلق علامہ کے خیالات پر بعض لوگوں نے احتجاج کیا۔ جب بڑی ہماہمی ہوئی اور مخالفین و موافقین کی طرف سے بے معنی تحریروں کا ایک طومار بندھ گیا تو مولانا نے قلم اُٹھایا اور اپنے خاص انداز میں ایک متوازن رائے پیش کردی۔ اس سلسلے میں "تصوّف اور اسلام" پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کا شمار انشاپردازی کے بہترین نمونوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"..... جب تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے اور چنگیز اور ہلاکو نے ایک قیامت صغریٰ برپا کردی تو اُن کی ہولناک خونریزیوں سے اُمّت کے فاتحانہ جذبات مٹ گئے، دنیا کی طرف سے ان کے دل سرد ہوگئے۔ طبیعتوں کا جوش اور ولولہ جاتا رہا۔ حوصلے پست اور ہمتیں سست ہوگئیں۔ زوال و فنا کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میلانِ خاطر زہد و ترک کی دُنیا کی طرف بڑھ گیا اور سرمایۂ توکّل و قناعت کو لے کر گوشۂ عافیت میں بیٹھنا پسند آیا۔ عالمِ فانی کے جاہ و جلال کی وقعت نگاہوں میں نہ رہی بوریائے فقر سریرِ سلطنت سے زیادہ عزیز ہوگیا .... ذوقِ عمل طبائع سے یہاں تک مسلوب ہوگیا کہ "شیوۂ قلندری" کے مقابلہ میں "رہ و رسمِ پارسائی دور و دراز" نظر آنے لگی۔ عالمِ ذوق میں حلقۂ یاراں میں "خلوت در انجمن" ہونے لگی اور سجادہ ہی پر "سفر در وطن" کی کڑی منزلیں طے کی جانے لگیں .... یہ اثرات اگر صرف ایک ہی جماعت تک محدود ہوتے تو نقصان نہ ہوتا، لیکن شاعری کے ساز پر یہ ترانہ کچھ اس انداز سے چھیڑا گیا کہ تمام ملک اس صدا سے گونج اُٹھا اور ادبیاتِ اسلامیہ میں ایک قسم کے جمود اور رہبانیت کا اثر ساری ہوگیا۔"

مولانا کی انشاپردازی سے متعلق ان کے مضامین سے اس قسم کے بہت سے زوردار اور رنگا رنگ ٹکڑے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ کسی صاحب کو اگر مطالعہ کا شوق ہو تو وہ "نوادرات" پڑھیں۔ مولانا کے مضامین کا یہ گراں بہا مجموعہ ادارۂ طلوع اسلام (کراچی) نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا ہے۔

مذہب، سیاست، معاشرت، غرض زندگی کے کسی شعبے میں مولانا کی طبیعت کورانہ تقلید اور جمود و تعطّل فکر و نظر کو برداشت نہیں کرسکتی۔ مذہب کے معاملے میں مولانا آرتھوڈاکس مکتبِ خیال سے کوئی تعلّق نہیں رکھتے۔ قرآن کو اسلام سمجھتے ہیں اور حدیث کو حجت نہیں گردانتے۔ مُلّائیت اور کلیسائی نظام کے سخت مخالف، جمہوریت کے شیدائی اور استبداد کے دشمن ہیں اور کہتے ہیں کہ "شوکت اسلام کے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ جمہوریت جو اسلام لے کر آیا تھا اور جس نے ہر مسلمان کو آزاد اور خودمختار بنا دیا تھا، مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتی رہی۔"

مولانا کی شخصیت کی انفرادیت مُسلّم ہے، اس کے ثبوت میں یہی ایک بات کافی ہے کہ مولانا نے جس ماحول میں پرورش پائی اور ابتدائی تعلیم و تربیت نے جس منصب کے لئے انھیں تیار کیا تھا، اگر وہ چاہتے تو اس سے فائدہ اُٹھاتے اور دنیا کماتے، ہزاروں ایسے مل جاتے جو ہاتھ چومتے اور ایک نگاہِ کرم کے منتظر رہتے۔ نفسِ انسانی بڑا مُفسد ہے۔ اچھے اچھوں کے قدم میں لغزش پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن مولانا نے اپنا کام سمجھ لیا تھا اور اپنی راہ متعین کرلی تھی۔ علم و تدبّر کو انھوں نے اپنا پیشوا بنایا اور قبائے مشیخت اور جبۂ پیشوائیت کو پارہ پارہ کردیا۔ اس راہ میں انھیں دشوار گزار مراحل سے گزرنا بھی پڑا، لیکن وہ ان سب سے آسان گزر گئے اور اس کی پروا نہیں کی کہ مذہبی دُنیا انھیں کیا کہتی ہے۔

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

نصیرالدّین ہاشمی

ملک محمدؐ جائسی کی ایک نایاب تصنیف

مرحوم نوّاب سالار جنگ ثالث حیدرآباد کے ایک مشہور امیر تھے جن کے خاندان کے کئی افراد سلطنت آصفیہ کے وزیراعظم کی حیثیت سے مامور تھے۔ خود سالار جنگ ثالث نے بھی تین سال تک اس خدمت کو انجام دیا ہے۔ موصوف نے شادی نہیں کی تھی اس لئے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کی وفات پر حکومت نے ان کے جمع کردہ نوادر کو سالار جنگ میوزیم کے نام سے عوام کے استفادے کے لئے عام کر دیا ہے۔ عجائب خانے میں بے شمار نوادر ہیں جو ایک سو سے زیادہ کمروں میں جوڑے گئے ہیں۔ مگر ہنوز نصف سے زیادہ حصّہ جگہ کی قلّت کے باعث محفوظ رکھا گیا ہے۔

عجائب خانے سے قطع نظر نوّاب صاحب کو قلمی کتابوں کا بھی شوق تھا۔ کئی ہزار کتابیں جمع کی تھیں۔ انگریزی کے علاوہ صرف عربی، فارسی اور اُردو کتابوں کی تعداد تقریباً پچاس ہزار ہے۔ ان میں تقریباً دس ہزار قلمی کتابیں ہیں۔ اس کے منجملہ ایک ہزار اُردو مخطوطات ہیں جن کی تفصیلی وضاحتی فہرست میں مرتب کر رہا ہوں۔ اس موقع پر ایک قلمی کتاب کا تعارف کرایا جاتا ہے جو بہت زیادہ نایاب کہی جا سکتی ہے۔

یہ کتاب ملک محمدؐ جائسی کی تصنیف "چترریکھا" ہے۔ ملک محمدؐ جائسی وہ علم دوست اور ادب نواز شخص تھا جس نے حکومت کی زبان فارسی ہونے اور علماء فضلا کے تصانیف فارسی میں ہوتے رہنے کے باوجود "ہندی" کی طرف توجّہ کی تھی اور اپنی بیش بہا تصانیف سے آج تک مشہور و معروف ہے۔

ملک محمدؐ جائسی اودھ کا رہنے والا باکمال شاعر تھا، وہ فارسی کا بڑا عالم اور سنسکرت پر پورا عبور رکھتا تھا۔ اس کی کتاب "پدماوت" کا ترجمہ انگریزی اور بنگالی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔ اس طرح ملک محمدؐ کو جاننے والے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ہیں۔ امیر خسرو بھاشا کے نامور ادیب اور شاعر تسلیم کئے گئے ہیں۔ ان کے بعد ملک محمد ظہیرالدّین بابر کے عہد میں سنہ ۱۴۹۵ع میں پیدا ہوئے ان کی پیدائش جائس میں ہوئی۔ یہ مقام ریلوے اسٹیشن جائس (رائے بریلی اور پرتاب گڈھ کے درمیان واقع ہے) سے تقریباً دو میل پر آباد ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اب تک ان کا مکان شکستہ حالت میں بوسیدہ موجود ہے۔

ملک کا خطاب ان کو حکومتِ مغلیہ کی جانب سے ملا تھا۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مگر اولادِ معنوی (تصانیف) موجود ہیں۔ وہ فقیر منش اور صوفی بزرگ تھے۔ صلح کل ان کی پالیسی تھی۔ ان کے مرشد کا نام شیخ مبارک تھا۔ ان کے بعد شاہ محی الدّین سے بھی فیض پانے کا ثبوت ملتا ہے۔ قصبہ امیٹھی کو اُنھوں نے اپنا مستقر بنایا تھا اور "پدماوت" اسی مقام پر ختم ہوئی۔ وہ ایک سنجیدہ مزاج شاعر، تنہائی پسند اور خوددار شاعر تھے۔ کسی بادشاہ کا تقرّب پسند نہیں کیا۔ صوفی ہونے کے باعث ہر مذہب اور ملّت کے اشخاص سے بلا تعصّب ملتے تھے۔ ان کے اخلاقِ حسنہ نے سب کو گرویدہ کر لیا تھا۔

۱۵۴۵ عیسوی میں ملک محمدؐ کا انتقال ہوا۔ رام نگر متصل گرہہ امیٹھی ان کا مزار ہے۔ بقول بعض ہندی رزمیہ نظم میں ان کو اوّلیت کا سہرا باندھا جاتا ہے۔

انجمنِ ترقّی اُردو نے ایک کتاب میں ان کے حالات شائع کئے ہیں جن کو کلب مصطفےٰ صاحب نے قلمبند کیا ہے۔ اس کتاب میں ان کی حسب ذیل تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۱) اکھراوت (۲) پدماوت (۳) سکھدرت (۴) چمپاوت۔ (۵) اتراوت (۶) مٹکاوت (۷) چتراوت (۸) کہرا نامہ۔ (۹) موراتی نامہ (۱۰) مکھرنامہ (۱۱) یوسف نامہ (۱۲) مہرا نامہ (۱۳) ہولی نامہ (۱۴) آخری کلام

ان میں سے پدماوت کی تفصیلی وضاحت کلب مصطفےٰ صاحب نے کی ہے

اور اس کے بعد الکھراوٹ، پوس نامہ اور آخری کلام کا مختصر حال لکھا ہے ان کے علاوہ ایک بارہ ماسہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

آج ہم ملک محمد جائسی کی ایک نئی تصنیف چترریکھا کا تعارف کراتے ہیں۔ اس کا قلمی نسخہ نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں ہے نمبر (۱۹۲) سائز (۸×۴) پانچ صفحہ (۲۷) سطر (۱۵) خط نستعلیق ہے اور کتابت سنہ ۱۱۳۳ھ میں ہوئی ہے۔

آغاز

آدئ ایک بر تو سوراجا　　جاکر سیپیے جگت پہ ساجا
چودہ بھوی پورکی ساجو　　ہنس اٹھارہ بھونجی راجو
ساجی چاند سورج اونارا　　ساجی بن کنھہ سمد بچھارا

اس کتاب میں اولاً حمد ہے اس کے بعد نعت پھر خلفائے راشدین کی مدح کی گئی ہے اس کے بعد اپنے مرشد کا تذکرہ کیا ہے۔

خلفائے راشدین کی مدح اس طرح کی ہے۔

چارمیت نبی سنگ تر ہے　　چارو کنھہ دولھوں جگ اپنے
ابابکر صدیق بکھانے　　سب بات سب پہنچی ملنے
عمر عدل سو کنھہ ربٹا　　سن دنیا و مراد ایٹیا
عثمان لکھ سو پوران سناوا　　جن جن ساتھہ نبی پاوا
علی سنگ کھانڈی رن کاجے　　ذوالفقار دلدل جن جاجے
چارہوں چہوں کہنہ بھنن بکے　　وولت اہے یو استھرا ہے

اپنے مرشد اور اپنے پیر بھائیوں کا تذکرہ اس طرح کیا ہے

سید اشرف پیرا پیارا　　ہوں مرید سبھوں تن یارا
جہانگیر چشتی دے راجے　　سمند ماہیہ بوہٹ کنان جے
حاجی احمد حاجی پیرو　　اینھ باہتھ جن سمند کنھرو
شیخ جمال جلال دنیارا　　دو وسو کتن بہت بنوسارا
اس مخدوم بوہٹ لین حرم کرم چالی　　کریا شیخ مبارک کھوئے شیخ جمال
مجہدین کرو شیخ برہان　　کاپیے نگر نبی کا استھان

شاعر کے تخلص کے بعض شعر یہ ہیں

ملک محمد پنتھے کہہی یا نیہ اوداس　　پکھو سورہ سنگے کیھوں نیک اوبیاس

محمد ملک یہم ۵۸ پھورا　　ناؤں بڈھسرا ورسن تھورا

محمد سا پرہ بن انیہ لکھ انرپ نہاں　　بدن جیس جگ سپورن سوک جنس بنہاں

اس نظم میں ایک داستان نظم کی گئی ہے جس کے ہیرو روپ ریکھا اور چترریکھا ہیں۔ یہ ہندو مذہب اور فلسفے پر مشتمل ہے۔ اسے ایک المیہ داستان کہنا چاہیئے حاصل مطلب "سیوا" کرنے کو انسان کی معراج بنایا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ

سیوا بہو کی تو ناموی　　سیوا بن لونان یکھ ہوی
سیوا بن جاکر من لاگو　　دن دن بادھی اویک سوڈو
سیوا پیہہ دشت من بھاؤ　　مو نہہ تجے بلو تہہ را او
سیوا کہنہ نسائی روسو　　سیوا کرت نلاکی دوسو
سیوا او آپس منہہ دیبنی و ساجدہ ساتھ　　رہنہ بھی جو کرت کہا رتے پاچنیں نچھا تھ

اس نظم کا اختتام ان اشعار پر ہوا ہے۔

لکھا سو بر ہتہہ رہی بو لکھہ جائی کری
پیکھہ را یا پرا سکی کل ماہی ہوی
کوتک پو بھتی بڈہ دری بنیٹ بہانہ کوئی
اسکی اچھریچ کا بدھی سو پنڈت ہوی

کتاب کے خاتمے پر کاتب وغیرہ کی صراحت بھی موجود ہے جو یہ ہے "تمام شد پوتھی چترریکھا من تصنیف ملک محمد جائسی در عہد محمد شاہ بادشاہ غازی بتاریخ دوازدہم شہر رجب سنہ ۲ جلوس موافق سنہ ۱۱۲۷ فصلی مطابق سنہ ۱۱۳۳ھ بروز منگل بوقت دوپہر از خط کمترین دیار.... ٹھٹاکر یا تمام رسید۔"

اس کے علاوہ ایک اور عبارت حسب ذیل درج ہے۔

"بتاریخ بست و پنجم شہر ربیع الاول سنہ ۱۲ جلوس محمد شاہ بادشاہ غازی در جنوں گنج لاپزدہ جگنال ولد نورمل کاہنہ ساکن متصل حویلی نور رتن"۔

ایک مہر سید محمد علی خان بہادر کی ثبت ہے جو نواب سالار جنگ کے خاندان میں شامل تھے۔

یہ کتاب بڑی نایاب ہے کسی اور نسخے کا پتہ نہیں چلتا اور اب تک شائع بھی نہیں ہوئی ہے۔ امید ہے کہ ارباب ادب اس کی اشاعت کی جانب توجہ کریں گے۔

رضی الدین احمد

جعفر زٹلی کی شاعری کا پس منظر

ہندی اور فارسی شاعری میں کچھ اس طرح کا فرق ہمیں نظر آتا ہے جس طرح دربار اور عوام میں پہلے دوری دکھائی دیتی تھی چنانچہ دربار سے متعلق اکثر فارسی شعراء اور امراء سے متعلق عام شعراء کے ہاں ہمیں ایک طرح کی لذّت پرستی' عیش پسندی' آدمی سے دوری' انفرادیت' کھوکھلی مذہبیت' اندھی عقیدت' اور بے جان صنعت گری اور بے لطف شاعری کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔ عوام سے ہمدردی رکھنے والے شعراء' ہندی شعراء اور ہندوستانی مزاج کے شعراء کے ہاں ہمیں ایک دبا دبا سا اجتماعی شعور آدمی سے تعلق فرد اور جماعت کے ربط کا اشارہ مذہبیت کی وہ روح جو خدمت اور ایثار پر اکساتی ہے عقیدت کا وہ جذبہ جو نا امید اور بے عمل نہیں بناتا کم کم سہی مگر محسوس ضرور ہوتا ہے مغل حکومت کے غروب آفتاب پر جس طرح تخت و تاج کے لئے دو بھائی ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے اور یہ دونوں دو مختلف بلکہ متضاد مدرسہ فکر کے ترجمان تھے اس طرح ان دو زبانوں کی باہمی سابقت میں بھی ہمیں دو مختلف تہذیبوں کا تصادم نظر آتا ہے۔ ایک طرف اورنگ زیب تھا دوسری طرف دارا شکوہ۔ ایک طرف فارسی زبان کا دباؤ تھا' دوسری طرف ہندوستانی زبان کی کشش' ایک طرف امراء اور قلعہ تھا' دوسری طرف گاؤں اور کسان' ایک طرف روائتی مذہبیت تھی جس نے امراء کی پشت پناہی پر کمر باندھی تھی' دوسری طرف حقیقی آدمیت تھی جو عوام کی طرف دار تھی۔ ایک طرف سیاست اور شاعری کے مقررہ ضابطے تھے جن کی بے چون و چرا پابندی لازمی تھی' دوسری طرف زندگی کے تقاضے اور شاعری کے نت نئے محرکات تھے جن میں آزادی اور اجتہاد کا جذبہ کارفرما تھا۔ ایک طرف وہ پست ذہنیت تھی جس نے قانون اور رواج کا سہارا لے کر تاریک اندیشوں کو جنم دیا تھا اور پھر خود مجبور ہو چلی تھی کہ ان سے چھٹکارے کے لئے جسمانی لذّتوں کا سامان فراہم کرے اور عیش کی دلدل میں پھنس جائے۔ دوسری طرف وہ مادی صداقت تھی جس نے سماجی حالات کے جبر سے نئی امیدوں کے چراغ روشن کئے تھے کہ ان کی روشنی میں جسمانی لذتوں کی ہوس کاری نا ممکن اور سماجی خوشحالی کا تصور ناگزیر ہوا۔ اور معشیت کی راہ کھل گئی۔

ایک طرف وہ عورتیں تھیں جن کے پاس لباس رنگین آوازیں حُسین تہذیب کے تیور اور سونے کے زیور تھے۔ ان کے کوٹھوں پر سبحان اللہ کی صدائیں اور اوئی اللہ کی ادائیں تھیں' ریوں کی جھنکار اور بوسوں کی چمکار تھی ان کی وہ عظمت تھی کہ شریفوں کی بہو بیٹیاں اخلاق انھیں سے سیکھتی تھیں۔ دوسری طرف وہ لڑکیاں اور عورتیں تھیں جو صبح سے شام تک اپنے خاندان والوں کے ساتھ کھیتی باڑی اور کام دھندے میں ان کا ہاتھ بٹاتیں۔ ان کے جسم محنت اور مشقّت کے پسینے سے شرابور' ہاتھ پیر افلاس اور ناداری سے کمزور' آوازیں جہالت سے دبی ہوئی اور آنکھیں حیا سے جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس بناؤ سنگار نہ تھا کردار تھا' تہذیب نہ تھی تندرستی تھی شرافت نہ تھی عفت تھی۔

ایک طرف کم ظرفی سے زر دار اور سکّہ چلتا تھا دوسری طرف کم بختی سے ایمان اور ادھار پر دونوں کو دھکّے دئے جاتے تھے۔

ایک طرف شہر اور فصیلیں تھیں دوسری طرف گاؤں اور پنچائتیں ایک طرف وہی لوگ جو نمازیں پڑھتے عیاشی بھی کرتے روزی کا احترام اور شراب کا اہتمام کرتے۔ دوسری طرف جو لوگ محنت کرتے وہی بھوکوں مرتے اور جو سب کے پیٹ اگاتے اور پیدا کرتے وہی سب سے زیادہ محروم رہتے۔

غرض زندگی میں سخت تضاد تھا جس نے ہر طرف کسی نہ کسی صورت میں اپنا اظہار کیا۔ اس تضاد کی ایک شکل ذہنی اور تہذیبی تھی دوسری مادی اور سیاسی۔ چنانچہ اس کا اظہار دارا اور اورنگ زیب کی جنگ میں ہوا۔

ہندو مسلم فلسفہ کی آمیزش، افکار، اور عقائد میں تطبیق اور عوام اور دربار میں تعلق کی جو کوشش اکبر نے شروع کی تھی، اور اس کا مختلف شکلوں میں عملی اظہار ہوا تھا دارا کے ہاں اس نے ایک سنجیدہ علمی صورت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ دارا نے اپنی پہلی تصنیف "سفینۃ الاولیا" ۲۵ برس کی عمر میں ۱۰۴۹ھ میں لکھی پھر تین سال بعد دوسری تصنیف "سکینۃ الاولیا" ۱۰۵۲ھ میں لکھی دارا نے شاعری بھی کی اور اپنا تخلص قادری رکھا رسالہ حق نما ۱۶۵۶ء میں تصنیف کیا۔

دارا نے مطالعے اور فکر کے بعد اصلاحی تصوف، اور طریقت کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کا مطالعہ بھی دقّتِ نظر سے کیا۔ اس نے بھگوت گیتا کا ترجمہ کر کے اصلاحی تصوف اور ویدانت فلسفہ کو ایک کر دکھایا وحدت الوجودی مسلک اور ہندو ویدانت کا اتحاد اس کے رسالہ مجمع البحرین ۱۰۶۵ھ میں ہے جو مذہب کے تقابلی مطالعے کا منصفانہ نتیجہ ہے دارا کی اس کوشش میں اس کے منشی چندر بھان نے بھی خاص شہرت حاصل کی۔ ایک رسالہ "مکالمہ داراشکوہ" مرتب کیا (۱۰۶۶ھ) "جوگ بششٹ" کا آسان فارسی میں ترجمہ کیا۔ بنارس کے پنڈتوں کی امداد سے دارا نے اپنشدوں کے کئی ابواب کا فارسی میں ترجمہ کیا غرض دارا اپنی ذہنی صحت اور فکری صلاحیت سے مسلمان صوفیوں اور ہندو جوگیوں کا رہنما بن گیا اس طرح ہندو ویدانتی مثنوی مولانا روم کی طرف متوجہ ہوئے دارا کے مرشد سرمد اور "دبستان مذہب" کا مصنف اور کئی آزاد خیال علما جمع ہو گئے اور اس طرح اس تحریک نے ایک علمی انداز اختیار کر لیا اس طرح ہندوؤں میں ایک جماعت مہر منشی چندر بھان کے ساتھ ہو گئی اور چندر بھان نے شاعری شروع کر دی فارسی میں، ایک خیال کے مطابق یہ فارسی کا پہلا صاحب دیوان ہندو شاعر تھا اس زمانے کا ایک اور آزاد منش ہندو شاعر بھوپت رائے بے غم بیراگی تھا۔ خوش گو کا شاگرد تھا اور دارا کے صوفیانہ ماحول سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کی مشہور مثنوی کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ رائے لائق توجہ ہے کہ

"مثنوی بے غم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ویدانت اور اسلامی تصوف کو تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے ان ہر دو روحانی سلسلوں کے اتصالی مقامات کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے مثلاً "تصورِ استغراق" "بے ثباتیِ عالم" کا ایک وہم اور افسانہ ہونا اور وحدت الوجود وغیرہ مسائل، اسلامی اور ہندو تصوف میں مشترک ہیں" ہندو اسلامی فلسفہ کی تطبیق کی اسی کوشش نے اگر ایک طرف سنسکرت کے ترجمے فارسی میں کرائے تو دوسری طرف "مجمع البحرین" کا ترجمہ "سمود سنگم" کے نام سے سنسکرت میں ہوا۔ دارا کی یہ کوشش ایک لحاظ سے اکبر سے زیادہ عالمانہ اور محققانہ ہے۔ اور اس کے اثرات بھی زیادہ گہرے اور دُور رس ہیں۔

اورنگ زیب کٹر وحدت الشہودی تھا تو دارا سخت وحدت الوجودی گویا اس طرح دونوں کے اختلافات دو مستقل مسلک بننے کی وجہ سے بڑھے تھے اور تخت و تاج کی وراثت سے بڑھ کر یہ دو مختلف رجحانات کا ٹکراؤ تھا۔ اورنگ زیب اپنی سیاست اور تدبّر سے کامیاب ہوا۔ اور دوسرے بھائیوں کو دارا کے مقابلے میں جمع کر کے اس نے پھر تقسیم کر دیا اور کامیاب ہوا دارا شکوہ اپنی افتادِ طبع کی بناء پر نہ صرف سیاسی اور مذہبی نقطہ نظر سے اورنگ زیب سے مختلف تھا بلکہ ادب اور زندگی کے نقطہ نظر میں بھی دونوں کا ایک مسلک نہ تھا۔ اورنگ زیب نے عربی سے دلچسپی لی اور اس کی کتابت کی تو دارا شکوہ نے سنسکرت سیکھی اور پھر "اپانی شادش کو سرالاسرار" بنا دیا۔ ہندو مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے دھاروں کو ملانے کی جو کوشش اکبر نے مذہب اور سیاست کے میدان میں کی دارا نے اسے علمی اور تحقیقی کام کے ذریعے سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اس نے ایسے مدرسے چاہے قائم نہ کئے ہوں جیسے اکبر نے اپنے عہد میں کئے تھے اور جن کے ذکر میں علامہ ابو الفضل "آئین اکبری" میں رقم طراز ہیں کہ "اخلاق، ہندسہ، زراعت، ہئیت، طبیعات اور مذہب، تاریخ ہندو مسلمان ایک مکتب میں ساتھ پڑھتے اور یوں قومی اختلاف مٹتے رہتے تھے" لیکن اس نے اجتہادی شان سے تحقیقی کام کر کے اس طرف اہل علم کو متوجہ کیا کہ دراصل اشتراک کے ماخذ کہاں ہیں اور کیا کیا ہیں۔ اس نے جلد نتائج کا ڈھیر لگانے کی جگہ ان اسباب کا کھوج لگایا جن سے یہ نتائج اخذ کئے جائیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح اورنگ زیب سیاسی اقتدار میں کامیاب ہوا دارا نے علمی تفوق اور اجتہادی شان پیدا کر کے ہندوستان کی مذہبی تاریخ اور مشترکہ قومی عناصر کی بازیابی میں اپنے لئے ایک ایسی جگہ بنا لی جسے تخت و تاج کے ساتھ نہ جیتا جا سکتا ہے نہ موت اور زوال کے ساتھ کھویا جا سکتا ہے۔ دارا نے علمی اور تحقیقی کام کر کے جو نتائج اخذ کئے ان کا اگرچہ براہِ راست نہیں مگر بالواسطہ بہت

بڑا اثر اردو شعر و ادب پر پڑا - اور اردو ہندی کی خلیج جس نے دو الگ کنارے بنائے تھے ایک سنگم پر آنے لگی -

اورنگ زیب نے جس روائتی اخلاق اور فقہی دینداری کی نہایت مخلصانہ پرجوش مگر اندھا دھند طریقے سے تبلیغ اور کوشش کیں اس پر بھی اصل اخلاق اور سچی مذہبیت پیدا کرنے میں اُسے آخر ناکامی ہوئی - اس کی ایک نہایت عبرت ناک اور افسوس ناک مثال اس زمانے کے اہل علم اور فضلا تھے جو علم سے زیادہ دولت کو عزیز رکھتے تھے -

اورنگ زیب کے نہایت معتمد اور خاص مشیر قاضی القضاۃ گجرات کے قاضی عبدالوہاب تھے مؤرخین کا بیان ہے کہ قاضی صاحب نے وفات کے بعد (۱۰۸۶ھ) میں ایک لاکھ اشرفیاں اور پانچ لاکھ روپے علاوہ جواہرات اور اثاث البیت کے چھوڑا -

غرض اس پست اخلاقی سطح کا اعتراف خود اورنگ زیب نے صاف لفظوں میں کیا ہے اورنگ زیب کی اس خشک مزاجی اور ظاہری مذہب پرستی نے شعر و شاعری میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا - چنانچہ پشتو کا مشہور شاعر خوشحال خاں خٹک افغان بغاوت کا رہنما تھا - خوشحال کی طرح پشتو کے ایک اور شاعر حمید نے بھی مغلوں کے خلاف اپنے جذبات بڑی شدت سے ظاہر کئے اس طرح پشتو ہی کے مشہور شاعر خواجہ محمد نے بھی اورنگ زیب کو "انصاف کا دشمن" کہا -

اورنگ زیب نے شعر و ادب پر جو پہرے بٹھائے تھے ان سے خود ان کی خشک مذہبیت اور کھوکھلی اسمیت جل اٹھی - ابھی تک اردو شعر و شاعری طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سے محروم تھی فارسی شاعری کی نقل اور ہندی شاعری کے اندرونی اثر نے اردو شاعری کی جو شکل بنائی تھی وہ ابھی تک سنجیدہ افکار اور سوچی سمجھی حقیقتوں کا بار پوری طرح نہ اُٹھا پائی تھی کہ ہمیں ایکا ایکی ایک بالکل نئی اور نرالی آواز سنائی دیتی ہے - یہ آواز بڑی بھرپور ہے بڑی تیز طرار اور نہایت ٹھٹھے مار رہی ہے طنز و ادب کی تلوار بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی دو دھاری تلوار ہوتی ہے - ذرا سی چوک سے خود وار کرنے والا آپ گھائل ہو جاتا ہے - مگر اس نئی آواز کی کاٹ بڑی تیز اور تڑپا دینے والی تھی - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اورنگ زیب نے جو زبان بندی کی تھی اب اس کے ٹانکے ٹوٹ گئے ہیں - اور خود مغل دربار ہی کے در و دیوار سے اس طرح یہ آواز ٹکرا رہی تھی گویا مغل حکمران کی زبان بندی کے خلاف خود اس کے بوڑھے ہاتھ پیر بول رہے اور گواہی دینے لگے ہیں -

اس زوال آمادہ نظام میں جب ہر چیز اپنی جگہ سے ہلتی اور گرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی - پرانے عقیدوں سے چمٹ چمٹ کر رونا اور شخصیتوں کے مزار پر عقیدت کے دو پھول چڑھا دینا کسے دوبھر ہوتا - فارسی شعراء رو پیٹ کر چپ ہوئے تو میر جعفر کے جگر گداز نالوں کا شور سینوں میں آگ لگانے کو اٹھا -

ایک طرف فارسی زبان سلطنت کا سایہ اٹھ جانے کے سبب سوگ منانے پر آمادہ تھی دوسری طرف اردو ابھی بچپن کی معصومیت اور تتلاہٹ سے آگے قدم رکھتے ٹھٹک رہی تھی -

ادب کی پرانی عمارت کے کنگورے ہل رہے تھے دیواریں ڈھتی جاتی تھیں سہارے اور بنیادیں کھوکھلی ہو چلی تھیں کہ یہ شور ساری تباہی اور غارت گری پر چھا گیا - جتنے شہر آشوب مرثیے اور نوحے لکھے گئے تھے ان کی سیاہی ماند پڑ گئی - یہ آواز اسی مثل کی مصداق تھی کہ "جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے" -

میر جعفر زٹلی کی یہ آواز مغلوں کے عہد کے لئے ایک صور بن کر رہ گئی - یہ آواز بظاہر بڑی غیر سنجیدہ، غیر مہذب، کھردری مگر باٹ دار آواز تھی - جو حلق ہی سے نہیں سینہ سے نکلتی محسوس ہوتی تھی - اس میں منہ بھر کر [illegible] کی کیفیت تھی ناک پر انگلی رکھ کر آنکھیں دکھانے کی بات نہ تھی -

اس آواز کے بعد ایک طرح سے پرانی دنیا کی کوکھ سے ایک نئی دنیا نے جنم لیا - مہذب، شستہ، سنجیدہ اور ہلکی پھلکی شعر و شاعری کی جگہ بڑی ناخوشگوار، نہایت بھدی سخت نا اُنوں مگر بھاری بھرکم اور اصلیت سے میل کھاتی شاعری نے لے لی -

یہ ایک طرح سے اردو شاعری کا ایک موڑ تھا - وہ سب اساتذہ جو فارسی کے اثر سے مسحور تھے اب بےہوش ہو چلے تھے - دکن کے فقیروں اور دہقانی کسانوں نے اورنگ زیب کی کمر اور مغلوں کے تاج کو ٹیڑھا کر دیا تھا - فارسی کے شعراء اب بے دم تھے اور اردو کے اساتذہ دم بخود - اس موت کے سناٹے میں زندگی کی چاپ ہمیں نظیر اور میر جعفر زٹلی کے ہاں سنائی دیتی ہے یعنی شعر و شاعری میں ایک نئے طرز کی ابتدا اور نئی زندگی کا سماں بندھ جاتا ہے - بقول ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے "ادب میں طرز ادا کی تبدیلی اگر وہ خلوص پر مبنی ہے در اصل وضع نفس اور فلسفہ حیات کی

تبدیلی کا آئینہ ہوا کرتی ہے چنانچہ اردو اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کا حقیقت نگاری کی طرف رجحان دراصل عکس تھا ایک ذہنی انقلاب کا جس نے ہندوستانیوں کی توجہ کا مرکز موضوع کی بجائے معروض کو تصور کی بجائے مشاہدہ کو بنا دیا تھا یعنی اسے عہدِ وسطیٰ سے عہدِ جدید میں پہنچا دیا تھا"۔

مغل شہزادے اپنی وراثتی فضیلت کی بنا پر ایک دوسرے پر تلواریں سونت رہے تھے بھائی بھائی پر فتح پانے کے درپے تھا۔ حیدرآباد کی تباہی اس برادرانہ جنگ کا انعام تھا۔

گولکنڈہ فتح ہوا تو جعفر نے سلطان پر بڑا بھرپور طنز کیا۔

نخستیں کلاں ترکہ بر کھنڈ کر — ہمہ کار و بارِ پدر ابنڈ کر

باپ کے کاروبار کو بیٹوں نے جب اس طرح چلایا تو ہر طرف لوٹ مار نوچ کھسوٹ اور بھاگ دوڑ شروع ہو گئی ایک بستی لٹی تو آخر میر جعفر بھی چپ نہ رہ سکے ؎

چناں لوٹ شد بستی ملک نگر　　نہ خذ نا صفا ماند نہ ما کدر
جہاں ہوئے ایسے کلچھن کپوت　　لگے خلق کے منہ کو کالک بھبھوت

دوسرے بھائی اعظم پر بھی طنز کیا ہے ؎

دگر شاہ اعظم ہمہ کند رو　　برسوائی انداخت کارِ پدر
بخوش دامن خو سپر ساختہ　　بہ للو پتو کار در باختہ

اعظم معظم کی خانہ جنگی پر اس طرح ماتم کرتے ہیں ؎

کہاں اب پائیے ایسا شہنشاہ　　مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
رگڑ کے الجھ واں دل روتا ہے　　نہ بیٹھی نیند کوئی سوتا ہے
دوا دو ہر طرف بھاگڑ مچی ہے　　بچہ در گود سر کھٹیا دھری ہے
ازاں سو اعظم و زیں سو معظم　　زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم
ما جعفر زباں کو مختصر کر　　ز دورِ مختلف دل میں حذر کر

آخر ان چٹکیوں سے ان کی طبیعت کا غبار اور دل کا بخار کم نہیں ہوا تو پھر ایک لمبا چوڑا شہر آشوب تحریر کیا۔ جس میں سامنے کی سی باتیں سیدھے سادے انداز میں کہہ دیں اور چپ ہو رہے۔

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے　　ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری　　محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹ میں کھوئی　　اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے

خوشامد سب کریں زر کی چہ بیگانہ چہ ان گھر کی　　بھلا دی بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے

یہ انداز ایسا سیدھا سادہ غمگین اور سنجیدہ تھا کہ ان کی بات بقول نواب نصیر حسین خاں خیال ہونٹوں نکلی اور کوٹھوں چڑھی۔

جب میر صاحب اعظم و معظم سے ناخوش تھے تو بھلا فرخ سیر سے کیسے خوش رہ سکتے۔ فرخ سیر نے اپنے سکے پر یہ شعر کندہ کرایا ؎

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر　　بادشاہ بحر و بر فرخ سیر

میر جعفر چوٹ کئے بغیر نہ رہ سکے۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر　　بادشاہ پشنہ کش فرخ سیر

میوہ ذناسی کا خیال ہے کہ میر جعفر نے ۱۱۲۵ھ (۱۳-۱۷۱۲ء) کے بعد وفات پائی۔ جعفر نے خود جو ماحول دیکھا تھا اب اس کا ٹھاٹھ باٹھ خواب و خیال ہو رہا تھا اسے یاد کرتے ہیں تو کس دردمندی سے کہتے ہیں۔

اب ہا ہا کروں پیا پڑوں بہوں بلبیاں　　غنڈوں میں نہ مل بیٹھ پکھ بھایا ہے سو
وہ ذوق ہر دم کا کہاں وہ عطر بیگم کا کہاں　　در خاک شد آں کر و فر نہ جعفرا کیسے بنے

حکومت کا خزانہ فوجی مہمات پر ختم ہو چکا ہے۔ فوج کی تنخواہیں ادا کرنے کے لئے سلطنت کو امرا سے روپیہ قرض بھی نہیں مل سکتا، امرا اپنی جگہ خوف زدہ اور غم دیدہ ہیں عوام سخت پریشان اور فوجی بغاوت پر آمادہ ہیں دربار کے لئے یہ عقدہ اب لاینحل ہو چلا ہے۔ میر جعفر اس بے کاری کا حال بیان کرتے ہیں تو زمانے کی سماجی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

بشنو بیان نوکری جب گانٹھ ہوتی کھوکری　　تب بھول جاوے چوکڑی یہ نوکری کا خبط ہے
مردم پشیمان یک دگر کشتہ سپاہی در بدر　　خوردہ بسے خون و جگر یہ نوکری کا خبط ہے
دھنیا جولا یا طاق ہے کنجڑا اٹھائی چاک ہے　　دیوس فرم ساق ہے یہ نوکری کا خبط ہے
ہر صبح ڈھونڈیں چاکری کوئی نہ پوچھے بات تک　　سب قوم ڈھوویں لاکڑی یہ نوکری کا خبط ہے
ندی ہیں مجرے بیس کئے دن بیس غشی نے لئے　　دن بیس جھگڑے میں کٹے یہ نوکری کا خبط ہے
چہ کی لکھیں اور حاضری کھانے نہ پاویں باجری　　تس پر جلد دیں تاج ری یہ نوکری کا خبط ہے
کیسے رہیں ایماں سے عاجز ہمیشہ ناں سے　　بیزار ہیں مہماں سے یہ نوکری کا خبط ہے
جعفر خدا کو یاد کر غمگین دل کو شاد کر　　یہ گفتگو برباد کر یہ نوکری کا خبط ہے

فوج کی حالت کا ہو بہو نقشہ ذیل کے بندوں میں بیان کر دیا ہے جو حقیقت حال پر مشتمل ہے۔

جب جو دو کو سب اٹھ چلے اسوار بیٹھے یوں کہے　　ٹٹو بچارا نہ ہلے یہ نوکری کا خبط ہے

اُمراء ہیں سب بے خبر اخادی بے چارے بے وقر   اسوار باجی سے بتر یہ نوکری کا خبط ہے
صاحب عجب بے داد ہے محنت ہمہ برباد ہے   اے دوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا خبط ہے
ہم نام کو اسوار ہیں روزگار سے بیکار ہیں   یارو ہمیشہ خوار ہیں یہ نوکری کا خبط ہے
نوکر خدائی خان کے محتاج آدمی نان کے   تعین ہے ایمان کی یہ نوکری کا خبط ہے
دم خیر ہو گھوڑا رہا یہ دکھ بے چارا سہہ گیا   پیشاب کر کے سو رہا یہ نوکری کا خبط ہے
دیکھ مہاجن کا جیا جن سود کا لالچ کیا   بے قرض پوتا ہے دیا یہ نوکری کا خبط ہے
دربار دیکھا خان کا بیڑا نہ پایا پان کا   توکا نہ پایا نان کا یہ نوکری کا خبط ہے
رات دن بھوکے مریں اس حال سے کیسے تریں   تم ہی کہو ہم کیا کریں سکر کس (کش) کا ذوق ہے

اپنی نئی تصنیف پر خود تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

مسلمان ہندو سہاگن چہ رانڈ   عزیزش بدارند چوں کھیر و کھانڈ
اگر چہ ہمہ کوڑا و کرکٹ است   بہندی رزندی زبان لت پت است
ولیکن کسی نے بھلی یہ کہی جیسے پیو چاہے سہاگن وہی   بتاریخ اثنا عشری سنہ لطف مد دہر شد این ٹلی نامہ قطہ

زندگی کی یہ زندہ بدبختیاں تھیں جن پر جعفر زٹلی نے دھول ڈالنے کی جگہ اُن کو ذرا پاس سے جا کر دیکھا۔ اس عہد کا بہروپیا پن ظاہری دینداری اور نہایت پست دنیاداری جب جعفر کے سامنے عریاں ہوئی تو اس نے اس سے آنکھیں چرانے کی جگہ اس پر خوب قہقہے لگائے اور اس کے قہقہے مغلوں کے در و دیوار سے ٹکرا کر اور بھی پر شور اور پُر رعب ہو گئے ۔

میر جعفر کی یہ شاعری اور سماجی حالات کا یہ عکس اس لئے اور بھی اہم ہے کہ یہ اپنی تردید آپ کرتا ہے۔ یعنی میر جعفر درباری نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ عوام کے بارے میں ان کا رویہ مضحکہ خیز بلکہ ایک حد تک رسوا کن ہے۔ مگر اس زوال آمادہ نظام کی ابتری کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ خود اس کے ہاتھ پیر اس کے خلاف گواہی دینے لگیں۔ میر جعفر کو اورنگ زیب سے جو اسی عہد کو جوں کا توں باقی رکھنے میں اپنی جان کھپا رہا تھا بے حد عقیدت تھی چنانچہ اورنگ زیب کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا اس میں اپنی دلی عقیدت کا نہایت سنجیدگی اور افسوس کے ساتھ اعتراف اور اظہار کیا ہے۔ چند اشعار جن سے یہ عقیدت ٹپکی پڑتی ہے درج ذیل ہیں ۔

دریغا عدل و دین بے رونیم است   عروس سلطنت بے رو سقیم است
مکمل، اکمل و کامل دل آگاہ   کہاں اب پائیے ایسا شہنشاہ

صدائے توپ و بندوق است ہر سو   بسر اسباب و صندوق است ہر سو

کہیں کہیں اپنے انداز سے کچھ اس طرح کے شعر بھی کہہ دیتے ہیں ۔

بہر سو مار مار و دھاڑ دھاڑ است   ادچل چال و تبر خنجر کٹار است
ازاں سو اعظم و زیں سو معظم   جھڑا جھڑ و دھڑا دھڑ ہر دو باہم

بہادر شاہ غازی کے "طنز نامے" میں فرماتے ہیں ؎

بھلائی بھیک کی لوٹی ملک مارے شہر لوٹے   جپی تس دن بہت مالا کبھی بوڑھا کبھی بالا
بھلائے بھیک کے ٹکڑے سپاہی ہو بہت اکڑے   جلیں جنگل میں جوں لکڑی اگن دوزخ جلایا ہے
مچا دند دتی میں دیکھو اس زر دبلی میں   دغل دیو میں داغول عجیب یہ نام پایا ہے

ایک قطعہ میں اعلیٰ خاندانیت نے ان سے کیا کہلوایا ہے ۔

کس بہ مفلس نمی دہد دختر   پسر خاندانِ عالی را
بجعفرا دیدۂ کہ سگ ہرگز   نہ کشد استخوانِ خالی را

اپنے عہد کی یہ تاویل انھوں نے کس طرح پیش کی ہے ؎

اینٹیں پرانی ہو گئیں ساٹی تماتی گھس چلی   کیا دوش ہے معمار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے
آئی اُمنڈ دھول گھٹائیں میں رہا کپڑا بچھا   چلنا بڑے بازار کا کہ جعفر اب کیا کیجئے

دارد خبر از لذت چپ چاپ عبادت   آنکس کہ شکم سیر بہت کوہ نباشد
زرداری ایک پیسہ دمی دار مولا   درحضرت حق اجر یہ پہلو نباشد

اورنگ زیب کی یہ شان جعفر ہی بیان کر سکتا ہے ؎

زہے دھاک اورنگ زیب شاہ شاہ دلی   کہ در ملک دکھن پڑی کھلبلی
دریں پیر سالی و ضعف بدن   نچائی دھما چوکڑی در دکن

یہ تھا مغل شہنشاہ کا وہ مالی اور ہوا خواہ جس نے تعریف میں تضحیک اور تضحیک میں حقیقت بیان کرنے کی کوشش کی اور جیسے تیسے آخر تک اپنی تصورات سے چمٹا رہا مگر ان کی گراوٹ کو بھی دیکھا اور آپ ہی آپ ہنسا کیا۔ اس کی ہنسی صرف ایک بھرپور طنز ہے اور بس۔ اس نے ہمدردی کی ہمت نہیں کی۔ حقیقت کو مکمل طور پر نہیں لیا۔ اور اس کے متعلقات کو صحیح طور سے نہیں سمجھا لیکن اس کی یہ خصوصیت نہایت اہم ہے کہ اس نے اپنی تردید آپ کی ہے۔ اور اپنے عہد کے تضاد کو شدت تاثر سے بیان کر دیا ہے ۔

غزل

(نواب محمد اسمٰعیل علی خاں تاجؔ آف ٹونک)

ہیں پھر تصوّرِ رُخِ جاناں کئے ہوئے
ہر داغِ دل کو مہرِ درخشاں کئے ہوئے

پھر دل ہے عزمِ دشت و بیاباں کئے ہوئے
اقلیمِ ننگ و نام کو ویراں کئے ہوئے

پھر کھینچتا ہے دامنِ دل دستِ آرزو
خود کو نگاہِ عقل سے پنہاں کئے ہوئے

پھر شامِ غم میں صبحِ تمنّا ہے جلوہ گر
ہر نقشِ زندگی کو نمایاں کئے ہوئے

پھر آ رہا ہے اک بُتِ سفّاک کا خیال
تاراجِ کشورِ دل و ایماں کئے ہوئے

در پردۂ نیاز ہے پھر اک نگاہِ ناز
شمشیرِ التفات کو عریاں کئے ہوئے

عرصہ گزر گیا ہے نگاہِ جنوں نواز
دل کو خرد سے دست و گریباں کئے ہوئے

پھر اک خیالِ عارض و گیسو ہے رات دن
مجموعۂ حواس پریشاں کئے ہوئے

پھر بڑھ رہے ہیں عشق و محبّت کے حوصلے
سعیٔ خرد کو سر بہ گریباں کئے ہوئے

پھر وحشتِ شوق و دامنِ جاناں کی شوخیاں
ہیں شرطِ ضبطِ عشق کو ویراں کئے ہوئے

پھر ہے شبِ فراق بلاؤں کا اک ہجوم
جیسے ہو کوئی بال پریشاں کئے ہوئے

ہے بزمِ دل میں حُسنِ گراں مایہ آج کل
نظّارۂ جمال کو ارزاں کئے ہوئے

ہیں آبروئے صبر کی آنکھیں جھکی ہوئی
ہے وضعِ احتیاط پشیماں کئے ہوئے

پھر کوچۂ حبیب میں جاتے ہیں بار بار
برپا اک اضطراب کا طوفاں کئے ہوئے

اے شورشِ جنوں تری غیرت کو کیا ہُوا
ہر گُل ہے چاک چاک گریباں کئے ہوئے

پھر دل پہ یاس و غم کی گھٹاؤں کا زور ہے
آنکھیں ہیں پھر تہیّۂ طوفاں کئے ہوئے

ہیں تاجؔ پھر کسی کے تصوّر میں ان دنوں
ہر لمحہ وقفِ شوقِ فراواں کئے ہوئے

پرکاش پنڈت

تکلّف میں ہے تکلیف تو پھر.....!

کردار

۱۔ میاں
۲۔ بیوی
۳۔ تلسی — ملازم
۴۔ پران ناتھ — میاں کا دوست
۵۔ کرشن آنند — ״
۶۔ جگل کشور — ״
۷۔ دیا نرائن — ״

پردہ اُٹھنے پر میاں بیوی صوفے میں دھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ارد گرد خالی کُرسیاں پڑی ہیں اور درمیان میں چھوٹی میز۔

میاں۔ ہاں تو سنیما کے بعد کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا۔ کھانے میں چکن کری۔ قورمہ۔ بریانی۔ مچھلی کے کباب اور .... اور .....

بیوی۔ اور نان اور سلاد اور میٹھے میں پڈنگ — لیکن دیکھئے جناب! اگر آج آپ نے کچھ گڑبڑ کی تو ہمارا آپ کا کنٹریکٹ کینسل۔ چاہے آپ کا کوئی کیسا ہی دوست کیوں نہ مل جائے ..... جی، میں نے کہا یہ کیسے کیسے دوست ہیں آپ کے؟ نہ عقل نہ تمیز۔ ابھی کل مسٹر شرمانے ....

میاں۔ چھوڑو ڈارلنگ! کل کی بات چھوڑو۔ آج بس آج کی بات کرو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کھانے کے بعد آج ہم لمبی سیر کو نکل چلیں۔ انڈیا گیٹ بلکہ اس سے بھی پرے۔ پُرانے قلعے تک۔ آج کتنے دن ہو گئے ہیں ہم اکٹھے گھومنے نہیں گئے۔

بیوی۔ آپ کو اپنے دوستوں سے فرصت ملے جب نا۔

میاں۔ دوست! تو ڈارلنگ! تم سمجھتی ہو یہ جو ایرے غیرے نتھو خیرے آئے دن ہمارے یہاں ٹپکتے رہتے ہیں، یہ سب میرے دوست ہیں؟

بیوی۔ میں تو یہی سمجھتی ہوں۔

میاں۔ تم غلط سمجھتی ہو ڈارلنگ! یہ تو بس ظاہرداری سمجھو جو میں اُنھیں دھتکار نہیں دیتا، ورنہ میری طبیعت تم جانتی ہو، کسی کی اُلٹی سیدھی بات مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ کوئی کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو، ڈانٹ کے رکھ دیتا ہوں۔

بیوی۔ جی، میں نے کہا، گھومنے کا پروگرام آج رہنے دیجئے۔ سنیما اور کھانے کے بعد خاصی دیر ہو جائے گی۔ تلسی خواہ مخواہ کُڑھے گا اور بے بی کی عادت تو آپ جانتے ہیں۔ جونہی دس بجے اور اُس کی نیند ٹوٹی۔ مجھے نہ دیکھا تو سارا گھر سر پر اُٹھا لے گا۔

میاں۔ میں سمجھتا ہوں آج بے بی کو بھی ساتھ لے چلیں۔ رنگین فلم ہے۔ خوش ہو گا۔

بیوی۔ اور جو اندھیرے میں چیخا تو .....

میاں۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ کہو گی تو اُٹھ کر باہر لے جاؤں گا۔ لیکن میں چاہتا ہوں، آج لمبی سیر کو چلیں۔ رات بھی چاندنی ہے اور ادھر کئی روز سے ..... لو اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ ......

(اسٹیج کے دائیں طرف کا دروازہ باہر سے کھٹکتا ہے۔)

میاں۔ (اونچی آواز سے) تلسی — ہے تلسی — دیکھو، باہر کون ہے۔

(اسٹیج کے بائیں طرف کے دروازے سے ملازم داخل ہوتا ہے)

تلسی۔ جی۔

میاں۔ (آہستہ سے) جو بھی ہو، کہہ دینا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں، سمجھے!

تلسی - جی

(تلسی دروازہ تھوڑا سا کھولتا ہے)

تلسی - فرمائیے۔

نووارد - (نیچی تلی آواز میں) آپ فرمائیے؟

تلسی - جی صاحب تو۔۔۔۔۔۔

نووارد - صاحب کی ایسی تیسی - تم راستے سے ہٹ جاؤ ——— آدمی ہو یا چین کی دیوار۔

(اندر داخل ہوتا ہے)

کیوں جناب یہ کیا بدتمیزی ہے کہ کوئی دس میل پیدل چل کر حضور کے درشن کرنے آئے اور آگے سے جواب ملے (منھ بنا کر) فرمائیے۔

میاں - او، ہیلو پران - آؤ، آؤ، کہاں سے آرہے ہو؟

نووارد یعنی پران - جہنم سے ——— نمستے بھابی۔

(ہاتھ جوڑتا ہے اور کرسی سرکا کر قریب ہو بیٹھتا ہے)

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ حضور کل پک نک میں کیوں تشریف نہیں لائے؟

میاں - ارے کیا بتاؤں بھائی - بس یونہی ——— کچھ دیر ہوگئی، اور میں نے سوچا۔۔۔۔۔۔

پران - حضور نے سوچا کہ مس روز تو جا نہیں رہیں، آپ کیا وہاں جھک مارنے جائیں گے ——— بھابی! میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ ان بزرگ کو کہ جنھیں تمہارے خاوند ہونے کا شرف حاصل ہے بڑی مضبوط نکیل کی ضرورت ہے۔

میاں - ارے یار مذاق چھوڑو - یہ بتاؤ کہ اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟

پران - کہاں سے آرہا ہوں؟ کمال ہے! تو کیا جناب سمجھتے ہیں، کہ میں آپ کی طرح کسی کلب، کسی بار، کسی بال روم یا ریس کورس سے آرہا ہوں - یہ سب کھیل تماشے آپ ہی کو مبارک ہوں - شریف آدمی ہوں، شریفوں کی طرح سیدھا دفتر سے آرہا ہوں۔

میاں - ارے میں تو اس لئے پوچھ رہا تھا کہ۔۔۔۔۔ خیر، کچھ چائے وائے پیوگے؟

بیوی - جی ہاں، چائے پیجئے گا؟

پران - بھابی! چائے میں بعد میں پیوں گا۔ پہلے آنحضرت کی خبر لے لوں - تم نہیں جانتیں بھابی کہ اوپر سے یہ جتنا بھولا نظر آتا ہے اندر سے اتنا ہی گولا ہے۔۔۔۔۔۔۔

بیوی - (اونچی آواز میں) تلسی!

تلسی - (دور سے) جی بی بی جی۔

بیوی - سنو، ذرا چائے کے لئے پانی رکھ دو۔

تلسی - جی بی بی جی۔

پران - اور بھابی چائے کے ساتھ کیا کھلائیے گا؟

بیوی - جو آپ کہیں۔

پران - یوں تو کوئی خاص ضرورت نہیں - میرا مطلب ہے، بازار سے کچھ منگوانے کی خاص ضرورت نہیں۔ گھر میں جو کچھ بھی ہو۔۔۔۔۔۔

بیوی - جی گھر میں تو۔۔۔۔۔۔

پران - نہ ہو تو کچھ پکوڑے ہی تل دیجئے۔ بہت عمدہ تلتی ہیں آپ پالک کے پکوڑے۔

بیوی - جی۔

میاں - ارے پران - بات دراصل یہ ہے کہ آج ہم لوگ ذرا۔۔

پران - میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا جی - آخر تم نے ہماری بھابی کو سمجھ کیا رکھا ہے - یہ کہاں کا انصاف ہے کہ وہ بے چاری تو دن بھر گھر میں پڑی تمہیں بھگوان کی طرح پوجتی رہے، اور تم ——— تم بھابی! جاؤ بناؤ پکوڑے۔ میں ذرا اس سے دو ہاتھ کر لوں۔

(بیوی اٹھ کر بائیں دروازے سے باہر چلی جاتی ہے)

میاں - ارے بھیا! میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج ہم لوگ ذرا۔۔۔

پران - ہم لوگ سے تمہارا مطلب ہے تم اور میں؟ نہیں جناب یہ خاکسار تو بھر پایا، میری تمہاری دوستی ہو چکی - آخر یہ کہاں کی تک ہے کہ ہم تو تمہاری خاطر پکنکوں کا انتظام کرتے پھریں، اور تم۔۔۔۔۔۔

میاں - بھئی کام ہی سے فرصت نہیں ملی - کیا کہوں - میں تو خود چاہتا تھا کہ۔۔۔۔۔۔ لیکن سنو آج ہم لوگ ذرا۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے میں اور تمہاری بھابی۔۔۔۔۔۔

(دایاں دروازہ باہر سے کھٹکھٹایا جاتا ہے)

میاں - (اُونچی آواز سے) تلسی ـــــ ارے او تلسی ـــــ ذرا دیکھنا باہر کون صاحب آئے ہیں۔

تلسی - (دُور سے) جی صاحب!

پران - سنو، اس سے کہہ دو کہ اب اُن سے نہ کہہ دے کہ (منہ بگاڑ کر) فرمائیے!

(اس سے پہلے کہ تلسی بڑھ کر دروازہ کھولے تو وا، وخود ہی دروازہ کھول کر اندر آ جاتا ہے)

کرشن آنند - تلسی کو آواز دینے کی ضرورت نہیں، دروازہ کھلا ہے۔ میں نے تو صرف اس لئے نہیں کھولا کہ کہیں تم ہماری بھابی سے ۔ ۔ ۔ ۔

میاں - او ہیلو، کرشن آنند۔ آؤ، بیٹھو۔

کرشن آنند - گھر والے نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔ میں نے سوچا جب تک نہیں آتے ذرا تمھارے ہاں ہی وقت کٹی کر لوں ـــــ (پران کی طرف دیکھ کر) آپ کی تعریف! (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

میاں - اوہ! آپ ہیں میرے عزیز دوست مسٹر پران ناتھ۔ آج کل فنانس منسٹری میں ہیں۔ پہلے ٹاٹا نگر میں تھے، اور آپ ہیں کرشن آنند میرے عزیز دوست۔ حال ہی میں ہمارے پڑوس میں آئے ہیں۔

پران اور کرشن آنند - (ایک ساتھ) ویری گلیڈ ٹو میٹ یو ۔ ۔ ۔

میاں - سُنا تھا تم بمبئی جانے والے ہو۔

کرشن - ہاں ارادہ تو ہے لیکن اس وقت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معاف کیجیے گا پران صاحب ان سے ذرا ہماری بے تکلفی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ چائے وائے ملے گی یا نہیں؟

میاں - ضرور، ضرور چائے بن رہی ہے۔ کچھ ساتھ لوگے؟

کرشن - کوئی ایسی چیز کھلاؤ کہ پیٹ میں پہنچ کر معلوم بھی ہو کہ کچھ پہنچا ہے۔ گھر والے نہ جانے کب آتے ہیں۔

میاں - پالک کے پکوڑے؟

کرشن - ارے نہیں، پالک کے پکوڑوں سے کیا ہوگا۔ اس وقت مجھے کچھ ٹھوس قسم کی غذا کی ضرورت ہے۔ بھابی کہاں ہے؟ ذرا بھابی کو بلاؤ۔ (اونچی آواز میں) بھابی!

بیوی - (دُور سے) جی، جی ابھی آئی۔

(بائیں دروازے سے اندر داخل ہوتی ہے)

کرشن آنند - نمستے بھابی ـــــ کیا حال چال ہیں؟

بیوی - جی اچھی ہوں - آپ سنائیے۔

کرشن - بس مزے ہیں۔ آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ ـــــ چائے کے ساتھ کیا کھلائیں گی؟

بیوی - جو آپ کہیں!

کرشن - ارے بھابی کہنا کیا ہے۔ بس دو چار انڈوں کا آملیٹ، کچھ ٹوسٹ۔ ہو سکے تو سینڈ وچز۔ پالک کے پکوڑے تو پران ناتھ جی کے لئے بن رہے ہوں گے۔

میاں - ارے نہیں ہم سب کھائیں گے۔

کرشن - تو بھابی پالک کے ساتھ ساتھ ذرا بینگن اور گوبھی بھی تل لینا۔

بیوی - جی بینگن اور گوبھی تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میاں - بات یہ ہے بھائی کرشن کہ آج ہم لوگ ذرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کرشن - نہ ہو تو دو پراٹھے ہی بنا دو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھر میں آلو تو ضرور ہوں گے۔ آلو کے پراٹھے کھائے مدت ہو چکی ہے۔ لیکن ان میں پیاز مت ڈالنا ـــــ پیاز سے میرا جی بہت جلتا ہے بھابی۔

بیوی - جی

میاں - بات یہ ہے کرشن کہ آج ہم لوگ ذرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بیوی - (طنز سے) جی اب رہنے دیجیے اپنی صفائی۔ میں سب جانتی ہوں۔

کرشن - اوہو ـــــ تو آج پھر آپ لوگوں میں کھٹ پٹ ہو گئی ہے۔ معاف کیجیے پران ناتھ صاحب، میری ذرا اس گھر میں بے تکلفی ہے۔ میں تم سے دس بار کہہ چکا ہوں، کمبخت کہ ہماری بھابی کو تنگ نہ کیا کرو۔ لاکھوں میں ایک ہے ہماری بھابی۔ وقت بے وقت جو بھی آ جائے گھر کے آدمیوں کا سا سلوک کرتی ہے۔ ذرا ہمارے گھر کی طرف دیکھو، کوئی دوست پانی مانگ لے تو مجال ہے کہ ایک ہفتے سے پہلے نصیب ہو جائے ـــــ بھگوان ہر کسی کو ایسی بیوی دے۔ لیکن یہ تو ناشکرا ہے ناشکرا ـــــ تم جاؤ بھابی میں کرتا ہوں اس کی حجامت۔ آخر اس نے

سمجھ کیا رکھا ہے ۔

بیوی ۔ جی ۔

(دائیں دروازے سے باہر چلی جاتی ہے)

میاں ۔ کچھ مجھے بھی کہنے دوگے یا اپنی ہی ہانکے چلے جاؤ گے ۔ بات اصل میں یہ ہے کہ آج ہم لوگ ذرا ۔۔۔۔۔۔

کرشن ۔ آج ہی نہیں ۔ یہ تمھارا ہر روز کا دستور ہے ۔ جب بھی آؤ بھابی بے چاری ۔۔۔۔۔

میاں ۔ ارے نہیں جھگڑا وگڑا کچھ نہیں ہوا ۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگ ذرا ۔۔۔۔۔۔

(بائیں ہاتھ کا دروازہ کھٹکتا ہے)

میاں ۔ (اونچی آواز میں) تلسی ۔ ارے او تلسی ۔۔۔۔

(کوئی جواب نہیں دیتا)

کہاں جاکر مرگیا ہے ۔ معاف کیجئے میں ذرا ۔۔۔۔۔۔

(اٹھ کر دروازہ کھولتا ہے)

گلزاری لال ۔ کیا دیا ترائن آچکا ہے ؟

میاں ۔ نہیں تو ۔

گلزاری ۔ بڑا الّو کا پٹھا ہے ـــــ مجھے خواہ مخواہ پریشان کیا ۔ خیر ، ذرا مجھے سات روپے دینا ٹیکسی والے کو دفع کردوں ۔ پھر باتیں ہوں گی ۔

میاں ۔ (پریشان ہوکر) سات روپے ۔۔۔۔ تلسی ۔۔۔۔ ابے او تلسی ۔۔۔۔۔

گلزاری ۔ بڑا الّو کا چرخہ نکلا ہے ۔ کہہ رہا ٹھیک چھ بجے یہاں پہنچ جاؤں گا ۔

میاں ۔ (پھر زور سے) ارے او تلسی ۔۔۔۔۔ کہاں جاکر مرگئے ہو ؟

بیوی ۔ (دور سے) تلسی ذرا بازار تک گیا ہے ۔

میاں ۔ اوہ ! اچھا ! رُکو میں ابھی لاتا ہوں ۔

(نو وارد دروازے پر کھڑا رہتا ہے اور میاں دائیں دروازے میں سے گزر کر اسٹیج کے اس حصے میں جاتا ہے جہاں اب تک اندھیرا تھا ۔ اس کے جاتے ہی ادھر روشنی ہو جاتی ہے اور بیوی کڑاہی میں پکوڑے تلتی نظر آتی ہے ۔)

میاں ۔ (سرگوشیانہ انداز میں) ڈارلنگ ! مجھے ذرا سات روپے تو دینا !

بیوی ۔ (خاموش ہے)

میاں ۔ (سرگوشی میں) میں نے کہا ڈارلنگ ! مجھے ذرا سات روپے ۔۔۔۔۔۔

بیوی ۔ (کھیج کر) میرے پاس جو خزانے دبے پڑے ہیں لے لیجیے ۔

میاں ۔ اوہو ۔ ذرا آہستہ بولو ڈارلنگ ۔ وہ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے ۔

بیوی ۔ کیوں آہستہ بولوں ۔ مجھے کسی موئے کا ڈر نہیں ۔ کسی کی دبیل نہیں ہوں میں ۔

میاں ۔ پھر وہی ۔ میں کہتا ہوں ڈارلنگ ! تم سمجھتی کیوں نہیں ۔

بیوی ۔ جی بہت سمجھ چکی ہیں ۔ میں بھی کہوں آج سینما اور کھانے کے چونچلے کیوں ہو رہے ہیں ۔ یہ معلوم نہ تھا کہ گدھے کی طرح کام لینا ہے ۔ پوری رات باورچی خانے میں سر مارنا ہے ۔

میاں ۔ ارے بھئی تم بالکل نہیں سمجھتیں ۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ ۔۔۔۔ خیر لاؤ ، ابھی مجھے سات روپے تو دو ۔ گلزاری لال باہر کھڑا ہے ۔ اس مصیبت کو تو ٹالوں ۔

بیوی ۔ کیوں اسے کیوں ٹالئے گا ۔ بلا کر گود میں بٹھایئے ۔ پکوڑے اور پراٹھے ٹھنسوایئے ۔۔۔۔۔

میاں ۔ نہیں ڈارلنگ نہیں ۔ لاؤ مجھے جلدی سے سات روپے دے دو ، ورنہ ۔۔۔۔۔۔

بیوی ۔ ورنہ کیا ؟ پرس میں جو کچھ رکھا ہے اٹھا کے بانٹ دیجیے بھک مروں میں ۔ ہم پر ایک آنہ خرچ کرنا ہو تو جان نکل جاتی ہے ! اسے تو وہاں مارو جہاں پانی نہ ملے ، اور یار دوست چاہے پورا گھر لوٹ لے جائیں ۔۔۔۔۔۔

(دیوار گیر پر پڑے ہوئے پرس میں سے دس کا نوٹ نکال کر اور دروازے میں سے گزر کر اسٹیج کے مین حصے

میں آتا ہے - اس کے آتے ہی پرلے حصے کی روشنی آہستہ آہستہ
گُل ہو جاتی ہے - پھر بائیں دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔)

میاں - (دس کا نوٹ دیتے ہوئے) لو بھئی گلزاری لال یہ دس کا نوٹ ہے ٹیکسی والے سے باقی ------

گلزاری لال - یہ اور بھی اچھا کیا تم نے کہ دس کا نوٹ لے آئے۔ میری جیب میں اس وقت صرف ایک اکنی تھی، اور مجھے ابھی ------- اچھا پیارے میں چلا ------

میاں - د. نرائن آئے تو اسے کیا کہوں؟

گلزاری - اس سے کہنا تم بڑے جھوٹے، دغا باز، بدمعاش ہو۔ وقت دیتے ہو اور وقت پر پہنچتے نہیں - ملوگے تو طبیعت صاف کر دوں گا۔ اچھا بائی بائی -------

(میاں لوٹ کر صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)

پران - کیوں بھئی کتنی دیر ہے ابھی؟

کرشن - میرے پیٹ میں تو چوہے ناچ رہے ہیں۔

پران - ذرا جلدی کرو بھائی - مجھے گھر پہنچنا ہے - کافی دیر ہو چکی ہے۔

کرشن - اور میرے گھر والے بھی شاید آ چکے ہوں -

میاں - بس ہو رہا ہے - ابھی دو منٹ میں ------ میں جا کر دیکھتا ہوں ---

(اٹھ کر پھر اسی کمرے میں جاتا ہے اور اس طرح اس کے پہنچنے پر ادھر کی بتی روشن ہو جاتی ہے)

میاں - ڈارلنگ، کتنی دیر ہے؟

بیوی - (خاموش ہے)

میاں - میں پوچھتا ہوں ڈارلنگ چائے میں کتنی دیر ہے، وہ لوگ -----

بیوی - جہنم میں جائیں وہ لوگ اور میں آپ کو کیا کہوں۔

(تلسی داخل ہوتا ہے)

میاں - دیکھو تلسی - بی بی جی کا پارہ بہت گرم ہو رہا ہے - تم جلدی سے چائے لاؤ -

تلسی - جی -

(واپس میں اسٹیج پر آ جاتا ہے اور اُدھر کی روشنی آہستہ گُل ہو جاتی ہے)

میاں - بس ابھی دو منٹ میں آتی ہے۔

کرشن - بھئی جو بن گیا تھا وہی لے آتے۔

پران - پالک کے پکوڑے تو بن ہی چکے ہوں گے۔

میاں - اے، ہاں، نہیں - وہ تلسی ابھی ------

پران - کیسے نمک حرام نوکر رکھتے ہو جی - میرا نوکر ہوتا تو کھڑے کھڑے کان سے پکڑ کر نکال دیتا - کرشن آنند صاحب! آپ ہی بتائیے ایسے بدتمیز نوکروں سے لنگور پالنا زیادہ اچھا نہیں، جو مالک کے گھر پر موجود ہونے پر بھی اس کے دوستوں سے دروازے پر ہی پوچھنا شروع کر دیں کہ "منہ لگاڑکس" فرمائیے!

میاں - نہیں، پران یہ بات نہیں، بات اصل میں یہ تھی کہ -----

(تلسی چائے لے کر داخل ہوتا ہے)

لو وہ آگئی چائے (زور سے) ڈارلنگ! تم بھی آؤ نا۔

پران - ہاں بھابی آؤ نا تم بھی ------

کرشن - بھابی بھابی -

(تلسی میز پر سامان رکھ کر چلا جاتا ہے - بیوی آ کر صوفے پر بیٹھ جاتی ہے - سب لوگ کھانا شروع کرتے ہیں اور بیوی چائے بنانے لگتی ہے - اسٹیج کی روشنیاں آہستہ آہستہ مدھم ہو کر بُجھ جاتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ روشن ہو جاتی ہیں - اب سب پلیٹیں صاف ہیں اور پران اور کرشن آنند کھڑے ہیں -)

کرشن - بھئی واہ مزا آگیا - پراٹھوں کا جواب نہیں۔

پران - اور پکوڑے؟

کرشن - پکوڑے تو بہت ہی لاجواب تھے - مجھے تو معلوم ہی نہ تھا کہ بھابی اتنے لذیذ پکوڑے بناتی ہیں - آج معلوم ہوا - بھابی کل پھر کھلائیے گا؟

بیوی - ضرور۔

پران - اچھا بھابی چائے کا بہت بہت شکریہ۔

بیوی۔ اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔

نرشن۔ میں تمھیں بتاؤں بھابی۔ ہم لوگوں کی تو خیر دوسری بات ہے، تم ذرا اس کے دوستوں سے تنگ کر بات کیا کرو۔ کوئی آئے، کوئی جائے، مرے یا جیے، تم مزے سے بیٹھی رہا کرو۔ پھر دیکھنا کہ بچّہ جی کے ہوش ٹھکانے آتے ہیں یا نہیں۔ جب باہر بے عزّتی ہوگی تو گھر پر عزّت کریں گے۔

پران۔ اچھا بھئی دینا ناتھ، اچھا بھابی بائی بائی۔

نرشن۔ ٹاٹا۔

(دونوں بائیں دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں تلسی آکر برتن اُٹھا لے جاتا ہے۔)

میاں۔ (گہرا سانس لے کر اور صوفے میں دھنستے ہوئے) تم ہی بتاؤ ڈارلنگ اس میں میرا کیا قصور ہے؟

بیوی۔ (غصّے سے) میں کسی کی ڈارلنگ وارلنگ نہیں۔ مجھے کوئی ڈارلنگ نہ کہے۔

میاں۔ نہ تم ہی بتاؤ ڈارلنگ، میرا اس میں کیا قصور ہے، اگر لوگ اونٹوں کی طرح منھ اُٹھائے گھر میں گھس آئیں۔

بیوی۔ (خاموش ہے)

میاں۔ ہم تو اس طرح کسی کے یہاں نہیں جاتے۔ آدمی کو وقت بے وقت دیکھنا چاہیئے۔ نہ جانے اگلا کس حال میں ہو۔ کہیں آنے جانے کا پروگرام۔۔۔۔۔۔

بیوی۔ جی بس ہو چکا آنا جانا۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ اگر کوئی گھر کو گھر سمجھے تو کس کی مجال ہے کہ۔۔۔۔۔۔

میاں۔ تو کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ہی انھیں تار دے دے کر بلاتا ہوں کہ آؤ اور کودو میری چھاتی پر؟

بیوی۔ اور نہیں تو کیا میں بلاتی ہوں کہ آؤ نہلا دوں تمھیں گھی میں۔ ہم پر ایک دھیلا خرچ کرنا پڑ جائے تو دیکھیئے کیا آفت آتی ہے۔۔۔ اور ٹھیک ہی تو ہے۔ آپ کو مجھ سے کوئی واسطہ ہو جب نا۔ جن مردوں کو پرائی عورتوں کے چسکے۔۔۔۔۔۔

میاں۔ پرائی عورتوں کے چسکے۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو ڈارلنگ! تم بھی اس اُلّو کے پٹھے پران کی باتوں میں آگئیں۔ اُس کی تو عادت ہی ہے۔

بیوی۔ جی ہاں، پران کی عادت ہے، وشوا ناتھ کی بھی عادت ہے۔ جو کوئی سچّی بات کہہ دے بس اُسی کی عادت ہے۔

میاں۔ بھئی ڈارلنگ! اب چھوڑ دو بھی یہ قصّہ۔ کمبختوں نے سارا پروگرام اپ سٹ کر دیا۔ اب آئے میرے یہاں کوئی۔ باہر ہی سے سڑک کا راستہ نہ دکھایا تو میرا نام بھی دینا ناتھ نہیں۔

بیوی۔ واہ، یہ خوب کہی آپ نے۔ آپ کا کیا ہے۔ آپ کوئی اور نام رکھ لیں گے اور۔۔۔۔۔۔

میاں۔ اور راہ گیروں کو اُٹھا اُٹھا کر گھر بھر لوں گا کہ آؤ میری بیوی بڑے اچھے پکوڑے تلتی ہے اور پراٹھے بنانے میں تو اُس کا جواب ہی نہیں۔ ہمیں تو نہ کبھی تل کے کھلائے۔۔۔۔۔۔

بیوی۔ آپ کو گھر کی کوئی چیز پسند ہو جب نا۔ جن مردوں کو باہر کی چیزوں کے چسکے۔۔۔۔۔۔

میاں۔ پھر وہی چسکے۔۔۔۔۔۔ بھئی تمھیں میری قسم ہے ڈارلنگ! مجھے زیادہ پریشان نہ کرو۔ میں پہلے سے ہی۔۔۔۔۔۔ تو کہو، چلتی ہو اب؟

بیوی۔ کہاں؟ اپنے ماں باپ کے گھر! پہنچا دیجیئے۔

میاں۔ اوہو ــــ ارے نہیں بھئی سنیما دیکھنے۔

بیوی۔ نو بجے سنیما دیکھنے! ابھی میرا دماغ خراب نہیں ہوا، کہ بچّے والی ہو کر رات کے نو بجے سنیما دیکھتی پھروں۔

میاں۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ ڈارلنگ سنیما نہ سہی، ذرا ٹہل آئیں گے۔

بیوی۔ اس وقت؟

میاں۔ یہی تو وقت ہے ڈارلنگ! جب ہم آسانی سے فرار ہو سکتے ہیں۔ ورنہ کوئی تعجب نہیں کہ ابھی کسی کی محبّت کی رگ پھڑک اُٹھے اور وہ اُٹھ بھاگے مجھ سے گلے ملنے۔ میری حالت پر رحم کھاؤ ڈارلنگ اور چلو جلدی سے نکل چلو یہاں سے۔

بیوی۔ اور بے بی؟

میاں۔ بے بی کو بھی ساتھ لے چلو اور چاہو تو تلسی کو بھی۔۔۔ تلسی بے بی کو سنبھال لے گا۔

بیوی ۔ اور کھانا پکانے کے لئے مجھے بارہ بجے پھر باورچی خانے میں ڈھکیل دیجئے گا۔

میاں ۔ یہی سنیما نہ سہی۔ کھانا تو باہر کھائیں گے ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یہ سب بعد کو ہوتا رہے گا۔ تم جلدی سے کپڑے بدل لو اور (زور سے) تلسی! اے او تلسی۔

تلسی ۔ (زور سے) جی ساب!

میاں ۔ ادھر آؤ۔

(تلسی داخل ہوتا ہے)

تلسی ۔ جی۔

میاں ۔ دیکھو، باہر کے دروازے کو باہر سے تالا لگا دو، اور پچھواڑے کی دیوار پھاند کر پھر آؤ میرے پاس۔

تلسی ۔ (تعجب سے) جی!

میاں ۔ جی وی کچھ نہیں۔ جو کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔ اب بچنے کی صرف یہی صورت ہے، اور سنو! آگر تم بھی تیار ہو جاؤ۔ گھومنے چلیں گے۔

تلسی ۔ جی ابھی آیا۔

(دائیں دروازے کی طرف بڑھتا ہے، اور دروازہ باہر سے بند کر دیتا ہے۔ اس اثنا میں بیوی الماری سے سیاہ رنگ کی ساڑھی نکالتی ہے)

میاں ۔ یہ سیاہ ساڑھی نہیں ڈارلنگ! اس وقت تو وہ سفید ساڑھی پہنو۔ چاندنی رات میں وہ سفید ساڑھی تم پر کتنی کھلتی ہے۔

بیوی ۔ جی وہ تو بہت دور ہے۔ یہی ٹھیک ہے۔ یہاں کون سا کسی کو دکھانا ہے۔

میاں ۔ نہیں ڈارلنگ! اس وقت تو آدھی ساڑھی پہنو اور اور جوڑے میں چنبیلی کا پھول ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بیوی ۔ اب رہنے بھی دیجئے یہ چاپلوسی کی باتیں۔

(تلسی بائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے اور بیوی بائیں دروازے سے باہر جاتی ہے۔)

تلسی ۔ جی لگا دیا ساب۔

میاں ۔ گڈ۔ اچھی طرح دیکھ لیا تھا نا! کبھی کبھی اندر کے بجائے باہر سے لگے ہوئے تالے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔

تلسی ۔ جی خوب اچھی طرح دیکھ لیا۔

میاں ۔ اچھا جاؤ۔ جوتے ووتے پہن لو اور پھر اسی طرح دیوار پھاند کر اور چاروں طرف دیکھ کر دروازہ کھولنا۔

تلسی ۔ جی۔

(تلسی بائیں دروازے سے باہر جاتا ہے اور بیوی سفید ساڑھی میں ملبوس اندر داخل ہوتی ہے۔)

میاں ۔ آہا، یہ ہوئی نا بات۔ ڈارلنگ! تمھیں تو کسی راجہ نواب کی بیوی ہونا چاہیئے تھا۔ یہ رنگ روپ، یہ لباس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا بتاؤں ڈارلنگ! جب تم میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہو اور لوگوں کی نظریں تمھاری طرف اٹھتی ہیں تو جانتی ہو کیا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

بیوی ۔ مجھے کیا معلوم کیا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

میاں ۔ میری چھاتی گز بھر کی ہو جاتی ہے۔ فخر سے میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بیوی ۔ کسی کو بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔

میاں ۔ نہیں ڈارلنگ! میں بنا نہیں رہا۔ سچ کہہ رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (زور سے) تلسی، اے او تلسی۔

تلسی ۔ (دور سے) جی ساب۔

میاں ۔ جاؤ، کھولو دروازہ ــــ لیکن ذرا احتیاط سے۔ چاروں طرف دیکھ کر۔ راستہ بالکل صاف ہو جب کھولنا۔

تلسی ۔ جی۔

میاں ۔ ہاں تو ڈارلنگ! میں تم سے کہہ رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(بے طرح گھبرایا ہوا تلسی داخل ہوتا ہے)

تلسی ۔ ساب غضب ہو گیا۔

میاں ۔ (گھبرا کر) کیا ہوا ــــ کیا ہوا تلسی ــــ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟

تلسی ۔ جی وہ۔

میاں ۔ ارے وہ کیا ــــ کچھ کہو گے بھی۔

تلسی - جی کوئی دیوار پھاند رہا ہے -

بیوی - (خوف سے) ایں !

میاں - کیا کہا دیوار پھاند رہا ہے - کون سی دیوار پھاند رہا ہے ؟

تلسی - جی ہماری -

میاں - ہماری دیوار پھاند رہا ہے ، کون پھاند رہا ہے ؟

(بائیں دروازے سے دیا نرائن داخل ہوتا ہے)

دیا نرائن - میں پھاند رہا ہوں تمہارا باپ - یہ بچنے کا اچھا طریقہ نکالا تم نے - باہر سے دروازہ بند کر کے تم سمجھتے ہو بچ جاؤ گے -

میاں - اوہ نہیں بھائی - معاف کرنا - ہم تو ڈر ہی گئے تھے کہ نہ جانے کون - - - - - - -

دیا نرائن - جی ہاں اب آپ کو ہم سے ڈر ہی تو آئے گا -

میاں - نہیں یہ بات نہیں دیا نرائن - بات یہ تھی کہ - - - - -

دیا نرائن - میں بات وات کچھ نہیں جانتا - پہلے میری بات کا جواب دو کہ باہر سے دروازہ بند کر کے تم - - - - - - -

میاں - ہم لوگ ذرا باہر جا رہے تھے -

دیا نرائن - دروازہ باہر سے بند ہے اور تم باہر جا رہے تھے کیوں مجھے بے وقوف بناتے ہو دینا ناتھ - یہ ہتھکنڈے کسی اور کو دکھانا - دیا نرائن کچی گولیاں نہیں کھیلا کہ اُسے اس آسانی سے چکمہ دئے جاؤ گے - پچاس بار تم نے کہا تھا تو آج آیا ہوں اور اس ارادے سے آیا ہوں کہ آج رات یہیں رہوں گا -

میاں - رات یہیں رہو گے ؟ لیکن ہم لوگ تو - - - - -

دیا نرائن - تم لوگ جاؤ جہنم میں ——— معاف کرنا بھابی ——— اس سے میں نپٹتا رہوں گا - تم ذرا جلدی سے مجھے کھانے کو کچھ لا دو - آج تو شام کی چائے بھی نصیب نہیں ہوئی -

میاں - لیکن - - - - - -

دیا نرائن - تم چپ رہو جی - تمہاری لیکن ویکن میں ابھی نکال دیتا ہوں - آخر تم نے مجھے سمجھا کیا ہے - تم سمجھتے ہو کہ اگر تم ہماری بھابی کو دھوکہ دے سکتے ہو تو ساری دنیا کو دھوکہ دے سکتے ہو ——— بھابی ، ذرا تلسی کے ہاتھ ایک کرتہ پاجامہ بھجوا دو اور دیکھو میرے لئے الگ بستر بچھانے کی ضرورت نہیں - میں اس چغد کے ساتھ سو جاؤں گا ——— کیوں بے چغد کیا سمجھا ہے تو نے مجھے ——— مارے گھونسوں کے میں تمہارا بھرکس نکال دوں گا - تمہاری ہاڑی پسلی ایک کر دوں گا -

میاں - (مری ہوئی آواز میں) ڈارلنگ !

بیوی - (طنزاً) جی -

میاں - ڈارلنگ -

بیوی - جی -

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

معلومات اور اعداد و شمار

— ملوں میں کپڑے کی پیداوار میں جو ۱۹۵۳ء میں ہی پنج سالہ پلان کے تحت کپڑے کی انتہائی مقررہ مقدار سے بھی بڑھ چکی تھی ۱۹۵۴ء میں تقریباً ۱ کروڑ گز کا مزید اضافہ ہو گیا -

— اپریل تا دسمبر ۱۹۵۴ء میں کسٹم کے محصول اور مصنوعات کے مرکزی محصول سے دو ارب ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے کی آمدنی ہو گی جبکہ گزشتہ سال یہ رقم ایک ارب اٹھاسی کروڑ چھیاسی لاکھ روپے تھی -

— ۱۹۵۴ء میں ہندوستان میں ۲۲۳۰۵۹ بجلی کے پنکھے طیار ہوئے - ۱۹۵۳ء میں ۱۹۹۴۶۸ پنکھے طیار کئے گئے تھے -

— ۱۹۵۳ء میں سیمنٹ کی پیداوار ۳۷۸۰۳۲۴ ٹن تھی جو ۱۹۵۴ء میں ۴۳۵۷۰۴۵ ٹن ہو گئی ہے -

— ۱۹۵۴ء کے دوران میں ریلوں پر ۱۳۶ مزید ٹرینیں چلائی گئیں اور ۱۱۷ ٹرینوں کی آمد و رفت میں توسیع کی گئی -

امیر محمد خاں

شہنشاہِ موسیقی اُستاد رجب علی خاں صاحب

فنونِ لطیفہ میں فنِ موسیقی اور شاعری کا مرتبہ اس لئے بلند ہے کہ اس کا تعلق وجدان سے ہے۔ مذہب بھی اگرچہ وجدانی اور اخلاقی تحریک ہے لیکن تاثیر اور کشش پیدا کرنے کے لئے اُسے بھی کبھی شاعری، کبھی سنگتراشی اور کبھی موسیقی کا سہارا لینا پڑتا ہے، اور ہندوستان میں تو تمام فنونِ لطیفہ دھرم کے اجزا ہی بن گئے۔ بدھ مت نے مصوری اور سنگ تراشی کو اپنایا تو اسلام کے شیعہ فرقے کے سوز نے حسینائی راگ کو جنم دیا، اور قرأت تو ویسے عام تھی ہی — صوفیوں، سنتوں اور رندوں نے اپنے دربارِ عام میں موسیقی کو عوام سے قریب کرکے اُسے عزت بخشی۔ ریاضت کے ساتھ اگر عبادت میں یہ تفریحی اور وجدانی پہلو نہ ہوتا تو صوفیوں اور سنتوں کے اعصاب پر بُرا اثر پڑتا۔ فنِ موسیقی تہذیبِ نفس کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

شمالی ہند کا ہندوستانی سنگیت اگر سنتوں اور صوفیوں کا مرہونِ منّت ہے تو شاہوں اور راجوں مہاراجوں اور امرا کے ذوقِ جمال اور اُن کی قدردانی نے بھی اس کو سنورنے نکھرنے کا موقع دیا ہے۔ یہ طرزِ موسیقی ہند مُسلم تہذیب کا قیمتی ورثہ ہے جو استادوں اور شاگردوں کے ذریعے سے منتقل ہوتا رہا ہے، اور کئی گھرانوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ ہر گھرانے نے اپنی ریاضت سے کمالاتِ فن کی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔

بچپن کے 'راجا' اور 'پچھیڑا' اور آج کے استاد رجب علی خاں صاحب فن کے اعتبار سے کرانہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد مرحوم مغلو خاں گوالیار اور بعد میں ریوا کے استاد بڑے محمد خاں صاحب اور اُن کے بیٹے اُستاد مبارک علی خاں کے شاگرد تھے۔ استاد رجب علی خاں صاحب نے ابتدا میں اپنے والد مرحوم سے تعلیم حاصل کی اور بعد میں اپنے زمانے کے بے مثال بین کار استاد بندے علی خاں صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ استاد بندے علی خاں کی تعلیم کا فیضان ہے کہ رجب علی خاں صاحب بین اور جل ترنگ بجانے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، حالانکہ بین کاری کی تعلیم اُنھیں صرف چار سال تک میسر آسکی۔

ناطق موسیقی میں وہ خیال گائکی کے پیرو ہیں اور اُن کی فنی خوبیوں میں مینڈ، گھسیٹ، الاپ اور سوت شامل ہیں۔ جب گاتے ہیں تو چہرے کو بگڑنے نہیں دیتے، اور گیت کے لفظوں کو سُروں کے جال میں مقید نہیں ہونے دیتے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ راگ میں جو رس ہے اُسی کے مطابق موسیقار کو جذبات کے اظہار پر بھی قدرت ہونی چاہیئے۔ تانیں لگانا تو اُن کے فن کا شیوہ ہے۔ ان کی تانیں بڑی شیریں اور دل نشیں ہوتی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جس تان میں سُر نہیں وہ تان نہیں۔ یہی تان بازی اُن کے فن کو کولہاپور کے اُستاد اللہ دیا خاں صاحب مرحوم کی لے کاری سے ممیز کرتی ہے، ورنہ عام طور پر یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ رجب علی خاں صاحب، اللہ دیا خاں صاحب کے مقلد ہیں۔ دونوں کے فن میں مماثلت بتائے جانے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کولہاپور دربار میں دونوں فن کاروں کو دس بارہ سال تک ایک ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔

خاں صاحب موصوف فطرتاً بڑے تیکھے مزاج کے انسان ہیں۔ تان بازی اسی گرم مزاجی اور بے چین طبیعت کی وجہ جواز ہو سکتی ہے۔ اُن کی لے میں بھی تیز رفتاری بہت ہے۔ غیور اتنے ہیں کہ اُن کے ہمسر استاد اللہ دیا خاں صاحب مرحوم سے ۳۰ سال تک اَن بولا رہا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ ایک بار کہیں اللہ دیا خاں صاحب نے مغلو خاں صاحب کو سارنگیا بتا دیا تھا، بس پھر کیا تھا رجب علی خاں صاحب زندگی بھر کے لئے کبیدہ خاطر ہو گئے۔ ۳۰ سال کے بعد جب استاد اللہ دیا خاں صاحب کو ایک بار اندور آنے کا اتفاق ہوا تو انھوں نے خاں صاحب موصوف کے پاس دیواس خبر بھیجی کہ وہ ملاقات کے آرزومند ہیں۔ کیونکہ دونوں کافی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لیکن رجب علی خاں صاحب نے اندور آنا گوارا نہ کیا، اور جواب

بھوا دیا کہ اتنی طویل مدت کی آزردگی میں تھوڑی دیر کی ملاقات سے خلل پڑ جائے گا۔ اس لئے بہشت ہی میں دونوں کی ابدی ملاقات ہوگی۔ ظاہر ہے استاد اللہ دیا خاں صاحب کو بہت مایوسی ہوئی ہوگی، لیکن حقیقی فن کار ذاتیات سے بالاتر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اللہ دیا خاں صاحب کا آخری وقت آیا تو انھوں نے اپنے بیٹے منجی خاں کو نصیحت کی" بیٹا! تم ہندوستان کے اور موسیقی کاروں کو چاہے سنو یا نہ سنو، لیکن رجب علی کو ایک بار ضرور سنو۔ گانے والوں میں ایک ہیرا ہے " استاد اللہ دیا خاں صاحب بھی شہنشاہِ موسیقی تھے، اور اپنے زمانے کے بے مثال لے کار تھے۔ رجب علی خاں کے فن کے بارے میں اُن کی یہ رائے بہت بڑا خراجِ تحسین ہے۔

ویسے خاں صاحب بھی استاد اللہ دیا خاں صاحب کے بڑے مداح رہے ہیں، اور اُنھیں باکمال فن کار تسلیم کرنے سے کبھی احتراز نہیں کرتے۔

طبیعت میں بے باکی اور استغنا بھی بہت ہے جو صوفیار کا خاصہ تھا۔ ایک بار اپنے محسن مہاراجہ صاحب کولھاپور کا رقعہ لے کر...... پہنچے۔ دستور کے مطابق نواب صاحب مرحوم کے اُستاد... خاں کے توسط ہی سے شرفِ باریابی حاصل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ رجب علی خاں صاحب جب... خاں صاحب کے یہاں پہنچے تو فرشی سلام کرنے کی بجائے اُنھوں نے معمولی سے آداب دکورنش پر اکتفا کی اور بلاتکلف اُس نفیس کرسی پر جا بیٹھے جو اُن کے لئے متعین نہیں تھی۔ دوسری جسارت یہ کی کہ حقہ کے کش بھی لگائے۔ اُستاد... خاں صاحب کی سامنتی طبع نازک پر یہ اکھڑپن بار گزرا، اور برہمی کا اظہار دورانِ تعارف میں یوں کیا "آپ اُنھیں مغلو خاں صاحب کے فرزند سعید ہیں جو کھبونڈا بین بجاتے تھے"! اس اہانت آمیز طنز کو بھلا استاد رجب علی خاں صاحب کیوں کر برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ فوراً جواب دیا" .... بجانے والوں سے تو وہ کافی اچھا بجا لیتے تھے"... خاں صاحب خفا تو بہت ہوئے لیکن وہ کر ہی کیا سکتے تھے، کولھاپور رئیس کا رقعہ جو تھا۔ نواب صاحب کے حضور میں باریابی ہوئی، اور انھوں نے بہ نفسِ نفیس گانا سنا کر رجب علی خاں صاحب سے رائے طلب کی۔ خاں صاحب نے حقیقت عرض کی" رئیسوں میں حضور کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا"! نواب صاحب نے پھر دریافت کیا" یہ بتاؤ گانے والوں میں ہم کیسا گاتے ہیں؟" خاں صاحب نے مصلحت اندیشی کو بالائے طاق رکھ کر بلا جھجک عرض کیا" حضور! گویوں کے تو بچے بھی آپ سے اچھا گا لیتے ہیں"! اِس پر نواب صاحب نے برافروختہ ہو کر کہا" اگر تم کولھاپور رئیس کا رقعہ نہ لائے ہوتے تو ابھی گولی کا نشانہ بنا دیئے جاتے"! اور قہراً و جبراً ۵۰۰ روپے دلوا کر خاں صاحب کو رخصت کر دیا۔ تنک مزاجی کی ایک دوسری مثال یہ ہے کہ اندور رئیس کی طرف سے چونکہ خاں صاحب کو دو ہزار کا سالانہ وظیفہ ملتا تھا، اس لئے ایک سال خلافِ معمول جب یہ رقم پوری نہیں ملی تو جتنی رقم خاں صاحب کو ملی تھی وہ سب وہیں اندور میں غریبوں کو بانٹ دی، اور اپنے وطن دیواس چلے گئے۔ مہاراجا تکوجی راؤ کو جب اِس کا علم ہوا تو خاں صاحب کو بُلوا کر پوری رقم دلوائی۔

خاں صاحب طبیعت کے بڑے فیاض اور لاابالی واقع ہوئے ہیں۔ دولت سے اُنھیں بیر ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں کولھاپور رئیس کے جشن تاج پوشی سے قبل خاں صاحب کو عمدہ لباس وغیرہ ضروریات کے لئے پانچ ہزار دیئے گئے تھے۔ لیکن اتنی بڑی رقم اُنھوں نے نہ معلوم کن کن مدوں پر خرچ کر دی، اور جشن میں شرکت کے لئے اپنے احباب سے روپے لے کر لباس بنوایا۔ کولھاپور رئیس نے دو ہزار کی مزید رقم خاں صاحب کو عطا کی۔ اس تقریب میں خاں صاحب کے دو شاگردانِ سعید مسٹر کرشن راؤ مزومدار اور امانت خاں مرحوم بھی شریک ہوئے تھے اور ہر دو فن کاروں کو ایک ایک ہزار ایک کے عطیوں سے نوازا گیا تھا۔ مسٹر مزومدار ان دنوں اسسٹنٹ سول انجینئر کی حیثیت سے دھار (مدھیہ بھارت) میں مقیم ہیں اور ابھی چند ماہ قبل اِنھیں کے اصرار پر خاں صاحب موصوف دھار تشریف لائے تھے اور جلسۂ تہنیت میں خاں صاحب نے تین گھنٹے مسلسل اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسّی بیاسی سال کی عمر ہونے کے باوجود بھی خاں صاحب جوانوں کا سا دم خم رکھتے ہیں۔ اُن کی تانوں میں برق و رعد کی سی تڑپ اور گرج ہے۔ کولھاپور رئیس اگر اُنھیں" دکن کا شیر" کہتے تھے تو وہ حق بجانب تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کولھاپور دربار نے خاں صاحب کو بہت نوازا ہے اور اُن کے فن کی سرپرستی اور قدردانی کے سلسلے میں ۳۵ ہزار روپے خرچ کئے ہیں۔

خاں صاحب بڑے ملنسار اور ظریف الطبع ہیں۔ اُن کا چلن سادہ ہے اور رہن سہن پُرانے درباریوں جیسا۔ اپنے دوسرے محسن مہاراجا دیواس

کا عطا کیا ہوا دکنی عمامہ انھیں بہت عزیز ہے۔ خاص خاص تقریبوں میں حتیٰ کہ دلی کے جمہوری دربارِ موسیقی میں بھی یہی عمامہ اُن کے سر کی زینت بنا ہوا تھا۔ اردو کے علاوہ مرہٹی بولنے کا بھی خان صاحب کو خوب ملکہ ہے۔

خان صاحب کا خیال ہے کہ ہندوستان میں موسیقی کی ریاضت آج کم ہوتی جا رہی ہے، اور فن کی سچی تعلیم استاد ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ طویل ریاضت اور مسلسل مشق ہی فن میں پختگی کی ضامن ہے۔ کلاس روم کے طرز کی تعلیم کے وہ حامی نہیں ہیں۔ اس قسم کی تعلیم سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید تو ہو سکتے ہیں لیکن فن میں کوئی فضل و کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے فن کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ اور پرانے زمانے کا سا اعلیٰ معیار عنقا ہو گیا ہے۔ خان صاحب استادوں کی انفرادیت اور فن کی کیفیت کے قائل ہیں۔

گھریلو صنعتوں کی ترقی

مرکزی حکومت کی طرف سے مزید امداد

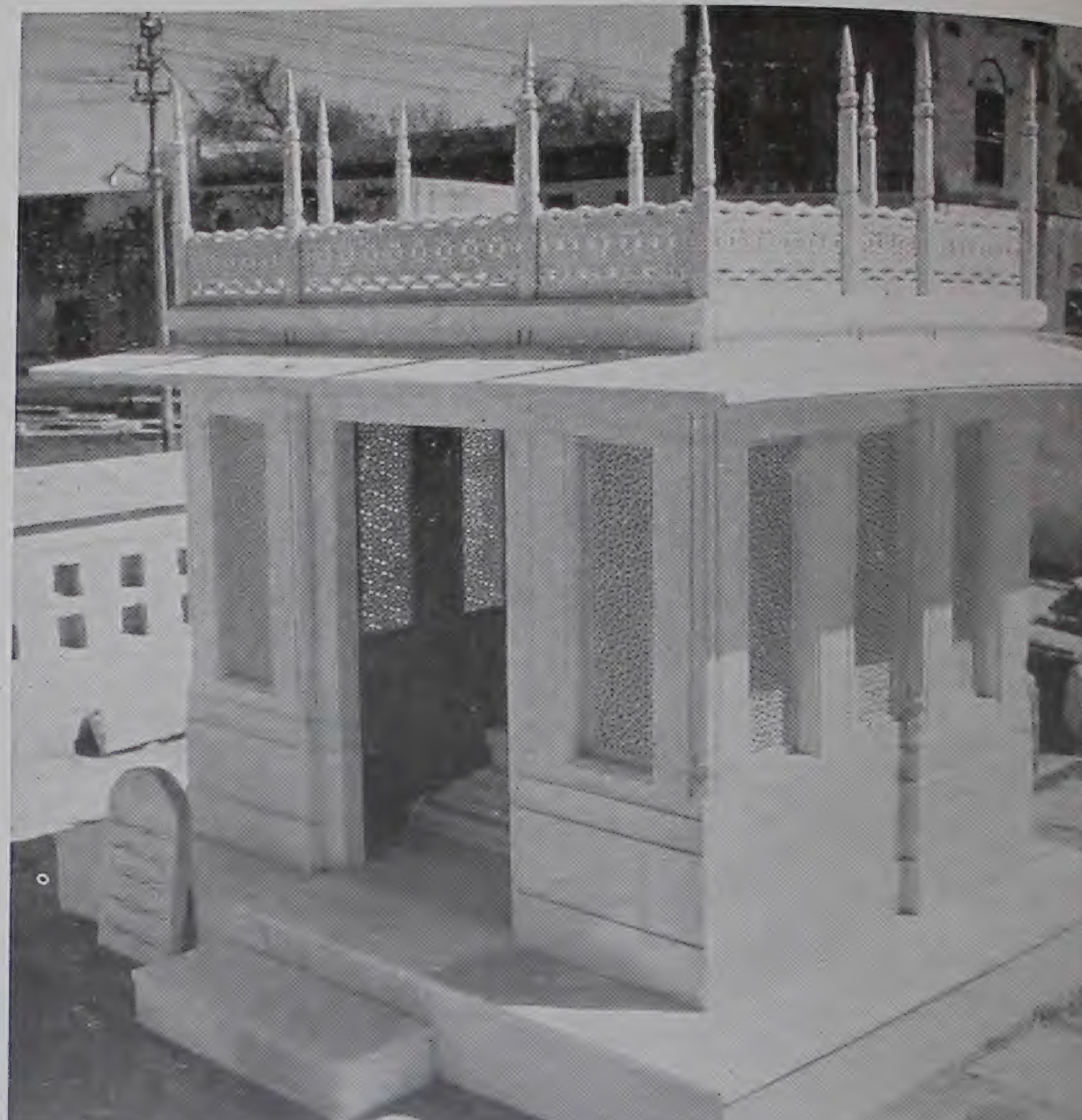
حکومت ہند نے دستی کرگھے، گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی ترقی کے سلسلے میں مزید قرضے اور مالی امداد دی ہے۔ چنانچہ اُتر پردیش کو کرگھے کی صنعت کی ترقی کے لئے ۲۰۹۱۳۲ روپیہ کی امداد دی گئی ہے۔ میسور کو ۲ لاکھ روپیہ قرض اور ۴۵ ہزار روپے کی مالی امداد دی گئی ہے۔ قرض کی رقم میں سے پارچہ بافوں کی کوآپریٹیو سوسائٹیوں کو سرمایہ کاری کے لئے قرضے دئے جائیں گے اور مالی امداد سے کرگھے کی پیداوار فروخت کرنے کی غرض سے سرکارا، منگلور اور ہبلی میں بین الریاستی ڈپو کھولے جائیں گے۔

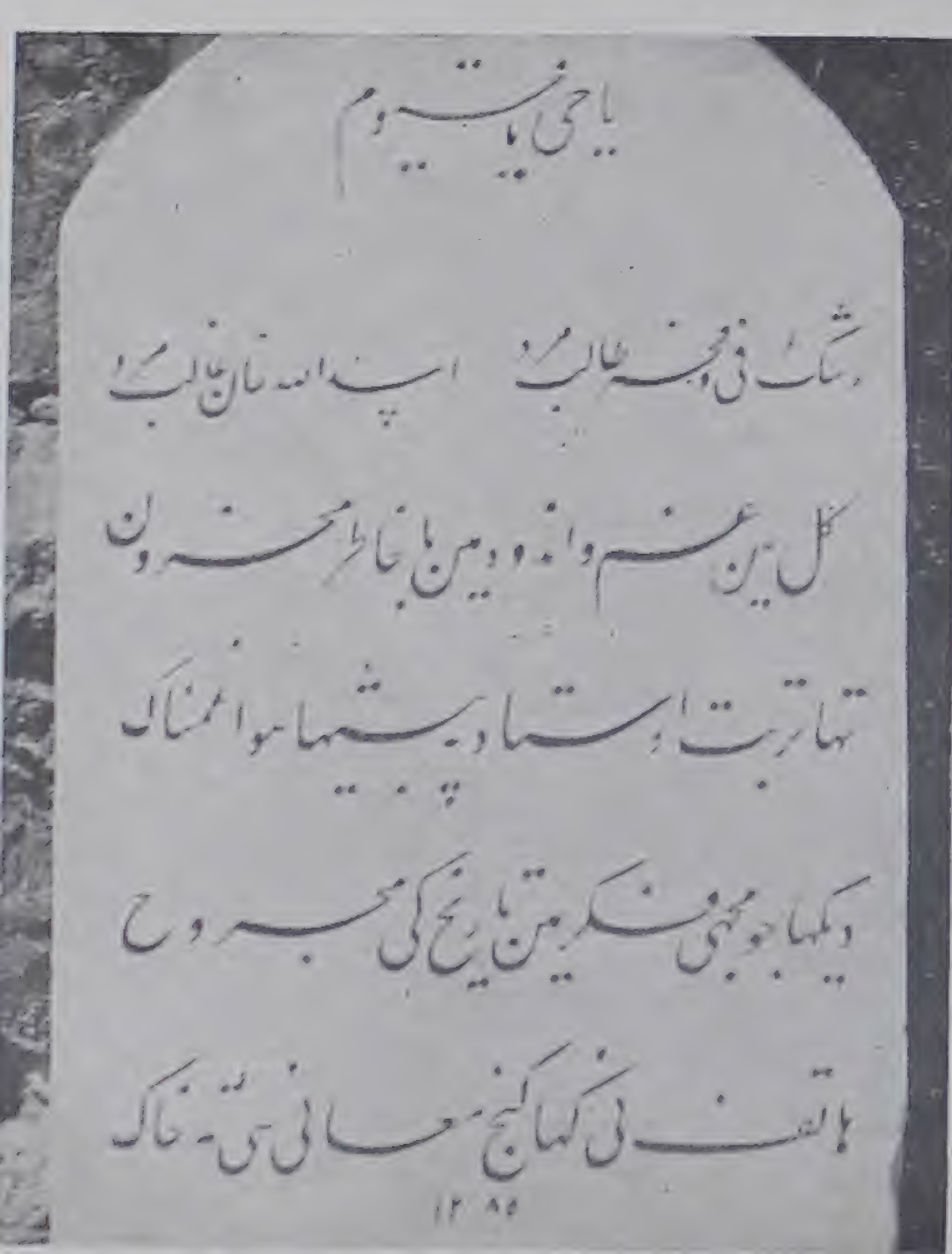
مدھیہ بھارت کو جاؤرا میں صنعتی تربیت کا مرکز قایم کرنے کی غرض سے ایک لاکھ ۴۴ ہزار روپے کی مالی امداد دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں چھوٹی مختلف صنعتوں کی ترقی کے سلسلے میں ۱۱۳۷۹۰ روپیہ کی امداد اور ۶۰ ہزار روپیہ قرض دیا گیا ہے، ان رقوم میں سے ۷۶۸۲۵ روپے کی مالی امداد اور ۳۰ ہزار روپیہ بطور قرض دیواس، نرسنگھ گڑھ اور اندور میں چمڑے کی دباغت کے موجودہ کارخانوں کی توسیع و ترقی میں صرف کیا جائے گا۔ اور بھینڈ میں ایک نئی ٹینری قایم کی جائے گی۔ رائے گڑھ میں بڑھی کے کام کے مرکز کو ۲۵۹۶۵ روپے کی امداد اور ایک ہزار روپیہ قرض دیا گیا ہے۔ مالی امداد اور قرض کی باقی ماندہ رقوم کو جفت سازوں کی کوآپریٹیو سوسائٹیوں کی ترقی کی مد میں بطور امداد اور قرض دینے کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

اڑیسہ کو ڈیڑھ ہزار روپیہ کی امداد آہن گری، ٹین گری اور ڈھلائی کی شاپ کی سرمایہ کاری کے لئے دیا گیا ہے۔

کھجور کے گڑ کی صنعت کی ترقی کے لئے آل انڈیا کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز بورڈ کو ایک لاکھ روپیہ قرض دیا گیا ہے۔ کھادی کے کارکنوں کو اوزاروں وغیرہ کی قیمت پر کٹوتی دینے کی غرض سے بورڈ کو پچاس ہزار روپے کی اور بھی امداد دی گئی ہے۔

مرزا غالب کے مزار پر سنگ مرمر
کی چھتری حال ہی میں غالب
سوسائٹی کی طرف سے تیار ہوئی
ہے -





مزار غالب کا کتبہ
مہدی مجروح کا قطعہ تاریخ اس پر کندہ ہے







ر - دهلي کے ایک گاؤں میں خود دیہاتیوں کا تعمیر کردہ
ایک کمیونٹي سنٹر
چے - اینٹوں کے بھٹے تعمیرات کي ترقي کا نشان ھیں

موضع گھوگا (دهلي) م

مویشیوں کو امراض سے بچانے کے سادھن کئے جا رھے ھیں

دهلي کے دیہات میں ٹڈي دل کو مارنے کے اقدامات







ل کنواں



دیہاتي عورتیں نقاشي میں ماہر ہوتي ہیں
تصویر میں ایک عورت اپنے گھر کي دیوار کو سجا رہي ہے

دیہاتي ایک نالے کي مٹي نکال رہے ہیں



دیہات کي وضع کو سدھارنے میں عورتیں بھي اپنا حصہ ادا کر رہي





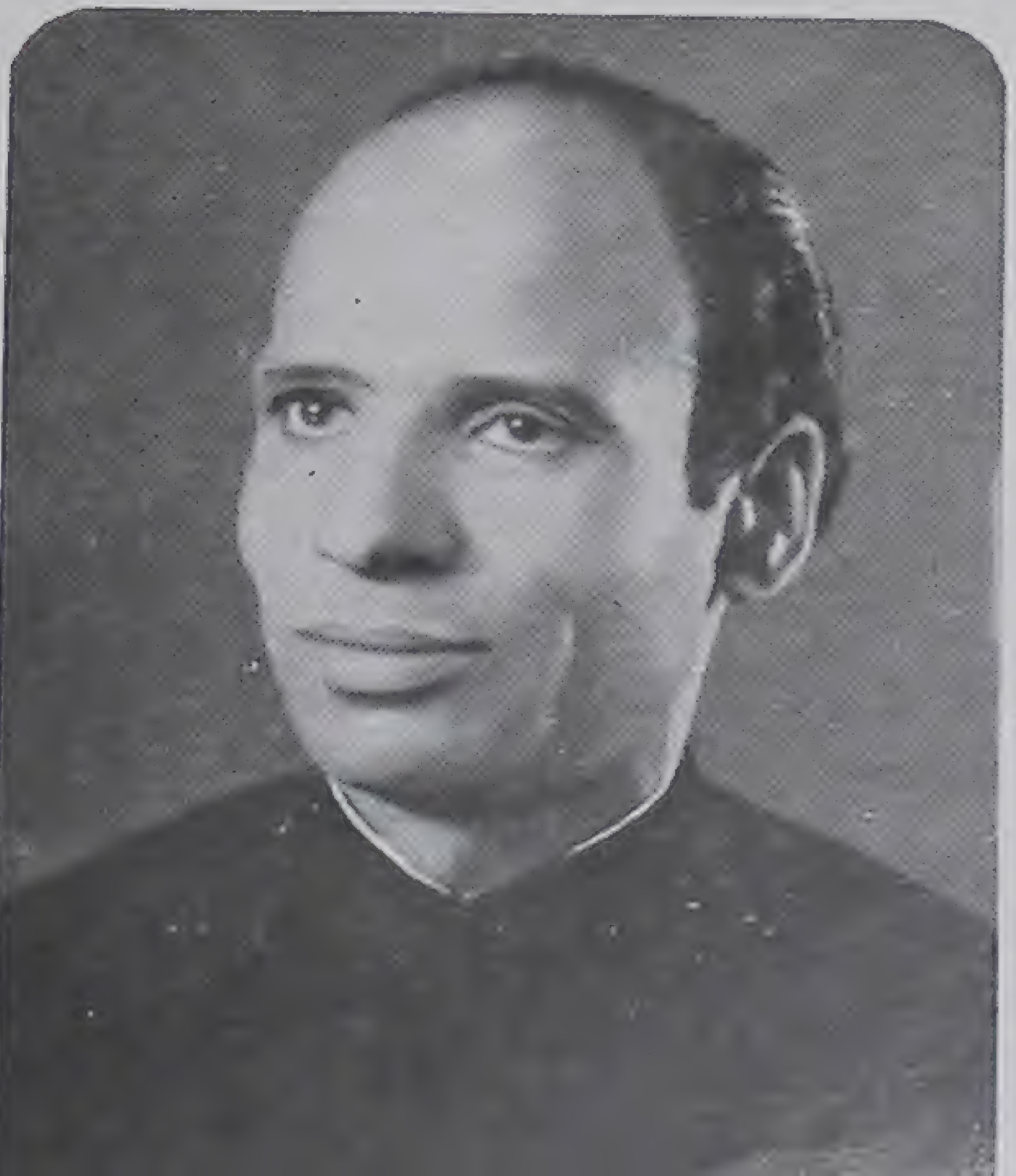
مشہور ماہر موسیقی استاد رجب علی خان راشٹرپتی سے
فن موسیقی کا انعام حاصل کر رہے ہیں

آج کل میں لکھنے والے

ممتاز حسین



رام لعل ورما
ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز دہلی سٹیٹ



نشور واحدی



خلیل الرحمٰن اعظمی

بہ ہنگامِ وصل

آج پھر کیٹس کی اک حسین نظم کی دُھن میں مجھ کو وہی گیت گانا پڑا
لو کہ ہنگامِ وصل آج آ ہی گیا، اپنا گھر آج مجھ کو بسانا پڑا
یہ اُداسی، یہ افسردگی، یہ تھکن، نغمے خزاں کے کئی اور بھی مرحلے
سوچتا ہوں کہ ان سب کو رخصت کردوں، آرہے ہیں بہاروں کے اب قافلے
اے مری زندگی کے جواں ولولو! آؤ اب مجھ سے کچھ عہد و پیماں کرو
اب بھی جو وادیاں ہیں مری منتظر، اُن میں چلنے کا بھی کوئی ساماں کرو
یہ تو سچ ہے کہ چلتے ہوئے راہ میں، کوئی چشمہ، کوئی کنج، سایہ کوئی
اپنی جانب بلاتا ہے رہگیر کو، چھیڑتا ہے کوئی نیستند کی راگنی
کچھ سکوں، کچھ نشہ پا کے انسان سے چھوٹ جاتا ہے یہ وقت کا سلسلہ
موت رہتی ہے اس وقت کی منتظر، ہے فنا کا اسی سمت سے راستہ
لیکن ایسے بھی ہوتے ہیں کچھ راہرو، ساتھ جن کے ہو کوئی متاعِ گراں
ایک نوخیز و نورستہ جنسِ ہنر، یا ادھورا سا اک خوابِ عشقِ بتاں
ایسی چنگاریاں جو تہِ خاک بھی گرم رکھتی ہیں ہر نبضِ احساس کو
یہ بھری نیند سونے نہ دیں گی کبھی جیسے کھٹکا لگا ہو کوئی رہزن کا ہو
میں بھی کچھ دیر سویا تو پھر کیا ہوا، ایسا لگتا ہے کچھ تازہ دم ہوگیا
گرد سب راستے کی جو تھی ڈھل گئی، سر پہ اک بوجھ سا تھا جو ہلکا ہوا
اب نئے موڑ پر آکے ذہنِ رسا کہہ رہا ہے کہ چلنا ہے جس دیس کو
آگئی ہیں اُسی دیس کی اب حدیں، اب اُسی آستانے پہ سجدہ کرو
اس زمیں کے لئے ہے یہ جنسِ گراں، یہ متاعِ ہنر اور یہ طبعِ رواں
میرے پیارے یہی ہے تمہارا نگر، پا سکو گے یہیں لمحۂ جاوداں

رام لال ورما

گاؤں

ہندوستان دیہات میں بستا ہے۔ کیونکہ اس کی تقریباً ۸۵ فیصدی آبادی دیہاتیوں پر مشتمل ہے۔ اور کم وبیش ۷۰ فیصدی کا انحصار کھیتی باڑی پر رہا ہے۔

ہندوستان میں تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ گاؤں ہیں۔ دیہات کی اس قدر بھاری تعداد کے مقابلے میں شہروں اور قصبوں کی تعداد محض حقیر معلوم ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ کسی بھی پہلو سے دیکھئے۔ مجلسی، تمدنی یا اقتصادی۔ ہمارے دیس کی ترقی کا انحصار اولاً اور لازماً دیہات کی ترقی پر ہے۔ راشٹرپتا مہاتما گاندھی نے ہندوستانی زندگی کی اس بنیادی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔

"میں تو یہ کہوں گا۔ کہ اگر دیہات کا خاتمہ ہو گیا۔ تو ہندوستان کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ ہندوستان پھر ہندوستان نہیں رہے گا۔ گاؤں کی بحالی کا امکان صرف اس صورت میں ہے۔ جب اس کی لوٹ کھسوٹ اور اس سے ناجائز نفع حاصل کرنے کی کوشش بند کر دی جائے۔ اس لئے ہمیں اپنی توجہ اس بات پر مرکوز کر دینی چاہئے کہ دیہات اپنی ضروریات کے لئے خود کفیل ہو سکیں"۔

انگریزوں کی عملداری میں

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی کسان ایسی مخلوق ہے۔ جس سے نہایت ہی ناجائز فوائد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ وہ دن رات ایک لادو جانور کی طرح محنت و مشقت کرتا ہے۔ اس کو موسم کی تندی و تیزی کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود اسے اس کی محنت کا اس قدر کم پھل ملتا ہے کہ اس کا اور اس کے خاندان کا بمشکل گزارہ ہوتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ انگریزوں کی عملداری میں ہوتا رہا ہے۔ انگریزی راجیہ سے پہلے ہندوستانی دیہات اپنی ضروریات کے آپ کفیل ہوتے تھے۔ چونکہ غیر ملکی حکومت کو غیر ملکی نظم و نسق اور سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام راس آتے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر غیر ملکی حاکموں نے ہندوستانی دیہات کی خود کفیل معاشیات کو تباہ کر کے اسے دوسروں کا دست نگر بنا دیا۔ جن دیہاتی دستکاریوں سے کھیتی کرنے والوں کو مزید آمدنی ہوتی تھی۔ ان کو جان بوجھ کر تباہ کر دیا گیا۔ صرف اسی پر اکتفا نہ کر کے زراعت کو بھی کئی طریقوں سے کمزور ہونے دیا گیا۔ مثال کے طور پر آبپاشی کے وسائل کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ بہت سے جنگلات کو محفوظ رقبے قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ وہ جنگلات کی دولت سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہوئی۔ کہ زمینداروں اور تعلقہ داروں کا ایک درمیانی طبقہ پیدا کر دیا گیا۔ جو پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں اپنے طرزِ عمل سے اپنے آپ کو برٹش گورنمنٹ کے بگڑے بیٹے ثابت کرنے لگے کبھی کبھار مفادِ عامہ کی ایک آدھ مثال کو چھوڑ کر یہ زمیندار اور تعلقہ دار ایک طرف تو غیر ملکی حکومت کو مستحکم کرنے کا باعث بنے اور دوسری طرف انھوں نے کسانوں کا خون چوسنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصے تک تو دیہاتیوں نے اپنی اس زبوں حالی کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قناعت کی۔ لیکن جوں جوں سیاسی بیداری میں اضافہ ہوا۔ شائستہ شہریوں کی طرح اپنی حالت پر مضطرب اور بے چین ہو اُٹھے۔ دیہاتی دستکاریوں کی تباہی کے بعد زمین پر دباؤ بڑھ گیا۔ اور اس کے حصے بخرے ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ غیر اقتصادی اکائیوں کی شکل اختیار کرتے گئے۔ جن پر قابض کنبوں کا گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چونکہ کسانوں کے زرعی حقوق محفوظ نہیں تھے اس سے بھی غریب اور ہراساں کسانوں کی مصیبتوں میں اضافہ ہوا۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ ملک میں اکثر قحط پڑنے لگے۔ جن کا نتیجہ موت اور مصیبت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

ان مصائب و آلام کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کسانوں میں زمینداروں اور غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کے جذبات اُبھرنے لگے اور سنتھال کی بغاوت

فسادات نیل اور موپلا غدر وغیرہ مثالیں دیکھنے میں آئیں۔ یہ تمام واقعات بیسویں صدی کے شروع میں ہوئے۔ گو اس وقت کے جابر حکمرانوں نے ان تمام بغاوتوں کو نہایت سختی سے دبا دیا۔ مگر دیہاتیوں کو یہ تلخ حقیقت زیادہ واضح شکل میں نظر آنے لگی۔ کہ ان کی حالت کس قدر خراب و خستہ ہے اور کہ اس حالت کو تبدیل کرنا کس قدر اشد ضروری ہے۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس نے بھی جس نے بعد میں ملک کی تحریک آزادی میں رہنمائی کی۔ شروع شروع میں اپنی اقتصادی سرگرمیاں زمینداروں کے حقوق کی حفاظت تک ہی محدود رکھیں۔ چنانچہ اس نے مطالبہ کیا۔ کہ استمراری علاقوں میں بھی زمینداروں کو دوامی پٹے داری کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ یہ صرف بیسویں صدی کے دوسرے دس برسوں کی بات ہے کہ جب کانگرس نے اپنے آپ کو کسانوں کے حقوق کی پاسبانی کے کام سے وابستہ کیا۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء کے شروع میں ایک کسان سبھا قائم کی گئی۔ جو اپنی قسم کی پہلی جماعت تھی۔ اس سبھا کے زیر اہتمام ایک میمورنڈم طیار کیا گیا۔ جو ہزاروں کسانوں کے دستخطوں سے اس وقت کے وزیر ہند مسٹر ایڈون سموئیل ماٹیگو کو جو ان دنوں ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے پیش کیا جانا تھا۔ مگر مسٹر ماٹیگو نے کسانوں کے وفد سے ملنے سے انکار کر دیا یہ تھی ابتدا کسانوں کے لئے اپنے آپ کو ملک کی تحریک آزادی کے ساتھ وابستہ کرنے کی۔

تاریخی پس منظر

غیر ملکی حملہ آور اس دیش میں آئے۔ اور چلے گئے۔ بڑی سلطنتیں معرض وجود میں آئیں۔ اور ختم ہو گئیں۔ راجدھانیاں بنیں۔ شان و شوکت حاصل کی اور پھر کھنڈروں میں بدل گئیں۔ مگر ہندوستان کے دیہات میں زندگی کے دھارے پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے دیہات کا اپنا مجلسی اور اقتصادی نظام تھا یہ جمہوری بھی تھا اور مرکز سے بے تعلق بھی۔ اس نظام کی بنیاد تھی دیہاتی پنچایت۔ حکومت خود اختیاری کا یہ ادارہ ہندوستان میں صدیوں سے چلا آتا ہے۔ شری آر۔ سی دت نے اپنی کتاب "ہندوستان کی اقتصادی تاریخ" میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے دیہاتی پنچایتوں کا رواج ہوا۔ اور دنیا کے تمام ممالک کی نسبت سب سے زیادہ دیر اس ملک میں چلا۔[1] حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں دیہات کو ویدک زمانہ سے ہی نظم ونسق کی بنیادی اکائی سمجھا جاتا رہا ہے۔

مہابھارت۔ منوسمرتی۔ کوٹلیہ کے دونو شاستر اور والمیکی رامائن میں بھی ہندوستان کے خود کفیل دیہاتی، مجلسی و اقتصادی نظام کا ذکر آتا ہے غیر ملکی سفیروں و سیاحوں مثلاً میگا سنھنز (یونان) اور ہیون سانگ و فاہین (چین) نے بھی اس بات کی شہادت دی ہے کہ ہندوستان کے دیہات اس وقت کے مروج اقتصادی و عصبی نظام کے تحت بہت خوشحال تھے۔ اس نظام کی بنیاد دیہاتی پنچائتیں یا دیہاتی جمہوریے تھے۔ دسویں صدی کی ایک پرانی پستک شکر آچاریہ کی نیتی سار میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ترکوں اور افغانوں کی آمد سے پہلے اس ملک کی نیتی کیا تھی۔ اس کتاب میں درج ہے۔ کہ "دیہاتی پنچایتوں کو انتظامیہ اور عدالتی اختیارات حاصل تھے۔ اور سرکاری افسر پنچایت کے ممبروں کا بہت ہی احترام کرتے تھے۔ یہی پنچایتیں زمین تقسیم کرتی تھیں۔ اور یہی لوگوں سے لگان وصول کر کے گاؤں کی طرف سے سرکاری حصہ ادا کرتی تھیں۔ کئی گاؤں کو ملا کر ان کی ایک اور مکھیہ پنچایت ہوا کرتی تھی۔ جو ماتحت پنچایتوں کے کام کی نگرانی کرتی تھی۔ اور ضرورت پڑنے پر ان کے معاملات میں مداخلت کر کے انہیں سدھار دیتی تھی۔"

سر چارلس مٹکاف نے جو ان دنوں ہندوستان کے قائمقام گورنر جنرل تھے۔ ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ (۱۸۵۲ء) میں لکھا ہے "دیہاتی پنچایتیں چھوٹے چھوٹے جمہوریے ہیں۔ جن کو وہ تمام اختیارات حاصل ہیں۔ جن کی انہیں اپنے دائرۂ اختیارات میں ضرورت ہے۔ وہ قریباً ہر قسم کے خارجی اثر و رسوخ سے مبرا ہیں۔ ان کی زندگی دیرپا ہے۔ جہاں اور کئی ادارے ختم ہو جاتے ہیں یہ قائم ہیں سلطنتیں یکے بعد دیگرے ختم ہو جاتی ہیں۔ انقلاب کے بعد انقلاب آتے ہیں۔ مگر دیہاتی زندگی ایک ہی دھارے پر بہے چلی جاتی ہے ..... اس لئے میں چاہتا ہوں۔ کہ دیہات کے دستور و آئین کو کبھی نہ چھیڑا جائے۔ اور مجھے ہر اس چیز سے ڈر لگتا ہے جو اس دستور و آئین کو توڑنے کا رجحان رکھتی ہے۔"

---

[1] کانگریس کی دیہاتی پنچایت کمیٹی ۱۹۵۴ء کی رپورٹ صفحہ ۹

لیکن برطانوی نظم ونسق کے آجانے کے بعد دیہاتی پنچایتوں کا یہ نظام درہم برہم ہوگیا۔ زرعی سسٹم کی جگہ رعیت داری سسٹم رائج کر دیا گیا۔ دیہاتی پنچایتوں کے انتظامیہ اور عدالتی اختیارات چھین کر سرکاری افسروں کے ہاتھ میں دے دئے گئے۔

آزادی کے حصول کے بعد اب دیہاتی پنچایتوں کے نظام کو پرانی بنیادوں پر بحال کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اور یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ دیہات کو کم سے کم علاقائی طور پر اقتصادی اعتبار سے خود کفیل بنا دیا جائے۔

مجلسی و اقتصادی زندگی

رقبے اور آبادی کے لحاظ سے ہندوستانی دیہات میں وہی فرق ہے جو قصبوں اور شہروں میں ہے۔ دیہات کا رقبہ ½ مربع میل سے تین یا چار مربع میل تک ہوتا ہے۔ اور آبادی ۲۰۰ یا اس سے بھی کم سے لے کر ۲۰۰۰ یا اس سے بھی زیادہ تک ہوتی ہے۔ دیہات میں لوگوں کا سب سے بڑا پیشہ کھیتی باڑی ہوتا ہے۔ دیہاتیوں کی اکثریت کھیتی کرنے والے مزدوروں پر مشتمل ہوتی ہے جن کی اپنی کوئی زمین نہیں ہوتی۔ یہ لوگ کھیتوں میں اُجرت پر کام کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔ کچھ اور چھوٹے موٹے کاروبار بھی ہوتے ہیں۔ جو دیہاتی کرتے ہیں۔ مثلاً

بڑھئی کا کام

لوہار کا کام

جولاہے کا کام

چرخہ کاتنا

جوتے بنانا اور چمڑے کا دیگر کام

کمہار کا کام ۔۔۔۔ اور ٹوکریاں بُننا وغیرہ

ہندوستان کا دیہاتی دیگر زراعتی ملکوں کے دیہاتیوں کی طرح روایتی طور قدامت پسند ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اُسے جدید قسم کے سائنسی ایجادوں اور ترقیوں سے جلدی روشناسی نہیں ہوتی۔ یہ باتیں انسان کو قسمت یا تقدیر پر شاکر رہنے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنانے میں مدد دیتی ہیں

دیہاتی علاقوں میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب ماسوائے دہلی سوراشٹر یا بمبئی جیسی ریاستوں کے جہاں شہری آبادی زیادہ ہے۔ شہروں کی نسبت بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے ہندوستان کے لئے پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب اس قدر کم یعنی ۶ء۱۶ فیصدی ہے۔

ذات پات کا سسٹم جو وقت کی ضرورتوں اور حالات کے کارن مسخ ہو کر ہماری مجلسی زندگی کے لئے مضرّت رساں ثابت ہوا ہے۔ شہروں کی نسبت دیہات میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود پرانے زمانے میں ہمارے سماج کے ساتھ ساتھ جس کی بنیاد دیہاتی پنچایتوں پر تھی ذات پات اور مشترکہ خاندان کا نظام اچھی طرح چل رہے تھے جیسا کہ ہمیں نیتی سار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے سرکاری تقرر کرتے وقت کام۔ کیرکٹر اور قابلیت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ذات پات اور خاندان کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ غیر ملکی حکمرانوں کے وقت میں ہمارا مجلسی نظام ٹوٹ گیا۔ ذات پات کے سسٹم کی تمام خوبیاں ختم ہوئیں۔ اور یہ لوگوں کے لئے خاص طور پر دیہاتی لوگوں کے لئے ایک امٹ مصیبت یا بدعت بن گیا۔ بہرحول آزادی کی جدوجہد کے دوران میں اور سیاسی آزادی ملنے کے بعد دیہاتی آبادی زیادہ فراخ دل اور ترقی پسند بن گئی ہے ہمارے دستور میں چھوت چھات کو قطعی طور پر خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ اور ذات پات عقیدے یا مذہب کو کسی عہدے، پوزیشن یا حق حاصل کرنے کا معیار قرار نہیں دیا گیا۔

زرعی اصلاحات

دیہات کی جو زیادہ تر کھیتی باڑی پر دار و مدار رکھتے ہیں۔ ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روکاوٹ دو باتیں یعنی زرعی حقوق کا غیر محفوظ ہونا اور گورنمنٹ اور کسان کے درمیان ایک درمیانی طبقے یعنی زمینداروں کی موجودگی ہے۔ ہندوستان میں زمین کی پٹے داری کے تین بڑے طریقے رائج ہیں "پہلا زمینداری" جس کے تحت ایک یا ایک سے زیادہ اشخاص مشترکہ طور پر ایک بڑی بھاری جاگیر کے مالک ہوتے ہیں اور وہی مالیہ اراضی کے ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ سسٹم زیادہ تر مغربی بنگال بہار اور آسام کے کچھ حصوں اڑیسہ، مدراس اور اتر پردیش میں رائج ہے۔ محال واری یا مشترکہ دیہات کے ماتحت زمین کی ملکیت گاؤں والوں کی ہوتی ہے۔ اور گاؤں والے مشترکہ طور سے یا انفرادی طور پر مالیہ اراضی کے تادیے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ مدھیہ پردیش، پنجاب اور اتر پردیش کے کچھ حصوں میں رائج ہے۔ رعیت داری کے طریقے کے تحت زمین کے انفرادی مالک مالیہ اراضی ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ بمبئی اور مدراس میں رواج ہے*۔

* انڈیا ۱۹۵۳ء صفحہ ۲۸۶

حصول آزادی کے بعد ایسے قوانین وضع کئے گئے ہیں جن کا مقصد کسانوں کے حقوق کو مستحکم اور محفوظ کرنا اور درمیانی طبقے یعنی زمینداروں کو ختم کرنا ہے قریباً تمام ریاستوں میں خاتمہ زمینداری کے قوانین پاس کئے جا چکے ہیں۔ اور درمیانی طبقے کے خاتمے کا اصل کام یا تو مکمل کیا جا چکا ہے یا کیا جا رہا ہے*۔ کچھ ریاستوں میں مزارعان کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے قدم اٹھائے جا چکے ہیں۔ اور باقی ریاستوں میں ایسا کیا جا رہا ہے۔

پانچ سالہ پلان میں بھی زرعی اصلاحات اور دیہات کی تعمیر نو کی ایک جامع پالیسی وضع کی گئی ہے۔ اس پلان میں مندرجہ ذیل بڑے بڑے امور کی سفارش کی گئی ہے۔

(۱) خاتمہ زمینداری کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا۔ اور ایک ایسی مضبوط ایڈمنسٹریٹو مشینری قائم کرنا۔ جو زمینداری کی جگہ لے سکے۔

(۲) آئندہ کوئی کسان اپنے پاس کس قدر زیادہ سے زیادہ زمین رکھ سکتا ہے۔ اس کا تعین کرنا۔

(۳) لگان کی کمی اور زرعی حقوق کا تحفظ

(۴) ایک کسان ذاتی طور پر کس قدر زیادہ سے زیادہ زمین جوت سکتا ہے۔ اس کا تعین کرنا۔

(۵) مزارعان کو زمین کے حقوق ملکیت دلانے کے لئے قدم اٹھانا

(۶) چک بندی کے پروگرام کو تیز کرنا نیز یہ تعین کرنا کہ کسی کسان کے پاس کم سے کم کس قدر زمین ہونی چاہئے تاکہ تقسیم در تقسیم کو روکا جا سکے۔

(۷) زمینوں کے انتظام کے متعلق قانون بنانا۔ تاکہ فالتو زمین کو سرکاری قبضے میں لا کر ان لوگوں کو کاشت کے لئے دی جائے جو کھیتی باڑی کرنا چاہتے ہیں اور جن کے پاس کوئی زمین نہیں۔

(۸) کھیتی باڑی کے لئے کوآپریٹو سوسائٹیوں کی ترقی اور حوصلہ افزائی

(۹) دیہات کے نظم و نسق کو بھی کوآپریٹو لائنوں پر چلانا۔ اور زمین کے انتظام گاؤں کے نظم و نسق کے لئے گاؤں پنچایتوں کو اختیارات دینا۔

(۱۰) مرکز میں زرعی اصلاحات کے لئے ایک آرگنائزیشن کا قیام

مجلسی و اقتصادی حالات جو اکثر تاریخی واقعات سے پیدا ہوتے ہیں۔ نہ صرف مختلف ریاستوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی ریاست کے مختلف حصوں میں بھی ان میں فرق ہوتا ہے۔ اس لئے تمام ریاستوں میں ایک ہی قسم کے زرعی اصلاحات کے قوانین بنانا ناممکن ہے۔ لیکن بنیادی طور پر زرعی اصلاحات کی ہر جگہ کوشش کی جا رہی ہے۔

چک بندی

مختلف ریاستوں میں کسی ایک آدمی کے پاس کم سے کم زمین کس قدر ہے اس کا پیمانہ مختلف ہے۔ مگر اوسط قریباً ۵ ایکڑ ہے۔ قحط تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق بمبئی میں ۱۱٫۷ ایکڑ اور مدراس میں ۴٫۴ ایکڑ فی کس ہے مدراس کے معین دیہات، بہار اور مغربی بنگال کے بعض حصوں میں ایگریکلچرل لیبر انکوائری کی رپورٹ کے مطابق جو سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء میں کی گئی۔ اکثر لوگوں کے پاس ۲ ایکڑ سے کم زمین ہے۔ اس قدر کم زمین کا ہونا اور بعد میں اس کے بھی حصے بخرے ہو جانے سے اس قدر کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی۔ کہ جس پر کوئی کنبہ اچھی طرح گزر بسر کر سکے۔ اس سے کھیتی باڑی کا خرچہ بھی زیادہ پڑتا ہے۔ اور کسان اور اس کے مویشیوں کو پورا کام اور روزی بھی نہیں مل سکتی*

سنہ ۱۹۱۴ء سے چک بندی کے طریقوں کو آزمایا جا رہا ہے۔ یہ طریقے رضاکارانہ طور پر چک بندی کرانے کے بھی تھے اور جبراً بھی۔ حصول آزادی کے بعد جس طرح زرعی اصلاحات کو تیزی سے عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ اسی طرح کئی ریاستوں میں چک بندی کے کام کو بھی تیز کر دیا گیا ہے۔

یہ کام سرکاری طور سے اور کوآپریٹو سوسائٹیوں کی معرفت دونوں طرح سے ہو رہا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کچھ عرصے سے زرعی زمین کے متعلق پالیسی کا رجحان یہ رہا ہے کہ ایسے قوانین بنائے جائیں۔ جن سے زمین کے چھوٹے چھوٹے اور غیر اقتصادی ٹکڑے نہ ہونے پائیں۔

کمیونٹی پراجیکٹس

ملک کے مختلف حصوں میں بہت سی دریائی گھاٹی سکیموں کو پانچ سالہ منصوبے کے تحت عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ اس سے بلا شبہ ہماری اقتصادی ترقی کو بڑی بھاری تقویت ملے گی۔ ان سکیموں کی تکمیل سے جہاں شہروں اور قصبوں کو فائدہ پہنچے گا۔ وہاں آبپاشی کے لئے مزید پانی ملے گا۔ اور دیہات میں گھریلو

---

* ہندوستان میں زرعی اصلاحات جنوری سنہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۳۳

* انڈیا سنہ ۱۹۵۰ء صفحہ ۲۴۷

دستکاریوں اور گھریلو استعمال کے لئے مزید بجلی دستیاب ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ سیلابوں کی روک تھام ہو جائے گی اور قحط پڑنے بند ہو جائیں گے۔ نئے پراجیکٹس کے تحت کھیتی باڑی کے بہتر آلات، بیج اور کیمیاوی کھاد وغیرہ کے بآسانی دستیاب ہونے سے بھی زرعی پیداوار میں نسبتاً اضافہ ہو جائے گا۔

اگرچہ بڑے بڑے پراجیکٹس کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں کافی مدت لگے گی۔ مگر ۵۵ کمیونٹی پراجیکٹس سکیموں کے جو ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اچھے نتائج نکلنے شروع ہو گئے ہیں۔ ہر ایک پراجیکٹس تین سو دیہات پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس کا رقبہ کوئی ساڑھے چار سو ایکڑ سے پانچ سو مربع میل تک ہوتا ہے۔ ہر ایک بلاک میں آبادی اوسطاً ۲ لاکھ اور رقبہ زیر کاشت قریباً ڈیڑھ لاکھ ایکڑ ہے۔

کمیونٹی پراجیکٹس سکیموں کا مسئلہ کچھ بنیادی مقاصد حاصل کرنا ہے یعنی دیہات میں آمد و رفت کے وسائل کو بہتر بنانا۔ اچھے مکان مہیا کرنا۔ پرائمری تعلیم کا بندوبست کرنا۔ صحت عامہ کے لئے بہتر سہولتوں کا بہم پہنچانا۔ صفائی کا انتظام بہتر بنانا۔ کھیل کود اور تفریح کے اسباب مہیا کرنا۔ چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور دیسی دستکاریوں کی حوصلہ افزائی اور نئے نئے روزگار مہیا کرکے دیہاتیوں کی اقتصادی بدحالی کو دور کرنا۔ کمیونٹی پراجیکٹس سکیموں کو نیشنل ایکسٹنشن سکیموں کے ذریعے تقویت پہنچائی گئی ہے۔ یہ سکیم ہندوستان بھر میں ۱۸۰ بلاکوں میں زیر عمل لائی گئی ہے۔ ان دونو سکیموں کا بنیادی مقصد یہ ہے۔ کہ دیہات کی پیداوار بڑھائے اس پیداوار کو جمع کرنے اور پھر تقسیم کرنے کے سلسلے میں مزید سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

وقت آنے پر دونو اسکیمیں ملک بھر میں نافذ کی جائیں گی جس سے دیہات زیادہ خوشحال اور پرکشش ہو جائیں گے۔ اس شاندار تبدیلی کا مظاہرہ بعض ریاستوں میں جن میں دہلی بھی شامل ہے۔ ابھی سے ہو رہا ہے۔ کم سے کم بعض دیہات میں پکی گلیوں، سرکلر سڑکوں، ہوادار مکانوں۔ ان میں غسل خانوں اور ٹٹیوں کے انتظام اور کچن میں چمنیوں وغیرہ کے لگ جانے سے حالت ہی بدل گئی ہے۔ ان دیہات میں مکانوں کی دیواروں پر اب سیمنٹ پلستر نظر آتا ہے۔ اور پکی سکول بلڈنگیں ہیں۔ کمیونٹی سنٹر بھی بن گئے ہیں اور گاؤں کے باہر کھاد کے گڑھے کھودنے کے علاوہ درخت لگانے کے لئے زمین بھی مخصوص کر دی گئی ہے۔

اس ضمن میں یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کہ کمیونٹی پراجیکٹس کے تحت ہر قسم کی تعمیری سرگرمیوں کی بنیاد "اپنی مدد آپ" کا اصول ہے۔ اور رضاکارانہ طور پر نقدی یا کام کی مدد دینی پڑتی ہے۔ اس طرح دیہات میں اب ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے جس سے حب الوطنی کا نیا جوش اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہ دونو باتیں تمام تعمیری کوششوں کی بنیاد ہیں۔

دیہاتی دستکاریاں

زمانۂ سلف و زمانہ وسطیٰ میں ہمارا ملک اپنی خود کفیل دیہاتی زندگی کے لئے مشہور رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے۔ انگریزوں کی عملداری میں ان دیہاتی دستکاریوں کو تباہ کر دیا گیا۔ اگرچہ آج کل ہم تہذیب کے اس دور سے گزر رہے ہیں جسے عام طور پر صنعتی تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن ملک میں افراط اور خوشحالی لانے کے منصوبے بنانے والوں کا خیال ہے کہ یہ مقصد صرف اس حالت میں حاصل ہو سکتا ہے جب دیہات کو خود کفیل بنایا جائے۔ اب کھیتی باڑی پہلے کی طرح سب سے بڑی دیہاتی صنعت ہے۔ یہ انفرادی طور پر اور کنبوں کو بھی سب سے زیادہ کام مہیا کرنے کا باعث ہے۔ سرکاری ملازمتوں کو چھوڑ کر باقی جس قدر لوگ پیداوار بڑھانے کے کام میں لگے ہوتے ہیں۔ ان کی بھاری اکثریت یعنی ۷۸ فی صدی کھیتی باڑی پر انحصار رکھتی ہے۔ کھیتی باڑی کے جدید طریقوں سے جو پانچ سالہ پلان کے تحت اختیار کئے جاتے ہیں پیداوار میں اضافہ ہوگا اور دیش کی دولت بڑھے گی۔ مگر اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا۔ کہ اس وقت جس قدر لوگ کھیتی باڑی سے روزی کماتے ہیں ان کی تعداد کم ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی اقتصادی ترقی کے لئے پنج سالہ منصوبے میں جو پروگرام وضع کیا گیا ہے اس میں دیہاتی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کو ایک اہم مقام دیا گیا ہے۔

کھادی کو دیہاتی دستکاریوں میں سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے باقی مصنوعات یہ ہیں۔

(۱) پام گڑ

(۲) تیل نکالنے کی دیہاتی گھانیاں

(۳) ہاتھ سے دھان چھڑنے کی دستکاری

(۴) گڑ اور کھانڈ سازی

(۵) شہد کی مکھیاں پالنا

(۶) آٹے کی چکیاں

(۷) ان تیلوں سے جو کھانے کے کام نہیں آتے صابن بنانا

(۸) دستی کاغذ
(۹) دیا سلائی کی گھریلو صنعت
(۱۰) کاتنے اور بننے کی صنعت

ان دیہاتی صنعتوں اور اس قسم کی دیگر صنعتوں کی ترقی کے لئے ایک منضبط اور منظم کوشش کرنے کے لئے حکومت ہند نے ایک آل انڈیا کھادی و دیہی انڈسٹریز بورڈ بنایا ہے - یہ بورڈ ۱۴ر جنوری ۱۹۵۳ء سے کام کر رہا ہے - بہت سی ریاستوں میں بھی اس قسم کے بورڈ بن گئے ہیں - جن میں سے زیادہ تر مشاورتی نوعیت کے ہیں اور کچھ ایک سٹیچوٹری بھی ہیں - حکومت ہند نے ایک سٹیچوٹری کمیشن بنانے کے لئے بھی قدم اُٹھایا ہے - جو دیہاتی صنعتوں کی ترقی کی کوششوں کو تقویت پہنچائے گا -

آل انڈیا ہینڈی کرافٹس بورڈ کے نام سے ایک اور بورڈ بھی بنایا گیا ہے جو ان دستکاریوں کو تقویت پہنچائے گا - جن کا دیہاتی صنعتوں سے گہرا سمبندھ ہے - دیہاتی دستکار جو کسی وقت اپنی کاریگری کے لئے دنیا بھر میں مشہور تھا - مگر اب جس کی کوئی حیثیت نہیں رہی - ایک مرتبہ پھر اپنی کھوئی ہوئی شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا -

اس سلسلے میں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا - کہ دیہاتی صنعتوں کی ترقی کے پشت پر تین بنیادی مقاصد ہیں -

(۱) روزگار مہیا کرنا
(۲) استحصال یا دیہات کی لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنا - اور
(۳) کو اپریٹو بنیادوں پر صنعتوں کو ترقی دینا - اس طرح سے ایک ایسی سوسائٹی قائم کرنا ہے جس کی بنیاد مجلسی و اقتصادی مساوات پر ہو - اور ایسی سوسائٹی جسے کو اپریٹو کامن ویلتھ کا نام دیا جا سکے -

مجلسی فلاح

جو لوگ ہندوستان کو خوش اور خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں - اب اُن کی نظریں دیہات پر مرکوز ہو گئی ہیں - حکومت ہند نے مجلسی فلاح و بہبود کے لئے ایک اور بورڈ سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کے نام سے ۱۹۵۳ء میں بنایا جس کے اغراض و مقاصد میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی ہیں -

(۱) دیہات سے ناخواندگی کو دور کرنا
(۲) دیہات میں مجلسی حالات کا سدھار -
(۳) دیہاتیوں کو دستکاریوں کی تربیت دینا -
(۴) دیہات کی صحت و صفائی کو بہتر بنانا -
(۵) زچہ اور بچہ کی بہبود کا انتظام کرنا -

سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ تو زیادہ تر رہنمائی کرنے کے لئے ہے - ریاستوں میں اسی قسم کے جو بورڈ بنائے گئے ہیں - اصل کام وہی کرتے ہیں - ان ریاستی بورڈوں نے کمیونٹی پراجیکٹس اور نیشنل ایکسٹنشن بلاکوں کی طرح اپنے کام کو آسانی سے چلانے کے لئے بلاک بنا رکھے ہیں -

دہلی سٹیٹ کے سوشل ویلفیر بورڈ نے اپنی پہلی ویلفیر سکیم کا آغاز ۱۵ر اگست ۱۹۵۴ء کو یوم آزادی پر اوکھلا گاؤں سے کیا - اس بورڈ کا بڑا مقصد دیہات کی مجلسی و اقتصادی زندگی کو بہتر بنانا ہے -

ہندوستان میں دیہاتی زندگی کا نقشہ کچھ دیگر مجلسی و اقتصادی سرگرمیوں اور تحریکوں سے بھی بدلا جا رہا ہے - ان میں سے سروودے اور بھودان کی تحریکیں سب سے زیادہ اہم ہیں - سروودے سماج کا جو گاندھی جی کے فلسفہ زندگی کے مطابق بنائی گئی ہے مقصد ایک ایسے سماج کا نرمان ہے جس میں اونچ نیچ اور حاکم و محکوم کی تمیز نہ ہو - جس میں تشدد کی کوئی جگہ نہ ہو - اور کوئی شخص کسی دوسرے سے ناجائز فوائد حاصل نہ کر سکے - ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے سماج کو جس میں کوئی ضروری اور باضابطہ حکومت نہ ہو - اور ہر ایک شخص اپنا حاکم آپ ہو - انارکی کا نام دیں - لیکن درحقیقت یہ جمہوریت کی انتہائی شکل ہے - ہر چند اس قسم کے تصوری دنیا کا قیام ناممکن نظر آتا ہو - لیکن اس قسم کے اعلےٰ و ارفع خیالات بذات خود نیکی کی ایک بڑی بھاری طاقت ہیں - اس لئے سروودے کا آدرش لوگوں کی روش اور سرگرمیوں پر اپنا اثر ڈالے نہیں رہ سکتا -

اس سلسلے میں ایک نہایت ہی قابل عمل اور مستحکم کوشش بھودان کی تحریک ہے - اس تحریک کا مقصد ان لوگوں سے زمین کا دان حاصل کرنا ہے جن کے پاس فالتو زمین ہے اور پھر یہ زمین ان لوگوں میں تقسیم کرنا جن کے پاس کوئی زمین نہیں - مگر جو زمین جوت کر اور کھیتی باڑی کر کے گزر اوقات کرنا چاہتے ہیں - اس تحریک کا مقصد جو آچاریہ ونوبا بھاوے نے شروع کی ہے ۵ کروڑ ایکڑ زمین حاصل کرنا ہے - اس میں سے ۳۲ لاکھ ایکڑ زمین تو اس وقت تک حاصل بھی کی جا چکی ہے - زمین حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسے

تقسیم بھی کیا جا رہا ہے - جاگیردارانہ نظام کو محض رضاکارانہ طور پر - اور پُرامن طریقے سے کاشتکارانہ نظام میں تبدیل کرنے کی یہ ایک بڑی بھاری کوشش ہے -

دیہاتی پنچائتیں

دیہاتی زندگی کے شیرازے کو مضبوط بنیادوں پر بحال کرنے کی طرف سے سب سے زیادہ اہم اور ضروری تبدیلی دیہات میں پنچائتوں کی بحالی ہے - انگریزی راج میں پنچایت سسٹم کمزور ہو کر ختم ہو گیا تھا۔ مختلف ریاستوں میں قانون پاس کئے جا چکے ہیں یا کئے جا رہے ہیں جن کا منشا پنچایتوں کو نئے سرے سے منظم کرنا اور نئی ضروریات کے مطابق سانچے میں ڈھالنا ہے - پنچایت سسٹم میں عام طور پر ایک منتخب گاؤں سبھا ہوتی ہے - ایک نمایندہ مضبوط ایگزکٹو یعنی گاؤں پنچایت اور ایک جوڈیشل ادارہ یعنی گاؤں عدالت ہوتی ہے - توقع کی جاتی ہے - کہ پنچائتی نظام کے رائج ہونے کے بعد ایک وقت ایسا آئے گا - جب دیہات میں مکمل اور مضبوط پنچایت راج قائم ہو جائیگا۔ ہندوستان کی دیہاتی زندگی سے جاگیردارانہ نظام تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے - اب کسی دیہاتی کو زمیندار کے ڈکٹیٹرانہ احکام کے سامنے جھکنا نہیں پڑتا - اسے اب نوشتۂ تقدیر کے سامنے بھی سرِ تسلیم خم کرنے کی ضرورت نہیں ہے - اسے تو اب اپنا صحیح مقام حاصل کرنا ہے - اسے نہ صرف اپنی تقدیر آپ بنانی ہے - بلکہ قوم و ملک کی تقدیر بنانے میں بھی ہاتھ بٹانا ہے -

---

ہندوستان اور پولینڈ کے مابین تجارتی معاہدہ کی تجدید

ہندوستان اور پولینڈ کی حکومتوں کے نمایندوں کے مابین موجودہ تجارتی معاہدہ کی تجدید کے متعلق مکتوبات کا تبادلہ ہوا - ان مکتوبات پر حکومتِ ہند کی طرف سے وزارتِ تجارت و صنعت کے سیکرٹری شری ایچ - وی - آر آئینگر اور پولینڈ کی حکومت کی طرف سے ہندوستان میں مقیم پولینڈ کے سفیر خاص و مدار المہام ہز ایکسی لنسی مسٹر جرزی گروڈزنسکی نے دستخط کئے -

ابتدا میں اس تجارتی معاہدہ پر ۶ جنوری ۱۹۵۱ء کو دستخط کئے گئے تھے اور اس کی وقتاً فوقتاً توسیع کی جاتی رہی ہے - معاہدہ کی اس نئی تجدید پر عمل درآمد یکم جنوری ۱۹۵۵ء سے تصوّر کیا جائے گا اور یہ سال رواں کے اختتام تک جاری رہے گا -

اس نئے معاہدے کے ساتھ درآمدی اور برآمدی اشیاء کے متعلق جو شیڈول شامل کئے گئے ہیں وہ بالکل وہی ہیں جو ۱۹۵۴ء میں زیرِ عمل تھے

ہندوستان سے جو اہم اشیاء پولینڈ کو برآمد کی جا سکتی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں -

لوہا - خام میگنیز - ابرق - چائے - قہوہ - تمباکو - کاجو - گرم مصالحہ - کمایا ہوا چمڑا اور کھالیں کھیلوں کا سامان - دستکاری اور گھریلو صنعتوں کی پیداوار - ہندوستانی فلمیں (ایکسپوزڈ)

پولینڈ سے ہندوستان کو جو اشیاء برآمد ہو سکتی ہیں ان میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں -

مختلف اقسام کی انجینئرنگ مشینری - مشینی اوزار - ٹریکٹر - زرعی مشینری اور اوزار - کیمیاوی اشیاء اور ادویہ سرجیکل اور آپٹیکل (آنکھوں سے متعلق) اوزار - فوٹوگرافی کے اوزار اور سامان - خوردبین - پولینڈ کی فلمیں (ایکسپوزڈ)

محمد عبداللہ الہ آبادی

طیور اور نقلِ وطن

یعنے

مہاجر چڑیاں

طائر کو "دو پایہ پرندہ" کہا جا سکتا ہے اور درحقیقت یہ تعریف نہایت جامع ہے۔ طیور کی زندگی میں "ہجرت" ایک بہت دلچسپ جزوِ حیات ہے۔ یہ ایک تحریک ہے جس میں وسعت، تنظیم اور تواتر قابلِ دید ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ موسمی تبدیلیوں کا اثر بالکل نمایاں ہے۔ انسانی عقل ایک زمانے سے اس پر دنگ ہے۔ قدیم زمانے میں تو بعض قبیلے اپنے کیلنڈر اسی سے بناتے تھے۔ ہم کو اس "نقلِ مکان" کی حقیقت پر غور کرنا ہے۔ لیکن اس کے قبل یہ جان لینا ضروری ہے کہ ارسطو کے زمانے میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ چڑیاں مثلاً گوریا، بلبل وغیرہ، جاڑے موسم میں مینڈکوں کی طرح معتدل خطّے میں بےحس و حرکت پڑی رہتی تھیں۔ اسی وجہ سے یہ چڑیاں سال کے کسی حصّے میں نظر آتی تھیں اور کسی حصّے میں غائب ہو جاتی تھیں۔

نقلِ وطن ایک عمل مبادلہ ہے۔ ایک نشیمن سے دوسرے نشیمن میں۔ لیکن یہ بات پرندوں، مچھلیوں، کیڑوں اور کچھ دیگر حیوانات ہی تک محدود ہے۔ وہ دراصل سال کے مختلف حصّوں میں مختلف جگہوں پر آباد ہو جاتے ہیں۔ پرندوں کا نقلِ وطن ایک موسمی تحریک ہے۔ جو اصولاً اُن کے تولیدی مقامات سے جو کہ عموماً سرد خطّوں میں ہوتے ہیں، نئے مقامات تک محدود ہے۔ یہ نئے مقامات بھی اُن کے لئے پرانے ہیں، اور یا لعموم گرم خطّوں میں ہوتے ہیں۔ اس لئے ہجرتِ طیور ایک ماحول کی تبدیلی ہے۔ جس سے چڑیاں مختلف سمتوں میں جاتی رہتی ہیں، اور جس کا مقصد ہر زمانے میں معتدل زندگی بسر کرنا ہے۔ ٹڈیوں کا دل بھی کبھی کبھی نکل پڑتا ہے۔ لیکن یہ نقلِ وطن نہیں ہے، بلکہ کثرتِ تعداد کا نتیجہ ہے۔ اس نقلِ مکان کی عادت کو علاوہ اور جانداروں کے ہم پرندوں میں اپنے کمال پہ پاتے ہیں۔

چڑیوں کے بدن کی حرارت یکساں رہتی ہے۔ موسمی تبدیلیوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی ساتھ اڑنے میں کوئی اور جاندار اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا عملِ ہجرت چڑیوں میں بہت بسیط ہے۔ سردی اور گرمی کا اثر اور جانداروں کے مقابلے میں پرندوں پہ کم ہوتا ہے۔ لیکن شدّت برف میں غذا کا حاصل کرنا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ ہجرت کی بنا پر چڑیاں ہر موسم میں نہایت ہی موزوں مقامات پر پہنچ جاتی ہیں۔ سب سے لمبا سفر ایک پرند (استرنا مکرورا) کرتی ہے۔ یہ ہر سال قطبین کا چکّر کرتی ہے اور تقریباً گیارہ ہزار میل ایک طرف کی راہ ہے۔

یہ ہوائی باشندے طرح طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بعض چڑیاں جیسے گوریّا ہر موسم میں وطن ہی میں رہتی ہیں۔ بعض چڑیا مثلاً بلبل گرم موسم میں ہجرت کرتی ہیں۔ بعض چڑیاں جاڑے کے زمانے میں وطن سے ہجرت کر جاتی ہیں۔ بعض چڑیاں نہ کسی جگہ پر نشیمن بناتی ہیں، نہ کسی جگہ قرینے سے نقلِ مکان کرتی ہیں، بلکہ یونہی گھوما پھرا کرتی ہیں۔ کچھ چڑیاں اس طرح کی بھی ہیں کہ اُن کے بعض افراد ہجرت کرتے ہیں اور بعض کہیں نہیں جاتے۔

نقلِ وطن کا وجدان دو وجہوں سے ہے۔ بیرونی ماحولی تبدیلی کا اثر جیسے موسم کی تبدیلی کے ساتھ دن رات کے وقتوں میں ردّوبدل، یا کوئی اندرونی تحریک ہو جو تولیدی اعضا کی صحت کے لئے ضروری ہو۔ ایسا متعامل چڑیوں میں اکثر دیکھا گیا ہے۔ اس عادت کی بنا پر بہت سی چراگاہوں اور تولیدی مقامات کا انکشاف ہوتا ہے جہاں پر چڑیوں کو غذا مل سکے اور اطمینان سے انڈے دے سکیں۔ چڑیوں کا مقرّرہ مقامات پر متواتر موسم کی تبدیلی کے ساتھ جانا، ان کی یادداشت اور ذہانت کا پتہ دیتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس عادت کی ابتدا کسی خطرے سے حفاظت یا کسی فائدے کے حصول کی بنا پر ہوئی ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حرارت کی تبدیلی اس

عمل کی اصل محرک ہے نسل بڑھانے کے فطری تقاضے کی وجہ سے چڑیاں دوبارہ اپنے وطن لوٹ جاتی ہیں ۔ اس طرح سے بعض بے کار، عمر رفتہ اور غیر ضروری چڑیاں ضائع ہو جاتی ہیں ۔ ہجرتِ وطن کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے ۔

یہ چڑیاں اپنی راہ میں مختلف بلندیوں پر اُڑتی ہیں ۔ تین سو سے دو ہزار میٹر تک کی عموماً پرواز ہوتی ہے ۔ بعض طیور مثلاً بگلے شب کو پرواز کرتے ہیں جس کی وجہ سے ایک ہزار میٹر سے زیادہ نہیں اُڑ پاتے ۔ تیز ہوا یا آندھی کا اس سفر میں بہت اثر پڑتا ہے ۔ اگر ہوا کا رُخ موافق ہو تو تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑنے والا پرند چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا سکتا ہے ۔ ورنہ اگر مخالف ہوا ہو تو بیس ہی میل کی رفتار ہو سکتی ہے ۔

صحیح راہ کا پتہ لگا لینا چڑیوں میں یا تو موروثی امر ہے یا پہاڑوں، وادیوں، ندیوں اور جزیروں وغیرہ سے اندازہ ہو جاتا ہے ۔ اگر ہم اُن خطرات کا اندازہ کریں جو دورانِ سفر میں درپیش ہو سکتے ہیں تو وہ اُن فوائد کے مقابلے میں جو نقلِ وطن سے حاصل ہوتے ہیں کچھ نہیں ہیں ۔ لیکن پھر بھی اکثر ایسی ہی تھکی ہوئی چڑیاں شکاریوں کے جال میں پھنستی ہیں ۔ بقول آتش

صیاد اسیرِ دامِ رگِ گُل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اُسے آب و دانہ کیا

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخالف آندھی کی وجہ سے مہاجر چڑیاں بہت نیچے آجاتی ہیں، اور غذا کی کمی، تھکن کی بنا پر منزلِ مقصود تک نہیں جا پاتیں ۔ راہ بھی بھول جاتی ہیں، اور بعض وقعہ کسی سمندر کو نہ عبور کر پانے سے اس میں غرق بھی ہو جاتی ہیں ۔ وہ تار، روشنی مینار وں سے بھی بہت نقصان پہنچتا ہے مثلاً راہ کا بھول جانا، اِدھر اُدھر بھٹک جانا وغیرہ ۔ ان خطرات کے باوجود نقلِ وطن میں بہت فوائد ہیں ۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ

عزّت اُسے ملی جو وطن سے نکل گیا
وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

جاڑے کی شدّت سے چڑیاں محفوظ ہو جاتی ہیں، اور معتدل موسم میں زندگی بسر کرتی ہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ جاڑے میں اکثر ابر کی وجہ سے آفتاب کم نکلتا ہے اور چڑیوں کو غذا حاصل کرنے میں جو تکلیف ہوتی، وہ اُس سے اس طرح بچ جاتی ہیں ۔ شدید سردی سے پانی جم جاتا ہے یا برف باری ہوتی، اُن سب سے چڑیاں محفوظ ہیں ۔ اس سفر سے چڑیاں مختلف مقامات پر منتشر ہو جاتی ہیں ۔ اس طرح رہائش کی تنگی نہیں ہوتی ۔ نئی منزلِ مقصود پر غذا کی فراوانی میسر ہوتی ہے ۔ حضرتِ انسان بھی اس عمل سے فائدہ حاصل کرتے ہیں ۔ اس سے موسمی تبدیلیوں کا نقشہ وغیرہ بنا لیتے ہیں ۔ ایسی بہت سی مہاجر چڑیاں چھوڑ دی جاتی ہیں اور اُن کے جسم میں ایک ہلکی مشین باندھ دیتے ہیں، اور جہاں جہاں چڑیاں جاتی ہیں وہاں وہاں کا پتہ نشان خود بخود درج ہو جاتا ہے ۔ اس طرح سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پرند سال میں کہاں کہاں گیا ۔

معلومات اور اعداد و شمار

۱ ۔ ۱۹۵۴ء میں ۱۲۰۷۰۲۹۵ ریڈیو سیٹ تیار کئے گئے اور ۱۹۵۳ء میں ریڈیو سیٹوں کی پیداوار ۱۲۳۱۲۱۵۶۱ تھی ۔ ان اعداد سے ۴۲۴ فیصدی اضافہ ظاہر ہوتا ہے ۔

۲ ۔ آسام میں دریائے برہم پتر کی وادی میں ناہور کاٹیا میں خام تیل کے روزانہ پانچ سو پیپے تیار کئے جاتے ہیں ۔

۳ ۔ آخر جنوری ۱۹۵۵ء تک ۴۱ ہزار بے گھر لوگوں کو ۹ کروڑ روپیہ بطور معاوضہ دیا گیا

۴ ۔ گذشتہ سال کے مقابلے میں ۱۹۵۴ء میں ۴۷ ہزار بائیسکلیں زیادہ تیار ہوئیں اور مجموعی پیداوار ۱۳ ۳۳۸۳ رہی ۔

۵ ۔ ۱۹۵۳ء میں ہندوستانی انشورنس کمپنیوں نے ہندوستان میں زندگی بیمہ کا جو نیا کاروبار کیا اس میں پالیسیوں کی تعداد ۵۳۵۰۰۰ رہی اور بیمہ کی رقم ۱۰۱ ارب ۳۷ کروڑ ۴۶ لاکھ روپے تھی ۔

کلیم سہسرامی

انڈونیشیائی شاعری میں آزادی کا تصوّر

جزائرِ شرق الہند جو عام طور پر ڈچ ایسٹ انڈیز کے نام سے مشہور تھا اسی کو اب جمہوریۂ انڈونیشیا کہتے ہیں یہ تقریباً تین ہزار جزیروں پر مشتمل ہے۔ جہاں تک غیر ملکی سامراج کے تسلّط کا تعلّق ہے ہندوستان اور انڈونیشیا کی تاریخ میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے باشندوں کی طرح انڈونیشیا کے باشندوں کو بھی ایک مدّت تک غلامی اور بیچارگی کی زندگی گزارنی پڑی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہندوستان پر انگریز حکمران رہے اور انڈونیشیا پر ولندیزی اپنا تسلّط جمائے رہے۔

صحت مند ادب اپنی سوسائٹی کا عکاس، اپنے ماحول کا ترجمان اور اپنے ملک کی سیاسی و معاشرتی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس لئے اس بات کا پتہ لگانے کے لئے کہ انڈونیشیائی شاعری میں آزادی کا تصوّر کس راہ سے آیا ہمیں وہاں کی سیاسی و سماجی زندگی کا جائزہ لینا ہوگا۔

جہاں تک تاریخ رہنمائی کرتی ہے ہمیں معلوم ہے کہ انڈونیشیا پر ولندیزیوں کا تسلّط تقریباً ساڑھے تین سو سال تک رہا۔ ولندیزی وہاں ۱۵۹۶ء میں آئے اور ۱۹۴۵ء تک وہ تمام مظالم روا رکھے جو استعمار پسند طاقتوں کا طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ لیکن وہاں کے عوام نچلے نہ بیٹھے اور برابر اپنی آزادی کے لئے برسرِ پیکار اور غلامی کا طوق اپنی گردن سے نکال پھینکنے کی کوشش کرتے رہے۔ صرف انیسویں صدی میں تینتیس ۳۳ مرتبہ انڈونیشی عوام نے ولندیزیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا لیکن ناکام رہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں قوم پرست تحریک شروع ہوئی اور ڈاکٹر سوئیکارنو کی قیادت میں انڈونیشی عوام نے ولندیزیوں کے خلاف عدم تعاون کی پالیسی اختیار کی۔ یہ پہلی منظّم کوشش تھی جس نے ولندیزیوں کی استعمار پسند طاقت کے دانت کھٹّے کر دئے۔ اور انھوں نے یہ محسوس کر لیا کہ اب ان کے قدم وہاں سے اکھڑ رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ انڈونیشی عوام میں آزادی کی جدوجہد نہ صرف زور پکڑتی گئی بلکہ ان کی تنظیم مضبوط بھی ہوتی گئی، چنانچہ ۱۹۲۸ء میں یونقد کانگریس نے نہایت منظّم طور پر "ایک قوم — ایک زبان" کا نعرہ بلند کیا، ان کی رگوں میں قومی جذبات موجزن تھے اور ان کے دلوں میں آزادی کی تڑپ تھی۔ یہ قوم پرست ادبی تحریک صرف انڈونیشیا تک محدود نہ تھی بلکہ یہ ایشیائی باشندوں کی ادبی انقلابی تحریک کی ایک شاخ تھی اور اس کا تعلّق براہ راست ایشیائی باشندوں کی اس تحریک سے تھا، جو نوآبادیاتی طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے شروع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر تقدیر علی شاہ بنّا نے ۱۹۳۳ء میں ایک ماہنامہ "پوجنگا بارو" (نوجوان اہلِ قلم) نکالا اور اس سے متعلق نوجوان اور ترقّی پسند اہلِ قلم کی ایک جماعت بنائی، ان میں قومی جذبہ اور ذہنی آزادی کی تڑپ پیدا کی اور بیداری کی روح پھونکی۔ تقدیر علی کی کوششوں سے ان نئے لکھنے والوں میں رفتہ رفتہ سماجی شعور بھی پیدا ہوتا گیا اور جدید ادب کی قدروں کی اہمیت بھی ان پر واضح ہوتی گئی۔ انھوں نے روایت پرستی اور رجعت پسندی کے خلاف منظّم طور پر صدائے احتجاج بلند کی اور پرانی ڈگر سے ہٹ کر اپنے ماحول اور زمانے کے مطابق نئی شاہراہ پر چلنا شروع کیا، چنانچہ ڈاکٹر تقدیر علی شاہ نے اپنے ایک بیان میں اس امر کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ "ہمیں یورپ، امریکہ اور جاپان کی پیش کی ہوئی مثالوں اور طریقوں پر عمل کرنا چاہیئے، جس کے ذریعے سے انھیں عصرِ حاضر میں عظمت و رفعت حاصل ہوئی، ہمیں پیچھے کی طرف مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ آگے کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے۔" — انڈونیشیا کے ہردل عزیز شاعر سمارو جو نے "آزادی کا گیت" میں اپنے ملک کو آزاد کرانے کا جو نعرہ بلند کیا ہے اس میں انڈونیشی عوام کے احساس کی شدّت اور قومی جذبے کی تڑپ نمایاں طور پر جھلک رہی ہے۔ ملاحظہ ہو "آزادی کا گیت":

ہم انڈونیشیا کے آزاد باشندے ہیں
ہم اپنے وطن کی آزاد سرزمین پر کھڑے ہیں۔

ہم بندوقوں کی گرج ہیں
آزادی کا استقبال کرتے ہیں
وہ دیکھو، ہمارے بہادر سپاہی لڑ رہے ہیں
وہ منزل کی سمت بڑھتے چلے جا رہے ہیں
ان کے جسم کٹ رہے ہیں
ان کا خون بہہ رہا ہے
وہ اپنی داستان سنہرے حرفوں میں لکھ رہے ہیں
ہمارے دلوں میں
ہمارے بازوؤں میں
یقینی فتح ہے
ہم وطن کو مضبوط اور بلند بنائیں گے۔

انڈونیشیا کی سیاسی تاریخ شاہد ہے کہ جوں جوں غیر ملکی تسلط کی گرفت مضبوط ہوتی گئی ویسے ویسے انڈونیشی فن کاروں کے لب و لہجہ میں شدتِ احساس، اسلوبِ فکر میں توانائی، خیالات میں بیداری، اور شعور میں پختگی پیدا ہوتی گئی۔ یہاں کے فن کاروں کو اپنی زبان سے والہانہ محبت ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۲ء میں جاپانی حملے کے بعد انڈونیشی زبان کے خلاف جو کچھ کیا گیا اس کے ردِ عمل کے طور پر وہاں —— "اپنی زبان بولو، انڈونیشی زبان بولو۔" کی تحریک شروع ہوئی۔ وقت کے تقاضے نے جاپانیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ انڈونیشی عوام کے مطالبات کو پورا کریں۔ لہٰذا جاپانیوں کے ایما سے ڈاکٹر سوئیکارنو، ڈاکٹر عطا، شرف الدین اور چند دوسرے مشہور اہلِ قلم پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن نے انڈونیشی زبان میں نئی اصطلاحات کا اضافہ کیا۔ یہاں تک کہ ۱۷۔ اگست ۱۹۴۵ء میں اعلانِ آزادی کے بعد انڈونیشی زبان ہی وہاں کی سرکاری زبان قرار پائی۔ یہ زبان عربی اور رومن دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ البتہ سترھویں صدی عیسوی میں اسلامی تسلط کے بعد یہاں عربی زبان مستعمل ہونے لگی، اس لئے کہ یہاں، تقریباً ۹۵ فیصدی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اقتدار کی منتقلی کے ساتھ انڈونیشیا کی تاریخ میں سیاسی و معاشرتی تبدیلیوں کا نیا باب شروع ہوا۔

انور انڈونیشیا کا مشہور انقلابی شاعر ہے۔ اس نے ۱۹۴۲ء میں اپنے دوستوں اور دوسرے فن کاروں کی ایک جماعت بنائی اور اس کا نام "جینگنگ" یعنی "دائرہ" رکھا۔ اس ادارے کی طرف سے فروری ۱۹۵۰ء میں جو منشور شائع ہوا اُس سے ان کے ادبی رجحان اور مقصد کی وضاحت بوجہ احسن ہوتی ہے۔ منشور سے اس بات کی بھی تشریح ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک انقلاب، وطنیت اور کلچر کا کیا مفہوم ہے۔ ملاحظہ ہو منشور:-

"ہم دنیا کے کلچر کے جائز طور پر وارث ہیں اور اس کلچر کو ہم اپنے طرزِ زندگی کے مطابق ترقی دیں گے۔ ہماری وطنیت، رنگ و نسل کے امتیاز کا نام نہیں ہے۔ ہمارا مقصد پُرانے کلچر کی تخلیقات کے خاکوں میں رنگ بھرنا اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہونا نہیں ہے، بلکہ نئے کلچرل زندگی کی طرف قدم بڑھانا ہے، جس کی بنیاد استوار ہے۔ انقلاب سے ہمارا مقصد زندگی کی ان قدروں کا تعین اور ارتقاء ہے جنھیں مجہول سمجھ کر پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ ہم فن کاروں کے فن اور عوامی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے ہیں —"

اسی انقلابی شاعر انور نے اپنی ایک نظم میں آزادی کا تصور اس طرح پیش کیا ہے:-

جب میرا وقت آئے گا
میں چاہتا ہوں کہ کوئی فریاد نہ کرے
یہاں تک کہ تم بھی نہ چیخو
اس کی ضرورت نہیں کہ تم میرے لئے آنسو بہاؤ
میں نہ صرف ایک جنگلی جانور ہوں
جو اپنی قیام گاہ سے نکال دیا گیا ہے
بندوقوں کی گولیوں کا زخمِ کاری مجھ پر لگے
اس کے باوجود میں گرجتا ہوا آگے بڑھوں گا
زہر اور زخم میرا پیچھا کریں گے
اور میں آگے بڑھتا رہوں گا
یہاں تک کہ ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں گی
مزید کوئی چیز میری راہ میں حائل نہ ہوگی
اور میں ہزار سال تک زندہ رہوں گا۔

انڈونیشیا کا دوسرا مشہور شاعر عبدالرواڈی ہے جو عام طور پر یوگی کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۴۹ء میں ولندیزی فوجوں کے جارحانہ اقدام کے دوران میں اس نے دو نہایت انقلاب آفریں نظمیں لکھیں۔ جن میں سے ایک کا عنوان "مرثیہ" اور دوسری کا "دو عالم کے درمیان" ہے۔ اس کی نظموں میں قومی استقلال اور آزادی کی جدوجہد میں پیامِ امید کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ — "ہم آج کی رات زندگی کی بازی لگا دیں گے جس سے آزادی کی صبح نمودار ہو گی۔

انڈونیشیا کے ایک اور شاعر سمارو جو نے "لہرائے جا پرچمِ انڈونیشیا" کے عنوان سے ایک کامیاب نظم کہی ہے۔ جس سے اس مضمون کے مقصد کی مزید وضاحت ہوتی ہے :-

اے سُرخ و سپید پرچم
لہرائے جا، لہرائے جا
تو جنگِ آزادی میں
ایک مضبوط قومی نشان تھا
لہرائے جا، لہرائے جا
اپنے چمکتے ہوئے اور باعزّت رنگوں کو
لہرائے جا، لہرائے جا
ساری دُنیا کے عوام کو
ہماری آزادی کے گیت
سُنائے جا سُنائے جا
لہرائے جا، لہرائے جا
اُن سے کہہ دے جو غلامی کو سہارا دیتے ہیں
ہم اب آزاد ہیں اور آزاد رہیں گے
ان سے کہہ دے جو امن و آزادی کے متوالے ہیں
ہم ان کے دوست ہیں
اے سُرخ و سپید پرچم
تو ہمارے قومی اتحاد کا شاہد ہے
جب وہ جدوجہد کر رہے تھے
جب وہ کامیابی کی طرف گامزن تھے
تو ہمارے بیٹوں کی قربانیوں کا شاہد ہے
جن کی بہادری بے مثال ہے
اپنے اجداد کا ملک حاصل کرنا
ہمارے لئے ابدی نعمت ہے
اے سرخ و سپید پرچم
لہرائے جا، لہرائے جا
ظلم اور خون کے دریا ہمیں نہیں دبا سکتے
اے پرچم ہم نے اپنے خون سے تجھے
یہ سُرخ رنگ بخشا ہے
ہماری پاک محبّت سے تجھے
یہ سپید رنگ ملا ہے
اے پرچم تو لافانی ہے
اگرچہ ہمارے جسم مردہ ہو کر فنا ہو جائیں گے
لہرائے جا، لہرائے جا
اے پرچم، اس وقت تو لہرائے جا
نہیں، تو ہمیشہ لہرائے جا
یہ سُرخ و سپید رنگ
ہمیشہ باقی رہیں
ان میں داغ نہ لگے
تو ہمیشہ نصب رہنا
لہرائے جا، لہرائے جا
تو صدیوں تک چمکتا رہے
تو ہماری قوم کے
پیدائشی حق،
انسانیت، تہذیب، تاریخ
اور تاج کا علمبردار ہے
اے پرچمِ انڈونیشیا
لہرائے جا، لہرائے جا

انڈونیشی شاعری مغربی ادب سے بھی متاثر ہوئی ہے - اور یہیں سے اس میں ترقی پسند عناصر داخل ہوئے ہیں - چناں چہ جہاں مواد میں تبدیلی ہوئی روائتی خیالات کی جگہ ترقی پسند خیالات نے لے لی، وہاں قدیم ہئیت میں بھی تغیر ہوا - اب انڈونیشی شاعری میں سانیٹ بھی لکھی جاتی ہے - اور آزاد نظم بھی، اس میں سادگی بھی پائی جاتی ہے اور صفائی بھی - فن کاروں کے لب و لہجے میں آزادی کے شدید احساسات کروٹ لے رہے ہیں - ان کے فن میں خلوص بھی جھلک رہا ہے اور وطن کی محبت کا والہانہ جذبہ بھی - ان کے ہاں صداقت بھی ہے اور مقصدیت بھی اور شاندار مستقبل کی جھلک بھی!

انڈونیشی شاعری کو ابھی اور ترقی کرنا ہے اور یہ انڈونیشیا کے شاعروں کا فرض ہے کہ اسے دوسرے ممالک کی شاعری کے مقابلے میں لاکھڑا کر دیں - جہاں تک پیشِ نظر مواد کا تعلق ہے ہمیں انڈونیشیائی شاعری کا مستقبل امید افزا نظر آتا ہے - آخر میں "انڈونیشیا کا قومی ترانہ" بھی سن لیجئے -

انڈونیشیا ہمارا وطن ہے
یہ ہماری پیاری ماں ہے جس سے ہم محبت کرتے ہیں
ہم یہاں زندہ ہیں، ہم یہاں کے باشندے ہیں
اور اپنی محبت بھری آنکھوں سے اس کو تکتے ہیں
انڈونیشیا ہماری قومیت ہے
ہاں، ہماری جان اور آبرو ہے
آؤ نغمے کا پیارا گیت گائیں
انڈونیشیا کے قومی ترانے کا حلقہ بنائیں
شاندار انڈونیشیا، شاندار انڈونیشیا
اے ہماری قوم، ہمارے وطن اور ہمارے سب کچھ
ہم تیری عزت اور عظمت کے گیت گاتے ہیں
ہم تیری خوبصورتی کو یاد کرتے ہیں -
تیری آزادی اور بڑائی کے لئے گاتے ہیں
کورس:- انڈونیشیا، انڈونیشیا، شاندار ملک، شاندار ملک
اے ہماری جان! اے ہمارے وطن انڈونیشیا !!
شاندار انڈونیشیا" "رایہ[1]"

---

[1] رایہ (قومی ترانہ)

باسط بھوپالی

غزل

شمعیں جلتی جائیں گی آنسو ڈھلتے جائیں گے
راہیں ملتی جائیں گی راہی چلتے جائیں گے

خون کی بوندیں دل بن جائیں یا ہوں نمایاں اشکوں میں
اصل و حقیقت ایک رہے گی نام بدلتے جائیں گے

سوزِ خزاں سے تابندہ ہے اپنی گلستاں اپنی بہار
نخلِ تمنّا جتنے جلیں گے اور بھی پھلتے جائیں گے

اے دیدۂ حیرت پھر ترا انجام تماشا کیا ہوگا
جب ذوقِ نظر کی تابش سے آئینے پگھلتے جائیں گے

ناہمواریٔ رہ کے ضامن ہیں ہموار نظر ہموار قدم
چلنے کا سلیقہ ہے جن کو ہر حال میں چلتے جائیں گے

کتنی صبحیں مٹ جائیں گی کتنی شامیں لٹ جائیں گی
جاگنے والے جاگ کے جب تک آنکھیں ملتے جائیں گے

لازم ہیں نظامِ نَو کے لئے نقّاش نئے فن کار نئے
تصویر یقیناً بدلے گی جب ہاتھ بدلتے جائیں گے

اپنی یک رنگی اے باسط رنگ یہ آتی جائے گی
رنگ بدلنے والے جتنا رنگ بدلتے جائیں گے

شری پادہ جوشی

جدید مراٹھی ادب

جو لوگ ہندوستان کی بہت سی زبانوں سے واقف ہیں اُن کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں بنگالی کے بعد مراٹھی ہی ایسی زبان ہے جو زمانے کے ساتھ برابر ترقی کرتی آ رہی ہے، اور جس کے ہر شعبے نے نئے نئے طریقے اور رجحانات اختیار کئے ہیں۔ بلکہ چند باتوں میں مثلاً ناٹک اور مزاح میں مراٹھی زبان بنگالی سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس بیان میں کچھ مبالغہ ہو۔ مگر ایک بات صاف واضح ہے کہ آج کی مراٹھی زبان اپنی ترقی کے لئے ہر طرف سے جد و جہد کر رہی ہے، زبان کی طاقت اگر اسی سے آزمائی جائے کہ اس میں ہر قسم کے مضمون کو ظاہر کیا جا سکتا ہے یا نہیں، تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مراٹھی زبان ہندوستان کی اُن طاقتور زبانوں میں سے ہے جو ہر قسم کے خیال اور جذبہ کو ظاہر کرنے کی صلاحیت اپنے میں رکھتی ہیں۔ اب ہم یہاں یہ دیکھیں کہ جدید مراٹھی ادب کے رجحانات اور خصوصیات کیا ہیں، اُس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ادب کے ہر شعبے کو الگ الگ لے کر اُن کی جانکاری حاصل کریں۔

ناول اور مختصر افسانے

مراٹھی میں سب سے زیادہ پیداوار اور کھپت ناولوں اور مختصر افسانوں کی ہے۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح مراٹھی نے بھی نئے ڈھنگ کا ناول اور افسانہ انگریزی زبان سے لیا ہے۔ جُوں جُوں انگریزی ناول اور افسانے کی ترقی ہوتی گئی مراٹھی میں بھی اُس کا عکس نظر آتا رہا۔ مراٹھی کے سب سے پہلے اور بڑے ناول نگار ہری نارائن آپٹے ہیں۔ جنھوں نے متوسط طبقے کے شہری عوام کی صحیح تصویریں اپنے ناولوں میں کھینچیں۔ اور اُس زمانے کے یعنی پچاس سال پہلے کے سماجی سوالوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کچھ اچھے تاریخی ناول بھی لکھے ہیں۔ اُن کے سماجی ناولوں میں "می" (میں) "پن لکشیات کون گھیتو" (لیکن کون دھیان دیتا ہے) وغیرہ بہت ہی زوردار اور مقبولِ عام و خاص ہیں۔ اُن کے ناول بے حد طویل اور ضخیم ہوتے ہیں مگر دلچسپ ایسے کہ ایک بار پڑھنا شروع کریں تو ختم ہونے تک کتاب کو رکھ دینے کو جی نہیں چاہتا۔ آج بھی اُن کے ناول بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

ہری نارائن آپٹے کے بعد ناتھ اور وِٹھل سیتا رام گُرجر نے ناول اور افسانے لکھے اور شری گُرجر آج تک لکھتے آ رہے ہیں۔ مگر وہ اپنی کوئی خاصیت پیدا نہ کر سکے۔ دس برس پہلے تک مراٹھی ناول نگاروں میں پروفیسر نارائن سیتا رام پھڑکے، وشنو سکھا رام کھانڈیکر اور گجانن ترمبک ماڈکھولکر بہت ہی مقبول تھے۔ یہ تینوں آج بھی ناول اور افسانے لکھتے ہیں۔ مگر وہ اب پُرانے ادیبوں میں گنے جاتے ہیں۔ اِن تینوں نے سماجی اور نفسیاتی مضمون پر ناول لکھے ہیں۔ لیکن اُن کا دائرہ متوسط طبقے تک ہی محدود ہے۔ اس واسطے اُن میں تکرار بہت پائی جاتی ہے۔ پھر بھی شری کھانڈیکر کے لکھنے میں گہرائی اور زندگی کے ساتھ وفاداری سب سے زیادہ ہے۔ اس لئے اُن کے ناولوں اور مختصر افسانوں کے ترجمے ہندی، گجراتی، کنڑ، تامل، تیلگو وغیرہ زبانوں میں بہت مقبول ہوئے۔ رومانی ناول نگاری میں پھڑکے اپنا ثانی نہیں رکھتے اور مسلسل پچیس سال تک درجنوں ناول لکھتے رہنے پر بھی آج بھی ان کے ناول پڑھنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ پھڑکے اور کھانڈیکر ناول و مختصر افسانوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے مختصر مضمون لکھنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اس قسم کے مضمون مراٹھی میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اور بڑے چاؤ سے پڑھے جاتے ہیں۔ ہندی، اردو، گجراتی زبانوں میں اس طرح کے مضمون بہت کم ملتے ہیں۔ ان کا مراٹھی نام لگھو نبندھ ہے۔ ماڈکھولکر صاحب نے زیادہ تر ناول ہی لکھے ہیں، اور آج کل ناگپور کے "ترون بھارت" نامی اخبار کے ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے وہ کلاسیکی ادب شاید ہی لکھ سکتے ہیں۔ اس زمانے میں اور بھی کئی افسانہ نگار ہو گئے جن میں یشونت گوپال جوشی، دِگھے، بوکیل، وامن چورگھڑے، لکشمن راؤ سردیسائی، بواکر وغیرہ مشہور ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کا

اپنا اپنا الگ طریقہ ہے اور اپنا اپنا رنگ ہے۔ یہ لوگ آج بھی لکھتے رہتے ہیں۔

اس طرح سنہ ۱۹۳۹ء تک مراٹھی ناول اور افسانے خوب ترقی کرتے رہے، مگر تب سے ۱۹۴۳ء تک یعنی تقریباً پانچ سال تک مراٹھی افسانہ نگاری میں ایک قسم کا جمود آگیا اور پُرانے ادیب ہی جو کچھ سوجھا لکھتے رہے۔ اس زمانے میں مراٹھی پڑھنے والوں کو ایسے محسوس ہوا کہ اب مراٹھی افسانہ نگاری کا چراغ گُل ہو جائے گا۔ مگر ۱۹۴۳ء سے مراٹھی میں نیا افسانہ اور ناول آنے لگا اور خوب آیا۔ اس کی خاصیت یہ رہی کہ وہ زندگی کے ساتھ زیادہ وفادار بن گیا۔ صرف متوسط طبقے تک محدود نہ رہ کر سماج کے ہر شعبے میں پہنچ گیا۔ سطحی باتوں میں پھنسنے کی بجائے زیادہ گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا اور پلاٹ کے بندھنوں سے آزاد ہوگیا۔ لیکن اگر اُردو افسانے سے مقابلہ کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ مراٹھی افسانہ اُردو افسانے سے پیچھے ہے۔ یعنی دس سال پہلے اُردو میں کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو نے جو نئی راہیں نکالیں، جو تجربات کئے وہی آج مراٹھی میں ہو رہے ہیں۔ اُس کی اچھائیوں کے ساتھ بُرائیاں بھی ہمارے یہاں آرہی ہیں اور نفسیاتی جذبات کو اُبھارنے والے فحش ادب کے گُن گائے جارہے ہیں۔ مگر چونکہ ہمارے مراٹھی افسانہ نگار اُردو سے ناواقف ہیں، اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے کچھ نئی ایجادیں کرلی ہیں۔

آج کل مراٹھی میں پلاٹ کی بہ نسبت تحلیل نفسی اور شعوری نفس کی بہ نسبت لاشعوری نفس کی حالت کو ظاہر کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس نئے طریقے کے بانیوں میں اِدند گوکھلے، گنگادھر گاڈگیل، پ۔ ب بھاوے اور وینکٹیش ماڈگولکر کے نام مشہور ہیں۔ اُن میں سے وینکٹیش ماڈگولکر نے مراٹھی میں ایک نیا اور زوردار طرز ایجاد کیا ہے۔ اُن کے افسانوں کو افسانہ کہنے کے بجائے قلمی تصویریں کہنا ہی ٹھیک ہوگا۔ اُن کے افسانوں کے دو مجموعے "ماندیشی مانسے" "اور گانوا کڑچیا گوشٹی" مراٹھی میں بہت مقبول ہوئے ہیں جن میں اُنھوں نے سماج کے غریب اور پچھڑے ہوئے لوگوں کی لفظی تصویریں کھینچی ہیں اور اُن کے ذریعے اونچے طبقے کے ظلم و ناانصافی کی طرف ناظرین کا دھیان کھینچا ہے۔ مگر وہ اس طرح کہ پڑھنے والوں کو اُس میں کسی قسم کے پرچار کی قطعی بُو نہیں آتی۔

ان چار لیکھکوں کے علاوہ د۔ ب۔ موکاشی۔ مانوس۔ سرانند دیگھے۔ گ۔ د۔ ماڈگولکر۔ د۔ ب۔ جوشی۔ کملا پھڑکے۔ کُسما دتی دیش پانڈے شانتا شیلکے۔ مہادیو شاستری جوشی۔ شانتارام وغیرہ افسانہ نگار بھی مشہور ہیں۔

آج کے مراٹھی ناول نے دوسری زبانوں کے ناول سے کچھ زیادہ ترقی کی ہے۔ سماج کے ہر طبقے کے سُکھ دُکھ اور سوالوں کو ناولوں کے ذریعے پیش کرنے میں آج کا مراٹھی ناول نگار اچھا خاصا کامیاب ہوا ہے۔ وِبھاوری شرودکر کے "بلی" بولنکر کے "سُنیتا" بودکر کے "بھاوین" اور پینڈسے کے "ایلگار" ناولوں نے مراٹھی ناول کو بہت اونچے درجے پر لا بٹھایا ہے۔ ان سب سے الگ طریقہ مرحوم سانے گوروجی کا ہے۔ مراٹھی میں سب سے زیادہ ناول اور افسانے ہی نہیں بلکہ دوسری قسم کی کتابیں بھی وہی پڑھی جاتی ہیں جو سانے گوروجی نے لکھی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ انھوں نے کوئی نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اُن کے لکھنے میں دل کی باتیں ہوتی ہیں جو پڑھنے والوں کے دلوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ مراٹھی میں اُردو کی طرح ترقی پسند ادیبوں کا کوئی الگ گروہ نہیں ہے۔ اور کمیونسٹ ڈھنگ سے سوچنے اور لکھنے والے ادیب بہت ہی کم ہیں۔

نظم

اب ہم مراٹھی نظم کی طرف آتے ہیں۔ یہ امر یاد رکھنے کے لائق ہے کہ مراٹھی میں سب سے کم بکنے اور پڑھا جانے والا ادب نظم ہے۔ یہاں شاعر کو وہ بلند رتبہ حاصل نہیں جو ہندی اور اُردو زبانوں کے شاعروں کو حاصل ہے۔ مراٹھی کے کئی رسالوں میں آپ کو ایک بھی نظم نہیں ملے گی۔ روزانہ و ہفتہ وار اخباروں میں تو نظمیں شاید ہی شائع ہوتی ہیں۔ بہت کم ماہنامے ایسے ہیں جن میں نظمیں چھپتی ہیں، اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو نظمیں پڑھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مراٹھی کی نظم پچھڑی ہوئی ہے یا ادنیٰ درجے کی ہے۔ برخلاف اس کے وہ بڑی تیزی سے ترقی کرتی جارہی ہے لیکن مراٹھی لوگوں میں نظموں کی بہ نسبت گیتوں میں دلچسپی زیادہ ہے۔ ایسے گیت جن میں معنی کچھ بھی نہیں ہوتے۔ اگر ہوں بھی تو بالکل معمولی جذبات پائے جاتے ہیں اور صرف الفاظ ہی الفاظ ہوتے ہیں۔ ایسے گیت لکھنے والوں کو ادیبوں میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ مگر ان کو شہرت اور پیسہ کافی مل جاتا ہے۔ لیکن جنھیں ہم ادبی نظمیں کہہ سکتے ہیں۔ اُس کی طرف عام لوگوں کا دھیان بہت کم جاتا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ پُرانے زمانے کے گیانیشور۔ تکارام۔ رام داس۔ ایکناتھ وغیرہ سنتوں کی مذہبی شاعری

عوام میں آج بھی بہت مقبول ہے ۔ اور لوگ بڑی شردھا سے اُسے پڑھتے ہیں ۔

نئی مراٹھی نظم کیشوسُت (۱۸۸۵ء) سے شروع ہوتی ہے جنھوں نے مذہبی اور نصیحتی ڈھنگ کی کوتا لکھنا چھوڑ کر انگریزی نظم کی پیروی کرکے مراٹھی میں نئی راہیں کھولیں ۔ چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات کو لے کر اُنھوں نے آسان زبان میں بڑی جان دار نظمیں لکھیں اور مراٹھی میں نظم معرّا کو رواج دیا ۔ ۱۹۲۰ء تک کیشوسُت کا اسکول چلتا رہا ۔ اُس کے بعد بھاسکر راؤ تامبے کا زمانہ شروع ہوگیا جس میں زبان کی صفائی اور ترنّم کی طرف خاص توجّہ دی گئی اور نظم میں گیتوں کی بھرمار ہونے لگی ۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب گانے کے خیال سے ہی نظم لکھی جانے لگی اور گانا ہی شاعری کی جان بن گیا ۔ آج بھی گانے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے ۔ مگر اعلیٰ مذاق کے ادیبوں میں اونچے درجے کی کوتا پسند کی جاتی ہے ۔ شری تامبے کے پیروؤں میں بورکر، لیشونت، مادھو جولین، گرتش، بی، انیل وغیرہ مشہور ہیں ۔

۱۹۴۵ء سے جدید نظم کا زمانہ شروع ہوتا ہے ۔ اس نظم نے پچھلے زمانے کے روحانیت کے خلاف بغاوت شروع کردی ہے اور ریلیزم کا جھنڈا کھڑا کرکے اشاریت کا چرچا گرم کیا ہے ۔ اس کے خلاف لوگوں کی سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ بہت مشکل ہے ۔ اُس میں نامہذّب الفاظ اور خیالوں کی بھرمار ہوتی ہے ، اور انگریزی لفظوں کا بیہودہ استعمال کیا جاتا ہے ، اس نئی نظم کے بانی شری مرڈھیکر ہیں ۔ اور اُن کے پیروؤں میں بھاوے ، وِندا کرندیکر ، مکتی بودھ وغیرہ شاعر ہیں ۔ ابھی چند روز پہلے شری مرڈھیکر کی نظموں کی وجہ سے بمبئی سرکار کی طرف سے اُن پر فحش نظمیں لکھنے کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا تھا ۔ مگر وہ اُس سے بری ہو گئے ۔ اس سے پتہ چلے گا کہ جدید نظم کا رُخ کس طرف ہے ۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ان نئے شاعروں کے علاوہ پُرانے ہی جانے والے شاعر بھی مراٹھی میں موجود ہیں ۔ اور اُن کی شاعری عام لوگوں میں بہت پسند کی جاتی ہے ۔ انھیں ہم رومانی شاعر کہہ سکتے ہیں ۔ اس رومانیت کے علم برداروں میں بورکر ، کُسماگرج ، انیل ، دیگے ، لیشونت ، باڈگولکر ، وسنت باپٹ ، منگیش پاڈگاؤں کر وغیرہ شاعر اور اِندرا سنجیبنا ، پدما ، شانتا شیلکے وغیرہ شاعرہ ہیں ۔

ڈرامہ

کہا جاتا ہے کہ مراٹھی میں فن ڈرامہ کی جتنی ترقی ہوئی ہے اُتنی دوسری کسی بھی ہندوستانی زبان میں نہیں ہوئی ہے ۔ مراٹھی کے کچھ ڈرامے تو اتنے اعلیٰ درجے کے ہیں کہ وہ آسانی سے دنیا کے بہترین ڈراموں میں شمار کئے جا سکتے ہیں ۔ بنگال میں اسٹیج کی کافی ترقی ہوئی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں ، مگر ادبی حیثیت سے مراٹھی ڈرامہ بنگالی ڈرامے سے کئی گنا آگے بڑھا ہوا ہے ۔ چند مراٹھی ناٹک اتنے زوردار اور جاندار ہیں کہ لگاتار پچھلے چالیس سالوں سے وہ اسٹیج پر کھیلے جا رہے ہیں ، اور آج بھی اُن میں لوگوں کی دلچسپی کم نہیں ہوئی ہے ۔ سینما کے اس زمانے میں بھی ہزاروں لاکھوں لوگ یہ ڈرامے دیکھتے ہیں اور اُن کا لطف اُٹھاتے ہیں ۔ ان ڈراموں میں کرلوسکر کا 'سوبھدرا' ۔ دیول کا 'شاردا' ۔ کھاڈیلکر کا 'مانا پمان' ۔ گڈکری کا 'ایک ہی پیالہ' ۔ وریرکر کا 'ستّے چے غلام' ۔ اترے کا 'ساشٹانگ نمسکار' ۔ ن ۔ چ ۔ کیلکر کا 'توتیا چے بنڈ' ۔ اور رانگنیکر کا 'کلودھو' ، ایسے ہیں جنھیں سیکڑوں بار دیکھنے پر بھی لوگ سیر نہیں ہوتے ۔ آج بھی ڈانگنے کر ، ماما وریرکر ، ننسر واڈکر ، اننت کانیکر ، ناگیش جوشی ، نانا جوگ وغیرہ کے ناٹک بڑے اونچے درجے کے ہوتے ہیں جس میں کسی نہ کسی موجودہ سوال کو لے کر اُس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہوئی ہوتی ہے ۔

مزاح

مراٹھی کا مزاحیہ ادب بھی کافی ترقی یافتہ ہے ۔ پُرانے زمانے کے مزاح لکھنے والوں میں گڈکری ۔ کولہٹکر ، اترے ۔ چ ۔ د ۔ جوشی ۔ شام راؤ اوک وغیرہ مشہور ہیں ، اور آج کل کے لکھنے والوں میں پ ۔ ل ۔ دیش پانڈے ۔ وتو باندیکر ۔ د ۔ م ۔ د ۔ پٹوردھن ، کیپٹن لیمئے وغیرہ نام بہت مقبولِ عام و خاص ہیں ۔ اصل میں ادب کے دیگر شعبوں کی بہ نسبت مزاح لکھنا بہت مشکل ہے ۔ چنانچہ اچھا اور اعلیٰ مزاح بہت کم پڑھنے کو ملتا ہے ۔ پھر بھی جب ہم دوسری زبانوں کے مزاحیہ ادب کے ساتھ مراٹھی مزاح کا مقابلہ کرتے ہیں تو مراٹھی کا مزاحیہ ادب بہت اونچے درجے کا معلوم ہوتا ہے ۔ مراٹھی میں واقعات کے ساتھ ہی

لفظوں سے تعلق رکھنے والا مزاح بھی کثرت سے ملتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ مراٹھی زبان کی باریکیوں اور خوبیوں سے واقف نہیں اُس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے اور اسی لئے دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

ترجمہ

مراٹھی بولنے والوں میں دوسرے ملکوں و زبانوں سے نئی نئی معلومات حاصل کرنے کا شوق بہت ہے۔ چنانچہ یہاں اچھے اچھے ترجموں کی مانگ ہمیشہ رہتی ہے، اور یہ ترجمے بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان سے مثلاً انگریزی، فرانسیسی، جرمن، پرتگالی، روسی، بنگالی، ہندی، اُردو زبان کے آج کے درجۂ اوّل کے افسانہ نگار کرشن چندر اور رانند ساگر کے ناول 'شکست'، 'اَن داتا' اور 'انسان مرگیا' کے مراٹھی ترجمے بہت مقبول ہوگئے ہیں۔ منشی پریم چند اور مہاشہ سدرشن کے افسانوں کو بھی مراٹھی ناظرین بہت پسند کرتے ہیں۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے مزاحیہ مضامین و افسانے اور سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عبّاس وغیرہ کی کہانیاں بھی مراٹھی میں شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ اقبال، چکبست، جوش ملیح آبادی وغیرہ جدید شاعروں کی شاعری کو اتنی ہی دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے جتنی دلچسپی سے میرؔ، غالبؔ، اکبرؔ اور نظیر اکبرآبادی، کو (یعنی اُن کی شاعری کے مراٹھی ترجمے کو) پڑھا جاتا ہے۔ بنگال کے ناول نگار شرت چندر چٹوپادھیائے کی تقریباً سبھی تصنیفیں مراٹھی میں آچکی ہیں۔ رویندرناتھ ٹاگور، نارائن گنگوپادھیائے اور نذرالاسلام کے ناولوں افسانوں اور نظموں سے مراٹھی بولنے والے اچھی طرح واقف ہوتے جارہے ہیں۔ اچھے ترجمے کرنے والوں میں ماما وریرکر اور و.گ. دیش پانڈے (بنگالی سے) ب.ب. بورکر اور ساتوسکر (پرتگالی سے) شری پاد جوشی اور و.پ. جوشی (اُردو سے)۔ و.و. ہڑپ اور مادھو منوہر (انگریزی سے) سوانند دیگے اور پرو ناتھ تھتے (ہندی سے) کے نام کافی مشہور ہیں۔

متفرق

ان کے علاوہ سوانح عمریاں، آپ بیتیاں، تنقیدیں، مکاتیب، تحقیق وغیرہ شعبوں میں بھی مراٹھی نے کافی ترقی کی ہے۔ خاص کر مراٹھی میں جتنا اچھا سیاسی ادب پیدا ہوتا ہے اُتنا دوسری کسی ہندوستانی زبان میں کم ہوتا ہوگا۔ گاندھی وادی، سماج وادی، کمیونسٹ، فرقہ پرست سبھی طرح کے لکھنے والے مراٹھی میں موجود ہیں۔ اُن میں آچاریہ ونوبھاوے، جاؤڈیکر، بھاگوت، مانے گروجی، گاڈگیل، ساورکر وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔ اگر اُردو سے مقابلہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ مراٹھی زبان نے نظم، مکاتیب، تذکرے اور تنقید میں اتنی ترقی نہیں کی ہے جتنی اُردو نے کی ہے، اور ان باتوں میں مراٹھی زبان اُردو سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ ناٹک (ڈرامہ) ناول اور مزاح کے بارے میں مراٹھی زبان اُردو کو بہت کچھ سکھا بھی سکتی ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ اب تک ہم نے ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کی قطعی کوشش نہیں کی ہے، اور اگر کسی کی بھی ہو تو وہ انگریزی کے ذریعے کی ہوگی۔ چنانچہ ہم زبان اور اُس کے بولنے والوں کی اصل رُوح تک پہنچ نہیں پائے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسری کے زیادہ نزدیک آکر اپنے گنجینۂ ادب کو مالامال کریں گی۔

شکر کی پیداوار اور ذخائر

وزارتِ خوراک و زراعت کا ایک پریس نوٹ مظہر ہے کہ اس فصل میں ۱۵ فروری ۱۹۵۵ء تک دانہ دار کھانڈ کی پیداوار ۸ لاکھ ۱۹ ہزار ٹن ہوئی اور ۲ لاکھ ۷۶ ہزار ٹن غیر ملکوں سے درآمد کی گئی۔

گذشتہ سال ان مدات کے اعداد و شمار علی الترتیب ۶ لاکھ ۸۷ ہزار ٹن اور ایک لاکھ ۳۹ ہزار ٹن تھے۔

اسی عرصے کے دوران میں ایک لاکھ ۸۹ ہزار ٹن کھانڈ کارخانوں سے باہر بھیجی گئی جب کہ گذشتہ سال اسی موسم میں ۳ لاکھ ۸۴ ہزار ٹن کھانڈ کارخانوں سے باہر بھیجی گئی تھی ـــــ ۱۵ فروری کو کارخانوں میں کھانڈ کا اسٹاک ۶ لاکھ ۸۷ ہزار ٹن تھا جب کہ پچھلے برس اسی تاریخ کو کارخانوں میں کھانڈ کا اسٹاک ۵ لاکھ ۳۳ ہزار ٹن تھا۔

پنچ سالہ پلان

نمبر ۷

گزشتہ سے پیوستہ

صنعت

س ۔ اس کا کیا سبب ہے کہ صنعت کے مقابلے میں زراعت پر بہت زیادہ خرچ کیا جائے گا ۔ کیا ترجیحات کی اسکیم میں صنعت کو اپنا موزوں مقام دیا گیا ہے ؟

ج ۔ ان کافی ذرائع کے علاوہ جو حفاظتی صنعتوں پر صرف کئے جا رہے ہیں پلان کی مدت کے دوران میں صنعت پر حکومت کا بالواسطہ صرف ۹۴ کروڑ روپے ہے ۔ اگر اس میں ہم چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا معدنی توسیع و ترقی کا اور بنیادی صنعتوں اور نقل و حمل کے لئے ۵۰ کروڑ روپے کی مزید مجموعی رقم کا بھی اضافہ کر دیں تو بھی یہ روپیہ ۱۵۰ کروڑ روپے تک پہنچ جاتا ہے ۔ اس کا اگر گورنمنٹ کے مجموعی مجوزہ اخراجات سے جو ۲۰۶۹ کروڑ روپے ہے مقابلہ کریں تو یہ بہت کم نظر آتا ہے ۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صنعت کے میدان کا زیادہ تر حصہ نجی کوششوں کے دائرے میں رکھا گیا ہے ۔ اور اس لئے صنعتی توسیع و ترقی کا بہت سا حصہ گورنمنٹ کے مجوزہ اخراجات کے دائرے میں شامل نہیں ہوتا ۔ گورنمنٹ کے پاس اتنے وسائل ہی نہیں ہیں کہ زراعت اور صنعت دونوں میں ساتھ ساتھ بھاری پیمانے پر روپیہ صرف کر سکے ۔ چنانچہ ترجیح زراعت کو ہی دی گئی ہے ۔ کیونکہ لوگوں کے لئے اناج کی مناسب فراہمی اور صنعتوں کے لئے کپاس اور جوٹ ایسے کچے مال کی فراہمی دوسرے حلقوں میں توسیع و ترقی کے لئے بنیادی شرط ہے ۔ اس کے لئے کاشتکاروں کی ایک بڑی اکثریت کے پاس مالی ذرائع ہی نہیں ہیں جس سے وہ زرعی پیداوار کو بڑھا سکیں ۔ اس لئے ٹھوس بنیادوں پر حکومت کی امداد ضروری ہے ۔ جبکہ صنعتی ماہرین اپنے ہی ذرائع سے کافی ترقی کر سکیں گے ۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ نجی حلقے میں صنعت کے لئے پرائیویٹ بچتوں سے کل ۶۱۳ کروڑ روپیہ مل سکے گا ۔ اس میں حکومت کی طرف سے بلاواسطہ اور بالواسطہ طور پر لگایا ہوا ۱۵۰ کروڑ روپیہ بھی شامل کر لیں تو میزان ۷۶۳ کروڑ روپے تک جا پہنچتا ہے ۔ یہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے اور پلان کی مدت کے دوران میں توسیع اور ترقی کے لئے جتنے ذرائع کے حاصل ہونے کی توقع ہے اس کا ۲۵ فیصدی ہے ۔

اس کے علاوہ یہ ذکر بھی کر دیا جائے کہ بجلی کی توسیع و ترقی پر جو بھاری خرچ کیا جا رہا ہے اس کا بھی ایک حصہ صنعتی توسیع و ترقی ہی کے لئے ہے ۔

س ۔ صنعتی توسیع و ترقی کے لئے کتنا روپیہ فراہم کیا گیا ۔ یہ روپیہ سرکاری اور نجی حلقے میں کس طرح تقسیم کیا گیا ہے ؟

ج ۔ پلان کی مدت کے دوران میں جس کے بڑے پیمانے کی صنعتی توسیع و ترقی پر صرف کرنے کی توقع ہے ۷۰۰ کروڑ روپیہ ہے ۔ اس میں وہ روپیہ شامل نہیں جو حفاظتی صنعتوں پر خرچ ہوگا اور وہ بھی شامل نہیں جو اس ۵۰ کروڑ روپے کی مجموعی رقم میں سے لیا جائے گا جو بنیادی صنعتوں اور ضمنی نقل و حمل کے لئے رکھا گیا ہے ۔ اس روپے میں سے ۹۴ کروڑ روپے جو گورنمنٹ سرکاری حلقے کی پراجیکٹوں پر خرچ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے ۔ اور باقی روپیہ ان ذرائع پر صرف ہوگا جو نجی کوششوں کے حلقے میں صنعتی توسیع و ترقی کے لئے درکار ہیں ۔

س ۔ صنعتی پیداوار اور مزید گنجائش کے نشانے کیا ہیں ؟

ج ۔ پلان کا مقصد یہ ہے کہ مزید گنجائش زیادہ تر بھاری مشینری اور روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کے صنعت کے میدان میں پیدا کی جائے ۔ جہاں تک روزمرہ کی استعمال کی اشیاء کی صنعتوں کا تعلق ہے موجودہ گنجائش اتنی ہے کہ اگر اسے پوری طرح استعمال کیا جائے تو اس سے موجودہ سطح کے استعمال

کی ضروریات بھی پوری ہو سکتی ہیں اور دوسرے ملکوں کو برآمد کرنے کے لئے فالتو مال بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے روزمرہ کے استعمال کے اشیاء کی صنعتوں میں وسعت اضافی طور پر کم اہمیت رکھتی ہے۔

جہاں تک چند بڑی صنعتوں کا تعلق ہے مزید گنجائش اور پیداوار کے نشانے مندرجہ ذیل ہیں۔

	یونٹ	۱۹۵۵-۵۶ء تک مزید گنجائش	۱۹۵۵-۵۶ء تک مزید پیداوار
۱- لوہا اور فولاد			
(۱) بھٹی میں تپا ہوا لوہا	۰۰۰ء ٹن	۱۷۵۷	۱۲۶۱
(ب) طیار شدہ فولاد	"	۶۳۵	۳۹۴
۲- سیمنٹ	۰۰۰ء ٹن	۲۰۲۶	۲۱۰۸
۳- پٹ سن کی بنائی ہوئی اشیاء	"	..	۳۰۸
۴- امونیم سلفیٹ	"	۴۰۲٫۶	۴۰۳٫۷
۵- المونیم	ٹن	۱۶۰۰۰	۸۳۰۰
۶- کاسٹک سوڈا	"	۱۸۴۰۰	۲۱۶۲۵
۷- سلفیورک ایسڈ	۰۰۰ء ٹن	۷۰	۱۰۱
۸- کھانڈ	"	۱۰	۳۸۰
۹- سوتی کپڑا			
(۱) تکلیاں	تعداد	۳۵۰۰۰۰	..
(ب) سوت	ملین پونڈ	۵۳	۴۶۱
(ج) مشین کا کپڑا	ملین گز	۳۵	۹۸۲
(د) کھڈی کا کپڑا	"	..	۸۹۰
۱۰- بائیسکلیں	۰۰۰ء ٹن	۴۱۰	۴۲۹
۱۱- مٹی کا تیل			
(۱) مٹی کے تیل کی مائع اشیا	ملین گیلن	..	۴۰۳
(ب) رال	۰۰۰ء ٹن	..	۳۷٫۵
۱۲- نیوز پرنٹ	۰۰۰ء ٹن	۳۰	۲۷٫۰

س- مختلف صنعتی پراجیکٹوں کی تکمیل کے فیصلے کے علاوہ جو اس وقت مرکزی اور ریاستی گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہے، پلان میں شامل شدہ صنعتی ترجیحات کی ترتیب کیا ہے؟

ج- متعدد پراجیکٹوں کی تکمیل کے علاوہ جو اس وقت مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے زیر عمل ہیں اور بعض حفاظتی صنعتوں کے قیام کے علاوہ صنعتی میدان میں ترجیحات مندرجہ ذیل تجویز کی گئی ہے۔

(۱) پروڈیوسر گڈس کی صنعتیں مثلاً پٹ سن، پلائی ووڈ اور روزمرہ کے استعمال کی اشیاء مثلاً سوتی کپڑا، صابن، کھانڈ، بناسپتی، پینٹ اور وارنشوں کی موجودہ گنجائش کا زیادہ سے زیادہ استعمال۔

(۲) پروڈیوسر اور بھاری صنعتوں مثلاً لوہا، فولاد، المونیم، سیمنٹ، کھاد، بھاری کیمیکل اور مشینی اوزاروں وغیرہ کی گنجائش میں وسعت۔

(۳) نئے کارخانوں کا قیام جو جہاں تک ذرائع اجازت دیں گے موجودہ خلا کو پر کر کے اور خامیوں کو دور کر کے یعنی کھریا مٹی سے گندھک پیدا کر کے اور مصنوعی ریشم کے لئے کیمیکل گودا پیدا کر کے صنعتی ڈھانچے کو تقویت دیں گے۔

س- سرکاری حلقے میں بڑے بڑے صنعتی پراجیکٹ کون سے ہیں اور ان پر کتنا خرچ آئے گا؟

ج- سرکاری حلقے میں صنعتی پراجیکٹ جن میں سے ہر ایک پر ایک ایک کروڑ روپے سے زیادہ خرچ آ رہا ہے۔ مندرجہ ذیل ہیں۔

زیر تکمیل پراجیکٹ	یکم اپریل ۱۹۵۱ء تک لاگت (روپے کروڑوں میں)	۱۹۵۱-۵۶ء کے دوران بجی لاگت (روپے کروڑوں میں)
۱- سندری فرٹیلائزر فیکٹری	۱۸٫۴	۹٫۰
۲- چترنجن کا ریلوے انجنوں کا کارخانہ	۱۰٫۲	۷٫۴
۳- انڈین ٹیلیفون انڈسٹریز	۱٫۲	۱٫۳
۴- میسور آئرن اینڈ سٹیل ورکس کی توسیع	۲٫۲	۲٫۸
۵- یو۔پی گورنمنٹ سیمنٹ فیکٹری	۱٫۵	۲٫۳
۶- نیپا ملز مدھیہ پردیش	۲٫۲۵	۲٫۰
۷- سرسلک لمیٹڈ	۳٫۸۱	۲٫۰
۸- مشین ٹول پروٹو ٹائپ فیکٹری	ابھی میسر نہیں	ابھی میسر نہیں
نئے پراجیکٹ	**۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء تک لاگت**	**مجموعی لاگت**
۹- لوہا اور فولاد	۳۰٫۰	۸۰٫۰

	۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء تک لاگت	مجموعی لاگت
۱۰- مشینی اوزاروں کی فیکٹری	۹٫۷۸	۹٫۷۸
۱۱- ہندوستان شپ یارڈ لمیٹڈ	۱۴٫۰۸	۱۸٫۱۵
۱۲- آل سٹیل انٹیگرل کوچ فیکٹری	۴٫۰۰	۴٫۰۰
۱۳- پنسلین فیکٹری	۲٫۱۱	۲٫۱۱
۱۴- ہندوستان کیبلز لمیٹڈ	۱٫۳۰	۱٫۳۰
۱۵- منڈی سالٹ ورکس	۱٫۰۰	۱٫۰۰
۱۶- نیشنل انسٹرومنٹس فیکٹری	۱٫۸۶	۱٫۸۶
۱۷- راڈر اور وائرلیس پراجیکٹ (ڈیفنس)	میسر نہیں	۷٫۰
۱۸- بجلی کا بھاری پلانٹ پراجیکٹ	۷٫۰۰	۲۸٫۰

(اس پر روپیہ پلان میں فراہم کی ہوئی
پچاس کروڑ کی رقم میں سے لگایا جائیگا)

س - کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان پراجیکٹوں کا انتخاب کسی حد تک ہی سہی موجودہ صنعتی ڈھانچے کے عدم توازن کو ٹھیک کرتا ہے؟

ج - جی ہاں! اس کی اہمیت اس سلسلے میں ضرور ہے - اگرچہ انتخاب کرتے وقت صرف اسی پہلو ہی کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا ہو - عدم توازن مکمل طور پر نجی اور سرکاری حلقے کی توسیع و ترقی ہی سے ٹھیک ہو سکتا ہے -

س - کون کون سی بڑی صنعتیں نجی کوششوں میں شامل کی گئی ہیں؟

ج - صرف ان صنعتوں کے علاوہ جو اپریل ۱۹۴۸ء کے انڈسٹریل پالیسی ریزولیوشن کے تحت صرف حکومت ہی کی توسیع و ترقی کے لئے وقف کر دی گئی ہیں - مثلاً اسلحہ اور بارود کی طیاری ایٹمی قوت کی پیداوار اور اس کا کنٹرول اور ریلوے ٹرانسپورٹ کے انتظام اور ملکیت کے علاوہ باقی تمام صنعتی میدان نجی کوششوں کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے - اگرچہ بعض اور صنعتوں مثلاً کوئلہ، لوہا اور فولاد، ہوائی جہازوں کی طیاری، سمندری جہازوں کی طیاری، ٹیلی فون، تار اور تار برقی کے آلات اور معدنی تیلوں کی طیاری میں حکومت ان کی توسیع و ترقی کے لئے ذمہ دار ہوگی - تاہم اس میدان میں پرائیویٹ کوششوں کے داخل ہونے کی گنجائش رکھی گئی ہے اور یہ گنجائش تعاون کی اس حد تک ہے جس حد تک حکومت ضروری خیال کرے - مثال کے طور پر مرکزی حکومت نے حال ہی میں نجی صنعت کاروں کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ معدنی تیلوں کی صنعت کو توسیع و ترقی دیں اور لوہے اور فولاد کی پیداوار کو بڑھائیں - اگرچہ ان دونوں میدانوں میں توسیع و ترقی کا کام حکومت کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے - بعض ایسے پراجیکٹوں کی حالت میں بھی جن کی توسیع و ترقی کا کام حکومت نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے - پرائیویٹ سرمائے کو حکومت کی طرف سے شرکت کی دعوت دی گئی ہے - اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈیفنس کی صنعتوں کو چھوڑ کر باقی صنعتی میدان مرکزی ضابطے اور کنٹرول کے تحت جیسا کہ ۱۹۵۱ء کے انڈسٹریز (ڈیولپمنٹ اینڈ ریگولیشن) ایکٹ میں موجود ہے، پرائیویٹ کوششوں کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے -

س - کیا نجی حلقے کو اس قدر آزادی دی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عوام کے سہارے دولت مند بنالے؟

ج - نہیں - اگرچہ صنعت کے میدان کا کافی حصہ نجی کوششوں کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے تاہم اس طرزِ عمل پر کچھ پابندیاں ہیں - انڈسٹریز (ڈیولپمنٹ اینڈ ریگولیشن) ایکٹ کی دفعہ ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ کے تحت مرکزی حکومت کو یہ اختیارات حاصل ہیں کہ وہ صنعتی کوششوں کے کام کاج میں باز پُرس کر سکے اور بعض حالات میں اس مقصد کے پیشِ نظر کہ نجی کوشش کا طریقۂ کار پنج سالہ پلان کے سماجی مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ رہے اور اس کی بنیاد قومی مفاد پر رہے - پرائیویٹ کوششوں کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے - اس کے علاوہ انڈین کمپنی ایکٹ میں بعض ترمیمیں بھی تجویز کی جا رہی ہیں تاکہ صنعتی نظام زیادہ سے زیادہ ایک ایسی خدمت کے معیاروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے - جو صنعتی توسیع و ترقی کے کام میں اپنا مناسب حصہ ادا کر رہی ہے -

س - کیا پلان اس بات کی بھی سفارش کرتا ہے کہ پرائیویٹ کوشش کو بڑے پیمانے کی صنعتی توسیع کے کام ہاتھ میں لینے کی تحریک کی جائے -

ج - ایسی صنعتوں کا قیام جن میں بڑے پیمانے پر روپیہ لگایا جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ روپیہ کروڑوں تک پہنچ جاتا ہے قدرتی طور پر حکومت سے امداد لینے کا تقاضا کرتا ہے - اگر یہ امداد نہ ملے تو ہو سکتا ہے کہ روپیہ لگانے والے کے دل میں ان کوششوں میں حصہ لینے کے لئے ضروری اعتماد ہی پیدا نہ ہو سکے - پلان میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اس امر کو یقینی بنانے کے لئے سرمایہ سب سے اونچی ترجیح کے مصرف کے لئے استعمال ہوتا ہے خاص محرکات کا ایک طریقہ ضروری ہو سکتا ہے - مثلاً رعایتی نرخوں پر بجلی کی فراہمی، کچے مال اور بھاری سامان پر درآمد کے ٹیکس میں مجرائی یا تحفظ کی یقین دہانی جیسا کہ پلان میں بیان کیا گیا ہے یہ محرکات "انفرادی حالت

کی ضروریات کے مطابق منصفانہ طریقے پر استعمال کئے جائیں۔

س۔ گزشتہ چند برسوں میں غیر ملکی سرمائے کی آمد بہت کم کیوں رہی ہے اور کیا اب مقابلتاً تیز بہاؤ کے لئے حالات پیدا کر دئے گئے ہیں؟

ج۔ کسی ملک کا سیاسی اور اقتصادی استحکام ٹیکس لگانے کی سطحیں اور پرائیویٹ کوششوں کے طرزِ عمل کے متعلق پالیسی ان چند عناصر میں سے ہیں جو کسی ملک میں غیر ملکی سرمائے کی درآمد کی رفتار مقرر کرتے ہیں۔ گزشتہ چند برس میں ہندوستان میں غیر ملکی سرمائے کی اضافی طور پر کم درآمد ہوتی ہے اس کی وجہ کسی حد تک ملک کی تقسیم اور آزادی سے پیدا ہونے والے سیاسی اور اقتصادی مستقبل کے متعلق غیر ملکوں میں محسوس کی جانے والی بے یقینی بھی ہو سکتی ہے۔ اب حال ہی میں انڈین آئرن اینڈ سٹیل کمپنی، کے لوہے اور فولاد کی پیداوار میں وسعت اور داموودر ویلی کارپوریشن کی بجلی کی توسیع و ترقی کی امداد کے لئے قرضے کے بارے میں جو کامیاب گفت و شنید ہوئی ہے اور مٹی کا تیل پیدا کرنے والے دنیا کے تین بڑے کارخانوں میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ ملک میں مٹی کا تیل صاف کرنے کی صنعت میں غیر ملکی سرمایہ لگایا جائے۔ تو یہ گویا اس امر کی جانب ایک اشارہ ہے کہ غیر ملکی سرمایہ دار کو اس ملک کے مستقبل کے متعلق اعتماد پیدا ہوتا جا رہا ہے کمیشن کی یہ سفارش کہ پلان کی مدت کے دوران میں موجودہ صنعتوں کو توسیع دینے کے کام کو کم ترجیح دی جائے اور حکومت کی طرف سے اس سفارش کو منظور کر لینا ایک اور سبب ہے جس کے باعث غیر ملکی سرمایہ کی درآمد کے لئے فضا سازگار ہو گئی ہے۔

وناسپتی تیلوں کی معیار بندی

انڈین اسٹینڈرڈ انسٹی ٹیوشن کی طرف سے حال ہی میں ارنڈی۔ گری۔ بنولہ۔ مونگ پھلی۔ سرسوں اور تل کے تیلوں کی معیار بندی کی تصریحات شائع کی گئی ہیں۔

بھارت میں مونگ پھلی۔ گری اور تل کے تیل ایک کثیر مقدار میں خام اور صاف شدہ حالت میں کھانے اور وناسپتی تیلوں سے نکلنے والی اشیاء کی تیاری میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ گری کا تیل مارجرین۔ سنگار کی اشیا اور صابن سازی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور گھی میں آمیزش پرکھنے کی غرض سے تل کا تیل وناسپتی کو رنگ دینے کے کام آتا ہے۔ ان تیلوں سے بہت سی ادویہ بھی تیار کی جاتی ہیں۔

بھارت میں سرسوں کے تیل کو خاص طور پر کھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس تیل کی دو حصوں میں درجہ بندی کرتے وقت اس میں چربی اور آرگیموں کی مقدار کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ کیونکہ آرگیموں کو آمیزش کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ سرسوں کا ادنیٰ قسم کا تیل اس معیار میں شامل نہیں کیا گیا۔

بھارت میں بنولوں کا خام یا غیر صاف شدہ تیل کھانے کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اسے صاف کر کے سلاد اور وناسپتی تیلوں کی تیاری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دھلے ہوئے بنولوں کا تیل صابن سازی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس تیل کی معیار بندی کرتے وقت تیل کے مختلف گریڈوں کا خیال رکھا گیا ہے اور خام بنولوں کا تیل اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

بھارت سے ارنڈی کا تیل ایک کثیر مقدار میں برآمد کیا جاتا ہے اور توقع ہے کہ سمندر پار ممالک اور بھارت کے صارفین کے لئے یہ معیار اس کی اچھائی کا ضامن ہوگا۔

رفتارِ زمانہ

فرقہ واریت ملک کی سب سے بڑی کمزوری ہے

ناگ پور میں بھارت سیوک سماج کے ایک بڑے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے کہا کہ اگر ہمیں بھارت میں سوشلسٹ طرز کا سماج قائم کرنا ہے تو ہم کو فرقہ واریت، ذات پات اور صوبائی تعصّب کو اپنے ذہنوں سے نکال دینا ہوگا۔ شری نہرو نے اس امر پر زور دیتے ہوئے کہا کہ فرقہ واریت اور ذات پات عہدِ ماضی میں بھی بھارت کی کمزوری کا باعث رہی ہیں، اور انھیں اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے ہمیں پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے اگر ہم ان کمزوریوں کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے تو ہماری آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اندرونی کمزوریوں کو دور کرنا ہم سب کا فرضِ اوّلین ہے۔ بھارت سیوک سماج کا ذکر کرتے ہوئے پردھان منتری نے کہا کہ بھارت سیوک سماج نے دیش کے تعمیری کام میں بہت بڑا حصّہ ادا کیا ہے اور جنتا میں تعمیری کاموں کے لئے ایک جذبۂ جوش پیدا کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس لئے ہم سب کو اس کی ترقّی کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے۔

بھارت اور کمبوڈیا کے مابین دوستانہ تعلقات

نئی دہلی میں بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو اور کمبوڈیا کے شاہزادہ نورودوم میں باہمی تبادلۂ خیالات کے بعد ایک مشترکہ اعلان جاری ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بھارت اور کمبوڈیا کی سرکاروں کا اس امر پر کُلّی اتفاق ہے کہ ہند چین کے متعلق جنیوا میں جو سمجھوتے ہوئے ہیں اُن پر پوری طرح عمل ہونا چاہیئے اور کمبوڈیا کی آزادی کی برقراری، اس کے استحکام اور وہاں کے عوام کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش ہونی چاہیئے۔ علاوہ ازیں بھارت سرکار نے کمبوڈیا سے آمدہ ایک وفد کو اس امر کا یقین دلایا ہے کہ وہ کمبوڈیا کو ہر وہ امداد دینے کے لئے تیار ہے جو اُس کے بس میں ہو۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ بھارت اور کمبوڈیا کے مابین سفارتی تعلّقات جلد از جلد قائم کر دئے جائیں۔

نیپال کے نئے مہاراجہ کی تخت نشینی، اور جنتا سے اپیل

نیپال کے چوبیس سالہ ولی عہد مہندر بیر بکرم شاہ دیو ۲ مارچ کو چار بجکر گیارہ منٹ پر نیپال کے تخت پر بیٹھ گئے اور اُن کے سر پر ہیروں سے جڑا ہوا تاج رکھ دیا گیا۔ راج گدی پر بیٹھتے ہی اپنے پہلے شاہی فرمان میں مہاراجہ نیپال نے نیپال کے لوگوں سے اپیل کی کہ اسٹیٹ کی از سرِ نو تعمیر میں تعاون کرنے کے لئے آپس میں متحد ہو جائیں۔ اس موقعے پر کمانڈر ان چیف نے اپنی تقریر میں سورگیہ مہاراجہ نیپال کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور نئے مہاراجہ کی وفاداری کا حلف لیتے ہوئے جنتا سے اپیل کی کہ وہ اپنے نئے تاجدار کو وفادارانہ تعاون پیش کریں۔

جاپان بھارت کے نقشِ قدم پر

جاپان کے وزیرِ اعظم مسٹر ایچیرو ہیٹویاما نے اعلان کیا کہ جاپان بھارت کے اصول "جیئو اور جینے دو" پر جہاں تک ہو سکے، عمل کرنے کی کوشش کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہم عالمی کشیدگی کو کم کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اگر پانچ اصولوں پر عمل درآمد کے عالمی امن کو حاصل کیا جا سکے تو نہایت بہتر ہے۔ ہم پنچ شیلا کے اصول پر غور کر رہے ہیں۔ جاپانی وزیرِ اعظم نے یہ بھی کہا کہ موجودہ وقت میں عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ امن طاقت کے ذریعے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جاپان کے لوگ دوستی اور باہمی رواداری کے ذریعے سے مستقل امن کے خواہش مند ہیں۔

عرب اور غیر عرب ممالک کے فوجی معاہدے سے مصر کا اختلاف

مصر کے نیشنل گائیڈینس کے وزیر میجر سلیم نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ مصر عرب اور غیر عرب دیشوں کے درمیان فوجی گٹھ جوڑ کی برابر مخالفت کرتا رہے گا۔ آپ نے کہا کہ مصر عرب ممالک کے بارے میں اپنی کوئی تبدیلی نہیں کرے گا اور یہ پالیسی عرب ممالک کی یکجہتی اور غیر ممالک کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ نہ کرنے پر مبنی ہے۔

بھارت میں غلّے کی افراط

بھارت کے وزیرِ خوراک سٹری اجیت پرشاد جین نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ بھارت کے طول و عرض میں گیہوں کی علاقائی نقل و حرکت پر رہی سہی پابندیاں بھی فی الفور ختم کر دی گئی ہیں اور اب بمبئی اور کلکتے کے شہروں میں بھی آٹا پیسنے والے کارخانوں کو عام اجازت ہو گئی ہے کہ وہ کھلی مارکیٹ سے دیسی گندم خرید سکیں۔ وزیرِ خوراک نے ہاؤس کو یہ بھی بتایا کہ امسال راجستھان، پنجاب، پیپسو اور اُتر پردیش کی فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ ہند کور ڈکن کے سوال پر سٹری جین نے کہا کہ جہاں گیہوں کا بھاؤ دس روپے فی من سے بھی کم ہے وہاں حکومت خود دس روپے فی من کے بھاؤ گندم خریدنے کے سوال پر غور کر رہی ہے۔

سندھ چیف کورٹ کے خلاف اپیل منظور

پاکستان فیڈرل کورٹ کے فل بنچ نے مولوی تمیز الدین خاں کے دائر کردہ کیس میں سندھ چیف کورٹ کے فیصلے کے خلاف حکومت پاکستان کی اپیل منظور کر لی ہے۔ سندھ چیف کورٹ نے مولوی تمیز الدّین صدر پاکستان آئین ساز اسمبلی کی درخواست پر آئین ساز اسمبلی کو توڑنے کے متعلق گورنر جنرل پاکستان کے حکم کو ناجائز قرار دیا تھا۔ پاکستان بھر میں فیڈرل کورٹ کے اس فیصلے پر اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کا روشن مستقبل

ریاست جموں و کشمیر کے وزیر خزانہ سٹری گردھاری لال ڈوگرہ نے سال ۵۶-۱۹۵۵ء کا جو بجٹ پیش کیا ہے اُس کی تمام حلقوں میں تعریف کی جا رہی ہے۔ بجٹ کا سب سے قابلِ تعریف پہلو یہ ہے اُس میں ریاست کے لوگوں پر کوئی نیا ٹیکس عائد نہیں کیا گیا۔ بجٹ کے مطابق اس برس ریاست کی کل آمدنی ۵ کروڑ ۸۲ لاکھ ۶۲ ہزار ہو گی جو سالِ رواں کی ترمیم شدہ آمدنی سے بقدر ۲۰ لاکھ ۸۹ ہزار زیادہ ہے۔ خرچ کا اندازہ ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ۲۲ ہزار ہے۔ بجٹ کو پنج سالہ پلان پر خرچ کیا جائے گا۔

بھارت اور امریکہ کے درمیان دوستی ضروری ہے

بھارت میں امریکہ کے نامزد سفیر مسٹر جان کوپر نے بھارت روانہ ہونے سے پیشتر کہا کہ وہ بھارت اور امریکہ کے تعلّقات کو مزید بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے انھوں نے مزید کہا کہ پریذیڈنٹ آئزن ہوور اور وزیر خارجہ دونوں کی یہ رائے ہے کہ دنیا کے ممالک میں بھارت کی اہمیت بہت اہم ہے۔ امریکہ اور بھارت دونوں جمہوری ممالک ہیں اس لئے سنسار کی شانتی کے لئے ہر دو ممالک کے درمیان اچھے تعلقات قائم رہنے نہایت ضروری ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر کا بھارت سے مکمل الحاق

کل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری غنی عبدالرشید نے اس بات کو پھر دہرایا ہے کہ کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق ہر لحاظ سے مکمّل ہے اور ریاست کی نمائندہ جماعت آئین ساز اسمبلی نے کشمیری عوام کے جذبات کی صحیح طور پر ترجمانی کرتے ہوئے اس فیصلے پر مہرِ تصدیق ثبت کر کے اپنا راستہ ہمیشہ کے لئے صاف کر لیا ہے۔ موجودہ حکومت کے ترقّی پرورانہ اقدامات کی تعریف کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ تھوڑی سی مدّت میں ہی ہماری نئی حکومت نے ریاستی عوام کی معاشی اور اقتصادی حالت کو سدھارنے کے لئے جو قدم اُٹھائے ہیں جنتا اُن سے پوری طرح مطمئن ہے اور انتہائی جوش و خروش سے گورنمنٹ کے تعمیری کاموں میں ہاتھ بٹا رہی ہے۔

امریکہ میں اُردو کی تعلیم کا انتظام

امریکہ میں ایشیائی زبانوں کو سیکھنے میں عوام کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں کے اس شوق کے پیشِ نظر سینٹ باربرا کالج واشنگٹن اور کیلی فورنیا یونیورسٹی میں امسال موسمِ گرما سے اُردو کی تعلیم کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں امریکہ میں بھارت کی تاریخ سیاست اور تہذیب و تمدّن کے مطالعے کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے۔

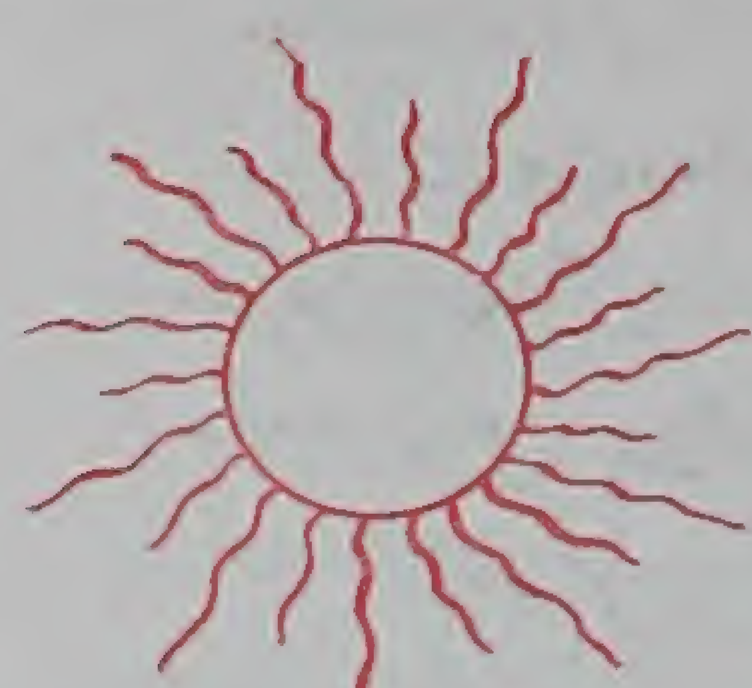
جرمنی کی جدید اسلحہ بندی کے لئے فرانس کا اتفاق

جرمنی کی از سرِ نو اسلحہ بندی کے سوال پر ایک عرصے سے کھینچا تانی چلی آ رہی تھی۔ امریکہ اور برطانیہ نے کئی مرتبہ اسے اس مسئلے پر رضا مند کرنے کی کوشش کی لیکن فرانس اسے اپنے لئے زندگی اور موت کا سوال سمجھتا تھا۔ کئی وزارتیں بنیں اور بگڑیں مگر یہ اُلجھن حل نہ ہوئی۔ اس دفعہ بھی کچھ کہنا مشکل تھا کہ فرانس کی سینیٹ میں اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ لیکن روس کے وزیرِ اعظم بلگانن کی طرف سے چار بڑی طاقتوں کی کانفرنس میں شامل ہونے پر اظہارِ رضا مندی اور فرانس کے وزیرِ اعظم کی زبردست اور پُر از دلائل تقریر نے پانسہ پلٹ دیا اور سینیٹ نے بھاری کثرتِ رائے سے جرمنی کی از سرِ نو اسلحہ بندی کے حق میں فتویٰ دے دیا۔ اس سلسلے میں امریکہ اور برطانیہ نے فرانس کو یقین دلا دیا تھا کہ جونہی فرانس جرمنی کی اسلحہ بندی کے حق میں فیصلہ دے گا تین بڑی طاقتیں اصولی طور پر روس کے ساتھ گفت و شنید کرنا منظور کر لیں گی۔ فرانس کو یہ بھی یقین دلا دیا گیا تھا کہ اُس کی شمولیت کے بغیر کسی طرح کی بات چیت شروع نہ ہو گی۔



بچوں کا آج کل





گرمی

اظہار ملیح آبادی





لو پھر گرمی کی رُت آئی
سُورج نے اگنی برسائی
دھرتی کے مُنہ پر ہے پسینہ
ایک برس ہے ایک مہینہ
دریا پیاسے ندیاں پیاسی
پربت کے مُکھڑے پہ اُداسی
ہانپ رہے ہیں کھیت اور میلے
اُجڑے رستے سُونی گلیاں
گائیں بھینسیں بیل اور خچّر
سب کو جینا ہو گیا دوبھر
اُتر گئے پیڑوں سے جھُولے
پنچھی باغ کا رستہ بھُولے
ہریالی نے ناتہ توڑا
باغ نے پہنا پیلا جوڑا
سوکھی شاخیں ڈول رہی ہیں
پیلے پتّے رول رہی ہیں
ملّاحوں نے پاؤں پسارے
سوکھ گئے ندیوں کے کنارے
پربت سے وہ آندھی اُٹھ کر
تان رہی ہے لُو کی چادر
گرمی کا اب پارہ ہے
ہر ذرّہ اک انگارہ ہے
دل پر ایسی سُستی چھائے
بیٹھے بیٹھے نیند آجائے
گرمی تو آتی ہی رہے گی
آآ کر جاتی ہی رہے گی

ہم کیوں اپنا وقت گنوائیں
آؤ اب اسکول کو جائیں



شبیر بن امام

کسان کی عقل مندی

ایک دفعہ کسی تہوار کے موقع پر کچھ کسان بیٹھے آپس میں بات چیت کر رہے تھے - اتنے میں گاؤں کا ایک دوکاندار بھی وہاں آ پہنچا اور لگا ڈینگوں کی ہانکنے -

میں یہ ہوں اور میں وہ ہوں اور میں تو جاگیردار کے مہمان خانے میں ہو آیا ہوں -

اس کی یہ بات سُن کر ایک سب سے غریب کسان نے اس پر طعن کیا بڑا کمال کیا کہ جاگیردار کے مہمان خانے میں ہو آئے! میں اگر چاہوں تو جاگیردار کے ہاں دعوت اُڑا سکتا ہوں -

دُکان دار کو یہ بات بُری لگی اور اس نے تاؤ میں آ کر کہا -

ارے تم! اور جاگیردار کے دستر خوان پر کھانا کھاؤ! میں یہ کبھی نہیں یقین کر سکتا -

غرض کہ بڑی دیر تک تکرار ہوتی رہی - آخر غریب آدمی نے کہا - میں شرط لگاتا ہوں کہ جاگیردار کے ساتھ کھانا کھا کر دکھلا دونگا - تم اپنی کالی اور چھوٹی گھوڑی بازی پر لگاؤ - اگر میں شرط ہار گیا تو تمہارے ہاں تین برس نوکری کروں گا اور ایک کوڑی بھی نہ لونگا

دکان دار کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا -

مجھے یہ شرط منظور ہے - میں تمہیں دو گھوڑیوں کے علاوہ ایک بچھڑا بھی دونگا - میں سب لوگوں کے سامنے قول دیتا ہوں - یہ سب گواہ ہیں -

چنانچہ شرط لگ گئی اور گواہ بھی ہو گئے -

غریب کسان اب جاگیردار کے ہاں گیا اور بولا

"حضور - میری ٹوپی کے برابر کچے سونے کے ڈلے کی کیا قیمت ہوگی؟

جاگیردار نے کوئی جواب نہیں دیا - اس نے تالی بجا کر نوکر کو بُلایا -

"جلدی جا کر کچھ کھانے پینے کو لے آؤ - آج ہم اس دہقان کے ساتھ کھانا کھائیں گے" - پھر وہ اس سے مخاطب ہوا -

"بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ - تکلف کی کوئی ضرورت نہیں - جی بھر کے کھاؤ"

غرض اس طرح کسان کی بڑی آؤ بھگت اور خاطر مدارات ہوتی - جاگیردار سونے کا ڈلا حاصل کرنے کے لالچ میں مرا جا رہا تھا -

اچھا تو میرے دوست اب جلدی کرو - کہاں ہے وہ کچے سونے کا ڈلا - جلدی نکالو - تمہیں کچھ روپے مل جائیں گے -

"لیکن میرے پاس تو سونا ہے نہیں! میں نے تو صرف اتنا پوچھا تھا کہ میری ٹوپی کے برابر کچے سونے کے ڈلے کی کیا قیمت ہوگی؟

جاگیردار کی آنکھ غصے سے سُرخ ہو گئی - اس نے جھڑک کر کہا -

نکل جا یہاں سے بے وقوف کہیں کا -

غریب کسان ہنسنے لگا - واقعی میں بڑا بے وقوف ہوں کہ ابھی آپ نے مجھے اپنا عزیز ترین مہمان بنا کر دعوت کھلائی اور اب اس دعوت کے کے بدلے دکاندار مجھے دو گھوڑیاں اور ایک بچھڑا دے گا"

اور کسان بڑا خوش خوش واپس چلا گیا -

اطہر پرویز

سانچ کو آنچ نہیں

ایک لکڑہارا اور اس کی بیوی جنگل میں رہتے تھے۔ ان کے ایک چھوٹی لڑکی تھی جو بہت خوبصورت تھی۔ لیکن لکڑہارا بہت غریب تھا۔ بڑی مشکل سے گزر بسر کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے کئی کئی روز فاقے کرنے پڑتے تھے۔ ایک دن جب وہ بہت پریشان تھا تو ایک پری اس کے پاس آئی اور بولی۔ دیکھو تم بہت غریب ہو اگر تم چاہو تو لڑکی مجھے دے دو۔ میں اس کی پرورش اپنے بچے کی طرح کرونگی اور اس کے بدلے میں تم کو ایک ہزار اشرفیاں دوں گی —" لکڑہارا طیار ہو گیا اور اس نے ایک ہزار اشرفیاں لے کر وہ لڑکی پری کے حوالے کردی۔ پری اسے پرستان میں لے گئی۔ اس نے اس لڑکی کا نام رخسانہ رکھا۔ پرستان کیا تھا جنّت کا نمونہ تھا۔ عیش و آرام کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ رخسانہ کو اس پرستان میں رہتے رہتے پندرہ برس گزر گئے۔ اب رخسانہ بڑی ہو گئی اور پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت۔ ایک دن پری کہیں جانے لگی تو اس نے اپنے مکان کے تمام کمروں کی کنجیاں رخسانہ کے حوالے کر دیں اور کہا کہ اس مکان کے ہر کمرے کو کھول سکتی ہو لیکن بس آخری کمرہ ہرگز نہ کھولنا۔

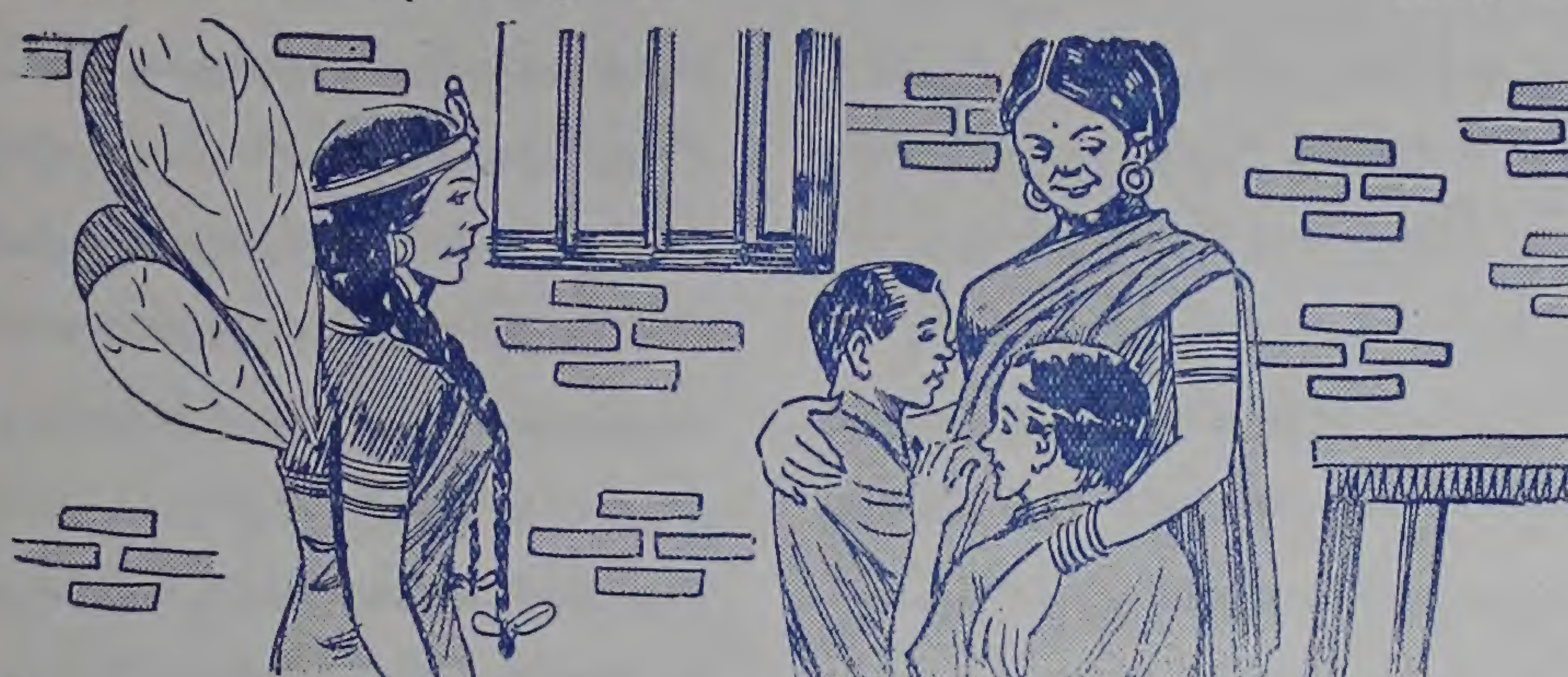
پری کے جانے کے بعد اس نے ایک ایک کمرے کو کھول کر دیکھا لیکن آخری کمرے تک جا کر وہ رک گئی۔ اور کئی روز تک اس کے اس کمرے کو اسی طرح رہنے۔ لیکن ایک دن اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس کمرے کو کھول کر دیکھوں پری کو کیا پتہ چلے گا کہ میں نے اسے کھولا ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اس نے ہمّت کر کے اسے کھول ڈالا۔ لیکن جیسے ہی کھولا اس میں سے آگ کی لپٹیں نکلیں ایک لپٹ تو اس کی انگلی میں بھی لگی۔ اس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ اور دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا لیکن اس نے اپنی انگلی میں جلنے کے بجائے ایک سونے کا چھلّا دیکھا۔ اب رخسانہ جتنا اس کو اتارنے کی کوشش کرتی اتنا ہی وہ اور کستا۔ ایک دن بعد پری بھی آ گئی۔ اس نے آتے ہی رخسانہ سے پوچھا "بیٹی تم نے آخری کمرہ تو نہیں کھولا"؟

رخسانہ نے کہا "نہیں"

پری نے دوبارہ پوچھا اور پھر بھی اس نے یہی جواب دیا یہاں تک کہ تیسری بار پوچھنے کے بعد بھی اس نے یہی جواب دیا۔ اس وقت پری کی نظر رخسانہ کی انگلی پر پڑی اور اس نے کہا۔ "رخسانہ تم نے کمرہ ضرور کھولا۔ یہ سونے کا چھلّا اس کی پہچان ہے۔ اب بھی سچ سچ بتا دو۔ لیکن رخسانہ بھلا کب ماننے والی تھی۔ اس نے پھر بھی یہی کہا "میں نے نہیں کھولا"۔



اب تو پری کو بہت غصّہ آیا - اور اس نے سارے کپڑے چھین لئے اور اسے جنگل بیابان میں چھوڑ دیا - رخسانہ نے اپنے بالوں سے اپنے جسم کو لپیٹ لیا - اتفاقاً اسی روز وہاں ایک بادشاہ شکار کے لئے اس جنگل میں آیا تھا - اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکی اپنے بالوں میں لپٹی ہوئی بیٹھی ہے - اس نے کبھی ایسی لڑکی نہ دیکھی تھی - وہ اسے اپنے محل میں لے آیا اور اس سے شادی کر لی - ایک سال کے بعد اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا - اگلے دن وہی پری آئی - اور اس نے رخسانہ سے وہی سوال کیا - رخسانہ سچ بتا دو - تم نے وہ کمرہ کھولا" -



رخسانہ نے پھر وہی جواب دیا - جو اس سے پہلے کئی بار دے چکی تھی - پری ناراض ہو کر بچے کو اٹھا کر لے گئی - اگلے روز سارے شہر میں کہرام مچ گیا لیکن یہ کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ بچہ کہاں گیا -

ایک سال بعد پھر ملکہ رخسانہ کے ایک اور لڑکا پیدا ہوا اور اس بار پھر رات کو وہی پری آئی اور اس نے وہی سوال کیا - رخسانہ نے اپنی عادت کے مطابق وہی جواب دیا - پری اس بچے کو بھی غصّے میں آ کر اٹھا لے گئی - اب تو یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی - لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ملکہ آدم خور ہے لیکن بادشاہ پھر بھی اس سے محبت کرتا تھا - اس پر کوئی اثر نہ پڑا -

تیسرے سال رخسانہ کے پھر ایک لڑکی پیدا ہوئی - اس بار پھر وہ پری آئی - اس نے کمرے کے بارے میں وہی سوال کیا - رخسانہ نے جھنجھلا کر کہا - میں نے دروازہ نہیں کھولا - یہ جواب سن کر پری اس لڑکی کو بھی اٹھا کر لے گئی -

اگلے روز یہ خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی - اب تو بادشاہ کو بھی یقین ہو گیا کہ یہ عورت ضرور آدم خور ہے اور اس نے حکم دے دیا کہ رخسانہ کو زندہ جلا دیا جائے - چنانچہ لکڑی کے ایک ڈھیر پر رخسانہ کو بٹھا دیا گیا - اور نیچے آگ لگا دی - لیکن جیسے ہی آگ لگی' اس نے سوچا کہ واقعی میں نے غلطی کی - کاش وہ پری مجھے اب مل جاتی تو میں اس سے سچ سچ کہہ دیتی کہ میں نے دروازہ کھولا تھا - اور جیسے ہی اس نے یہ سوچا' چاروں طرف بادل آ گئے اور خوب زوروں سے بارش ہوئی اور اسی میں پری آ موجود ہوئی - اس کے پیچھے دونوں بچے تھے اور گود میں لڑکی - پری نے خوش ہو کر وہ بچے اس کے حوالے کر دئے - اور سچ بولنے پر اسے پیار کیا - اور رخسانہ اپنے بچوں کو پا کر بے حد خوش ہوئی -

رتن سنگھ شاہی

شہد کی مکھیاں

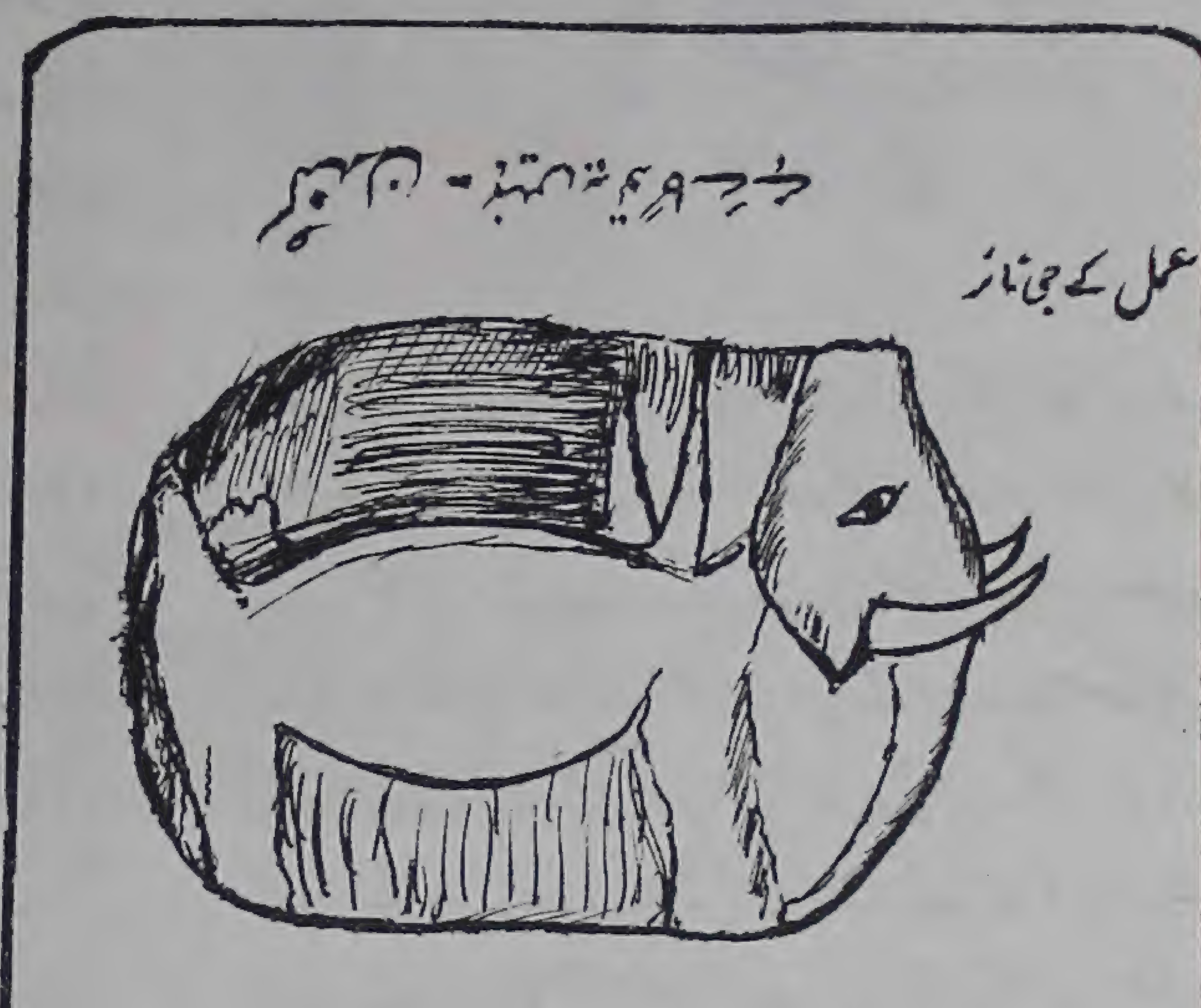
پیارے بچو! اس مضمون میں تمھیں شہد کے فوائد اور شہد کی مکھیوں کا مکمل حال بتایا جائے گا۔ یہ تو تم سب کو معلوم ہی ہوگا کہ شہد کی مکھی جہاں ایک چھوٹی سی مخلوق ہے وہاں اس میں زہریلا مادہ بھی ہے۔ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے درختوں خصوصاً پیپل اور بڑ کے درختوں پر شہد کی مکھیوں کے بڑے بڑے چھتّے لگے ہوتے ہیں۔ جن پر مکھیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔ تم میں سے بعض بچے مکھیوں کے ان چھتّوں پر کنکر پھینکتے ہیں جس سے مکھیاں بھنبھنا کر اُڑتی ہیں، اور کنکر مارنے والوں اور قریب سے گزرنے والوں کو ڈنک مارتی ہیں اور زہر اندر داخل کر دیتی ہیں پھر وہ جگہ سُوج جاتی ہے اور انسان کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے مکھیوں کے چھتّوں پر کنکر وغیرہ بالکل نہیں مارنے چاہئیں۔ کیوں کہ یہ مکھیاں اس قدر ہوشیار ہوتی ہیں کہ کنکر مارنے والے کے پیچھے بھاگتی ہیں، اور جب تک اُسے ڈنک نہیں مار لیتیں اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اس لئے تم میں سے جو بچے مکھیوں کو چھیڑتے ہوں وہ آئندہ ہرگز ایسا نہ کریں۔ شہد کی ان مکھیوں میں شرارت کا مادّہ ہرگز نہیں ہوتا، اور اپنے آپ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتیں۔ مگر جب اُنھیں چھیڑا اور تنگ کیا جاتا ہے تو وہ اس قدر کینہ ور ہو جاتی ہیں کہ اپنے زہر آلودہ ڈنکوں سے مل کر حملے کرتی ہیں اور ایذا پہنچانے والوں کو پہچان کر بدلہ لیتی ہیں۔ شہد کی مکھی ایک کیڑا ہے جو عام مکھی سے بہت بڑی



ہوتی ہے۔ اِس کے چھ ٹانگیں ہوتی ہیں۔ چار پچھلے حصّے میں اور دو اگلے حصّے میں۔ اس کے دو ڈنک بھی ہوتے ہیں۔ اس کا رنگ سنہری ہوتا ہے۔ اور چاروں طرف جسم پر کہیں کہیں سیاہ داغ ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں دنیا کے بہت سے حصّوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ تین قسموں میں منقسم ہوتی ہیں۔ ملکہ۔ نر اور کام کرنے والی مکھیاں۔ ملکہ بڑی اور دیکھنے میں خوب صورت ہوتی ہے۔ اس کا حکم مانا جاتا ہے۔ اور شہد کی مکھیوں کا گروہ اس قدر سرگرمی سے اس کی پیروی کرتا ہے، گویا کہ وہ کوئی بڑا سردار ہے۔ نر زیادہ فربہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں کوئی کام نہیں کرتے، اور تمام دن ایک پھول سے دوسرے پھول پر اُڑ کر تفریح کرتے رہتے ہیں۔ کام کرنے والی مکھیاں سب سے چھوٹی ہوتی ہیں، اور یہ ہی مکھیاں شہد بناتی ہیں۔ وہ پھولوں

کے اندر کی مٹھاس چُوس لیتی ہیں ۔ رس شہد کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں چلا جاتا ہے اور وہاں جا کر شہد بن جاتا ہے ۔ چھتّے پر پہنچ کر وہ اُسے شہد کی تھیلیوں سے باہر نکالتی ہیں ، اور موسم سرما کے استعمال کے لئے جب تمام پھول مُرجھا جاتے ہیں اُسے کوٹھریوں میں بھر دیتی ہیں ۔ ان کا چھتّہ نہایت ہی عجیب و غریب ہوتا ہے ۔ اس میں چھ چھ کونوں والی سینکڑوں کوٹھریاں ہوتی ہیں ۔ ملکہ مکھّی انڈے دیتی ہے ۔ جن کو وہ کوٹھری کے سب سے آخری کونے میں رکھتی ہے ۔ اور پھر اس کی بہت حفاظت کرتی ہے ۔ کیوں کہ یہی اُن کا سرمایہ ہوتا ہے جو انھیں اپنی زندگی کی طرح عزیز ہوتا ہے ۔ مکھیوں کے ان چھتّوں سے شہد نکالنا بڑی ہوشیاری اور ہنر کا کام ہوتا ہے ، اور شہد نکالنے والے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ان چھتّوں سے شہد نکالتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ شہد بہت قیمتی بکتا ہے ۔

شہد انسانی صحت کے لئے بہت ہی مفید ہے ۔ یہ کئی طرح کی بیماریوں اور مختلف اقسام کی اعصابی کمزوریوں کو دُور کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ شہد چونکہ گاڑھا ہوتا ہے ، اس لئے بہت جلد فائدہ کرتا ہے ۔ شہد کے اتنا مفید ہونے کے سبب شہد کی پیداوار بڑھانے کے لئے بہت بڑے پیمانے پر تجربات کئے جا رہے ہیں ۔





جیمز ڈیومنٹ

اینٹاروی بلجیم کا باشندہ جس کی ڈاڑھی بارہ فٹ لمبی ہے

سلیم مبشر علی

سونے کا لیموں

تین دوست روزگار سے تنگ آکر سفر کو چلے۔ اُن کے نام شارق، حسن اور موہن تھے۔ اُنھوں نے بہت کوشش کی کہ کہیں نوکری یا مزدوری مل جائے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسے مقام پر پہونچے جہاں ایک شہزادی حکومت کرتی تھی۔ شہزادی کا نام شاہینہ تھا۔ تینوں دوستوں نے ایک سرائے میں قیام کیا۔



جب دن ہوا تو انھوں نے آس پاس کے لوگوں سے روزگار کے بارے میں پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہاں روزگار کافی تھا مگر جس دن سے شہزادی کا لیموں چوری ہوگیا ہے، اُس نے سلطنت کے کاموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی ہے۔ اب وہ نہ کوئی عمارت بنواتی ہے اور نہ کوئی باغ لگواتی ہے۔ تجارت اور صنعت و حرفت سب کام بند پڑے ہیں شہزادی بغیر سونے کے لیموں کے بہت اُداس رہتی ہے اور نہ معلوم کب تک یہ سلسلہ چلے گا۔

شارق۔ بھئی! اس سونے کے لیموں میں آخر کیا بات تھی جو شہزادی اس قدر اُداس ہے؟

حسن۔ سونے کا لیموں نہ ہوا الکا ڈلی کا پھول ہوگیا۔

موہن۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہزادی کو کسی نے تحفے کے طور پر دیا تھا۔

سرائے کا ایک شخص۔ بھئی! یہ لیموں ایک شہزادے نے اُس کو دیا تھا۔ اور اگر یہ غائب نہ ہوتا تو شاید شہزادی اُس شہزادے کے ساتھ شادی کرتی۔

دوسرا شخص۔ مگر اب تو شہزادی اور سارے درباری اس قیمتی لیموں کے چوری ہو جانے کی وجہ سے ماتمی لباس پہنے ہوئے ہیں۔

تیسرا شخص۔ اور یہ کسی کو نہیں معلوم کہ لیموں خود شہزادی کے وزیر نے چرایا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں "بغل میں لڑکا شہر میں ڈھنڈورا"۔

پہلا شخص۔ لیکن بھائی کس کی ہمت ہے جو کہدے، ورنہ لیموں لیموں کا ملنا کچھ دشوار نہیں۔

تینوں دوست اس بات پر غور کرنے لگے، اور دوسرے دن شہزادی کے دربار میں پہونچے۔ شہزادی نے اُن سے پوچھا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

شارق - ہم علمِ جوتش کی مدد سے بہت سی باتیں بتادیتے ہیں جو اور لوگوں کو معلوم نہیں ہیں -

حسن - ہم چوری کرنے والوں کا پتہ چلاتے ہیں -

موہن - ہم صرف اشاروں میں راز کی بات بتا دیتے ہیں -

شہزادی شاہینہ - اچھا بتایئے ہمارا سنہری لیموں جس کے اندر جواہرات بھرے تھے کس نے چُرایا ہے - اگر آپ لوگوں نے صحیح بتلادیا تو بہت سا انعام دیا جائے گا -

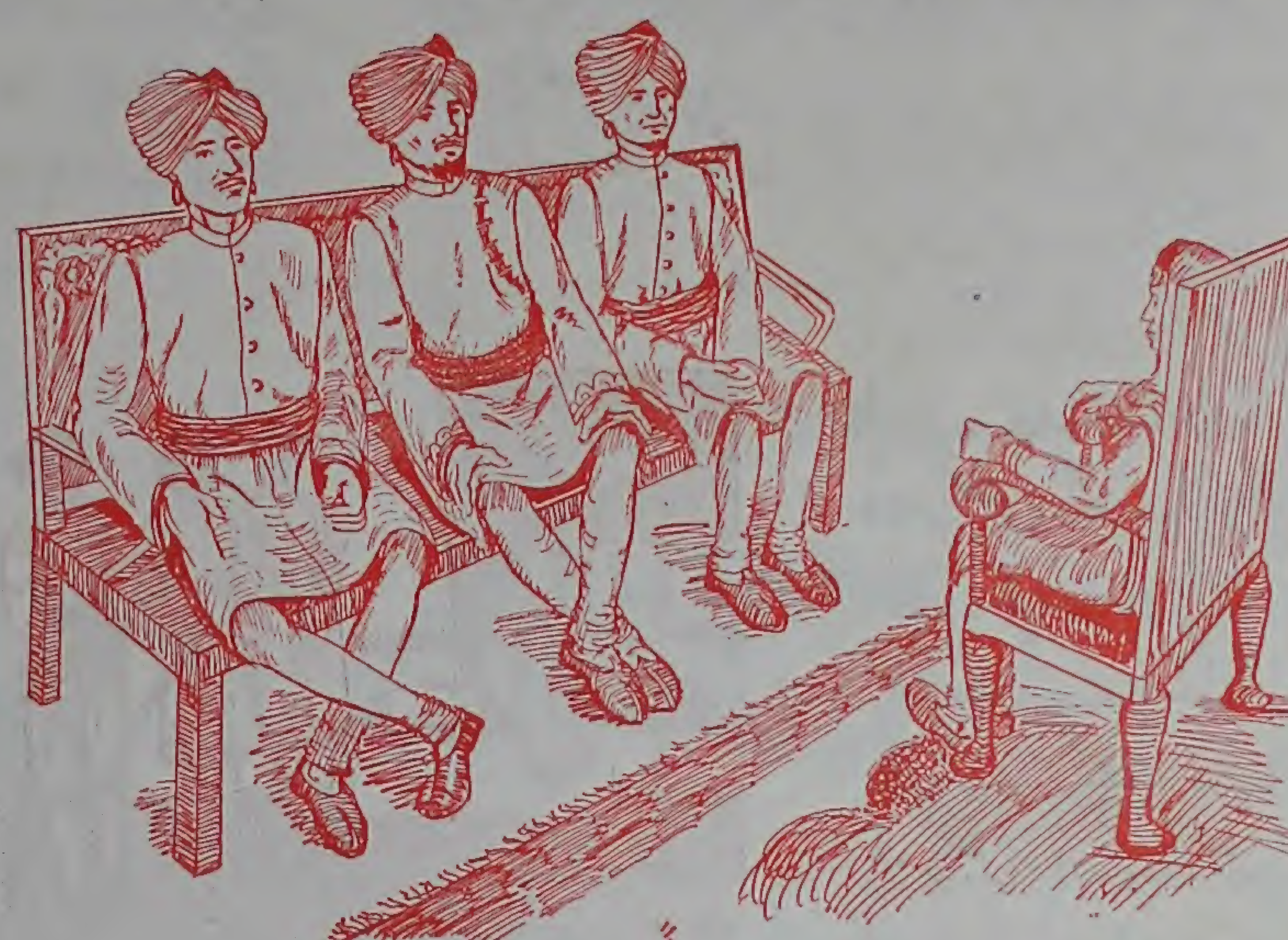
تینوں دوستوں نے کہا کہ ہم کل بتلائیں گے - آپ سب درباریوں کو حکم دے دیں کہ وہ دربار میں حاضر ہوں اور وقتِ مقررہ پر وزیر بھی موجود ہوں ، اور کچھ عام لوگوں کو بھی آپ دُور سے دیکھنے کی اجازت دے دیں تو اچھا ہے ، شہزادی شاہینہ تیار ہوگئی ، اور دوسرے دن کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی - دوسرے دن تینوں دوست آگئے ، اور بھرے دربار میں اس طرح چلّا کر کہنے لگے -

شارق - گول گنبد گوُں

حسن - رنگ زرد گوُں

موہن - نام لیموُں

اور فوراً موہن نے وزیر کا ہاتھ پکڑ لیا ، اور کہا کہ ہمارا جوتش یہ بتاتا ہے کہ لیموں آپ کے پاس ہے ، اُس کو جلد واپس کیجیے -



وزیر نے شہزادی کے قدموں پہ اپنا سر رکھ دیا ، اور خطا کی معافی چاہی شہزادی نے وزیر کی خطا معاف کردی ، اور اپنا سنہری لیموں واپس لے لیا - تینوں دوستوں کو بہت سا روپیہ انعام میں دیا - اور مناسب جگہوں پر ملازم رکھ لیا -

---

لطیفہ

والد - تمھاری تعلیم کا اب کیا حال ہے ؟

لڑکا - ماسٹر کے کہنے کے مطابق ترقی کر رہا ہوں -

والد - شاباش ! جماعت میں تمھارا کیا نمبر ہے ؟

لڑکا - آٹھویں نمبر سے اب سولھویں نمبر پر آگیا ہوں -

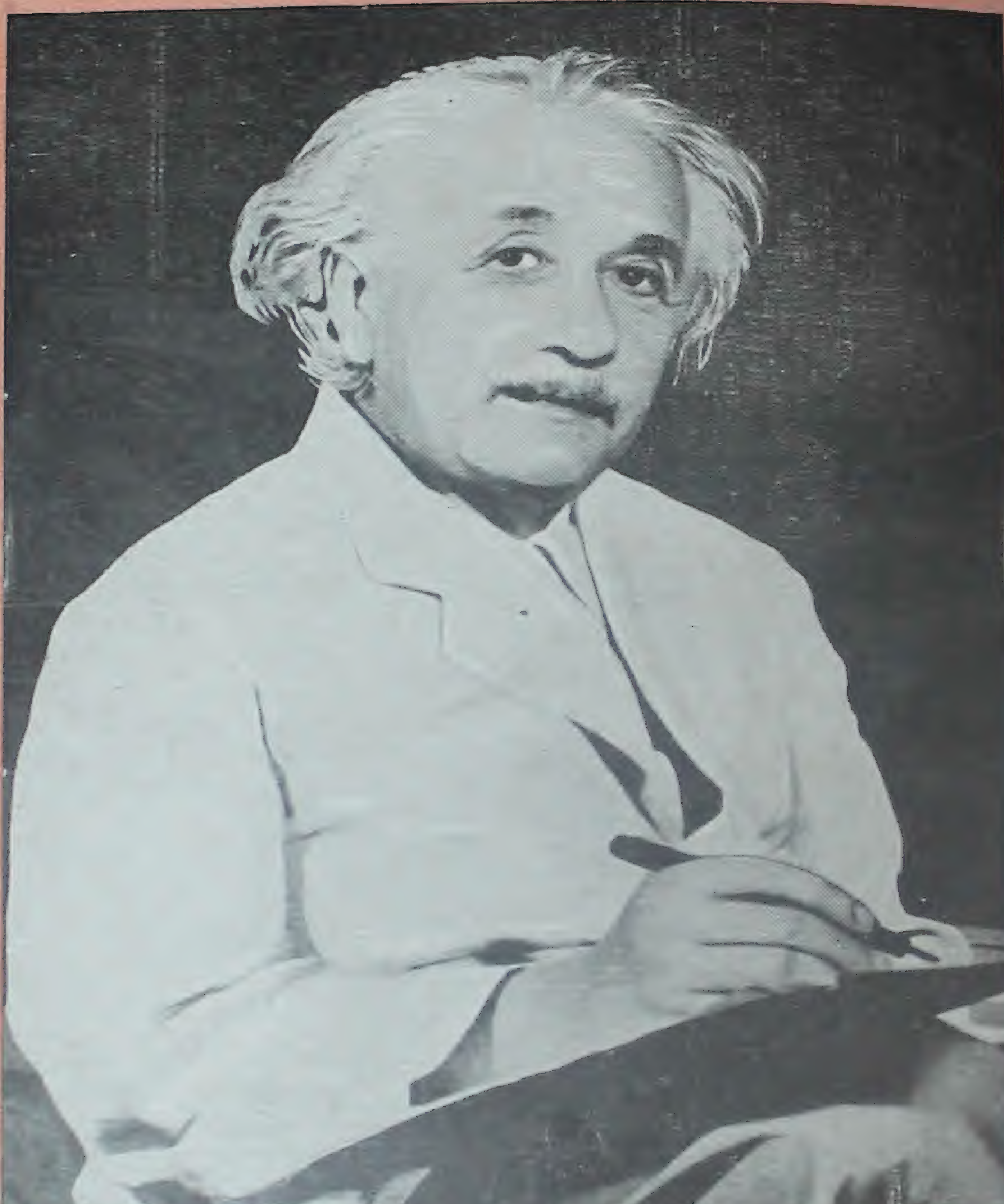


سیاحوں کی ایک پارٹی گلمرگ کو جاتے ہوئے

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—509

آج کل



جون ۱۹۵۵ء

آٹھ آنے

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

" رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُراز معلومات ہوتے ہیں۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلّد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بُجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

" رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دلکشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بِنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

" میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسینؔ



" تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ داروں کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس للک سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسینؔ

" میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دلکش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے نامی اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمّت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

" آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچّوں کا حصّہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے | بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی | قیمت سالانہ چھ روپے


it's SUMMER
FIIROZI
لو گرمیاں آگئیں!
گرمیوں کے موسم میں عموماً آپ کا جی کسی کام پر نہیں لگتا اور آپ بے حد پیاس اور تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں۔
"روح افزا" کا ایک گلاس آپ کو از سرِ نو تازہ دم اور بشاش بنا سکتا ہے۔ یہ پیاس کو بجھاتا ہے۔ تھکاوٹ کو دور کرتا ہے۔ اور جسم میں تازگی اور فرحت پیدا کرتا ہے۔ یہ تازہ پھلوں کے رس۔ جڑی بوٹیوں اور پھولوں کے عرق سے تیار ہوتا ہے۔ اور وٹامن سی سے بھرپور ہوتا ہے۔ ہر روح افزا کا گلاس آپ کے جسم کو ۱۵۰ کلوریز طاقت بخشتا ہے۔
روح افزا
فرحت بخش اور تسکین دِہ
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی۔
کتابچہ مشروبِ مشرق اپنے شہر کے اسٹاکسٹوں سے مفت طلب فرمائیں۔

ترتیب

بچوں کا آج کل

سرورق:۔ مشہور سائنس دان آئنسٹائن جو وفات پاگئے

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:۔ جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:۔ بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۳ —— نمبر ۱۱

سالانہ چندہ:۔ —— ہندوستان میں:۔ چھ روپے
پاکستان میں:۔ چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:۔ نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:۔ —— ہندوستان میں آٹھ آنے
پاکستان میں آٹھ آنے (پاک)

جون ۱۹۵۵ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱۔ دہلی

عبدالمجید حیرت

غزل

آج کے ہیں پابند نہ کل کے — پیکر ہیں جو لوگ عمل کے

دوسروں پر پتھر تو نہ پھینکیں — رہنے والے شیش محل کے

کیا معلوم کہ برسیں گے بھی — آ تو رہے ہیں دل بادل کے

ایسے بھی ظالم ہوتے ہیں — رکھ دیتے ہیں پھول مسل کے

شمع پہ کوئی آنچ نہ آئی — خاک ہوا پروانہ جل کے

بنتی ہے انسان کی سیرت — غم کے سانچے میں ڈھل کے

راہِ عمل میں کانٹے بھی ہیں — چلئے گا سرکار سنبھل کے

ہو گئے دو ہی دن میں دیکھا — کیا سے کیا حالات بدل کے

کچھ جھگڑے ایسے ہیں جن کا — فیصلہ ہوگا آگے چل کے

کیا معلوم کہاں تک پہنچے
منہ سے حیرت بات نکل کے

منظور الحسن برکاتی

غالب کی ایک نا در فیصلہ کُن تحریر

ما طفل کم سواد و سبق قصہ ہائے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

اُنیسویں صدی کے باکمال شعراء میں مرزا غالب ہی کی ایسی خوش نصیب شخصیت ہے جس کی زندگی کے ہر ہر گوشے کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اُن کے معتقد و پرستار اس کے کلام، اس کے خطوط اور مضامین، حتّٰی کہ زبان و قلم سے نکلے ہوئے گم شدہ الفاظ و حروف بھی محفوظ و مدون کرنے میں سرگرم ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ غالب نے اردو ادب کو جو عظیم الشان اور بلند خیالات عطا کئے ہیں۔ وہ اسی کے متقاضی ہیں کہ ان کے تمام ادبی شہ پاروں کو زمانے کی دست بُرد سے محفوظ اور غیر فانی بنا دیا جائے۔

غالب کے فکر کی وسعت اور خیال کی بلندی کے مقام تک اُردو ادب کے آسمان میں ابھی تک کوئی پہنچا نہیں ہے۔ بین الاقوامی زبانوں کی دنیا میں دوسرے شعراء کے مقابلے میں غالب کا مقام کیا ہے؟ یہ مضمون ابھی تشنۂ تبصرہ ہے۔ غالب کے تعلقات اور اُس کے ماحول کی تحقیق و تجسس میں ابھی تک شیفتگانِ غالب لگے ہوئے ہیں اور جوئندہ یابندہ کے مصداق ہندوستان کے طول و عرض میں گم شدہ اوراق دستیاب بھی ہو رہے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون غالب کے بعض قصائد کی ترسیل سے متعلق ہے۔

ایک مدّت سے یہ مسئلہ موضوعِ بحث بنا ہُوا ہے کہ مرزا غالب نے نوّاب وزیر الدولہ محمّد وزیر خاں والی ٹونک کی مدح میں جو قصائد لکھے ہیں، ان کی تاریخ ارسال کیا ہے؟

محققینِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، اور مولانا امتیاز علی عرشی بھی اس بارے میں متفق نہیں ہیں

مولانا مہر، قصیدوں کی تاریخ ارسال ۱۲۷۸ھ بتاتے ہیں۔

"نواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک کی مدح میں دو قصیدے ہیں۔ پہلا قصیدہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں بھیجا گیا تھا اس وقت غالب کی عمر چونسٹھ، پینسٹھ برس کی تھی۔"

غالب از مہر صفحہ ۲۲۱

عرشی صاحب نے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں "غالب کی شعر گوئی" پر جو سیر حاصل مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ اس مقالے میں "دواوین فارسی" کے تاریخی تعین کے ذیل میں کتب خانۂ رام پور کے ایک قلمی نسخے کا تذکرہ فرمایا ہے اور اس کی تاریخِ کتابت پر بحث کرتے ہوئے غالب کے ان قصیدوں کا بھی ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"کتاب خانۂ رام پور کا یہ قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ کے مطبوعہ نسخے کی نقل ہے۔ یا یہ دونوں نسخے ایک ہی مسودہ سے منقول ہیں۔ اور تقریظ کے سنین ۱۲۵۳ھ میں ۱۲۶۳ء والے نولکشوری نسخے کی طرح ردّ و بدل نہیں کیا گیا ہے۔

اس کتاب کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مرزا صاحب کی غزل

اے ذوقِ نوا سنجی بازم بخروش آور

جو ۴ اکتوبر ۱۸۵۵ء کی رات میں لکھی گئی تھی۔ اس نسخہ میں موجود نہیں ہے۔

اس فیصلہ پر صرف یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ رام پور کے اُس قلمی نسخہ کے صفحہ ۱۸۷ پر نواب وزیر الدولہ وزیر محمّد خاں

بہادر والی ٹونک کی مدح کا قصیدہ درج ہے جو مولانا عرشی کے خیال میں ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) کو ٹونک بھیجا گیا تھا، پھر نسخہ ۱۲۶۱ھ کے مخطوط سے کیا علاقہ رکھ سکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وزیر الدولہ والا قصیدہ صرف اسی نسخہ میں نہیں، کلیات فارسی کے اس نسخہ میں بھی موجود ہے جو نواب فخر الدین خاں مرحوم کا نوشتہ ہے اور ۲۰ مارچ ۱۸۶۱ء کو رام پور پہنچ گیا تھا۔

۱۲۷۷ھ تقریباً ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء کو شروع ہوا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ ۲۰ مارچ ۱۸۶۱ء کو رمضان ۱۲۷۷ھ ہوگا۔ اگر یہ قصیدہ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) میں ٹونک جاتا تو اس نسخہ میں اس کا ہونا ممکن نہ تھا، اسی طرح ٹونک کا دوسرا قصیدہ بھی اسی ما فی الذکر نسخہ میں موجود ہے۔ لہٰذا اس کو بھی ۱۲۷۷ھ سے قبل کا ہونا چاہیئے!"

علی گڑھ میگزین ۴۹-۱۹۴۸ء صفحہ ۱۱۷

بہرحال ہر دو محققین تاریخ ارسال قصائد کے بارے میں "مضطرب" ہیں اور یہ "تاریخی اضطراب" حل نہ ہو سکا۔

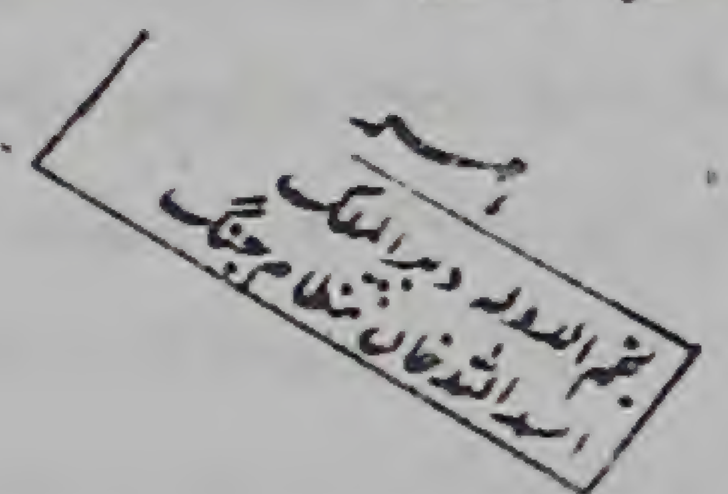
میں ایک مدت سے کتب خانۂ وزیری و دفتر منشی خانہ ریاست ٹونک کے کاغذات و وثائق "ادبی شہ پاروں" کی تلاش میں کھنگال رہا تھا کہ مرزا غالب کی ایک رسید بطرز عرضداشت نظر پڑی، اپنی کاوش کے اس انجام پر خدا کا شکر ادا کیا۔

عرضداشت کی نقل حسب ذیل ہے (اس مضمون کے ساتھ اس کا عکس بھی شائع کیا جا رہا ہے)

عرضداشت بندۂ درگاہ اسد اللہ

بحضور مکرمت ظہور بندگان دارا دربان حضرت نواب صاحب قبلہ و کعبہ دو جہان
قلزم فیض و محیط احسان دام اقبالہٗ

معروض برایں کہ روزے چند ازیں پیش عرضداشتی با قصیدہ کہ در تہنیت عید سعید ذی الحجہ فرو ریختہ کلک نیاز مرید بود، بتوسط خاں صاحب الطاف نشاں میر تفضل حسین خاں ارسال یافتہ، امروز کہ چہاردہم صفر ۱۲۶۷ھ است خانصاحب مشفق طالع یار خاں منشور کرامتے کہ بہ مہر شجاع خدائگاں بر عنوان داشت بمن سپردند، و مبلغ چہار صد و پنجاہ و سہ روپیہ سکۂ انگریزی کہ دریں قلمرو روائے دارد نیز حوالت کردند، سپاس یاد آوری و شکر و درویش پروری بجائے آوردم، یارب ولی نعمت را عمر و دولت و جاہ و مکنت فراواں، و لفظ امیر المومنین مشرف نامۂ اقبال خداداد را زیب عنوان باد



غالب کی اس تحریر نے "عید اضحیٰ" والے قصیدے کی تاریخ کا تو فیصلہ کر دیا کہ یہ قصیدہ ذی الحجہ ۱۲۶۶ھ میں ارسال کیا گیا تھا، اور اس سال عید اضحیٰ موسم سرما کے آغاز ہی میں آئی تھی۔ جیسا کہ خود غالب نے قصیدے کی تشبیب میں کہا ہے۔

عید اضحیٰ بہ سر آغاز زمستاں آمد — وقت آراستن حجرہ و ایوان آمد
گرمی از آب برون رفت و حرارت ز ہوا — نحل ہمچناں تاب بہ میزان آمد
روز ہا کاہد و شب راست درازی گوئی — موسم دیر غنودن بہ شبستان آمد
آذر افروز و خز و اطلس و سنجاب بدوز — بہر ہر مدعی رود رنگ مہ آبان آمد
ہند در فصل خزاں نیز بہارے دارد — گونا گوں سبزہ حلی بند خیابان آمد
دی و بہمن کہ دو ماہ عظیم دگر یخ بندد — اندریں ملک گل و سبزہ فراواں آمد
نخل نارنج نہ بینی کہ ہم از میوہ و شاخ — گوئے و چوگاں بکف آورد بہ میداں آمد

ایسی صورت میں عرشی صاحب کا یہ فیصلہ کرنا کہ "کتب خانہ رام پور کا قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ کے نسخہ کی نقل ہے"۔ محل نظر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب غالب کی تحریر کے بموجب یہ قصیدہ ۱۲۶۶ھ میں لکھا گیا، تو پھر یہ ۱۲۶۱ھ والے نسخے میں کیسے شامل ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رام پور کا وہ قلمی نسخہ ۱۲۶۶ھ کے بعد کا مرتب کردہ ہے۔

البتہ نواب فخر الدین خاں مرحوم کے نوشتہ کلیات میں اس قصیدے

کا ہونا باعثِ تعجب نہیں۔ کیونکہ بقول عرشی صاحب یہ نسخہ ۱۸۶۱ء میں رام پور پہنچا تھا اور ۱۸۶۱ء کا مطابق سن ہجری ۱۲۷۸ھ ہے۔ ۱۲۷۷ھ میں اس قصیدے کو لکھے ہوئے دس سال گزر چکے تھے اور غالب کو صلہ بھی چار سو ترپن روپیہ مل گیا تھا۔

گزیٹیر ٹونک میں ہے کہ ٹونک میں ۱۸۶۳ء تک مادھو پوری سکہ رائج تھا جس کے مقابلے میں کلدار روپیہ (سکہ انگریزی) ایک آنہ، سوا آنہ زائد ہوتا تھا۔ چار سو ترپن کا مطلب یہ ہے کہ مرزا غالب کو نواب وزیرالدولہ کے دربار سے پانچ سو روپیہ سکہ مادھو پوری صلہ مرحمت ہوا، عرضداشت میں "در بیں قلمرو روائے دارد" کا فقرہ اس چیز کو بتاتا ہے کہ انگریزی اور ٹونک کے سکہ کا فرق مرزا غالب کو بھی معلوم تھا۔

بادیُ النظر میں پانچسو روپے کا صلہ بہت تھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ٹونک کی آمدنی اور روسائے ٹونک کی بالعموم عادتِ داد و دہش کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ پانسو روپے کا صلہ اُس وقت کے لحاظ سے ایک بلند صلہ تھا۔

ساتھ ہی اس کو بھی نظر میں رکھنا چاہیئے کہ نواب وزیرالدولہ، سید احمد شہید رح کی مجاہدانہ تحریک کو اور سید صاحب کے ساتھیوں کو ہمیشہ خفیہ طور پر ہزاروں روپے سے مالی امداد دیتے رہے۔ اور سید صاحب کی شہادت کے بعد آپ نے پورے قافلہ کو ٹونک میں لا بسایا اور سینکڑوں آدمیوں کی کفالت کی۔

ان حالات کے پیشِ نظر ایک مجاہدانہ نظر رکھنے والے رئیس کے دربار سے ایک قصیدے کے صلے میں دُور بیٹھے ہوئے آدمی کو پانچسو روپیہ صلہ مل جانا ہی بہت کچھ ہے۔ اس کے علاوہ روپیہ کی قیمت اُس زمانے میں بہت بڑی تھی۔ ٹونک کی فوج کے ملازم کو چار، پانچ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ اہل کاروں میں دس روپیہ تنخواہ رکھنے والا آدمی دولت مندوں میں شمار کیا جاتا تھا، اس لئے بھی ہمارا فیصلہ ہے کہ غالب کو گراں قدر صلہ ملا۔

منقولۂ بالا عرضداشت میں مرزا غالب نے میر تفضّل حسین خاں اور طالع یار خاں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ دونوں غالب کے حلقۂ احباب میں داخل تھے اور ریاست ٹونک سے بھی وابستہ تھے۔

طالع یار خاں کا ٹونک کے "استادانِ فنِ سپہ گری" میں شمار تھا نواب وزیرالدولہ بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ ٹونک میں "استاد" کے لقب سے مشہور تھے۔ غدر کے زمانے میں ان کے دو بیٹے جو ٹونک سے دہلی رخصت پر گئے ہوئے تھے، پھانسی پر چڑھا دئے گئے، مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو نواب انورالدولہ سعدالدین خاں کے نام ہے ان کے قتل پر ان الفاظ میں اظہارِ افسوس کیا ہے۔

"طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت آئے تھے غدر کے سبب جا نہ سکے یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں زندہ ہیں پر یقین ہے کہ مردہ سے بدتر ہوں گے۔"

عود مطبوعہ نولکشوری صفحہ ۵

میر تفضل حسین خاں! غالباً یہ وہی میر تفضل حسین خاں ہیں، جو مضطر خیرآبادی کے دادا تھے۔ اور اُس زمانے میں ریاست ٹونک کے سفیر تھے اور سفارت ریاست کے سلسلے میں دہلی میں بھی آمد و رفت اور قیام رہتا تھا۔ اردوئے معلیٰ کے بعض خطوط میں مرزا غالب نے مرزا تفضل حسین کا ذکر کیا ہے اور ایک خط خاص ان ہی کے نام ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی میر تفضل حسین خاں ہوں، غالب ان کو بھی مرزا تفتہ کی طرح کمالِ اتحاد و یگانگی کی بنا پر "مرزا" کے لقب سے یاد کرتے ہوں۔ بہر حال یہ نام تحقیق طلب ہے۔

تاریخ ٹونک میں ہے کہ "میر تفضل حسین کا انتقال ۱۲۸۰ھ میں ہوا، ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حافظ احمد حسین سفارت پر مامور ہوئے، حافظ احمد حسین سید افتخار حسین مضطر کے والد تھے۔

اب رہ گیا غالب کا دوسرا قصیدہ "عرفی کی زمین والا" جس کا مطلع ہے

اے ذات تو جامع صفت عدل و کرم را
وے بر شرفِ ذاتِ تو اجماع امم را

مولانا مہر اس کی تاریخِ ارسال بھی ۱۲۷۷ھ ہی بتاتے ہیں۔ اور عرشی صاحب ۱۲۷۷ھ سے پہلے کی تاریخ قرار دیتے ہیں۔ تاریخِ ٹونک میں بھی اصغر علی آبرو نے ۱۲۷۷ھ میں غالب کے ایک قصیدے کا ٹونک آنا ظاہر کیا ہے اور یہ کہ جب اس کے صلے میں تاخیر ہوئی تو تقاضے کا ایک قطعہ اور لکھ بھیجا۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

گفتم بخرد بخلوت اُنس	کائے شمع و چراغ ہفت ایواں
آیا نہ چہ او بود کہ نواب	ننوشت جواب نامہ ام ہاں

آں گونہ عریضہ، کہ دانی — درویش نوشتہ سوئے سلطاں
آں گونہ قصیدہ کہ گوئی — از منظر دیدہ سنبلستاں
ایں ہر دو رسید نیست پیدا — زاں سو اثرے بہ ہیچ عنواں
رنجیدہ مگر ز مدح نواب — اے کاش نہ گشتے شناخواں
ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم — از گفتۂ خویشتن پشیماں
ختم بجواب گفت "غالب" — زنہار مخور فریب شیطاں
نواب بعسکر ارمغان است — تا نامہ فرستدت بساماں
وانجا کہ بخاطرش گذاشتہ است — زودآں ہمہ جمع کرد نتواں
زود است کہ جمع نیز گردد — دیر است کہ دادہ است فرماں

مولانا مہر لکھتے ہیں

"تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدہ کے صلہ میں تاخیر ہو گئی تو غالب نے ایک قطعہ بھیجا، جسے خواجہ حالی مرحوم نے "یادگار" میں "بحوالہ طلب" کی مثال کے طور پر نقل فرمایا ہے (یادگار غالب صفحہ ۵۸) اور جو غالب کی کلیات میں شامل نہ ہو سکا، لیکن "سبد چین" میں چھپ گیا تھا۔ میری رائے میں یہ قطعہ محض حسن طلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد غالب کو صلہ بھیجا گیا لیکن اس کی مقدار و نوعیت معلوم نہ ہو سکی۔"

غالب از مہر صفحہ ۲۲۲

صلہ کے بارے میں صاحبزادہ یار محمد خاں بہادر شوکت بھوپالی کی تحقیق یہ ہے۔ کہ "جناب ممدوح نے ایک قصیدہ جو دیوان فارسی میں مرقوم ہے والیٔ الدولہ امیر الملک نواب وزیر محمد خاں صاحب بہادر رئیس ٹونک کی مدح میں لکھ کر ممدوح کے پاس بھیجا، نواب صاحب موصوف نے ارسال صلہ میں عمداً یا سہواً دیر کی، مرزا صاحب نے ایک خط بھیجا۔ (یہ مذکورۂ بالا قطعہ کی طرف اشارہ ہے) نواب صاحب نے بعد ملاحظہ ہوا اور روپیہ بطریق جائزہ روانہ کیا۔"

انشائے نور چشم صفحہ ۶۵

مطبوعہ نظامی کانپور ۱۲۸۹ھ

لیکن قصیدے کی ارسال کی ان تاریخوں (۱۲۷۸ھ بقول مولانا مہر یا ۱۲۷۷ھ مولانا عرشی کی تحقیق کے مطابق) پر ایک اعتراض تو یہ ہو سکتا ہے کہ مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو سرور مارہروی کو لکھا تھا اس قصیدے کا تذکرہ کیا ہے۔ کہ

"میں نے کسی زمانہ میں اسی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر وزیر الدولہ والیٔ ٹونک کو بھیجا تھا۔ اس میں کے دو شعر آپ کو لکھتا ہوں۔"

تا بوسی نگہ داشتی از جود بگیتی — جز پردگیان حرم معتمدی دیم را
دقتیست کہ ایں قوم بہر کوچہ و بازار — پرسند ز ہم منشاء رسوائی ہم را

عود مطبوعہ نولکشوری صفحہ ۹

اس خط کے بارے میں جمیل الدین صاحب ٹونکی کی تحقیق ہے کہ یہ ۸ نومبر ۱۸۵۹ء سے کچھ پہلے لکھا گیا ہے اور ۱۸۵۹ء کا مطابق ہجری سن ۱۲۷۶ھ ہوتا ہے اور ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء کے خط میں "کسی زمانہ میں بھیجا جانا" لکھنا اس بات پہ دلالت کرتا ہے کہ اس وقت اس قصیدے کو بھیجے ہوئے کافی مدت گزر چکی تھی۔

دوسرا اعتراض یہ کہ پھر یہ قصیدہ ۱۲۶۱ھ والے مخطوط میں کیسے شامل ہوا اور چونکہ عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ دوسرا قصیدہ بھی ۱۲۶۱ھ والے مخطوط میں موجود ہے تو پھر اس کی تاریخ ارسال عیداضحیٰ والے قصیدے سے پہلے کی تسلیم کرنا پڑے گی۔ اور اس قیاس کی اس بات سے بھی تائید ہوتی ہے کہ کلیات فارسی میں عیدالضحیٰ والا قصیدہ پنجاہ و ہفتم اور عرفی کی زمین والا قصیدہ پنجاہ و ششم کے زیر عنوان مندرج ہے۔

ان تمام تصریحات کے پیش نظر مولانا مہر کا قصیدے کی تاریخ ارسال ۱۲۷۰ھ قرار دینا محل غور ہو جاتا ہے۔ بہر حال تحقیق ابھی تک کہیں پہنچی ہے اس کی بھی تلاش کرنے گی۔

ان قصیدوں کے علاوہ مرزا غالب اور نواب وزیر الدولہ میں مراسلت رہی ہے اور غالب نے "دامن وزیری سے وابستگی کو آخر دم تک باقی رکھا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مرزا کی کوئی کتاب شائع ہوتی، تو وہ اس کو اپنے دوسرے قدر دان، امراء رؤساء اور حکام وقت کی طرح نواب وزیر الدولہ کو بھی ہدیۃً بھیجتے۔ چنانچہ جب ۱۲۶۸ھ میں مہر نیمروز فخر المطابع سے شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ نواب وزیر الدولہ کو بھی تحفۃً بھیجا اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد "دستنبو" طبع ہوئی تو یہ قطعہ لکھ کر اس کو بھی نذر کیا

ملاحظہ ہو مقالہ "مہر نیمروز کا ایک خاص نسخہ" شائع کردہ رسالہ نوائے ادب بمبئی بابت جولائی و اکتوبر ۱۹۵۲ء

قطعہ

نذرِ نواب وزیر الدولہ — آں مبداِ کرم و دانش و داد
ہم بدیں حیلہ مگر یاد آید — غالبِ خستہ کہ رفتت زیاد

"دستنبو" پر "یادِ غالب" کے عنوان سے فروری ۱۹۵۳ء کے آج کل میں قطعہ کے عکس کے ساتھ ایک مضمون ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں۔

نواب وزیر الدولہ کے انتقال کے بعد جب ۱۲۸۱ھ میں نواب محمد علی خاں مسند نشینِ ریاست ہوئے۔ تو مرزا غالب نے روایتِ قدیم کے مطابق ان کی مدح میں بھی ایک مثنوی بھیجی۔ جس میں اپنی قدیمی نیازمندی کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں

ز غالب کہ از روزگارے دراز
بریں عتبہ سایدجبینِ نیاز

انجمن اقوامِ متحدہ

۱۴۔اگست ۱۹۴۱ء کو دو رہنماؤں، پریذیڈنٹ روزویلٹ اور مسٹر چرچل نے ایک مشترکہ تاریخی اعلان جاری کیا جو منشورِ اٹلانٹک کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اعلان دونوں ملکوں (امریکہ اور برطانیہ) کے درمیان کسی باقاعدہ معاہدے کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس میں دونوں ملکوں کی قومی پالیسی کے بعض مشترکہ اصولوں کا اعادہ کیا گیا تھا جن کی بنیادوں پر وہ ایک بہتر دنیا کی تعمیر کی توقعات رکھتے ہیں۔

مذکورہ منشور کے آٹھ نکات میں سے دو براہِ راست ایک عالمگیر تنظیم کو وجود میں لانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۱ء کو روس اور مقبوضہ یورپ کی دس حکومتوں نے بھی اس اعلان پر دستخط کردئے۔ تین ماہ بعد ایک اور اعلان جاری کیا گیا جو اب اقوامِ متحدہ کے اعلان کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۴۲ء کے فوراً بعد امریکہ، برطانیہ، روس اور چین کے نمایندوں نے اس پر دستخط کئے اور اس سے اگلے روز دیگر ۲۲۔اقوام کے نمایندوں نے اس اعلان پر دستخط کردئے لیکن اس امر کا فیصلہ کرنا ابھی باقی تھا کہ عالمگیر تنظیم کی بنیادیں کن اصولوں پر رکھی جائیں۔

برطانیہ، امریکہ اور روس کے وزرائے خارجہ کا اجلاس اکتوبر ۱۹۴۳ء میں منعقد ہوا۔ جس میں عالمگیر تنظیم کی بنیادوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی اس غور و خوض کے نتیجے کے طور پر برطانیہ، امریکہ، روس اور چین کے نمایندوں نے ایک نئے اعلان پر دستخط کئے۔ اس اعلان میں بین الاقوامی امن و تحفظ کی بقا کے لئے جلد از جلد ایک ایسی عالمگیر تنظیم کو وجود میں لانے کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا جس کی بنیادیں تمام امن پسند ممالک کی خود مختارانہ مساوات پر رکھی جائیں اور جس کی رکنیت کے دروازے چھوٹے بڑے تمام ممالک کے لئے کھلے ہوں۔ دو ماہ بعد روزویلٹ، اسٹالن اور چرچل کے درمیان پہلی بار تہران میں ملاقات ہوئی اور انھوں نے دنیا کی بھاری اکثریت کے لئے قابلِ قبول امن کے قیام اور دنیا کو آئندہ کئی نسلوں تک جنگ کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں اپنی اور تمام اقوامِ متحدہ کی ذمہ داریوں کو پورے طور پر محسوس کرتے ہوئے اس امر کا اعتماد ظاہر کیا کہ ان کی مفاہمت بقائے امن کی ضامن ثابت ہوگی۔ یہ تھا عالمگیر تنظیم کا بنیادی اصول۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس تنظیم کی شکل و صورت کیا ہو؟ اس مقصد کے لئے امریکہ، برطانیہ، روس اور چین کے نمایندوں کی ایک کانفرنس ڈمبارٹن اوکس کے مقام پر منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی تجاویز کو تمام اقوامِ متحدہ کی حکومتوں اور تمام ملکوں کے لوگوں کے سامنے مطالعہ کے لئے پیش کیا گیا۔ اس کانفرنس نے یہ تجویز پیش کی کہ عالمگیر انجمن کا نام انجمنِ اقوامِ متحدہ رکھا جائے اور یہ چار بڑی تنظیموں پر مشتمل ہو۔ ایک جنرل اسمبلی جس میں تمام رکن ممالک کے نمایندے شامل ہوں، گیارہ ممبروں کی سیکورٹی کونسل قائم کی جائے جس میں پانچ ملکوں کے نمائندے مستقل ہوں اور کونسل کے باقی ماندہ نمایندوں کا انتخاب جنرل اسمبلی کے ارکان میں سے دو دو سال کے لئے کیا جائے۔ اس کے علاوہ دو دیگر اداروں، اقتصادی و سماجی کونسل اور بین الاقوامی کورٹ آف جسٹس کے قیام کی سفارش کی گئی۔ اور اس طرح چار سال کی مسلسل غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ایک نئی تنظیم وجود میں آئی جو بنی نوعِ انسان کے لئے امید کا نیا پیغام لئے ہوئے تھی۔

ناصر کرنولی

دکن کا رُباعی گو شاعر

دکن کی سرزمین دنیائے ادب میں ایک امتیازی مقام کی حامل ہے۔ اس سرزمین نے شمس الدین ولی کو جو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا اور جس کو محمد حسین آزاد نے شاعری کا باوا آدم تسلیم کیا ہے، جنم دیا۔ اس کے بعد بھی باکمال شعرا کو پیدا کرنے میں برابر فیاضی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ آج بھی ہم ان کے شعرا میں ایک ایسی شخصیت سے آپ کا تعارف کرانے میں فخر محسوس کرتے ہیں جسے اس سرزمین نے اپنے آغوش میں پرورش کیا ہے۔ یہ حضرت امجد حیدرآبادی ہیں۔ ان کا کلام نہ صرف لطف زبان کی حیثیت سے واجب التعظیم ہے بلکہ خوبی مضمون، روانی اور سلاست کے اعتبار سے بھی قابل صد آفرین و تحسین ہے یہ قلمی کاوش میرے لئے وجہ مسرت ہے کہ میں اس شخص کے کارہائے نمایاں قلمبند کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس کا رتبہ شاعری میں امتیازی شان رکھتا ہے جس کی شاعری اس کی وضع زندگی کا آئینہ ہے، جس کے بلند مذاق سخن اور خصوصاً حکیمانہ، اخلاقی اور سب سے بڑھ کر متصوفانہ رباعیات نے اردو ادب کو چار چاند لگا دئے ہیں اور امجد نے نہ صرف واحد رباعی نگار شاعر کی حیثیت سے اپنا مقام معین کیا ہے بلکہ دنیا کے لازوال شعرا کے زمرے میں جگہ نکال لی ہے۔

حضرت امجد ۱۸۶۸ء بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ یقیناً یہ ان کی دعا اور تربیت کا اثر ہے کہ تصوف میں امجد نے ایسا بلند مذاق پایا کہ موجودہ دور کے باکمال رباعی گو شعراء میں ان کا شمار ہونے لگا۔ آپ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے کسی اہم امر کی تکمیل کے لئے امجد کو فطرتاً شاعر پیدا کیا اور اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو میرا یقین حق بجانب ہوتا کہ سرمد کی روح اس دکنی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر چمن رباعیات کی آبیاری کر رہی ہے۔ ذیل کا شعر ان کا اولین ہے جو قصر شاعری کا سنگ بنیاد کہلانے کا مستحق ہے ؎

نہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسماں اپنا
مگر یارب نہ ہو نا مہرباں وہ مہرباں اپنا

امجد کے والد محترم کا انتقال عہد طفلی میں ہو گیا۔ تاہم ان کی روایات اور زندگی کے حالات امجد کے معلم و رہنما رہے۔ ابتدائی تعلیم اسلامی مدارس میں حاصل کی۔ آخرش مولانا نادرالدین اور نواب سعد الملک آغا سید علی شوشتری جیسے عربی اور فارسی کے بامذاق علماء امجد کی تعلیم کے لئے مل گئے۔ یوں سمجھئے کہ پیاسے اور سمندر کی یکجائی ہو گئی اور انھیں کی صحبتوں میں ان کا ادبی مذاق اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا اور ان کی بصیرت کو اوج ثریا کا مقام عطا ہوا۔

رباعیات کے ساتھ ساتھ امجد کی نظمیں اور غزلیں بھی جذبات کا اعلیٰ نمونہ اور ان کی حیات کا قابل قدر سرمایہ ہیں خصوصاً جوش رحمت دنیا و انسان، دعائے یتیم، قیامت صغرا، تصویر غم اپنی طرز میں لاجواب اور بے مثل ہونے کی حیثیت سے قابل صد آفرین و داد ہیں۔ یوں بھی شاعر کا دل مصوری کا آلہ ہوتا ہے جس میں ہر وہ چیز منعکس ہو جاتی ہے جو اس کے سامنے آجاتی ہے چنانچہ امجد کی حسب ذیل نظم کے چند اشعار جو موسیٰ ندی کی اس طغیانی کے قیامت خیز حادثے کا نتیجہ ہیں۔ جس میں امجد کی والدہ محترمہ، بیوی اور عزیز بچی ان کی آنکھوں کے سامنے موت کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ اس خونچکاں حادثہ نے امجد کے دل پہ ایک گہرا نقش چھوڑا جس کو امجد نے اپنی نظم "قیامت صغریٰ" میں موثر پیرایے میں بیان کیا ہے۔

مادر کہیں اور میں کہیں با دیدۂ پُرنم
بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم

سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے
وہ غم تھا کہ دن کو نظر آنے لگے تارے

کس جا سے میں ڈوبی ہوئی نعشوں کو اٹھاؤں
بیٹی کا پتہ کیا ہے کہاں بی بی کو پاؤں

دوں کس کو کفن کس کا میں تابوت بناؤں
ہے قبر کہاں پھول کہاں جا کے چڑھاؤں

ہے ہدف رنج و محن کر گئیں اماں افسوس کہ بے گور و کفن مر گئیں اماں

اردو کے ساتھ ساتھ امجد کو فارسی و عربی میں بھی کافی دسترس حاصل ہے۔ متصوفانہ شاعری میں درد کے بعد اگر کوئی شاعر فارسی کے لازوال رباعی نگار صوفی شاعر سرمد کا مدمقابل ہو سکتا ہے تو وہ امجد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسفی، اخلاقی اور مذہبی نکات کے بیان کرنے کے لئے کوئی موزوں چیز سوائے رباعی کے نہیں ہے۔ جس حسن اور خوبی کے ساتھ شاعر اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے وہ رباعی کا ہی حصہ ہے مگر علم دوست ادب نواز حضرات اور صاحب فن اس امر سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں کہ رباعی میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کوئی آسان امر نہیں ہے بلکہ فن شعر میں نہایت مشکل اور دشوار ترین امر ہے کیونکہ چار مصرعوں میں مضمون کا ادا کرنا اور پھر چوتھا مصرعہ ایسا برجستہ اور ایسا پر زور ہونا ضروری ہے جو تینوں مصرعوں کا نچوڑ ہو۔ سنگ لاخ زمین سے جوئے شیر لانا ہے۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ امجد دنیائے سخن میں اقلیم رباعیات کے شہنشاہ ہیں۔ پروفیسر وحید الدین سلیم کا یہ خیال صحیح ہے کہ امجد کی ٹکر کا کوئی رباعی کہنے والا شاعر نہیں ہے۔ ڈاکٹر سر اقبال لکھتے ہیں کہ ہر رباعی قابل داد ہے اور ان کے پڑھنے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ گرامی نے اپنی ایک رباعی میں امجد کا پایہ نہایت عمدگی سے معین کیا ہے۔

امجد بہ رباعی است فرد امجد کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز روح سرمد بگفت "امجد امجد"

ذیل کی دو رباعیاں نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی رباعی میں آیتہ ان اعرضنا الامانتہ الخ کی تفسیر کی ہے۔ لیکن اس انوکھے انداز میں کہ اس میں انفرادی شان پیدا ہو گئی ہے۔

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی نادان سہی سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

دوسری رباعی میں عاشقانہ انداز کی جھلک ہے۔

جی اس کا بھی بھر آیا رولا کر مجھ کو ٹھنڈا نہ رہا خود بھی جلا کر مجھ کو
خود مل گیا خاک میں ملا کر مجھ کو کیا فتح ہوئی شکست کھا کر مجھ کو

بقول عظمت اللہ خاں امجد کی رباعیاں زندگی کے اعلیٰ ترین رُخ کی تفسیر ہیں اور بلحاظ ادب اظہار خیال کا بہترین نمونہ ہیں۔ پروفیسر مناظر حسین گیلانی لکھتے ہیں کہ امجد کا شمار ہندوستان کے ان شعرا میں ہے جن کو زمانہ صدیوں کے بعد پیدا کرتا ہے۔

حضرت امجد کی شاعری حسن و عشق، گل و بلبل کے جھوٹے تذکروں اور بے سروپا خیالی کرشموں سے خالی ہے جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

نہ ذکر بلبل و گل ہے نہ داستان بہار نہ وصف سنبل و ریحاں نہ مدح باد شمال
نہ کوئی لطف زباں ہے نہ خوبی مضمون نہ حسن و عشق کا قصہ نہ شاعرانہ خیال

امجد کے تصانیف اور رباعیات کے مجموعے ان کے زور قلم کے رہین منت ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی دُرشاہوار کہلانے کے مستحق ہیں اور شعریت کے لحاظ سے بھی بلند پایہ ہونے کی حیثیت سے اپنی مثال آپ ہیں اور ان کا شمار علمی خزانہ کے درخشاں گوہروں میں ہے۔

میری آنکھیں اب تک اس مشاعرہ کے منظر کو ڈھونڈتی ہیں جو ۱۹۵۱ء ماہ جنوری کی ۲۹ شب بمقام عثمانیہ کالج کرنول میں مولانا الحاج ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اور جس میں حضرت امجد کی تشریف آوری نے عثمانیہ کالج کی رونق افزائی کے ساتھ بانیان مشاعرہ (طلبہ) کو سرفراز فرمایا تھا۔ مجھ ناچیز کو بھی مقدمات اور گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔ جب ناخدائے سخن امجد حیدرآبادی سحر انگیز رباعیات سنا رہے تھے تو عوام پر خاموشی طاری تھی۔ عوام کا بڑھتا ہوا شوق اور مولانا صاحب کے اصرار نے امجد کو اور چند رباعیات سنانے پر مجبور کر دیا۔ میں بھی ہمہ تن گوش ہو گیا۔ صاحب موصوف کے پڑھنے کا انداز بھی عجب مستانہ تھا۔ ان کے کلام میں جا بجا بجلی سی کوندتی نظر آتی تھی۔ شب کے تین بج چکے تھے مگر امجد صاحب سنا رہے تھے اور عوام سر دُھن رہے تھے۔ مجھے بار بار خیال آرہا تھا کہ "شاعری جزو یست از پیغمبری" کا مصرعہ امجد پر کہاں تک صادق آتا ہے۔ میرے دماغ نے مولانا موصوف کی چند رباعیات محفوظ کر لی تھیں جو حسب ذیل ہیں۔

تن کی ہستی کو چھو نہ کر دوں تو سہی میدان ہوا کو ہو نہ کر دوں تو سہی
ملتا نہیں تو مجھ سے اگر، خیر نہ مل میں بھی اس میں کو تو نہ کر دوں تو سہی

مت سُن پردے کی بات بہرا ہو جا مت کہہ اسرار غیب گونگا ہو جا
وہ روئے لطیف اور یہ ناپاک نظر امجد کیا دیکھتا ہے اندھا ہو جا

کس بت کی تفسیر ہوں معلوم نہیں
کس ہاتھ کی تحریر ہوں معلوم نہیں
ہیں بھول کہ میرے پردے میں ہے درکوئی
صورت ہوں کہ تصویر ہوں معلوم نہیں

بے فائدہ کیا ہے جبہ سائی اچھی
طاعت میں نہیں ہے خودنمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو
حضرت تم سے تو دیا سلائی اچھی

صنعت تیری ہر خار دکھا دیتا ہے
ہر غنچۂ گل تیری صدا دیتا ہے
ہر اصل ۔ اصل معرفت ہے یارب
پتہ پتہ تیرا پتہ دیتا ہے

جنوبی ہند کے سرسید عالی جناب ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب زاد فیوضہم کی نسبت جو رباعی امجد صاحب نے فرمائی تھی ناظرین کی دلچسپی کے لئے اسے بھی یہاں پیش کیا جاتا ہے

۱؎ کیسا کالج بنا دیا تم نے
سرسید کو جگا دیا تم نے
اے عبدالحق خدا تمہیں جزا دے
اچھا حق العباد ادا کیا تم نے

دوسرے دن امجد صاحب چلے گئے ۔ اور میں جب انھیں الوداع کہہ کر کالج کی فضا میں لوٹ آیا تو یہاں کی ٹھنڈی ٹھنڈی خنک ہوائیں مترنم آواز میں پوچھنے لگیں ؎

اے دل ناصر یہ کیا ہے ماجرا
نقش بن کر رہ گئی امجد کی یاد

۱؎ یہ رباعی فاضل مضمون نگار کو صحیح طور پر یاد نہیں رہی ۔ (ادارہ)

روشؔن صدیقی

بنامِ خوش نظراں

عشق دشوار نہیں خوش نظری مُشکل ہے
سہل ہے کوہ کنی شیشہ گری مُشکل ہے

کچھ مرا حسنِ طلب بھی تو ہے شامل لے دوست
ورنہ اس حسن سے بیدادگری مشکل ہے

مسندِ لالہ و ریحاں ہو کہ ہو تختۂ دار
ہم نشیں چارۂ آشفتہ سری مشکل ہے

نکہتِ زلفِ پریشاں نے کیا دیوانہ
ہوش میں آئے نسیمِ سحری مشکل ہے

کاش مل جائے ترا گوشۂ داماں، ورنہ
ختم ہو سلسلۂ جامہ دری، مشکل ہے

یہ حقیقت کوئی اربابِ خبر سے پوچھے
کِس قدر مرحلۂ بے خبری مشکل ہے

کم نگاہی بہت آساں ہے مگر یاد رہے
نکتہ چیں! مرتبۂ دیدہ وری مشکل ہے

طے نہ جب تک ہو روشؔن! منزلِ بیداریٔ دل
حرفِ تاثیرِ فغانِ سحری مشکل ہے

دُعاؔ ڈبائیوی

دُنیائے ہیچ

چار دِن کا لطف دم بھر کی خوشی کچھ بھی نہیں
زندگی سب کچھ ہے پھر بھی زِندگی کچھ بھی نہیں

ایک مجبورِ سراپا کی خوشی کیا رنج کیا
آدمی کی کیا حقیقت، آدمی کچھ بھی نہیں

جل جلا کر شمع نے پُوری تو کر لی زندگی
دل جلا میں ہوں کہ میری زندگی کُچھ بھی نہیں

ہیں وہ بد قسمت ہوں مے خانے میں جب رکھا قدم
کہہ دیا ساقی نے تیرے نام کی کچھ بھی نہیں

ہے غنیمت زندگی میں ایک لمحے کا سکوں
بعد مرنے کے سکونِ دائمی کچھ بھی نہیں

چار دن کی زندگی سب کچھ ہے انساں کے لئے
دیکھنے کو چار دن کی زندگی کچھ بھی نہیں

حسن والوں کا زمانے سے نیا دستور ہے
برہمی ہے اور وجہ برہمی کچھ بھی نہیں

کر دیا مُردہ مجھے صدماتِ پیہم نے دعاؔ
اب مرے حق میں خوشی دنیا خوشی کچھ بھی نہیں

شفیقہ انجم

جسم کی پُکار

ہر سال ماگھ کے مہینے میں پورنماشی کی رات کو میرے گاؤں میں ایک میلہ لگتا ہے۔ گاؤں چھوٹا سا ہے جس کے پچھمی طرف ایک چھوٹی سی ندی بہتی ہے۔ ندی کے دونوں کناروں پر ریت کے چھوٹے چھوٹے سے ٹیلے بن گئے ہیں۔ دن کے وقت دھوپ میں ریت کے ذرّوں کی چمک آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن چاندنی رات میں اس کا منظّرہ بڑا ہی دل کش ہوتا ہے۔ سال کے بہت کم دن ایسے ہوتے ہیں جب اس ندی میں زوروں کا مدوجزر ہوتا ہے۔ ورنہ عموماً یہ ایک ہی چال سے بہتی رہتی ہے۔ بعض اوقات تو یہ اتنی خاموش اور ساکت ہو جاتی ہے جیسے دھوپ میں پڑا ہوا کوئی مُردہ سانپ۔ سطحِ آب پر طرح طرح کے سُرخ، نارنجی، زرد اور کاسنی رنگ کے پھول کھل جاتے ہیں۔ ان کے نام کیا ہیں یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔

ماگھ کے پورے چاند کی رات میں میرے گاؤں کا یہ میلہ سال کا سب سے بڑا تیوہار ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بھی صحیح صحیح نہیں بتلا سکتا کہ یہ سب سے پہلی بار کب لگا تھا۔ بڑے بوڑھے جن کی بھویں تک سفید ہو گئی ہیں۔ کہا کرتے ہیں کہ وہ بھی اس میلے کو اسی شان سے لگتے ہوئے دیکھتے رہے ہیں۔ دا جو دادا تو بڑا مزہ لے لے کر کہتے ہیں کہ جب وہ بچّے تھے تو میلے سے تل کے لڈّو خرید کر کھایا کرتے تھے۔

گاؤں اور اس کے آس پاس بہت سے چھوٹے بڑے شِو مندر ہیں جن کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہزاروں برس پہلے بھگوان وشواکرم نے ماگھ کے پورے چاند کی رات میں زمین پر آ کر خود اپنے ہاتھوں سے ان مندروں کی تعمیر کی تھی جن میں سے اکثر اب خستہ اور برباد ہو چکے ہیں۔ ان میں کبھی بھی کوئی آدمی نہیں جاتا۔ آدمیوں کے نہ جانے کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بھگوان بھوتوں سے خوف کھاتے ہیں بلکہ صرف اس وجہ سے کہ اُن میں طرح طرح کے جھاڑ اور جنگل اُگ آئے ہیں جو اب مستقل طور پر زہریلے اور خطرناک جانوروں کے اڈّے ہیں۔ پوجا تو صرف دو ہی مندروں میں ہوتی ہے جس کے اخراجات کے لئے شہر کا ایک امیر آدمی میرے گاؤں کے ہری ہر پانڈے کو پندرہ روپے مہینہ بھیجا کرتا ہے۔ جو مندر کا پجاری ہے۔ سوائے خاص خاص موقعوں کے ان دونوں مندروں میں بھی دیا نہیں جلتی۔ بیچارے یاتری اور پوجا پاٹھ کرنے والے اکثر اندھیرے میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ لوگ عموماً اشاروں ہی اشاروں میں اپنا کام کر کے چل دیتے ہیں۔

ماگھ کا مہینہ ختم ہو رہا تھا لیکن سردی جانے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ حالانکہ اب سے پہلے اس مہینے کے گذرتے گذرتے ہی دم توڑ دیا کرتی تھی ——

میلے کے کچھ دن پہلے گاؤں کے لوگوں کی حالت عجیب ہو جاتی۔ پورے گاؤں میں افراتفری سی پھیل جاتی۔ بعض دفعہ تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی مریض حالتِ اختلاج میں ہو۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہونے کو ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ اُن کے ذہنوں پر دُھواں سا چھا جاتا۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ہر سال میلے کے بعد کسی نہ کسی اہم واقعے کا ہونا ضروری ہے۔ اس دفعہ نہ جانے کیا ہو؟

گاؤں کی پوربی طرف میدان میں چھوٹے چھوٹے خیمے اور ترپال تانے جا چکے تھے۔ میلے میں دوکانداری کرنے والے لوگ بھی آہستہ آہستہ آنے لگے تھے اس لئے کہ اگر پہلے ہی سے وہ اپنے لئے کسی مناسب جگہ کا انتخاب نہیں کر لیتے اُن کے لئے دوکانداری بے کار تھی۔ تجارت کے لئے موقع محل کے جانچ پڑتال کی بھی بہت اہمیت ہے۔ ندی کے کنارے دونوں طرف بہت ساری چھوٹی بڑی اور نئی پُرانی کشتیاں ٹھہر چکی تھیں جو مختلف دور دراز جگہوں سے آئی تھیں۔ حالانکہ میلہ صرف ایک دن لگتا تھا لیکن اس کے لئے انتظامات بہت قبل ہی سے ہونے لگتے تھے۔ اسی طرح اس کے ختم ہو جانے کے بعد بھی دوکانوں کے اُٹھتے اُٹھتے ایک زمانہ لگ جاتا۔

میلے میں اِدھر اُدھر سے ہزاروں طرح کے لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے۔ اس لئے اس زمانے میں ہمارے گاؤں کے لوگ اپنی چیزوں اور مکان کی رکھوالی

میں ذرا زیادہ ہوشیاری سے کام لیتے۔ رات کو دروازہ بند کر لینے کے بعد دوبارہ تمام مکان کو دیکھ لیتے۔ حد تو یہ ہے کہ جھوٹے برتنوں کو بھی لوگ باہر سائبان میں چھوڑنے کے قائل نہ تھے۔ بہت دنوں کی بات ہے کہ میلے کے ختم ہو جانے کے بعد میرے گاؤں سے دو نوجوان لڑکیاں غائب ہو گئی تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میلے کو غنیمت جان کر وہ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ کہیں بھاگ گئی تھیں۔ جو کچھ بھی ہوا ہو۔ بھاگ گئی ہوں یا بھگا کر لے جائی گئی ہوں۔ لیکن اس وقت سے اتنی بات ضرور ہوئی کہ لوگ اپنی اپنی جوان بیویوں اور بیٹیوں کو نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیتے تھے۔ عورتوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ نہانے یا کپڑے دھونے کے لئے بھی ندی کے کنارے نہ جائیں۔ یوں بھی ندی کے دونوں کناروں پر اتنی طرح طرح کی کشتیاں اکٹھی ہو جاتیں کہ مشکل ہی سے کوئی ایسی جگہ بچ جاتی جہاں نہایا اور کپڑا دھویا جا سکے۔ حالانکہ یہ بہت تکلیف دہ بات تھی خاص کر ان عورتوں کے لئے جن کے مکان کے پاس تالاب نہیں تھا۔ اسی لئے گاؤں کے چند سمجھ دار لوگوں نے بانس کی ایک ٹٹی بنا کر ندی کے کنارے کو کچھ دور تک گھیر دیا تھا کہ اس طرح عورتوں کے لئے کچھ پردہ کا انتظام ہو جائے۔

میلے کے میدان میں پوربی کنارے پر بہت سی دوکانیں کھل گئی تھیں کہیں ہوٹل تھے تو کہیں چائے کی دوکانیں۔ چھابڑی والے الگ شور مچا رہے تھے۔ کپڑے اور لکڑی کے کھلونوں کی دوکانوں کا کیا کہنا۔ ان کے علاوہ بھی تین چار بڑے بڑے شامیانے نصب تھے جو گاؤں کے لوگوں کو جوق در جوق اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ سب سے بڑا شامیانہ بیچ میدان میں تھا جس میں ہر سال ناٹک ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس سال وہ لوگ ایک ڈرامہ پیش کرنے والے تھے۔ یہ تھیٹریکل کمپنی شہر سے آئی تھی۔ اس سال "سیتا کا بن باس" اور "بھگت سورداس" قسم کا کوئی مذہبی کھیل نہیں ہو رہا تھا بلکہ سرت چندر چیٹر جی کا ایک مشہور ڈرامہ پیش کیا جانے والا تھا۔ تھیٹر جس میں ہر طرح کا ساز و سامان ہو، خوبصورت بتیاں، رنگ برنگ پردے اور شاندار اسٹیج، بھلا وہ لوگوں کو اپنی طرف کیوں نہ کھینچتا — رنگیلے نوجوان جو خوب بیڑی پیتے، سر میں سرسوں کا تیل ڈال کر بالوں کو اچھی طرح سنوارتے اور عموماً ندی کے کنارے بانسری بجایا کرتے تھے، اُن کے لئے تو جیسے بہار آ گئی تھی۔ انھیں میں سے ایک نوجوان یہ خبر لایا کہ اس سال ڈاڑھی مونچھ والے مرد اور لونڈے عورتوں کا پارٹ نہیں کریں گے بلکہ تھیٹر والے تو سچ مچ کی لونڈیا لے آئے ہیں۔ وہ اتنی سُندر ہیں، اتنی سُندر جیسے پریوں کی رانی "اروشی"۔ اُن کا رنگ بالکل میم صاحب کی طرح سفید۔ سفید ہے۔ ایک افواہ یہ بھی پھیلی کہ وہ لڑکیاں اتنی حسین ہیں کہ صرف اُن کے حسن کے سہارے تھیٹر والے غیر ممالک کا دورہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ اور گانا تو اتنا اچھا جانتی ہیں کہ جو بھی سُن لے اس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہیں —— وہ لڑکیاں نہیں بلکہ جادو کی گڑیاں ہیں۔

بہت سے بڑے بوڑھے جو صرف مندر کے پاس چبوترے پر بیٹھ کر حقہ پیا کرتے یا تاش اور شطرنج کی بازی لگاتے تھے وہ بھی اس میں دلچسپی لئے بغیر نہ رہ سکے۔ اب ان کا کھیل بند ہو چکا تھا۔ وہ دن بھر آپس میں بحثیں کیا کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ دنیا بہت تیزی سے تباہی کی طرف جا رہی ہے، جبھی تو ہر روز کوئی نہ کوئی نیا کھیل نکل آتا ہے۔ اُن لوگوں نے فیصلہ کیا کہ گاؤں کا کوئی آدمی بھی تھیٹر جانے نہ پائے۔ بلکہ کچھ لوگ ہر گھر میں جا کر دوسروں کو بھی اس فیصلے کی اطلاع دے دیں۔ اگر وہ چاہیں تو اس نوٹنکی کا تماشہ دیکھ سکتے ہیں جس کا ٹکٹ صرف ایک آنہ ہے۔ تھیٹر والوں نے تو چار آنے اور آٹھ آنے کے ٹکٹ رکھ کر گاؤں کو لوٹ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

لیکن ان باتوں کے باوجود ان کا اپنے دلوں پر قابو رکھنا محال تھا۔ انھوں نے سوچا کہ میلے میں تو اتنے سارے جگہ جگہ کے لوگ ہوتے ہیں کہ اگر ہم خود کو اچھی طرح چھپا لیں اور بیچ بیچ کر اندھیرے میں چلیں تو ممکن ہے کہ گاؤں کے لوگ ہمیں نہ پہچان سکیں اور اس طرح ہمیں بھی تھیٹر دیکھنے کا موقع مل جائے جس کی اتنی شہرت ہے۔

میدان میں دکنی طرف ایک ہی قطار میں تین خیمے نصب تھے۔ ان میں سے ایک میں بائیں طرف فوٹوگرافر کی دوکان تھی جہاں صرف آٹھ آنے میں بیس منٹ میں فوٹو کھینچ کر تیار کر دی جاتی تھی۔ لوگ وہاں ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ طرح طرح کی تصویریں کھینچی جا رہی تھیں۔ گاؤں والوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا اور شاید آخری بھی کہ وہ اپنی تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ وہاں شاید ہی ایسے ایک دو خوش قسمت انسان ہوں گے جنھوں نے اپنی پوری زندگی میں دوبارہ تصویریں کھنچوائی ہوں۔

اس کے بعد والا دوسرا خیمہ بھی بڑا دلچسپ تھا جس کے دروازے کے سامنے لکڑی کے خالی بکسوں کو اکٹھا کر کے ایک اسٹیج سا بنا لیا گیا تھا۔ اداس

پر ایک شخص کھڑا چلّا رہا تھا :-

" آیئے آیئے دو آنے میں

صرف دو آنے میں ..... ایک تماشہ

بالکل عجیب تماشہ ....

کمر سے اُوپر ایک جوان لڑکی اور کمر سے نیچے صرف تین برس کی بچّی

خوبصورت لڑکی، حسین لڑکی، بالکل عجیب لڑکی

صرف دو آنے میں ——— "

آواز لگانے والے نے اپنی ہیئت بھی عجیب بنا رکھی تھی جسے دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آ ئے۔ اس نے پھٹی ہوئی سیاہ پتلون کے اوپر ایک سلکن جمپر پہن رکھی تھی۔ ایک گال پر سفیدی پوت رکھی تھی اور دوسرے پر سیاہی۔ اُس نے اپنی ٹوپی کو بھی چونے سے سفید کر لیا تھا۔ اس کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر راہگیر خواہ مخواہ ٹھٹک جاتے۔ وہ کبھی گاتا، کبھی عجیب عجیب نقلیں اُتارتا، کبھی درجنوں گز لمبا کاغذ اپنے منہ سے کھینچ کر باہر نکالتا اور اپنے کرشموں سے جب لوگوں کو اکٹھا کر لیتا تو پھر پیتل کی گھنٹیاں لے کر بجانا شروع کر دیتا اور چلّاتا :-

" خوبصورت لڑکی، حسین لڑکی، بالکل عجیب لڑکی

صرف دو آنے میں ———

کمر سے اوپر جوان عورت اور کمر سے نیچے صرف تین برس کی بچّی

بالکل نیا تماشہ، عجیب تماشہ!

صرف دو آنے میں ——!

خیمے کے دروازے پر کپڑے کے پردے پر ایک لڑکی کی تصویر بھی پینٹ کی ہوئی لٹک رہی تھی جو بڑی وحشت ناک دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کی کمر کے اُوپر کا حصّہ تو واقعی بالکل جوان عورت کا سا تھا لیکن نچلا حصّہ بچّوں جیسا۔ اس قسم کا حیرت انگیز تماشہ اب سے قبل میرے گاؤں میں کبھی نہیں آیا تھا اس لئے اس خیمے کے سامنے سب سے زیادہ بھیڑ تھی۔ جب بھی کوئی آدمی اندر سے تماشہ دیکھ کر لوٹتا تو لوگ اُسے چاروں طرف سے گھیر لیتے اور طرح طرح کے سوالات کرتے۔

ایک بہت ہی باتونی آدمی جو تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتا تھا اور ایک دو شہر سے بھی ہو آیا تھا۔ جب باہر آیا تو اس نے عجیب انداز سے کہا —

'ونڈرفل، ونڈرفل، کیا قابلِ دید چیز ہے؟ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ پھر ایک نوجوان لڑکا خیمے سے نکلا اور اس نے اس باتونی آدمی سے پوچھا۔ "کیا آپ نے تماشہ دیکھ لیا؟"

"کیوں نہیں میں تو پہلا شخص ہوں دیکھنے والا۔"

"میرا مطلب ہے آپ نے ہر چیز دیکھا —؟"

"ہر چیز سے کیا مطلب —؟"

"ہر چیز کا مطلب ہر چیز ——" پھر اس لڑکے نے اپنا منھ اس کے کان کے پاس لے جاکر کہا۔ "اگر کوئی چار آنے ادا کرے تو وہ اس لڑکی کے کپڑے بھی اتروا کر دیکھ سکتا ہے"

"ہاں قسم —! سچ؟"

ہاں قسم —! اگر کوئی آٹھ آنے ادا کرے تب تو وہ اُس لڑکی کو چھو کر بھی دیکھ سکتا ہے۔ پھر اُس لڑکے نے اپنا منہ اُس آدمی کے کان کے پاس لے جا کر کہا۔ "میری تو آج پوری اٹھنی خرچ ہو گئی۔ تھیٹر کیسے دیکھوں گا؟"

اس سے ملا ہُوا ایک اور خیمہ تھا جس کے سرے پر موٹے حروف میں "پیراڈائز ریسٹوران" کا بورڈ لٹک رہا تھا۔ اندر معمولی قسم کی چار پانچ لکڑیوں کی میزیں اور لوہے کی کُرسیاں پڑی تھیں جن پر دیہی بڑی پینے والے نوجوان اور چند سن رسیدہ لوگ بیٹھے گرم گرم چائے طشتریوں میں ڈھال ڈھال کر پھونکیں مار مار کر پینے میں مشغول تھے۔ اندر کی فضا تیل میں تلی ہوئی چیزوں کی بُو سے بس رہی تھی۔ ساتھ ہی ایک اور جھونپڑا تھا جس کے سامنے ایک آدمی لانبا کرتا پہنے کپڑے کے تھیلے کو لکڑی کے ایک صندوق پر رکھے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ اور بھورے رنگ کی گھنی گھنی داڑھی تھی اور مونچھوں نے تو پورے طور پر اس کے منہ کو ڈھک لیا تھا۔ لوگ اس کو بھی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ سنا جاتا تھا کہ وہ ہر مرض کا علاج کرتا ہے۔ اس کے پاس ایسی عجیب و غریب دوائیاں ہیں کہ وہ انھیں سے ہر قسم کی خراب سے خراب اور پُرانی سے پُرانی بیماریوں کا علاج کر کے صرف چند گھنٹوں میں اچھا کر دیتا ہے۔ بیشتر اوقات وہ خاموش ہی رہتا البتہ کبھی کبھی زور کی آواز لگا دیتا تھا اس کی ہیئت کذائی، بھاری بھرکم آواز اور ڈاڑھی مونچھیں کچھ ایسی ہیبت ناک تھیں کہ لوگوں کو اس کی باتوں کا یقین کرنا ہی پڑتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جنگلی جڑی بوٹیوں کا ماہر ہے اور کچھ دوائیں اُس نے انگلینڈ سے بھی منگوائی ہیں۔

بھیڑ سے نکل کر ایک آدمی کانپتا ہوا ڈاکٹر کے پاس آیا۔ اس نے ایک بوسیدہ سا جاپانی کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ اور سر ایک لانبے کپڑے

سے بندھا ہوا تھا اور چہرے سے شدید قسم کے کرب اور اضطراب کا احساس نمایاں تھا۔ اس نے اپنی کانپتی ہوئی آواز میں جو کچھ بھی کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ چار دن ہوئے اس کی ڈاڑھ میں درد شروع ہوا جو بڑھتا ہوا آج اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ گال پھول کر کُپّا ہو چکا ہے اور بات کرنی مشکل ہے۔ درد میں اتنی شدت ہے کہ جیسے سر پھٹا جا رہا ہے۔ پچھلے چار دن اور چار راتوں سے نہ تو اس نے ایک دانہ کھایا ہے اور نہ ہی اس کی آنکھ ہی لگی ہے۔ اس نے اپنا علاج گاؤں کے وَید سے بھی کرایا لیکن درد گھٹنے کے عوض اور بڑھتا ہی چلا گیا۔

ڈاکٹر نے اپنے بغچے سے ایک ٹارچ نکالا۔ پھر سنجیدگی سے بولا "ذرا مُنہ تو کھولو۔"

بڑی مشکل سے اس بے چارے نے اپنا منہ کھولا۔ ڈاکٹر نے بڑے غور سے اس کا معائنہ کیا اور بولا "علاج ہو جائے گا۔ لیکن دوا کی قیمت دو روپے ہوگی۔"

"دو روپے ۔۔!" بڑے تعجب اور بڑے کرب سے اس آدمی نے کہا "میں دو روپے کہاں سے لاؤں، ڈاکٹر صاحب! وَیدجی نے صرف دو ہی آنے میں دوا دے دی تھی۔"

"تب تم اپنے وَیدجی کے پاس کیوں نہیں جاتے؟" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "تمھاری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ خدانخواستہ ایک دو دن یہی حالت رہی تو پھر تمھارا بچنا مشکل ہو جائے گا۔ میں تم سے چالبازی نہیں کر رہا ہوں، اور نہ ہی تم سے روپیہ ٹھگتا ہوں۔ میں تم کو دوا دیتا ہوں۔ اگر دس منٹ میں فائدہ نہ ہو تو پیسے مت دینا۔"

دوسرے لوگوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی

دس منٹ میں درد رفع ہو جانے کے خیال نے اس آدمی کو بے چین کر دیا۔ پھولے ہوئے گال کو بڑی مشکل سے حرکت دیتا ہوا بولا "لیکن دو روپے میں کہاں سے لاؤں؟ اگر میں تم کو ہی دو روپے دے دوں تو کھاؤں گا کیا میری بیوی بھی ہے اور چار پانچ بچے بھی ہیں اور پھر۔۔۔۔۔"

ڈاکٹر بیچ میں بول پڑا "دیکھو! اپنی تکالیف کا ذکر کرکے میرا وقت برباد نہ کرو۔ نہ کسی نے آج تک مجھ پر رحم کیا ہے اور نہ میں کسی پر رحم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سب بالکل فاضل باتیں ہیں۔ دوا کی تجارت کرتا ہوں، پیسے ہوں تو دوا لو ورنہ چلتے بنو!"

مریض نے کسی وجہ سے اپنا خیال بدل دیا اور آگے آیا۔ "اچھا تو دوا دے دیجئے۔ لیکن ہاں، جب تک درد کم نہیں ہو جاتا۔ میں ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔"

"ٹھیک ہے ۔۔۔ اگر درد کم نہ ہو تو مت دینا۔ اتنے سارے لوگ موجود ہیں۔ گواہ رہیں گے۔"

ڈاکٹر نے اپنے بغچے سے تھوڑی سی سوکھی ہوئی پتیاں نکالیں اور انھیں اپنی ہتھیلی پر مسل مسل کر بالکل سفوف بنا دیا۔ پھر ایک چھوٹے سے گلاس میں تھوڑا سا پانی لے کر ایک بوتل سے چند قطرے عرق کے ٹپکائے اور گلاس کو ہلا مارا۔ پھر مریض کو پلا دیا۔ دوا پلانے کے بعد اس نے مریض کو منہ پھاڑنے کے لئے کہا اور اس کے سُوجے ہوئے مسوڑے پر سفوف مل دی اور بولا تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔ پہلے تمھارے مُنہ سے بھاپ ٹپکے گا پھر درد جاتا رہے گا۔

آس پاس جتنے لوگ بھی بیٹھے تھے بڑے تعجب سے دونوں کی حرکتوں کو دیکھ رہے تھے۔ دس منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ وہ آدمی اُٹھ کھڑا ہُوا ۔۔۔!

"کیوں جی درد اچھا نہیں ہُوا" ڈاکٹر نے بڑے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

"درد تو سچ مچ غائب ہو گیا۔ تمھاری دوا ہے یا جادو کی پڑیا" مریض نے جواب دیا۔ جتنے لوگ وہاں موجود تھے اس عجیب و غریب معاملے سے بڑے متعجب اور حیران ہوئے۔ پھر مختلف قسم کے لوگوں نے مختلف قسم کی خیال آرائیاں شروع کیں۔ لیکن ڈاکٹر بولا ۔۔۔ "دیکھو جی، جانے سے قبل میرا روپیہ ادا کرتے جاؤ۔"

مریض نے کمر سے روپیہ نکالا اور چاہتا تھا کہ کچھ بولے۔ لیکن اس کی نظر ڈاکٹر کے چہرے پر پڑ گئی پھر تو وہ بغیر کچھ کہے سُنے ہی روپیہ دے کر چلتا بنا۔

آخر رفتہ رفتہ یہ افواہ گرم ہوئی کہ میلے میں ایک ایسا ڈاکٹر آیا ہے جو ہر قسم کا علاج چند منٹوں میں کرتا ہے۔ اس کے پاس طلسمی طاقت ہے۔ اس نے نہ جانے کتنے مُردوں کو جلا دیا ہے پھر تو ڈاکٹر کے پاس ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ جن میں سے اُن لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جو اپنے رشتہ داروں کے لئے دوائیاں خرید رہے تھے۔ ڈاکٹر نے سارے لوگوں کو یقین دلایا کہ تین دنوں کے اندر دوا ضرور کارگر ہوگی۔ بے کار نہیں جا سکتی۔ لیکن ڈاکٹر پیسوں کے معاملے میں اتنا سخت تھا کہ وہ کسی کو ایک پائی بھی چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

اچانک ایک بوڑھی عورت روتی پیٹتی ڈاکٹر کے پاس آئی اور اس کے

قدموں پر گر پڑی - اس نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کا اکلوتا لڑکا پچیس دنوں سے بخار میں مبتلا ہے - بخار ہے کہ ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا - بلکہ کل سے تو اس کی سانس بھی رک رُک کر آنے لگی ہے اور بے ہوش ہے - وہ اپنے لڑکے کے لئے دوا کی خواستگار تھی

بہت ہی سنجیدہ چہرہ بناتے ہوئے ڈاکٹر بولا۔ "پانچ روپے۔"

"پانچ روپے ؟" بوڑھی عورت پھر سسکیاں بھرنے لگی - "پانچ روپے ؟ رحم کرو بابو مجھ غریب بیوہ عورت پر رحم کرو - میرا اس دُنیا میں کوئی نہیں - میرے اکلوتے بچے کو بچا لو رحم کرو، ڈاکٹر بابو ! رحم !!"

ڈاکٹر نے پھر وہی جواب دیا۔ جو اب سے پہلے ایک آدمی کو دے چکا تھا۔ "میں نے کسی پر آج تک رحم نہیں کیا ہے اور نہ کسی نے مجھ پر ہی رحم کیا - میں کسی پر رحم نہیں کرتا، میں دوا بیچتا ہوں ۔"

بوڑھی عورت اس کے قدموں پر گر پڑی - "پھر کیا ہوگا ڈاکٹر بابو، کیا میرے بچے کو مر جانے دو گے ؟ نہیں نہیں، اسے بچا لو، تم ہی اُسے بچا سکتے ہو، بابو ! رحم کرو، رحم ۔"

ڈاکٹر نے پھنکارتے ہوئے کہا - "میں کچھ نہیں کر سکتا - تم ہی بتلاؤ اگر میں اسی طرح رحم کرتا رہوں تو میرا کام کیسے چلے گا - میں کسی پر رحم نہیں کھاتا - تم پانچ روپے ادا کر دو تو دوا لو، ورنہ اپنا راستہ پکڑو ۔"

رات کافی ہو چکی تھی اور بیشتر دوکانوں کی بتیاں گل ہو چکی تھیں صرف تھیٹر کی بڑی بڑی بتیاں روشن تھیں اور میلے کے تمام لوگ اسی کے گرد جمع تھے۔ تھیٹر اپنے عروج پر تھا۔ جوان اور بوڑھے، مرد اور عورتیں سب کے سب وہاں جمع تھے - ناٹک کمپنی والوں نے ابھی اپنا کھیل شروع کیا ہی تھا کہ یہ خبر پھیل گئی کہ ایسا تھیٹر تو میلے میں کبھی آیا ہی نہ تھا اور نہ ایسی چیز کبھی دیکھنے اور سننے میں آئی - نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں لوگ ناٹک سے نکل نکل کر تھیٹر کے خیمے کی طرف لپکے - بڑی پیٹ والے نوجوان، ادھیڑ عمر کے لوگ جو دن بھر جھونپڑے میں بیٹھے تاش یا شطرنج کھیلا کرتے اور حقّہ پیا کرتے اور وہ عورتیں جو چھوئی موئی کی طرح سنبھال کر رکھی جاتی تھیں، سب ہی دوڑ پڑے۔ تھیٹر کے اندر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی - کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو خود کو چادروں اور کمبلوں سے اچھی طرح لپیٹے ہوئے تھے خیمے کے ارد گرد منڈلا رہے تھے - انھیں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا - البتہ مکالموں کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے سُن پاتے اور کبھی کبھی گانوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی جس سے اُن کی تشفی ہو جاتی تھی اور وہ لوگ اسی سے مسرور ہو رہے تھے -

میلے میں شاید ڈاکٹر ہی ایسا شخص تھا جو تھیٹر نہیں گیا تھا - وہ اپنے جھونپڑے میں بیٹھا پاسنگ شو کے کش لگا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ سگریٹ ختم ہو جانے کے بعد سو جائے کہ اچانک رونے کی آواز سُنائی دی - آواز کسی لڑکی کی تھی جو پاس ہی کے خیمے سے آ رہی تھی -

"اُف ! لعنت ہے اس زندگی پر، اس وقت آدھی رات کو بھی چین نہیں - میں تو تنگ آ گیا ہوں اس سے ! تھوڑی دیر تک وہ یونہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ تاریکی اب اُسے بھیانک دکھائی دے رہی تھی - حالانکہ باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی - اس نے زور کا ایک کش لیا اور سگریٹ پھینک دیا - تھیٹر سے ایک لڑکی کے گانے کی ٹوٹی پھوٹی آواز یہاں پہنچ رہی تھی لیکن دوسری آواز زیادہ صاف اور نمایاں سُنائی دے رہی تھی جسے ڈاکٹر سننا نہیں چاہتا تھا - گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز تاریکیوں کو چیر رہی تھی - ڈاکٹر سے نہیں رہا گیا - وہ باہر نکل آیا - پہلے تو اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ سسکیوں کی آواز کہاں سے آ رہی ہے - دو چار قدم بڑھنے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ چائے خانے کے بازو والے خیمے سے سسکیاں پھوٹ رہی ہیں۔ ڈاکٹر اور آگے بڑھا - یہاں تک کہ اب وہ اُس خیمے کے دروازے کے سامنے تھا، جس میں دن بھر آج ایک عجیب و غریب لڑکی کا تماشہ دکھلایا جا رہا تھا۔

سسکیاں پھر شروع ہو گئیں - آواز کسی لڑکی کی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُسے ہچکی بندھ گئی ہے -

"کون ہے اندر — ؟ کیا ہوا ہے ؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

کوئی جواب نہ آیا — سسکیاں بند ہو گئیں - تھوڑی دیر کے بعد پھر جاری ہو گئیں -

"اُف کیا مصیبت ہے ؟ کون ہے اندر ؟" ڈاکٹر نے پھر پوچھا۔

ہچکیوں کی آواز پھر بند ہو گئی - دھیمی سی کسی لڑکی کی آواز سنائی دی -

"میں ہوں یہاں ۔"

"کون ہو تم — ؟"

"میں — میں کوئی نہیں"۔ ہچکی پھر شروع ہو گئی -

"ہے بھگوان — !" "کوئی نہیں ۔" کیا تم لڑکی نہیں ہو، تمہاری آواز سے تو یہی پتہ چلتا ہے ۔"

کوئی جواب نہیں ——

"کون ہے اندر ——" ڈاکٹر نے کسی انجان کو پھر خیمے میں مخاطب کیا۔

"کوئی نہیں ۔" اندر سے جواب آیا۔ سب لوگ تتر بتر ہو گئے ہیں۔"

"صرف تم یہاں ہو ——؟"

"ہاں —— صرف میں ہوں!"

ڈاکٹر نے اپنی جیب سے ٹارچ نکالی اور خیمے کے پردے کو اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اُسے خیمے کے اندر مختلف چیزوں کے درمیان لکڑی کا ایک صندوق دکھائی دیا۔

"کہاں ہو تم؟" ڈاکٹر نے پوچھا

"اس بکس کے اندر۔" ڈاکٹر کو سخت تعجب ہوا۔ اُس نے آگے بڑھ کر صندوق کے ڈھکنے کو اٹھا دیا۔ دیکھا کہ بکس کے اندر ایک کپڑا بچھا ہوا ہے اور وہ لڑکی اسی میں لیٹی ہوئی ہے۔ ایک پرانا اور خستہ کمبل اس کے جسم پر پڑا ہوا ہے اس کے سر پر خوبصورت گھنگھریالے بالوں کا گچھا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان ہی ہوگی۔ لیکن اتنا چھوٹا بکس ایک جوان لڑکی کے لئے کافی ہو گیا ہے، معاملہ ذرا پیچیدہ تھا۔

"آخر تم ہو کون ——؟" ڈاکٹر نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ اس بکس میں کیوں پڑی ہو اور رو کیوں رہی ہو؟"

"تم مجھے جانتے ہی نہیں ——؟ بڑے تعجب کی بات ہے! تم نے مجھے دیکھا بھی نہیں جبکہ میلے کے ہر شخص نے مجھے دیکھا ہے۔ دو آنے میں مجھے صرف دیکھا جا سکتا ہے، چار آنے میں مجھے ننگا کیا جا سکتا ہے اور آٹھ آنے میں تو جیسے چاہو اور جس طرح چاہو، مجھے چھو سکتے ہو، صرف ایک بار —— لیکن اس معاملے میں تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تمہیں پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اب تم بغیر خرچ کئے ہی دیکھ سکتے ہو، سارے تماشے۔ ارے وہاں کیوں کھڑے ہو، مجھے دیکھو، میری طرف دیکھو، نگاہوں کی پیاس بجھاؤ، کھینچ لو کمبل، دیکھو اور خوب دیکھو! چھوؤ اور اچھی طرح چھوؤ۔ میں عجیب لڑکی ہوں، بالکل عجیب، ایک تماشہ! کمر سے اوپر سولہ سال کی ایک دوشیزہ اور کمر سے نیچے ایک دودھ پیتی بچی ——......"

ڈاکٹر ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آج زندگی میں پہلی بار وہ خود کو گونگا محسوس کر رہا تھا۔ کہنے کے لئے اُس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔

"کیوں، تمہیں انتظار کس بات کا ہے؟ تم میں اتنی جرأت نہیں کہ اس کمبل کو اتار پھینکو۔ اچھی بات ہے۔ تمہارے لئے یہ کام میں خود ہی کئے دیتی ہوں۔ اور اچانک لڑکی نے کمبل کو جھٹک کر پھینک دیا۔ ڈاکٹر کو سخت دھچکا سا لگا۔ اس کے سامنے ایک نوجوان لڑکی کا ننگا جسم تھا۔ اوپر کا حصہ واقعی سولہ سالہ دوشیزہ کا سا جیسا تھا۔ البتہ کمر سے نیچے کا حصہ ڈھائی تین سال کے بچوں جیسا تھا۔

ڈاکٹر نے ٹارچ بجھا دیا۔ اور کمبل بڑھاتے ہوئے بولا۔ "چھپا لو —— چھپا لو اپنا بدن!"

"کیوں ——؟" تاریکی میں لڑکی کی متحیر آواز گونجی، کیا تم خوفزدہ ہو گئے۔ مجھ کو تو اتنے سارے لوگ دیکھتے ہیں لیکن کوئی بھی نہیں ڈرتا۔"

"چھپا لو —— چھپا لیا تم نے اپنا بدن؟" ڈاکٹر بولا۔

"ہاں چھپا لیا —— اب روشنی کر دو!" لڑکی بولی

ڈاکٹر نے ٹارچ جلایا۔ لڑکی نے اسی بوسیدہ اور خستہ کمبل سے اپنا جسم چھپا لیا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب تم ہی بتاؤ، میں کون ہوں؟ کیا میں انسان ہوں۔ تم نے تو میرا پورا جسم دیکھ لیا ہے"

"تم —— تم —— ایسی کیسے ہو گئیں، کیا تم ایسی ہی پیدا ہوئی تھیں؟"

"نہیں —— جب ہم لوگ پیدا ہو گئے......

ڈاکٹر نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی۔ "ہم لوگ —— ہم لوگ کا کیا مطلب؟"

"اوہ! ہم دونوں —— میں اور میری بہن! ہم دونوں ایک ساتھ ہی پیدا ہوئیں۔ پیدائش کے کچھ دن بعد جب ہم دونوں بیٹھنے کے قابل ہو گئیں تب ہمیں ہانڈیوں میں بٹھا دیا گیا۔ چنانچہ جسم کے اوپری حصے کی نشوونما تو فطری طور پر ہوئی لیکن نچلا حصہ جو ہانڈی کے اندر قید تھا ویسا ہی رہا۔ آخر چودہ سال بعد جب ہانڈی خود بخود ٹوٹ گئی تو ہم دونوں کو نجات ملی۔ چودہ سال بعد —— آیا سمجھ میں۔"

تم چودہ سال تک ہانڈی میں رہیں؟" ڈاکٹر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ حیرت اور تعجب کے ملے جلے آثار اس کے چہرے پر نمایاں ہو گئے۔ "ناممکن ہے! تم اس میں رہ کیسے سکیں؟"

"اوہ! میں سمجھی۔ ایک گول سوراخ ہانڈی کے پیندے میں کر دیا گیا تھا۔ کیوں، اب آ گئی سمجھ میں بات! ہمارا شمار جانوروں میں تھا لیکن جب میں

لانڈی سے باہر آگئی تو پھر نہ جانوروں میں رہی نہ انسانوں میں۔ اسی لئے تو ہزاروں آدمی مجھے دیکھنے آتے ہیں۔ سیکڑوں آدمی تمھاری طرح دم بخود رہ جاتے ہیں اور میرا باپ کافی آمدنی کرتا ہے۔"

"کیا بولتی ہو تم — ڈاکٹر بولا۔ تمھارا باپ؟ — کون ہے تمھارا باپ؟؟"

"کیوں — اس میں تعجب کی کون سی بات ہے! میرا باپ ہی تو ہے جو لوگوں کو تماشہ دکھلاتا ہے۔ جو لوگوں سے یہ سرگوشیاں کرتا ہے۔ کہ "اگر چار آنے دوگے تو ہر چیز کھول کر دیکھ سکتے ہو اور آٹھ آنے میں ایک بار چھو بھی سکتے ہو۔"

لڑکی نے بڑی رقت آمیز انداز میں یہ باتیں بتائیں۔ تھوڑی دیر چپ رہی پھر رونے لگی۔ "تین سال ہوئے کہ میری بہن یکایک مر گئی اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ حیرت ہے کہ مجھے موت کیوں نہیں آتی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں کب مروں گی؟" ڈاکٹر سے جواب سنے بغیر ہی وہ پھر کہنے لگی۔ "میرا دماغ میرے جسم کے اوپری حصے ہی کی طرح بالغ ہے جیسا کہ ایک اٹھارہ سالہ دوشیزہ کا ہونا چاہئے۔ لیکن نہ میں انسان ہوں اور نہ جانور۔ میرے تصورات اور میری خواہشات کی کیا قیمت؟ میری خوبصورتی اور شرم و حیا کا کوئی مصرف بھی ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ تم صرف چار آنے میں میرے جسم کو ننگا کر کے دیکھ سکتے ہو، آٹھ آنے میں میرے نازک اور خوبصورت جسم کو چھو سکتے ہو، اس کی نرمی اور گرمی کو محسوس کر سکتے ہو۔ اگر میں اعتراض کروں تو میرے لئے زدوکوب اور فاقہ کشی ہے، میں کہیں بھاگ بھی تو نہیں سکتی۔"

لڑکی پھر رونے لگی اور سسکیاں بھرنے لگی۔ پھر اچانک رُک کر بولی "لیکن تم کون ہو؟ تم نے تو اپنے بارے میں کچھ بتلایا ہی نہیں؟ تعجب تو مجھے اس بات پر ہے کہ تم نے مجھے اب تک دیکھا ہی نہیں تھا اور پھر تم گھبرائے بھی نہیں گئے۔ آخر تم کس قسم کے انسان ہو؟"

"میں ڈاکٹر ہوں — !"

ڈاکٹر — ! لڑکی بے ساختہ ہنس پڑی۔ "تم کس قسم کی بیماری کا علاج کرتے ہو۔ کیا تم مجھے اچھا کر سکتے ہو؟"

"بے شک — میں تمھیں تندرست کر دوں گا — " ایسا محسوس ہوا جیسے ڈاکٹر کچھ سوچ رہا ہو۔ "تم ایک شیشی دوا میں بالکل درست ہو سکتی ہو۔"

"میں بالکل اچھی ہو جاؤں گی؟ — تندرست؟؟" لالٹین کی روشنی میں لڑکی کی آنکھیں چمک اٹھیں — "میں اچھی ہو جاؤں گی؟ — چلنے کے قابل ہو جاؤں گی — ؟؟ ایک انسان بن جاؤں گی؟؟"

"ہاں۔" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تب مجھ پر رحم کرو ڈاکٹر — کوئی دوا دو جلد — رحم —" لڑکی گڑگڑانے اور منت کرنے لگی۔

رحم — رحم — رحم جیسے ڈاکٹر کو موت سونگھ گئی۔ اس نے اپنی ہتھیلی تنفیذت سے مشتدہ کیا۔ میں جب رحم کا نام سنتا ہوں تب میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ میں نے آج تک کسی پر رحم نہیں کیا ہے اور نہ کسی نے مجھ پر — میں کیوں تم پر مہربانی کروں — کیوں — کیوں — کیوں — اس کا سر چکرانے لگا۔

ڈاکٹر اب اپنے جھونپڑے میں واپس آ گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے پنچ پر بیٹھا رہا۔

پورن ماشی کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ دودھ کی سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ جھینگروں کے گانے کی جستہ جستہ آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی اور اسی میں ملی جلی لڑکی کی سسکیاں بھی۔ وہ ہچکیوں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈاکٹر سحر زدہ سا پندرہ منٹ تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھا اور ایک بوتل اُٹھا لایا۔ تھیلے سے ایک سفید سفوف کی پڑیا نکالی اور پھر دونوں کو ایک گلاس میں تھوڑے سے پانی میں ملا کر ہلانا شروع کیا۔ پھر ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں گلاس کے ساتھ لڑکی کے خیمے کی طرف بڑھا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ دروازے پر ٹھٹھکا پھر اندر داخل ہو گیا۔

روشنی دیکھ کر لڑکی خاموش ہو گئی اور بولی — "کون ہے؟"

"میں ہوں ڈاکٹر — دوا لے آیا ہوں!" وہ بکس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اب کچھ مت بولو۔ اور یہ دوا پی لو۔ تمھیں نیند آ جائے گی، پُرسکون نیند — اور جب اُٹھو گی تو دیکھو گی کہ تم بالکل تندرست ہو — انسان بن گئی ہو!"

لڑکی نے اپنا منھ کھول دیا۔ ڈاکٹر نے دوا انڈیل دی۔

"میں اچھی ہو جاؤں گی نا، کیوں —" لڑکی نے پوچھا جیسے یقین نہیں آ رہا ہو۔ ڈاکٹر باہر نکل آیا اور اس نے گلاس کو زمین پر پٹک کر چکنا چور کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر اپنے خیمے کے باہر دکھلائی دیا۔ ایک تھیلا اُس کے کاندھے سے لٹک رہا تھا اور ایک گٹھڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اُس نے کسی طرف نہیں دیکھا۔ جس راستے سے آیا تھا خاموشی سے اُسی پر چل پڑا ۔

محمد امین

چاند کا سفر

زمین پر آبادی بڑھ رہی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو بسانے کے لئے روز روز ہمارے سیارے یعنی زمین پر جگہ محدود ہوتی جا رہی ہے۔ امریکہ، روس اور برطانیہ کے سائنس داں تجربے اور تحقیقات کر کے چاند پر جلد سے جلد پہنچنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔

بمبئی، کلکتہ، رنگون، پیکنگ، ماسکو، لندن، نیویارک تک سفر کرنے کی خبر تو سنتے رہتے ہیں، لیکن چاند کا سفر بالکل ہی انوکھا خیال ہے۔ بھلا چاند تک بھی کوئی سفر کر سکتا ہے۔ وہ تو زمین سے لاکھوں میل دور ہے۔ سمجھ لو ۲,۴۰,۰۰۰ میل۔ بھلا اتنی دور کا سفر وہ بھی آکاش میں۔ نہ معلوم کس قدر سنسنی خیز ہوگا۔

جنھیں ہوائی جہاز میں اُڑنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ کس قدر لطف آتا ہے، اگر ایک ایسا ہوائی جہاز بنایا جائے جو ایٹم کی طاقت سے اُڑے۔ پھر ہوا میں سے ہو کر ہم بہت تیز سفر کر سکیں گے، ایسے جہاز میں بیٹھ کر اُڑتے اُڑتے جب ہم اوپر ایک ہزار میل پہنچ جائیں تو وہاں کی دنیا ہی عجیب دنیا ہوگی۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں چاند اور زمین دونوں کی قوتِ کشش بالکل برابر ہے۔ وہاں پر ہم ایک مصنوعی چاند بنائیں گے جو چاند کے چاروں طرف گردش کرے گا، اور ہم بھی اس پر قیام کر کے چاند کے ارد گرد چکر کاٹیں گے۔ چاند پر پہنچنے کے لئے یہی ہمارا پہلا اسٹیشن ہوگا۔



چاند پر پہنچ کر اگر ہم اپنی زمین کو دیکھیں تو اس کی سطح کچھ اس طرح کی دکھائی دے گی

اس سلسلے میں اب تک ہمارے سائنس دانوں نے ایک ایسا راکٹ بنا لیا ہے جو ۲۵۰ میل کی بلندی پر ۵۱۵۰ میل فی گھنٹہ یعنی ۱½ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے اُڑ چکا ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک دوسرا راکٹ بنائیں جس کی رفتار پانچ گنی زیادہ ہو یعنی فی سیکنڈ ۷½ میل۔ جس دن ہم نے اس قسم کا ہوائی جہاز بنا لیا اُڑان کے وقت یہ جہاز با آسانی زمین کی قوتِ کشش سے نکل جائے گا، اور پانچ دن کے اندر اندر چاند پر پہنچ جائے گا۔

بعض لوگوں کو خطرہ ہے کہ ہزاروں میل کی اڑان کے دوران میں وزن گھٹنے اور ہمارے اعضا پر جو اس کے اثرات ہوں گے وہ بہت تکلیف دہ ہوں گے، اور اس اذیت

کو جھیلنا ناممکن ہوگا۔ لیکن تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ ۴۰ میل کی اونچائی پر راکٹ میں اڑان کرنے کے بعد بندر اور چوہے صحیح سلامت، زندہ بلا کسی قسم کے نقصان کے واپس آگئے ہیں۔ وزن گھٹنے کا جو بھی تجربہ ہوا یہ جانور بآسانی اسے برداشت کر گئے۔ اسی بنا پر ڈاکٹروں کو یقین ہے کہ انسان بھی اسے جھیل جائے گا۔

بہت بلندی تک اُڑنے میں سب سے زیادہ تکلیف اسی بات سے ہوگی اور ماہرین کا خیال ہے کہ اسے برداشت کرنے کی طاقت انسان میں موجود ہے۔ ایورسٹ کی چوٹی کی فتح کے بعد تو اب لوگوں کے حوصلے اور بڑھے ہوئے ہیں۔ پھر تو فی سیکنڈ ۷½ میل کی رفتار سے اڑنے والا ایک راکٹ چاہیئے۔ اسی کا انتظار ہے، اور جس دن یہ راکٹ بنا سمجھو انسان چاند پر پہنچا۔

راکٹ کے متعلق کئی ایک ملکوں میں تجربے اور تحقیقات جاری ہیں۔ برطانیہ میں سو کارخانے اور چار ریسرچ اسٹیشن اڑن طشتریاں بنانے میں منہمک ہیں۔ امریکہ دفاع کے سلسلے میں راکٹ پر سیکڑوں ملین ڈالر خرچ کر رہا ہے۔

فوجی تیاری اور دفاع کے سلسلے میں راکٹ کے بارے میں جو ریسرچ ہو رہا ہے وہ صیغۂ راز میں ہے۔ لیکن چاند کے سفر کی تیاری کے سلسلے میں ہمیں ان سے خاصی مدد ملے گی، اور غیر معمولی بلندی تک کائنات کے وسیع خلا میں اڑانے کے لئے کام بہت تیزی سے آگے بڑھ جائے گا۔ ایسے ہی جیسے کہ پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں معمولی قسم کے ہوائی جہازوں کے تجربے خوب خوب کئے گئے۔ آخر میں کامٹ نام کا جہاز نکلا، جسے ہوائی بلندی سے بہت اوپر اُڑایا گیا، اور خاصی ترقی ہوئی۔ اب کامٹ نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ برٹش کمپنی بی، او، اے، سی نے روزانہ لمبا سفر کرنے والے راستوں پر اس کی باقاعدہ سروس شروع کر دی ہے۔ چنانچہ ۵½ گھنٹے میں وہ لندن سے اُڑ کر نیویارک پہنچ جاتا ہے۔ گویا دوپہر کا کھانا لندن کھا کر اگر آپ اڑان کیجئے تو رات کا کھانا اطمینان سے آپ نیویارک میں کھا سکیں گے۔ اسی کامٹ سے ہم اگر سفر کریں تو بمبئی سے لندن ہم ۲½ گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے۔ دیکھا آپ نے کتنی تیزی سے اُڑان کی سائنس ترقی کر رہی ہے۔ (کامٹ کے حادثے کی وجہ سے ان دنوں برٹش کمپنی نے یہ سروس بند کر دی ہے۔ لیکن اس نے اعلان کیا ہے کہ جلد ہی وہ اسے پھر شروع کر دے گی)

ایک امریکن پائلٹ (ہواباز) نے ابھی حال میں ۹۸,۰۰۰ فٹ کی بلندی تک اڑان کی تھی اور اس کا یہ سفر خاصا کامیاب تھا۔ اس سے پہلے کا ریکارڈ ۹۰,۰۰۰ فٹ کا تھا، گویا بلند سے بلند مقامات تک پہنچنے کی جد و جہد مسلسل ہو رہی ہے۔

امریکہ کے انجینئر ہوائی جہاز کا ایک ایسا انجن بنانے والے ہیں جو ۴۰ میل کی بلندی پر ۲۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑے گا۔

ذیورچ (سوئٹزرلینڈ) کی کانفرنس کے موقعے پر سائنس دانوں نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ چاند تک پہنچنے کے لئے کئی منزلیں طے کی جا چکی ہیں اور ہم میں سے بہتوں کی زندگی میں چاند کی سطح پر انسان ضرور پہنچ جائے گا۔

آئندہ دس سال کے اندر اندر ایک راکٹ ہوائی جہاز کو خلا میں ضرور اُڑا دیا جائے گا، جو بلا انسان کی مدد کے اپنے آپ اڑے گا۔ اس کی رفتار ایک گھنٹے میں ۱۸,۰۰۰ میل ہوگی۔ یہ راکٹ اوپر جا کر زمین کا پورا ایک چکر کاٹے گا، گویا ۴۰۰ میل کی بلندی پر ایک مصنوعی چاند ہوگا۔ اس راکٹ میں ایسے آلے فٹ ہوں گے جو موسم کے حالات، اور اس کی تبدیلیوں کا ریکارڈ رکھ کر زمین تک لے آئیں گے۔ ایسی مشین بنانے میں سردست ۵۰ بمبار ہوائی جہاز کی لاگت کے برابر روپے خرچ ہوں گے۔

۱۵ سال کے اندر اندر بغیر انسان کی مدد کے اپنے آپ اڑنے والا راکٹ چاند پر پہنچ جائے گا، اور اس طرح وہ خلا، چاند کی سیزی اور سطح کا فوٹو اتار کر زمین تک لے آئے گا۔

۲۵ سال میں انسان خلا کے اندر ایک ایسا اسٹیشن بھی قائم کرنے میں قطعی طور سے کامیاب ہو جائے گا جو ہر وقت زمین کے ارد گرد گھومتا رہے گا اور چاند تک پہنچنے کے سلسلے میں اس اسٹیشن پر انسان قیام کر سکے گا۔ اس اسٹیشن سے چاند تک پہنچنا خاصا آسان ہوگا۔ ہم ۷,۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑنے والے راکٹ میں بھی بیٹھ کر چاند تک پہنچ جائیں گے اور چاند کی سطح پر قیام کئے بغیر پھر اسی اسٹیشن پر واپس آ جائیں گے۔

چاند پر جیسا کہ ہم جانتے ہیں ہوا نہیں ہے۔ اس لئے اس کی سطح پر قدم رکھنے میں بہت دشواریاں حائل ہوں گی۔ لیکن زیورچ کی کانفرنس میں شرکت کرنے والے سائنس دانوں کا پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ دعویٰ ہے کہ موجودہ صدی ختم ہونے سے بہت پہلے یہ دشواری حل ہو جائے گی۔ انہیں سائنس دانوں کا پورے وثوق کے ساتھ یہ بھی دعویٰ ہے کہ بیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے سیر و تفریح کے لئے کائنات کی وسیع خلا میں سفر کرنا ایک معمولی بات ہوگی اور امریکہ و برطانیہ اور روس کے شوقین بچے چاند پر پہنچ کر پکنک منانے کے منصوبے بنا رہے ہوں گے۔

الغرض سائنس داں تُلے ہوئے ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو ہم کائنات کی وسیع خلا میں اونچائی سے اونچائی تک نہ صرف اپنی مرضی کے مطابق اُڑنے لگیں بلکہ جتنی جلد ممکن ہو ہم چاند پر بھی پہنچ جائیں اور وہاں پہنچ کر ایک نئی دنیا بسانے کی کوشش کریں۔

بعض سائنس داں یہ سمجھتے ہیں کہ چاند کے اندر ایسی دھاتیں بھی ہیں جسے حاصل کرنے کے بعد انسان اپنے آپ کو لافانی بنا سکتا ہے یعنی انسان ہمیشہ اپنے آپ کو زندہ رکھ سکے گا۔ کیسی نایاب اور اچھوتی بات ہے، اسی لئے اور چوٹی کے سائنس داں چاند کی مہم کو سر کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں۔

انسان فطرتاً کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ ہر وہ چیز جو دشوار گذار یا ناممکن معلوم ہوتی ہے اسے سر کرنے کے جتن کرتا ہے۔ ایک نہیں ہزاروں تدبیریں اس کے ذہن میں آتی ہیں۔ کبھی وہ شکست تسلیم نہیں کرتا، اور کائنات کا راز ڈھونڈنے میں اپنی فہم و فراست سے حیرت انگیز ترکیبیں اور جدّتیں اختیار کرتا ہے، اور کامیابی کا سہرا حاصل کرکے اپنے آپ کو برتر و بالا ثابت کرتا ہے۔

اپنی جگہ پر یہ بات بالکل واضح ہے کہ موجودہ دور قدرتی عناصر کے غلبہ کا دور نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو انسان کی فتوحات کا دور ہے ــــ ہر میدان میں وہ قدرت پر فوقیت حاصل کرتا جا رہا ہے ــــ ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء کو دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ فتح ہوگئی۔ اس کے بعد اب دنیا کے سائنس دانوں کے سامنے چاند کے سفر کا مسئلہ درپیش ہے۔ بس سب کو اب اسی کی دھن سوار ہے۔ امریکہ میں بعض لوگ تو اتنی جلدی کر رہے ہیں کہ چاند پر سب سے پہلے پہنچنے کے لئے اپنی اپنی سیٹ محفوظ کرا رہے ہیں۔ تاکہ وہاں پہنچ کر اپنی اپنی نوآبادیاں قایم کرنے میں انھیں سب سے زیادہ آسانی ہو۔

روڑکیلا میں فولاد کا کارخانہ

روڑکیلا میں جرمن فرم کے تعاون سے فولاد تیار کرنے کے کارخانے کے قیام کے سلسلے میں کام جاری ہے۔ ہندوستان اسٹیل لمیٹڈ کے منیجنگ ڈائرکٹر شری ایس۔ این مزمدار نے حال ہی میں اُس جگہ کا معائنہ کیا، جہاں یہ کارخانہ قایم کیا جا رہا ہے۔ تقریباً دس ہزار مرد اور عورتیں پہلے ہی اس جگہ کام کر رہے ہیں جہاں ایک نیا قصبہ وجود میں آرہا ہے۔ ان میں سے تقریباً چھ ہزار اشخاص ایسے ہیں جو منصوبہ مذکورہ پر عمل درآمد کے سلسلے میں زمین قبضے میں لئے جانے سے بے گھر ہو جائیں گے۔ اسکیم کے نتیجے کے طور پر تقریباً ۲۳۰۰ کنبے بے گھر ہوں گے، اور ان میں سے کام کاج کے اہل اشخاص کی اکثریت پہلے ہی روزگار سے لگ چکی ہے۔ دریں اثنا حکومت اڑیسہ نے اس زمرے کے تمام اشخاص کی بحالی کے لئے علاقے کا انتخاب کر لیا ہے۔ لیکن یہ بحالی عارضی نوعیت کی ہوگی۔ کیونکہ توقع ہے کہ اس سلسلے میں بے گھر ہونے والے اشخاص کی اکثریت کو بالآخر ہندوستان اسٹیل لمیٹڈ کے ماتحت ہی مستقل روزگار مل جائے گا۔

خام لوہے کے ذخیروں تک پہنچنے کے لئے سڑکیں تعمیر کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ زمین میں سوراخ کرنے کا کام موسم برسات سے پہلے ختم ہو جائے گا۔

عرش ملسیانی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

تاریخِ ادبِ اُردو انگریزی، اردو اور ہندی میں شائع ہو چکی ہے۔ کتنے نوجوانانِ ملک اس سے استفادہ کر چکے ہیں۔ اب اس کا ترجمہ فرانسیسی، جرمنی، رُوسی، چینی اور فارسی زبانوں میں ہو رہا ہے۔ اس شہرہ آفاق کتاب کے مصنّف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے نامِ نامی سے کون واقف نہیں۔ اردو ادب کی گراں بہا خدمات جو آپ نے ادا کی ہیں، ان کے پیشِ نظر حال ہی میں آپ کو اُردو کے نمائندے کی حیثیت سے ساہتیہ اکیڈیمی کا ممبر منتخب کیا گیا ہے۔ اس انتخاب کا پس منظر آپ کے وہ ادبی کارنامے ہیں جن کی ایک مختصر تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

۱۹۱۸ء میں آپ نے الہ آباد یونی ورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ آپ یونی ورسٹی میں سب سے اوّل رہے۔ اسی حیثیت سے آپ نے اسی سال ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا یعنی فرسٹ ڈویژن اور یونی ورسٹی بھر میں سب سے اوّل۔ ۱۹۴۵ء میں آگرہ یونی ورسٹی نے آپ کی علمی خدمات کے صلے میں آپ کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری پیش کی۔

آپ کی تصانیف کی فہرست ذیل میں درج ہے۔

۱۔ تاریخِ ادبِ اردو (انگریزی) جس کا پیش لفظ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو مرحوم کے قلم سے ہے۔

۲۔ اردو اور فارسی کے یورپین اور اینگلو یورپین شعراء (انگریزی) جس کا پیش لفظ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو مرحوم کے قلم سے ہے۔

۳۔ تاریخِ ادبِ اردو (اُردو) ۵۰۰ صفحات سے زیادہ پر مشتمل۔

۴۔ تاریخِ ادبِ اُردو (ہندی) دو جلدوں میں۔ مطبوعہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد

۵۔ یورپین اور اینگلو یورپین شعرائے اردو کی تاریخ (زیرِ طبع)

جن کتابوں کی تصنیف و تالیف میں آپ اس وقت مصروف ہیں۔

۱۔ سمبالزم اور لٹریچر (انگریزی) ۷۰۰ صفحات پر مشتمل

۲۔ جدید اُردو ادب دو جلدوں میں

۳۔ اردو اور فارسی شعراء کا ہندی میں کلام

۴۔ اردو شعراء کا البم مقدّمے کے ساتھ

۵۔ مثنویاتِ میر بخطِ میر مقدّمے کے ساتھ

۶۔ پی ای این سیریز کے لئے اُردو لٹریچر پر کتاب

۷۔ اُردو کے نامور ادیب۔ انگریزی میں اسی قسم کے ایک سلسلہ کتب کے انداز میں ہے۔ اس سلسلے میں میر، غالب، انیس وغیرہ باکمالوں پر کتب تصنیف کی جا رہی ہیں۔

آپ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور، مسز سروجنی نائیڈو اور مسٹر کے ایم پانیکر کے ساتھ انگریزی زبان کی پی ای این سوسائٹی (انجمنِ اہلِ قلم) کے رکن رہے ہیں اور ہیں۔

ہندوستانی پی ای این سوسائٹی کے جنم داتا ممبروں میں سے ہیں۔ اس کی سیکرٹری محترمہ صوفیہ واڈیا ہیں۔

آپ ہندوستانی اکیڈیمی کے قائم کرنے والوں مثلاً رائے راجیشور بلی، ڈاکٹر تارا چند، حافظ ہدایت حسین اور منشی دیا نرائن نگم کے ساتھیوں میں سے ہیں۔

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کے انتقال کے بعد اب آپ کا انتخاب ساہتیہ اکیڈیمی میں اُردو کے نمائندے کی حیثیت سے ہوا ہے۔

۱۹۴۶ء میں آل انڈیا رائٹرز کانفرنس کا جو اجلاس بنارس میں منعقد ہوا تھا، آپ نے اُس کی صدارت فرمائی تھی۔

ہندوستان بھر میں بے شمار مشاعروں اور ادبی کانفرنسوں کی آپ صدارت فرماتے رہے ہیں۔

آپ ورلڈ اکیڈمی آف انٹلکٹ کانفرنس برسلز (۱۹۵۱ء) کی سب کمیٹی کے چیئرمین تھے۔

آپ ہندوستان بھر کی یونی ورسٹیوں میں اُردو کے اعلٰی سے اعلٰی امتحانوں کے ممتحن ہیں اور رہے ہیں۔

آپ کے ادبی نوادر میں مثنویاتِ میر بخطِ میر اور اُردو شاعروں کا البم ایسے قیمتی نوادر ہیں، جو اشاعت پذیر ہونے کے بعد اُردو کے سرمایے میں ایک بیش ترین اضافہ سمجھے جائیں گے۔ میر کی تین مثنویاں، مثنوئ جنگ نامہ، مثنوی در بیانِ ہولی اور مثنوئ دگر، خود میر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ ابھی تک میر کا نمونہ خط منظرِ عام پر نہیں آیا۔ میر سے اہلِ ادب کو جو شیفتگی ہے اس کے پیشِ نظر یہ مثنویاں ان کے لئے ایک ایسی نعمت ثابت ہوں گی جس سے وہ اپنی نظر کی تشنگی بجھائیں گے۔ لکھنؤ سکول آف آرٹس اینڈ کرافٹس کے ڈاکٹر ہالدہ نے اس بات پر مہرِ توثیق لگائی ہے کہ روشنائی، کاغذ اور اندازِ تحریر سے یہ مثنویاں ۱۲۱۴ ہجری کے لگ بھگ لکھی گئیں۔

شعراء کے البم میں مندرجہ ذیل شعراء کی رنگین تصاویر شامل ہیں۔

۱۔ میر

۲۔ قتیل فرید آبادی

۳۔ جسونت سنگھ پروانہ

۴۔ مرزا قدری لاہوری

۵۔ مرزا مظہر جان جاناں

۶۔ مصحفی

۷۔ جعفر علی خاں حسرت

۸۔ ضیا دہلوی

۹۔ رائے ٹیکا رام تسلی

۱۰۔ کرپا دیال سکینہ مضطر

اس البم میں قتیل کے اُردو اشعار بھی تحریر ہیں۔ قتیل کے اردو اشعار کے باب میں علم تو تھا لیکن نایاب تھے۔

ہمیں امید ہے کہ ساہتیہ اکیڈیمی یا حکومتِ ہند کی مدد سے یہ نوادر جلد منظرِ عام پر آ جائیں گے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا اکیڈیمی کی رکنیت کے لئے حالیہ انتخاب نہایت ہی موزوں ہے۔

..یوں بھی آپ سے مل کر ایک گونہ مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ شعر و ادب کے آپ دلدادہ ہیں۔ جب بھی راقم سے ملاقات ہوتی ہے کوئی نہ کوئی نیا رسالہ، اخبار یا کتاب آپ کی بغل میں ہوتی ہے۔ راقم کے پاس کوئی ایسی ہی چیز انھیں نظر آئے تو وہ چھوڑتے نہیں۔ کتابوں کے باب میں، تصنیف و تالیف میں زندگی گزارنے والے کچھ ایسے ہی "سخت گیر" ہوا کرتے ہیں۔ پیرانہ سالی میں بھی ابھی ماشاءاللہ وہ عزم جواں ہی نہیں بلکہ دل بھی جوان رکھتے ہیں۔ چہرے کی بشاشت، ہنستی ہوئی پیشانی اور شعر و ادب کا والہانہ عشق مل جل کر اُن کی شخصیت میں ایک ایسی جاذبیت بھر دیتے ہیں کہ جسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اعداد و شمار

— آخر فروری ۱۹۵۵ء تک "بحالیات کے متعلق مالی امداد کی تنظیم" نے بے گھر لوگوں کو ۳۹ کروڑ ۵۹ لاکھ ۱۰ ہزار روپے کے قرضے دئے۔

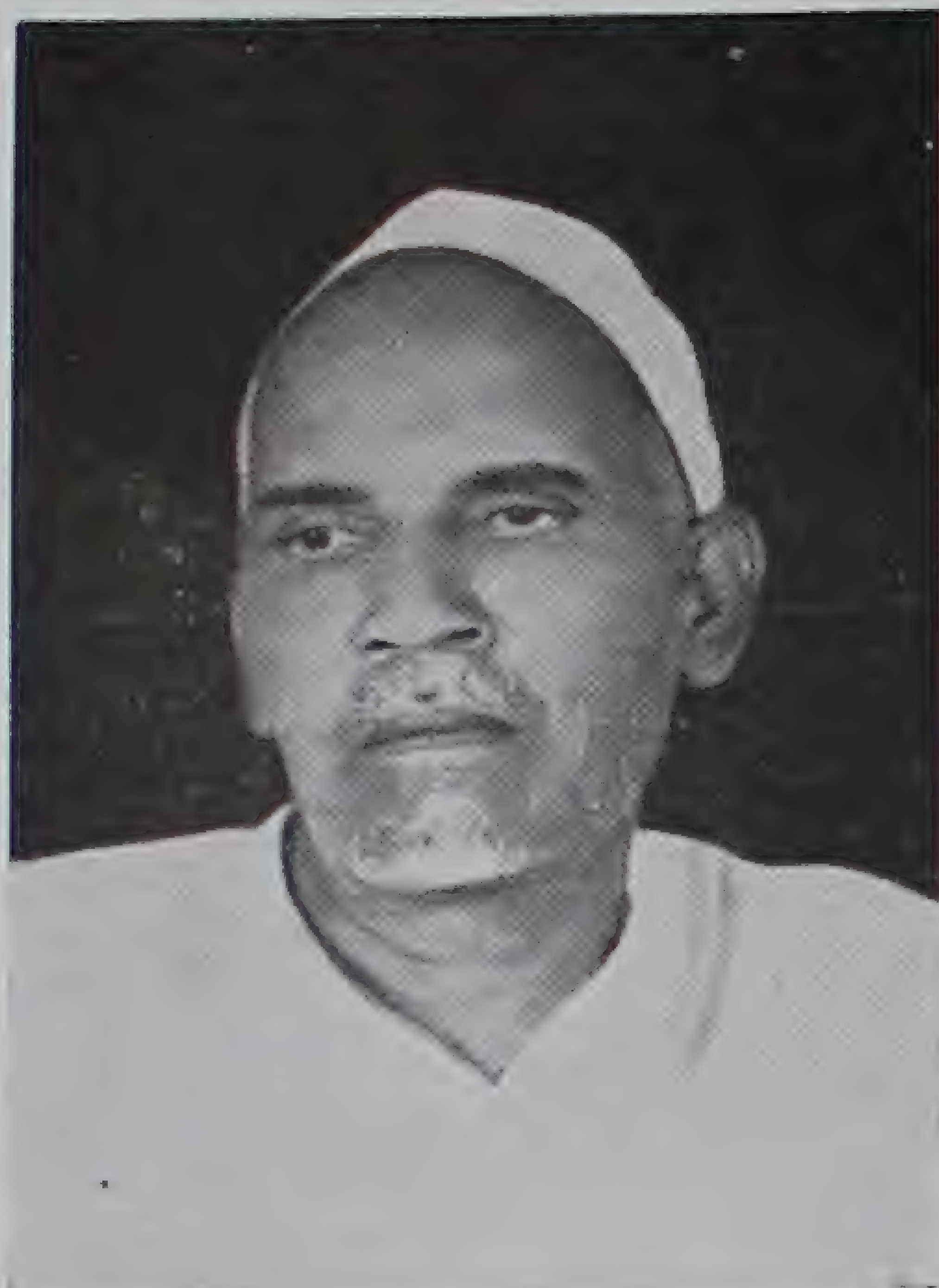
— ہندوستانی ریلوں کی طرف سے ۱۴۵ اسکول قائم ہیں۔ ان میں سے ۹۴ پرائمری، ۲۷ مڈل اور ۲۴ ہائی اور ہائیر سیکنڈری اسکول ہیں۔

— آخر ۱۹۵۴ء تک اجتماعی ترقی اور زرعی توسیع کی قومی اسکیموں میں عوام نے نقدی، محنت و مشقت یا دیگر صورتوں میں ۷ کروڑ ۸۴ لاکھ روپیہ کی امداد دی اور حکومت نے اس سلسلے میں ۱۳ کروڑ ۸۴ لاکھ روپیہ صرف کیا۔

— آخر دسمبر ۱۹۵۴ء تک ہندوستان کے اجتماعی ترقی کے پروگرام کے تحت ۱۱۸۸۶ میل کچّی اور ۱۱۴۵ میل پکّی سڑکیں تعمیر کی گئیں۔

— ۱۹۵۴ء میں ہندوستان نے امریکہ کو ۳ کروڑ ۲۱ لاکھ ۶۰ ہزار پونڈ چائے برآمد کی۔

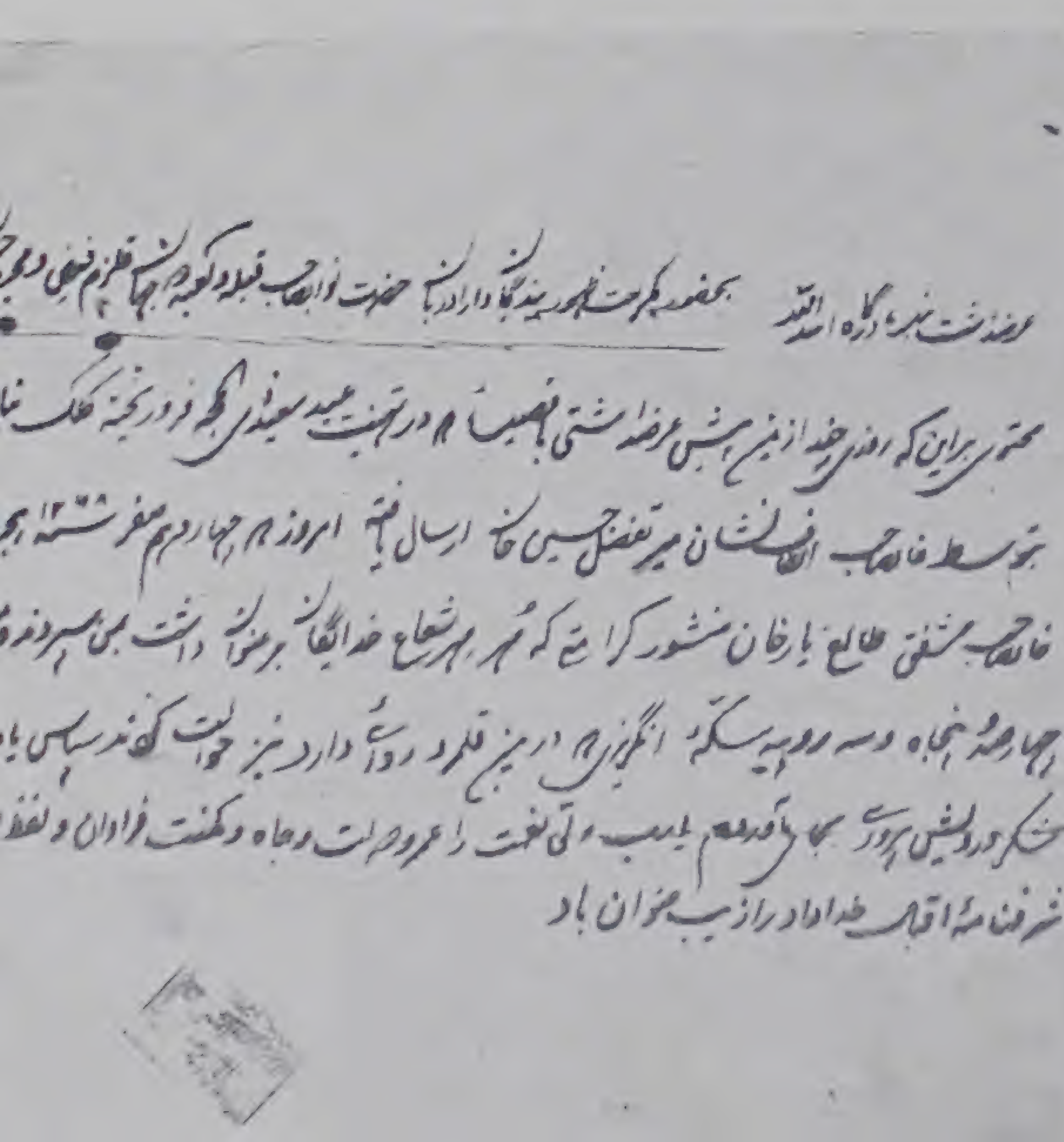
— ہندوستان کے سمندروں میں ایک لاکھ دس ہزار مربع میل سے بھی زیادہ رقبے پر ماہی گیری ہو سکتی ہے۔



امجد حیدرآبادی
آپ کی شاعری پر ناصر کرنولی کا
مقالہ اسی شمارے میں ملاحظہ
فرمائیے



ڈاکٹر رام بابو سکسینہ
آپ اردو کے نمائندے کی حیثیت سے ساہتیہ اکیڈیمی
کے ممبر منتخب ہوئے ہیں



عرضداشت بندهٔ درگاه اسدالله   بحضور [illegible] حضرت نواب صاحب قبله و کعبهٔ [illegible]
[illegible] برای که روزی چند ازین پیش عرضداشتی با قصیده در تهنیت عید سعیدی [illegible]
بتوسط خانصاحب [illegible] میر تفضل حسین خان ارسال یافته امروز که چهارم صفر [illegible]
خانصاحب مشفق [illegible] یار خان منشور گرامی که [illegible] شجاع خداآگاه [illegible] داشت [illegible]
چهارصد و پنجاه و سه روپیه سکهٔ انگریزی درین قلمرو رواج دارد [illegible]
[illegible] شکر [illegible] دولت و جاه و مکنت فراوان [illegible]
شرف نامهٔ اقبال خداداد را زیب عنوان باد

غالب کی ایک عرضداشت نواب وزیر الدولہ
والئی ٹونک کی خدمت میں۔ متعلقہ مقالہ
اسی شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔

بہ شکریہ سید منظور الحسن برکاتی



سامعین

« فسانہ ہیں ہم لوگ »

۱۰ اپریل ۱۹۵۵ کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے
جو مشاعرہ نشر ہوا اس سے متعلق تصویریں

مانی جائسی

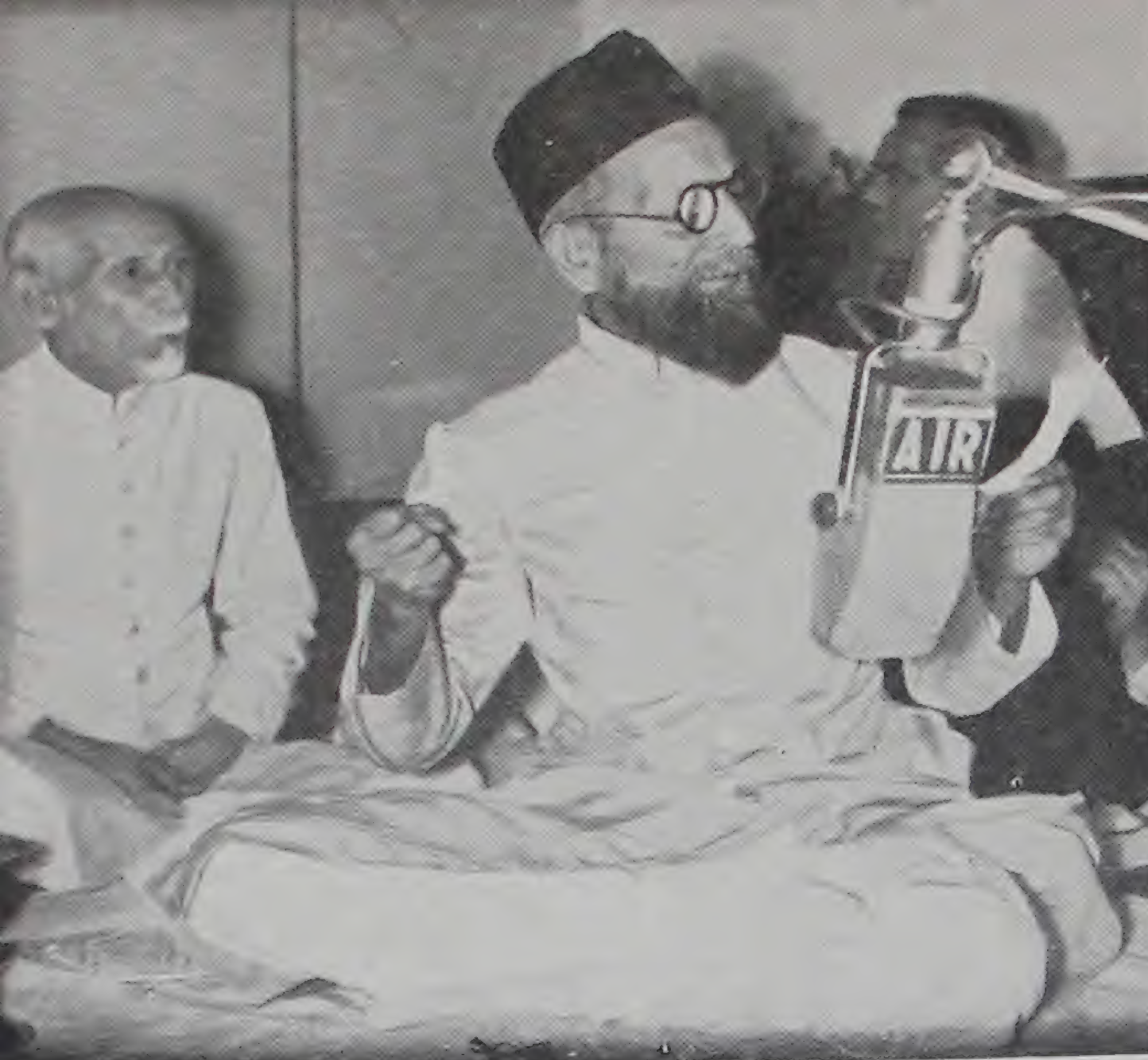


جگر بریلوی



نجم آفندی







حیرت بدایونی

ر دہلوی



محوی صدیقی لکھنوی

نوح ناروی



زار دہلوی





دل شاه جهان پوري



تلوک چند محروم

جوش ملسياني



ناطق گلاؤٹھوي



فسانہ ہیں ہم لوگ

مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی کے اہتمام سے ایک مشاعرہ نئی دہلی ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہوا تھا۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں سب سے جواں سال شاعر کی عمر ۶۱ سال کی تھی۔ مشاعرے کے بعد دو بزرگ شعراء کی نظم بھی سنائی گئی اور ان کا کلام ریکارڈ بھی کیا گیا۔ بدقسمتی سے علامہ دتاتریہ کیفی، حضرت امجد حیدرآبادی، مرزا یگانہ چنگیزی، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور جناب بیرم سردی مدعو کرنے کے باوجود بوجوہ تشریف نہ لا سکے اردو کے بزرگ شعراء کی عزت افزائی اور ان کی صورتوں اور آوازوں کو محفوظ کرنے کی جدت کے لئے ادارہ آل انڈیا ریڈیو شیدائیانِ اردو سے شکریے کا مستحق ہے۔ جن شعراء نے مشاعرے میں حصہ لیا ان کا تعارف اور کلام ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔ تصویریں ۲۵، ۲۶ اور ۲۷ صفحوں پر ہیں (ادارہ)

سید وحیدالدین بیخود دہلوی

عمر ۹۸ سال۔ فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کے جانشین کہے جاتے ہیں۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ وسیع رہا ہے۔

نزع میں سامنے اک صورت زیبا آئی ۔۔۔ موت آنکھوں سے اٹھاتی ہوئی پردا آئی
کوئی انسان بھی دیکھا کوئی عاشق بھی ملا ۔۔۔ یوں تو آنے کو تری بزم میں دنیا آئی
جان قربان ہو اس آنکھ پہ حسرت یہ ہے ۔۔۔ دیکھ کر جو ترے جلوے کا تماشا آئی
وہ ترا عشق تھا جس نے مجھے بیمار کیا ۔۔۔ وہ تری یاد تھی جو بن کے مسیحا آئی

بات کرنے کی قسم کس لئے کھالی بیخود
تو نے کیا سوچا ہے یہ جی میں ترے کیا آئی

مرزا تجمل حسین نجم آفندی

وطن آگرہ۔ عمر ۶۱ سال۔ ۲۲ کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کے خاندان میں چار پشتوں سے شاعری کا سلسلہ جاری ہے۔ مدتوں غازی آباد اور لکھنؤ میں قیام رہا۔ ایک عرصے سے حیدرآباد دکن میں رہتے ہیں۔

اس قدر شدتِ احساس میں ڈوبا ہوں میں ۔۔۔ آہ کرتا ہے جو دشمن بھی تڑپتا ہوں میں
ہوں برا یہ دنیا سمجھتی ہے کہ اچھا ہوں میں ۔۔۔ آج تک خالق ہستی کو گوارا ہوں میں
میکدے میں مرے ساتھی بھی ہمدردی تھے ۔۔۔ جب سے مسجد میں ٹھکانہ ہے اکیلا ہوں میں
مجھ سا مظلوم زمانے میں نہ ہوگا کوئی ۔۔۔ کارفرمائے محبت تنِ تنہا ہوں میں
عرصۂ حشر ہوئی جاتی ہے دنیا یارب ۔۔۔ کوئی اتنا نہیں کہتا کہ شناسا ہوں میں
اللہ اللہ یہ ہے میری برائی کا وقار ۔۔۔ اچھے اچھوں کی نگاہوں میں کھٹکتا ہوں میں
حل کئے میں نے ہزاروں ہی مسائل لیکن ۔۔۔ سر پہ موت آ گئی جب زیست کو سمجھا ہوں میں
خود پرستی کا گنہگار سمجھنے والے ۔۔۔ یہ نہ سمجھے کہ گنہگار خود اپنا ہوں میں
ہمت افزا ہو کوئی یہ میرا ماحول نہیں ۔۔۔ آپ ہی اپنے ارادوں کا سہارا ہوں میں
میری بگڑی ہوئی رفتار پہ نظریں ہیں بہت ۔۔۔ ہوش اڑتے ہیں ذرا بھی جو سنبھلتا ہوں میں
یہ نہ سمجھے ہے سے بھی سمجھا کوئی قسمت کا دھنی ۔۔۔ اتفاقات کی دنیا کا نمونا ہوں میں
ابھی دیکھا ہے کہاں ولولۂ صبر دسکوں ۔۔۔ کثرتِ غم نے یہ سمجھا ہے کہ تنہا ہوں میں
زاہدِ خشک سمجھتے ہیں گنہگار مجھے ۔۔۔ اور گنہگار سمجھتے ہیں فرشتا ہوں میں
مجھ پہ اللہ کے بندوں ہی نے توڑے ہیں ستم ۔۔۔ میں یہ کہتا رہا اللہ کا بندا ہوں میں

یہ بھی اک حادثہ اردو کی محبت کا ہے نجم
کنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

جناب حیرت بدایونی

وطن بدایوں۔ عمر تقریباً ۶۲ سال۔ عربی فارسی کے ماہر۔ ۱۵ سال کی عمر سے اردو فارسی میں شعر فرماتے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اپنے والد مولوی محمد حسن سے فن شاعری میں استفادہ کیا جو نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے

رکھتے ہو خیال اور ہی دیتے ہو بیاں اور ۔۔۔ کیا بات ہے واللہ کہ دل اور زباں اور

ہم بھی تو ہیں مریخ و مہ و مہر سے آگے — مانا کہ ستاروں سے بھی آگے ہیں جہاں اور
ساقی تپشِ شوق کہیں سرد نہ پڑ جائے — ہاں آتشِ سیال کا اک رطلِ گراں اور
طوفانوں کی یلغارِ مسلسل سے نہ معلوم — کتنے ورق الٹے ابھی تاریخِ جہاں اور
طوفان سے اگر جان چرائی دل و جاں نے — لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور
اب ہے کفِ محنت میں کلیدِ درِ دولت — کچھ دیر کی ہے کشمکشِ سود و زیاں اور
ہم ماتمیٔ بے روح کا ماتم نہیں کرتے — بلوائیے باہر سے کوئی مرثیہ خواں اور
ہے پیرِ خرابات کا ہونا ہی اگر فرض — ہم خود ہی بنا لیں گے کوئی پیرِ مغاں اور

ہم پیر ہیں اور پختگیٔ عمر میں حیرت
ہو جاتے ہیں انسان کے افکارِ جواں اور

جناب محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی

عمر تقریباً ۶۵ سال ۔ وطن لکھنؤ ۔ عربی فارسی اور اردو کے عالم ۔ ایک درجن کتابوں کے مصنف ۔ منشی احمد علی شوق قدوائی کے شاگرد ۔ مدرسہ الہیات کانپور، جامعہ عربی کالج اور اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس یونیورسٹی میں اردو فارسی و عربی کے استاد رہ چکے ہیں ۔

مری دیوانگی جا کر اسیروں میں پکار آئی — قفس کو توڑ ڈالو تم تو ہم سمجھیں بہار آئی
یہ ایں کاوش نظر آتے نہیں دام و قفس اس کو — نشیمن ہی پہ آئی اور بجلی بار بار آئی
ابھی رگ رگ سے خونِ گرم کے جاری ہوں فوارے — قفس میں دل اگر سن لے گلستاں میں بہار آئی
امارت کی نہیں پروا مگر یہ کیا قیامت ہے — غریبوں کو محبت بھی نہ یارب سازگار آئی
مصور کی نظر شاعر کا دل موزوں ہیں سجدے میں — جوانی بن کے قدرت کا انوکھا شاہکار آئی
نہیں کہتا کوئی ہاں پوچھتا پھرتا ہوں محشر میں — بتاؤ تو محبت بھی کسی کو سازگار آئی
ہمیں روکا مگر اس کو نہ روکا ناصحو تم نے — کسی کی یاد آئی اور ظالم بار بار آئی
وہ آئے پھول کچھ آنکھوں سے کچھ دامن سے برسائے — یہ تو تربت میں ہم ہیں اور تربت پر بہار آئی

خطا دل کی نہ آنکھوں کی نظر آئے جو ہو محوی
نگاہوں میں مری رگ رگ سے کھنچ کر جانِ زار آئی

بابو شیام موہن لال جگر بریلوی

تاریخ پیدائش ۱۸۹۰ء ۔ عمر ۶۶ سال ۔ والد کا نام ۔ حضرت دل بریلوی ۔ ۱۹۱۵ء سے شعر فرماتے ہیں اور لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے شاگرد ہیں ۔ سترہ کتابوں کے مصنف و مولف ہیں جن میں سے دو کتابیں یادِ رفتگاں اور "پیام ساوتری" شائع ہوئی ہیں ۔ پیام ساوتری مثنوی ہے اور اتر پردیش سرکار نے اس کتاب پر پانچ سو روپے انعام دینے کا اعلان کیا ہے ۔

دل اکیلا رہ کے اجڑ گیا ہمیں میہماں کی تلاش ہے
گل و لالہ کی ہمیں ہے ہوس ہمیں باغباں کی تلاش ہے
کوئی اور ہوں گے جو بھولے ہوں ہمیں عہدِ رفتہ ہے یاد اب بھی
ہمیں ہے بہار کی آرزو ہمیں گلستاں کی تلاش ہے
مجھے دیکھئے وہ ستم زدہ، یہ جہاں ہے یا کوئی غمکدہ
جو پلٹ دے گردشِ آسماں ہمیں اس جواں کی تلاش ہے
سرِ راہ چھوڑ کے چل دیا نہ پھر اس طرف کبھی رخ کیا
ہمیں غیر جس نے سمجھ لیا اسی کارواں کی تلاش ہے
پر و بال پہلے درست کر تو تپش بھی دل کی مدد کرے
تجھے عندلیبِ شکستہ پر، عبث آشیاں کی تلاش ہے
نہ ہمیں خدا کی ہے جستجو نہ ہمیں نجات کی آرزو
ہیں قتیلِ شیوۂ دلبری ہمیں دلستاں کی تلاش ہے
ہے عجب جگر کا غمِ نہاں ہے عجیب سوزش میں رواں دواں
کبھی دلستاں سے ہے بے غرض کبھی دلستاں کی تلاش ہے

منشی تلوک چند محروم

وطن عیسیٰ خیل ضلع میانوالی ۔ تاریخ پیدائش یکم جولائی ۱۸۸۷ء ۔ عمر پونے ارسٹھ سال ۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۵۵ء تک مختلف درسگاہوں میں ماسٹر ہیڈ ماسٹر اور لیکچرار رہے ۔ آج کل کیمپ کالج دہلی میں لیکچرار ہیں ۔ تصنیفات:۔ کلام محروم حصۂ اول، حصۂ دوئم، حصہ سوئم ۔ گنج معانی، رباعیاتِ محروم اور مہرشی درشن

بارہا حیرت کے عالم میں جہاں گم ہو گیا — اس پہ حیرت کیا جو کوئی بے نشاں گم ہو گیا
جذب ہو کر رہ گئیں دل میں ہزاروں حسرتیں — جس طرح دامن میں ہر اشکِ رواں گم ہو گیا
فکرِ جاں کیا کیجئے جب موت سر پر آ گئی — ذکرِ دل سے کیا غرض جب دلستاں گم ہو گیا
کشتیٔ امید اپنی دور ساحل سے رہی — جب چلی بادِ موافق بادباں گم ہو گیا
کس بہارِ ناز کے جلووں سے ہو کر بد حواس — ڈھونڈتی پھرتی ہے بلبل آشیاں گم ہو گیا
عشق سے سو بار پیمانِ وفا باندھا گیا — حسنِ فانی بن کے زیبِ داستاں گم ہو گیا
چشمِ حیرت بن گیا ہر حلقہ دامِ رسن کا — طائرِ جاں ہو کے آخر پر فشاں گم ہو گیا
کیا کرے کوئی حیاتِ جاوداں کی آرزو — خضر مانندِ حیاتِ جاوداں گم ہو گیا

بیدلی ہیں کٹ گئی محروم ساری زندگی
کیا کہیں دل کس طرح کب؟ اور کہاں گم ہو گیا

مولانا ناطق گلاوٹھوی

مرزا داغ دہلوی کے شاگرد۔ تاریخ پیدائش نومبر ۱۸۸۶ء۔ عمر تقریباً ۶۸ سال ۶ ماہ۔ وطن قدیم گلاوٹھی ضلع بلند شہر۔ ۴۸ سال سے ناگپور میں رہتے ہیں۔ ۳۰ سال تک بلدیہ ناگپور کے ممبر رہے۔ مرکزی اسمبلی کے بھی ممبر رہ چکے ہیں۔ عربی اور فارسی کے عالم۔ غیر مطبوعہ تصانیف:۔ دیوان ناطق، شرح دیوان غالب، نطق ناطق، شہاب ثاقب اور نظموں کا مجموعہ۔

تو آخر سازِ ہستی کیوں طربِ آہنگ محفل تھا
نشان آئینِ کیفِ بیدلی یارب اگر دل تھا

تماشا وضطرابِ زندگی تھا مرنے والوں کا
وجودِ بزمِ عالم اک نظامِ رقصِ بسمل تھا

مری وارفتگی وجہہ بنائے بزمِ ہستی تھی
مرا رنگِ پریدہ باعثِ نیرنگ محفل تھا

مقام ہُو سویدائے مجردِ عالم حیرت
مری گم گشتگی سے اب یہ نقشہ ہے جہاں دل تھا

نہ سمجھا زیست کو کچھ جس نے رازِ زندگی سمجھا
یہ دیکھا ہے کہ جب انساں کو ہوش آیا تو غافل تھا

کہاں ذوقِ تن آسانی یہیں آسانی میسر تھی
تلاشِ راحتِ منزل میں دل گم کردہ منزل تھا

نہ تھا قیس اہلِ معنی ہم اسے کس طرح سمجھاتے
..یہاں لیلےٰ ہی لیلےٰ تھی وہاں محمل ہی محمل تھا

ہمیں کمبخت احساسِ خودی اس در پہ لے بیٹھا
ہم اُٹھ جاتے تو وہ پردہ بھی اُٹھ جاتا جو حائل تھا

ہوس پر اعتبارِ نیک و بد دنیا میں تھا ناطق
حق و باطل کے جھگڑوں میں کہیں حق تھا نہ باطل تھا

سید کلب احمد مانی جائسی

وطن :۔ ملک محمد جائسی کا وطن جائس۔ تاریخ پیدائش دسمبر ۱۸۸۷ء
تصنیفات :۔ نقوش مانی، نگارستانِ مانی، یہ دو دیوان چھپ چکے ہیں۔
۵۰ تصیدوں کا مجموعہ غیر مطبوعہ ہے۔

نہ رہی وہ کششِ تیغِ ادا میرے بعد
جذب کھو بیٹھا ہے قاتل کا صلا میرے بعد

کیوں نہ بے رنگ ہو صحرائے بلا میرے بعد
کون کانٹوں پہ چلا برہنہ پا میرے بعد

تا بہ محرابِ خمِ تیغ و سجدے کہ رسد
دل بکف بھی کوئی حاضر نہ ہوا میرے بعد

میری روداد وفا سے ہوئی ترتیب نصاب
کھل گیا مدرسۂ صبر و رضا میرے بعد

کشتنی میں تھا سو مقتل میں تہ تیغ ہوا
اب نہ منتظرِ اہلِ وفا میرے بعد

مکتبِ عشق تھا استادِ ازل تھا میں تھا
درس الفت کا زمانے کو ملا میرے بعد

صبح آخر مری صبح شبِ ہجراں تھی مگر
شمع و پروانہ میں بھی رابطہ نہ تھا میرے بعد

خلشِ پرسشِ محشر تھی میری بے گنہی
نظر آیا میرے قاتل کو خدا میرے بعد

تو نے مانی دلِ غالب سے یہ غم دور کیا۔
کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی

نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد۔ تاریخ پیدائش یکم فروری ۱۸۸۲ء عمر تقریباً ۷۳ سال۔ ۱۹۰۱ء میں پیشۂ مدرسی اختیار کیا اور نکودر ہائی اسکول میں فارسی کے مدرس اول رہے

اردو اور فارسی کے اُستاد ہیں

تصنیفات :۔

دستور الفوائد (فارسی صرف و نحو) شرح دیوان غالب، دعوت عمل دو مستقل دیوان بادۂ سرجوش اور جنون و ہوش کے نام سے ہیں۔

ڈر ہے کہ پھر مرا دلِ مضطر حزیں نہ ہو
اس ہاں سے بھی مراد تمھاری نہیں نہ ہو

قائل ہوں اس ادا کا جو ہو بانیِ خلوص
وہ ناز ہی نہیں جو نیاز آفریں نہ ہو

کیوں انتظارِ حشر ہو آئیں کی بات پر
کیوں فیصلہ ہمارا تمھارا یہیں نہ ہو

ظالم نے سنگِ در کو بھی اٹھوا دیا ہے آج
اس وہم میں کہ یہ بھی کسی کی جبیں نہ ہو

کوئی چمن میں کوئی بیاباں میں جا رہا
وہ کیا کرے کہ جس کا ٹھکانا کہیں نہ ہو

رہنا پڑا ہے مہر بہ لب یاں تمام عمر
اتنا بھی کوئی دردِ نہاں کا امیں نہ ہو

نکلے ہیں اپنے گھر سے ہم اس کی تلاش میں
جس بے نشاں کا نقشِ قدم بھی کہیں نہ ہو

وعدہ تمھارا اور یہ قسمیں بجا سہی
لیکن وہ کیا کرے جسے اب بھی یقیں نہ ہو

اے جوش کہہ رہا ہے کلام جناب داغ
وہ شاعری نہیں جو حیات آفریں نہ ہو

حضرت نوح ناروی

تاریخ پیدائش ۱۸ ستمبر ۱۸۷۹ء۔

بھوانی پور ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور اردو کے استاد میر نجف علی کی صحبت میں شاعری سے شوق پیدا ہوا۔ شروع میں میر صاحب کو کلام دکھایا۔ حضرت امیر مینائی اور حضرت جلال لکھنوی سے بھی مشورہ لیا۔ آخر نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد دکن گئے اور ایک مدت تک استاد داغ کے ساتھ رہے۔
آپ کے تین مبسوط دیوان ہیں۔ سفینۂ نوح، طوفان نوح اور اعجاز نوح

یہ تینوں چھپ چکے ہیں۔ چوتھا دیوان ملفوظاتِ نوح غیر مطبوعہ ہے۔

دنیا کا طریقہ عقبیٰ کا وہ قرینا — جینے کے بعد مرنا مرنے کے بعد جینا
اے ناخدا توقع اب کیا نہ ڈوبنے کی — دریا میں ہے طلاطم منجدھار میں سفینا
تھا سوزِ دل کا دریا موقوف آنسوؤں پر — کم ہو گئی تپِ غم نکلا جو کچھ پسینا
میں خوب جانتا ہوں اُن کی کرشمہ سازی — ظاہر میں صاف دل ہیں، دل میں گرہ ہے کینا
اُف اُف تری ادائیں اُف اُف تری نگاہیں — ان سب نے مل ملا کر دل اہلِ دل کا چھینا
اتنا مجھے بتادے میرے لئے مجسم — بارہ میں ایک بھی کیا اچھا نہیں مہینا
اس سنگ دل پہ ناوک کا پڑا نشانہ — ٹکرا گیا یکایک پتھر سے آبگینا
پھر موسمِ گل آیا ایسے میں کیوں نہ آئے — مینا کے ساتھ ساقی ساقی کے ساتھ مینا
شامل تھی بحرِ غم میں قسمت کی نارسائی — ساحل کے پاس آ کر ڈوبا مرا سفینا
میں اپنی زندگی سے ہاتھ اپنے دھو رہا ہوں — ماتھے پر آ چلا ہے اب موت کا پسینا

یہ نوحؔ کی تمنا پوری ہو یا الٰہی
کعبے کو دیکھ کر وہ دیکھے کبھی مدینا

حضرتِ دلؔ شاہ جہاں پوری۔

تاریخ پیدائش ۱۸۷۵ء۔ عمر تقریباً ۸۰ سال۔ وطن شاہ جہاں پور۔ حضرت امیر مینائی لکھنوی کے شاگرد۔

تصانیف۔ نغمۂ دل، ترانۂ دل اور مکمل دیوان۔ دو ناول بھی ہیں، دردِ دل اور دل سوز۔

جو عہد کیا وہ توڑ دیا، ہم عظمتِ پیماں بھول گئے
ان دیر و حرم کے جھگڑوں میں ہمدردیِ انساں بھول گئے
دامان و گریباں چاک کئے پھر سوچ کے خود ہر چاک سیا
کچھ تو ہی بتا اے خودداری کیوں چاک رگِ جاں بھول گئے
اس گلشنِ عالم میں اکثر ایسی بھی بہاریں دیکھی ہیں
رعنائیِ گل نظروں میں رہی آرائشِ داماں بھول گئے
آنسو سرِ مژگاں جب دیکھے شرمندہ وفائے عشق ہوئی
ہم جور و جفا کے سب شکوے اے چشمِ پشیماں بھول گئے
تسکینِ جنوں ہر کانٹا تھا معراجِ جنوں ہر ٹھوکر تھی
پابندیِ زنداں میں وحشی جذباتِ بیاباں بھول گئے
کیا جان لیا پہچان لیا کیا دیکھ لیا کیا سوچ لیا
ہم اپنے وطن کا ہر منظر اے گردشِ دوراں بھول گئے
اعجازِ مسیحائی کہئے اس طرزِ فسوں اندازی کو
جب نازِ تبسم یاد آیا ہم کاوشِ پنہاں بھول گئے
منظورِ نظر جو کلیاں تھیں وہ توڑ کے رکھ لیں دامن میں
محویتِ رنگ و بو میں ہم آدابِ گلستاں بھول گئے
رُخ طور کی جانب تھا اپنا مقصودِ طلب تھے دیر و حرم
سمجھے نہ کبھی دل کی وسعت ہم منزلِ جاناں بھول گئے
کیا ذکرِ شبابِ رفتہ کا اب تو یہی سمجھو تم اے دلؔ!
اک خوابِ پریشاں دیکھا تھا وہ خوابِ پریشاں بھول گئے

پنڈت تربھون ناتھ زارؔ زتشی دہلوی

تاریخ پیدائش اکتوبر ۱۸۸۳ء عمر ۷۲ سال۔ دس سال کی عمر میں مرزا داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ اندر پرستھ گرلز کالج دہلی میں اردو فارسی کے لیکچرار ہیں۔

نہ بت خانہ نشیمن ہے، نہ کعبہ آشیاں میرا
تعین سے ہے بالاتر طلسمِ ہفت خواں میرا
صدا ناقوس کی ہے دیر میں، شورِ فغاں میرا
حرم کا نعرۂ تکبیر، غوغائے اذاں میرا
جہاں جلتے ہیں، پرِ جبریل کے تابِ تجلی سے
اُسی نوری فضا میں ہے، قیامِ جاوداں میرا!
جہاں مجذوب و سالک بار پانے سے ترستے ہیں
ٹھکانا ہوشِ مدہوشی میں ہوتا ہے وہاں میرا
فنا فی العشق ہو کر تجھ سے ہوں شیر و شکر ایسا
کہ مجھ پر شک ترا ہوتا ہے اور تجھ پر گماں میرا
جو ہو لیں جی سے میرے یا بنا لیں مجھ کو خود اپنا
اُنھیں مرمٹنے والوں پر ہے لطفِ بیکراں میرا
ہوئے جب زارؔ جلوے عالمِ رویا میں باطل کے
ہُوا خوابِ پریشاں این چنیں و آں چنیں میرا

جدید بنگالی ادب

قرونِ وسطیٰ کا آخری ادیب اور "منگل کاویہ" کا مصنف بھرت چندر جدید ادب کا پیش رو تھا جس نے آسمانی دنیا سے اتر کر انسانی حیات اور جذبات کے موتی بکھیرنے شروع کئے۔ اس سے پہلے ادیب عام طور پر عالمِ بالا کے خیالات میں ہی غوطے لگاتے اور گوہر افشانی کرتے تھے۔ اگرچہ بھرت چندر چنڈی مت میں اعتقاد رکھتے تھے۔ لیکن 'ودیا' اور 'سندر' کے افسانۂ عشق میں مادی اور نفسانی خیالات غالب ہیں۔ بھرت چندر ہی کیا اٹھارھویں صدی کے ادیبوں کا رجحان ہی رومان کی طرف تھا اور وہ لسانی خوبیوں اور لطافت میں ہی مست نظر آتے تھے "کابی والاس" پر بھرت چندر کا نمایاں اور صریح اثر تھا جنھوں نے برائے نام رادھا کرشن کے عشق پر نظمیں کہیں۔ لیکن فی الحقیقت وہ سادہ اور پاک عشق کی داستانیں تھیں۔ بھرت چندر کی زندگی میں ہی جنگِ پلاسی کے بعد ملک کے سیاسی، اقتصادی، اور سماجی نظام کا نقشہ بدل گیا، اور ایسٹ انڈیا کمپنی پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ملک کا نظم و نسق چلانے کے لئے اُنھیں اپنے افسروں کو مقامی زبانوں اور قوانین میں تربیت دینا پڑے گی۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قایم کیا گیا، اور اس کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر گلکرائسٹ مقرر ہوئے۔ آپ ہندی کے عالم تھے اور آپ نے ایک جہاز میں سرجن کے عہدے سے استعفیٰ دے کر کالج کے قیام کے لئے راستہ صاف کیا تھا۔ اس کالج میں ہندوستان کی مختلف زبانوں مثلاً بنگالی، ہندی، ہندوستانی، پنجابی، اڑیہ وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ انگریزی کے عالموں نے ہندوستانی پنڈتوں اور منشیوں کی مدد سے کتب تیار کیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مشہور و معروف زبان داں ڈاکٹر کاری بائبل کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے کے لئے ہندوستان تشریف لائے۔ آپ بنگالی زبان کی گرامر، ڈکشنری اور کئی ایک دیگر کتابوں کے مصنف ہیں۔

اس اثنا میں فلسفیانہ مضامین پر مختلف رسالوں کے ذریعے رام موہن رائے میدانِ ادب میں اُتر پڑے، اور آپ درحقیقت جدید ہندوستان کے معمار کہلانے کے مستحق ہیں۔ آپ توہمات اور قدیم رسم و رواج سے بالاتر ہو کر سچائی اور عالم گیر مذہب کا پرچار کرنے لگے۔ اور فلسفیانہ تحقیقات کے نتائج پر انھوں نے نثر میں اظہارِ خیالات شروع کیا۔ آپ نے ہی انگریز مشنریوں سے بحث مباحثے کا سلسلہ جاری کیا، اور اس مہم کو کامیابی سے چلانے کے لئے مختلف رسالوں کی اشاعت شروع کی۔

صحافت کا سلسلہ انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا لیکن صحافیوں کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ ان کے پرچار سے کہیں نظم و نسق میں خلل واقع نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ مشنری صحافیوں نے سیرام پور میں ڈیرہ جمایا جو اس وقت تک ڈنمارک کے زیر تحفظ تھا۔ یہاں سے انھوں نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد "ڈگ درشن" اور "سماچار درپن" نامی رسالے اور اخبار جاری کئے۔ اس کے بعد بنگالی صحافت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

اس کے بعد ایشور گپتا کا زمانہ آیا، جو اپنی مزاحیہ تحریروں اور لسانی کرتبوں کی بدولت عوام پر چھا گئے، اور بنگال میں ادبی انجمنوں کے قیام کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ آپ انگریزی نظموں کا ترجمہ بنگالی میں اسی طرز پر کرنا پسند کرتے، اور اس کی حوصلہ افزائی کے لئے انھیں نہ صرف اپنے اخبار میں شائع کرتے ہیں بلکہ انعامات بھی تقسیم کرتے۔ اس کے کچھ عرصے بعد مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور نے تتوا بودھنی سبھا قائم کی اور تتوا بودھنی پتریکا کے نام سے اخبار بھی جاری کیا۔ اس اخبار سے اکشے کمار اور ایشور چندر ودیا ساگر ایسے عالم وابستہ تھے۔ جن کی تحریروں سے نثر کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اکشے کمار یورپی سائنس اور عقلیت کو ہندوستانی لباس پہنانے میں مصروف تھے اور ودیا ساگر مختلف کتابوں

کے ترجمے کے ذریعے بنگالی زبان کو نئی زینت بخشتے رہے۔ آپ نے ہندی سے "بتیل پنج و نساتی" "شیکسپیر" سے "بھرانتی بلاش" اور سنسکرت سے "شکنتلا" اور "ستارنیاس" کا بنگالی میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ ان کا بہت سا وقت سماجی اصلاح اور تعلیم لے لیتی تھی۔ لیکن باوجود اتنی مصروفیت کے انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھنے کی کوشش کی جس سے ان کی تخلیقی قوت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یورپی طرز کی تقلید

مختصر کتب اور کتابچوں کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کے سلسلے میں ورنیکولر لٹریچر سوسائٹی نے قابل قدر کام کیا۔ لیکن تخلیقی اسپرٹ حقیقی طور پر مائیکل مدھو سودھن دت کی تصانیف میں ملتی ہے جنھوں نے بنگالی میں بے قافیہ نظم کہنی شروع کی۔ انھوں نے میگھ ناتھ کی موت پر یورپی طرز پر ایک رزمیہ نظم لکھی جو عوام میں بے حد مقبول ہوئی۔ نیز رسمی قواعد وضوابط سے بلند ہو کر انھوں نے ڈرامے بھی لکھے۔ آپ پہلے بنگالی تھے جنھوں نے بنگالی زبان میں "سانیٹ" طرز کی نظم کہنی شروع کی۔ ان کی تصانیف عجیب و غریب اور نہایت بلند پایہ ہیں۔ ان میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اور قدرتی طور پر ان میں راجپوتوں کی شجاعت، بہادری، حب الوطنی اور شہادت کے قصے کہانیاں درج ہیں۔ آپ نے رام نرائن ایسے پیش روؤں کے خلاف سرکشی بھی اختیار کی اور ان کے ایک ہم عصر دینا بندھو نے نیل کے باغات مالکوں کے خلاف ایک مہم کا آغاز کیا۔ لیکن اسٹیج کے لئے مدھو سودھن کی طرز تحریر ہی اختیار کی گئی۔ مدھو سودھن کی موت کے بعد نئے ڈراموں کے فقدان کی وجہ سے تھیئٹر والوں کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن گرش چندر گھوش نے اس خلا کو پر کر دیا۔ قدرتی طور پر ان کے ڈرامے کئی قسم کے ہیں اور اس دریا کو کوزے میں بند کرنا دشوار ہے۔ لیکن پرانے "جاتروں" اور نئے ڈراموں میں جو نمایاں فرق پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں گیت کم ہیں۔ لیکن اس کمی کو پورا کرنے کے لئے آرکسٹرا، سینری اور اسٹیج کی نمائش پر زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ دوجیندر لال رائے کے تاریخی ڈراموں میں حب الوطنی کے جذبات کو اہم مقام حاصل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ بنکم چندر چٹرجی میدان میں آرہے تھے۔ آپ اپنے ناول "درگیش نندنی" کے ذریعے ادبی دنیا میں ایک نئی روح پھونکنے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے تاریخی اور سماجی حالات پر ناول لکھنے کے علاوہ فلسفے پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ جن میں "انند مٹھ"، "دیوی چودھرانی" اور "سیتارام" قابل ذکر ہیں۔ سماجی اور سیاسی ریفارمروں کا تمسخر اڑاتے وقت وہ تخیل سے کام نہیں لیتے تھے، فی الحقیقت وہ خود ریفارمر تھے لیکن ایک انقلابی نوعیت کے۔ وہ بے غرض خدمات کو بلند درجہ دیتے جس کی دوسرے مصنف بھی تقلید کرنے لگے۔ اس طرح وہ عوام کے دلوں پر چھا گئے۔ آپ ہندی کلچر کے گرویدہ تھے۔ چنانچہ آپ نے خیالات کی اشاعت کے لئے "انوشیلانہ" نامی کتاب تصنیف کی جس میں سری کرشن کو کلچر کے مجسمے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور بنگالی ادب کے سرتاج تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ نے نہایت ہی دلکش پیرائے میں کئی قصے کہانیاں لکھی ہیں جن میں آنسوؤں اور قہقہوں نیز سوز و گداز مزاحیہ عناصر کی ملی جلی تصویر پیش کی گئی ہے۔ نثر میں ان کا طرز تحریر بے مثال ہے۔ اگرچہ اوائل عمر میں آپ بہاری لال کے زیر اثر تھے، لیکن آپ نے اپنی غیر معمولی ذہانت کی بدولت ایک انوکھے طرز تحریر کی بنیاد رکھی۔ "کمل کنتر دفتر" کی تقلید کرتے ہوئے آپ نے صرف ظاہری صورت ہی قبول کی۔ آپ کے ناولوں میں انسانی خیالات و جذبات کو ترجیح دی گئی ہے۔ آپ نے نظم بھی نثر کی طرز پر کہنی شروع کی۔ آپ نثر کے استاد مانے جاتے ہیں۔ آپ ذہین اور محنتی تھے، اور حب الوطنی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ادبی دنیا میں آپ کی شخصیت اور عظمت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔

سرت چندر چٹرجی پسماندہ لوگوں کے وقار کو بلند کرنے میں بہت ممد و معاون ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنے وقت کی سماجی قدروں پر نکتہ چینی کر کے رہنماؤں کو بنیادی سماجی مسائل پر غور و خوض کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ ان کے علاوہ کئی ایک اور مصنفوں نے بھی بنگالی ادب کی زینت کو دوبالا کرنے کی کوشش کی۔ "پاتھر پنچالی" کے مصنف بی بھوتی بھوشن نے اپنی کہانی کی بدولت ادبی دنیا میں دائمی مقام حاصل کر لیا ہے۔ آج کل بھی دوسری ہندوستانی زبانوں کی طرح بنگالی زبان روبہ ترقی ہے اور قابل اشخاص کی کوئی کمی نہیں۔ آج بھی کئی ایک مصنف ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ اب جب کہ سیاسی آزادی ایک حقیقت بن چکی ہے بنگالی ادب کے مستقبل پر ہمیں زیادہ اعتماد کرنا چاہئے۔ توقع کرنی چاہئے کہ بنگالی ادب دوسرے ادب کے ساتھ مل کر قومی ترقی میں برابر کا شریک ہوگا، اور یہی طریقہ صحت مند صحیح اور درست ہے۔

(آل انڈیا ریڈیو کے شکریے کے ساتھ)

گُل کدہ

(ہندوستانی زبانوں کا ادب)

خریداری

مراٹھی

ا۔ وا۔ ورٹی

ترجمہ جوہر چاند وڈی

"اوہو، ہوا ہو! آیئے ڈاکٹر صاحب اور محترمہ ڈاکٹرنی صاحبہ" بابو بھائی نے کہا۔

اگر بذات خود اُٹھو با اور رگوما بائی میاں بیوی "تکارام تاجر کے گھر تشریف لاتے تو اُنھیں جتنی مسرت ہوتی، اتنی ہی مجھے اور میری بیوی شکنتلا دیوی کو اپنی دکان کے زینے پر چڑھتے ہوئے دیکھ کر بابو بھائی کو ہوئی، یہ اُن کے شگفتہ چہرے سے روشن ہو رہا تھا۔

"آیئے، آیئے، کہیے حضور کیا حکم ہے؟" سامنا ہوتے ہی بابو بھائی نے ہم سے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

ان کی حد درجہ آؤ بھگت سے میں ذرا پشیمان سا ہو گیا۔ کیوں کہ میں بالکل معمولی سودا خرید کرنے والا تھا۔ ہماری خریداری کے مقابلے میں ہمارا استقبال بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ مگر میں نے اُن کی آؤ بھگت اور خوشامدانہ باتوں پر ذرا توجہ نہ کی۔ یہ تعجب کی بات نہیں۔ عام طور پر ہر چھوٹے بڑے دکاندار کا تاجرانہ دستور یہی ہے کہ ہر گاہک کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہے اور اُن کی شانِ شایاں آؤ بھگت کرتا ہے۔

مجھے صرف تین رومال خریدنا تھے۔ آج میری جیب میں ایک رومال بھی نہ تھا۔ اگر زکام کی شکایت ہو اور رومال پاس نہ ہو تو بُری گت ہوتی ہے۔ اس کا کم و بیش سبھی کو تجربہ ہے۔ مجھے جب بھی زکام ہوتا ہے تین رومال خریدنا لازمی ہو جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دوسرے زکام تک تینوں رومال میں سے ایک بھی میرے پاس نہیں رہتا۔ عام طور پر مجھے ہر موسم کے ابتدائی دنوں میں زکام کی شکایت ہو جاتی تھی۔ اس لئے سال بھر میں تین یا تین تین رومال خریدنے کی ضرورت نوبت آتی تھی۔

لیکن اب تک جب بھی زکام ہوا، رومال خریدنے کے لئے بابو راؤ کلاتھ مرچنٹ کی دکان پر اکیلا ہی جاتا تھا اور پاؤ پاؤ درجن رومال خرید کر لاتا رہا۔ آج بھی اکیلا ہی جانے کے ارادے سے گھر سے باہر قدم رکھا تھا کہ شکنتلا نے پوچھا۔

"کہاں جانا ہے؟"

"بابو بھائی بزاز کی دکان پر پاؤ درجن رومال خریدنے کے لئے جانے کا ارادہ ہے۔"

"ٹھہریئے، میں بھی آتی ہوں"، شکنتلا نے کہا۔

"تم نہ آؤ، صرف پاؤ درجن رومال ہی تو خریدنا ہیں۔ تمھارے آنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"شکنتلا ساتھ آئے گی تو فضول گھنٹہ دو گھنٹے لگیں گے، یہ سوچ کر اسی وقت میں نے انکاری جواب دے دیا۔

"پاؤ درجن رومال خریدنے میں تو کیا ہرج ہے۔" ہاتھ منہ دھونے کے ارادے سے تولیہ کندھے پر ڈالتے ہوئے شکنتلا نے کہا۔

"آپ اکیلے بازار جا کر بالکل معمولی درجے کے رومال خرید لاتے ہیں۔ اُن کا نہ رنگ اچھا ہوتا ہے نہ ڈیزائن دل فریب، بابو بھائی آپ سے دام بھی زیادہ لیتے ہیں۔

اب شکنتلا کے آنے نہ آنے کے سوال کا فیصلہ ہی ہو گیا۔ پھر شکنتلا دلربایانہ قدم اٹھاتی ہوئی غسل خانے میں چلی گئی۔ شکنتلا کی بات معقول تھی۔ میں کبھی کسی چیز کی خرید کے وقت بھاؤ تاؤ نہیں کرتا۔ دکان دار جو بل پیش کرتا ہے رقم ادا کر دیتا ہوں۔ آج تک جو سودا سلف لایا شکنتلا نے قیمت کے لحاظ سے پسند نہ کیا۔ اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر میں نے کہا تھا۔

"تمھارے آنے کی کیا ضرورت ہے؟"

مگر شکنتلا پر میرے انکار کا کتنا اثر ہوا ہوگا، یہ آپ ہی فیصلہ کر لیں۔ آپ نے شکنتلا کو کبھی کوئی چیز خریدتے ہوئے دیکھا بھی ہے؟ وہ جب بھی بازار جاتی ہے اس کے سودا لینے کا عجیب طریقہ ہوتا ہے۔ اس سے کچھ نہ کچھ سبق ضرور ملتا ہے۔ کیوں کہ خرید و فروخت بھی ایک ہنر ہے۔" وہ سودا لیتے وقت دکانداروں سے بحث و مباحثہ کرتی ہے۔ وہ پہلے بہت سا مال سرسری طور سے دیکھ لیتی ہے۔ پھر ایک ایک کپڑے کی بناوٹ، صفائی، تانا بانا، ڈزائن، کچا پکا رنگ اور مضبوطی وغیرہ باتوں کا خیال رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ بآسانی یہ بھی جان لیتی ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت کیا ہوتی ہے۔ شکنتلا میں اتنی خوبیاں پاکر دیکھنے والا کیا حیران نہ ہوگا؟ اس کو لین دین کا خوب تجربہ ہے۔ اگر کسی کالج کی طالبہ کو خرید و فروخت کی سند حاصل کرنی ہو تو شکنتلا یقیناً ماہر خرید و فروخت یا ماہر تجارت معلّمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسے اعلیٰ ماہر تجارت کو صرف پاؤ درجن جیبی رومال خریدنے کے لئے تکلیف دی جائے۔ اور یہ نادر خوبی منظرِ عام پہ لائی جائے۔

یہ تو وہی بات ہوگی کہ کسی بھوکے چور کی گرفتاری کے معمولی کام پر کسی فیلڈ مارشل کا تقرر کیا جائے۔ مگر شکنتلا نے میرے ساتھ بازار چلنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا، اور بیوی جو بھی مصمم ارادہ کر لیتی ہے اس میں کوئی مرد دانا رکاوٹ نہیں کرتا، نہ کر سکتا ہو، اس کی مرضی کا خیال رکھتے ہوئے رضامند ہی ہوتا ہے۔

بابو بھائی کی دکان کے کاؤنٹر کے قریب کھڑے ہو کر میں نے کہا،

"بابو بھائی! مجھے ذرا۔۔۔۔۔"

مگر انھوں نے مجھے کچھ کہنے کا موقعہ نہ دیتے ہوئے اپنے ملازم سے کہا۔

"رام داس! کل جو بنارسی ساڑیوں اور شالوں کا پارسل آیا ہے نا؟ وہ ذرا اٹھا لاؤ۔"

اور شکنتلا سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"کل ہی نیا مال آیا ہے۔ ڈاکٹرنی صاحبہ! بالکل نیا ڈزائن ہے نیا، بمبئی میں اس کی بہت مانگ ہے۔ میں آپ کے دیکھنے کے لئے بھیجنے ہی والا تھا۔"

"آپ اکثر ایسی ہی باتیں بناتے ہیں۔" شکنتلا نے جواب میں کہا۔ "ہر گاہک سے یہی کہتے ہیں کہ بالکل نیا مال اور نیا ڈیزائن ہے مگر دیکھا گیا تو ہوتا پرانا ہی ہے۔"

"آپ بالکل سچ کہتی ہیں بائی صاحبہ! مجھے اپنے جرم کا اقرار ہے۔" چہرہ بناتے ہوئے بابو بھائی کہنے لگے۔ "مگر یہ مال آپ ایک نظر دیکھئے تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ میرا کہا کہاں تک درست ہے۔ بائی صاحبہ! سچ مانئے نیا ڈیزائن ہے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ رام داس نے بنارسی شالوں اور ساڑیوں کی گٹھڑی شکنتلا کے سامنے لاکر رکھی۔ بابو بھائی گرہ کھولنے لگے۔ شکنتلا بے تابانہ نظروں سے گٹھڑی کا مال غور سے دیکھنے کے لئے کھوئی ہوئی تھی۔

"بابو بھائی! میں نے پھر بولنے کی کوشش کی۔ مجھے ذرا ــــــ"

"بائی صاحبہ! بابو بھائی میری طرف توجہ کے بعد شکنتلا سے کہنے لگے۔ "دیکھئے کہ نہیں بہترین مال؟ کل ہی کلکٹرنی صاحبہ نے اس میں سے ایک شال اور ایک شال تحصیلدارنی صاحبہ دیکھ گئی ہیں۔"

بابو بھائی ایک ایک شال کی تہ کھول رہے تھے۔ ان کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ رُکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ دکان دار لوگ بڑے چالاک اور غضب کے باتونی ہوتے ہیں۔ اُس کے چہرے ہی سے تاڑ لیتے ہیں کہ کون کیسا گاہک ہے۔ اور اس سے کس قسم کی باتیں کی جائیں۔

"اونہہ، اس شال کی زمین ٹھیک نہیں۔" ایک شال کو دیکھتے اور اُس پر انگلیاں پھیرتے ہوئے شکنتلا نے کہا۔ "کلکٹرنی صاحبہ ہی یہ شال پسند کریں تو کریں۔"

"ایں، ایں، ایں" کہتے ہوئے شکنتلا کا چہرہ مجھے بہت بھلا معلوم ہوا۔ اور بابو بھائی اپنی بتیسی دکھانے والا شگفتہ چہرہ بناتے ہوئے بولے۔

"آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ ذرا یہ شال تو دیکھئے۔ یقیناً آپ کو بہت بھائے گی۔ اور آپ کے سرخ و سفید رنگ پر خوب زیب بھی دے گی۔ اس کی بناوٹ بھی اچھی ہے ــــــ"

شکنتلا اک دم اس شال کو غور سے دیکھنے لگی۔ "ارے اس کا تو کنارہ زیادہ زردار نہیں ہے۔"

شکنتلا ہر شال میں کچھ نہ کچھ نقص نکال کر نا پسند کئے جا رہی تھی،

اور بابو بھائی ایک کے بعد ایک شال اُن کے سامنے ڈالے ہی جا رہے تھے۔ ان دونوں میں بحث و مباحثہ جاری تھا۔

شکنتلا، کون سا مال پسند کرتی ہے، اور کیسا سودا کرتی ہے۔ یہ منظر دیکھنے کے قابل ہی تھا، اور اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا، دکان کے کس نوکر سے رومال لانے کے لئے کہا جائے۔ سبھی تو شکنتلا کی خرید اور چالاکی دیکھنے میں محو تھے۔ آخر مجبور ہو کر میں نے ہی شکنتلا سے دو تین مرتبہ رومالوں کے لئے اشارتاً کہا، مگر اس نے اَن سُنی کر کے "ذرا ٹھہریئے" کہنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ جب میں نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ تو اس نے بگڑ کر کہا۔

"ذرا ٹھہریئے نا؟"

اور مجھے خاموش کر دیا۔ پھر وہ بابو بھائی سے شال کی بھلائی برائی کی بحث میں کھو گئی۔

قریباً ایک گھنٹے کی بحث کے بعد ایک شال پسند آئی۔ اب ان دونوں میں قیمت کے متعلق بحث چلی۔ خود بخود آنکھیں بند کر دینے والی خشک بحث چھڑ گئی۔ میں ایک سگار جلا کر میز کے کونے پر بیٹھ گیا، اور سڑک پر آنے جانے والوں کو دیکھ کر اپنا دل بہلانے کی کوشش کرنے لگا۔

"سنتے ہو، بابو بھائی کیا کہتے ہیں؟" شکنتلا کے یہ کہنے پر میں چونک پڑا۔ اب میں سمجھا کہ شال کا سودا ہو گیا۔ اب رومالوں کا ہوگا۔ بڑی اُمید سے کاؤنٹر کے پاس گیا۔ مگر میرے ارمانوں کا خون ہو گیا۔ دیکھا تو کاؤنٹر پر ایک بھی رومال نہ تھا۔ اس پر ساڑھیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب ڈاکٹر صاحب آپ ہی فرمایئے" بابو بھائی نے کہا۔ "یہ رنگین ساڑی ڈاکٹرنی صاحبہ کو خوب زیب دے گی یا نہیں؟"

"انہیں تو ہر رنگ کا کپڑا زیب دیتا ہے" میں نے کہا

"مگر قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے" شکنتلا بابو بھائی سے کہنے لگی۔

"پسند تو ہے" شکنتلا اپنے بدن سے ساڑی لپیٹتی ہوئی دکان میں لگے ہوئے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ "مگر پیسے ابھی نہیں ملیں گے"

"پیسوں کا کون تقاضا کرتا ہے؟" بابو بھائی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "ایک سال بعد روپے ادا کریں۔ اس کا فکر نہ کریں"

"مگر قیمت؟" شکنتلا نے پھر کہا۔

"بائی صاحبہ! آپ کو یہ ساڑی پسند ہے نا؟" بابو بھائی نے کہا، "قیمت کیا پوچھتی ہیں، مُفت لے جا سکتی ہیں ——" "ارے رام داس! اس ساڑی کو ڈبے میں رکھ کر بائی صاحبہ کو دے دو، اور کیا چاہیئے۔ اندور کی ساڑھیاں بہت ہی اچھی آئی ہیں"

"سر دست نہیں،" "یہ شال خریدلی ہے، یہی سودا زیادہ ہو گیا ہے" شکنتلا نے کہا۔

"بائی صاحبہ! پیسوں کا نہ فکر نہ سوال، آپ جب چاہیں ادا کر سکتی ہیں" بابو بھائی نے کہا۔

"پانچ سال بعد ادا کروں گی" شکنتلا نے کہا۔

"ایک پیسہ بھی ادا نہ کریں۔ اب تو کوئی مضائقہ نہیں؟ مگر یہ مال پھر نہ ملے گا" یہ کہہ کر بابو بھائی نے نوکر سے بلند آواز سے کہا۔

"رام داس! گزشتہ ہفتے جو اندوری ساڑھیاں آئی ہیں۔ وہ بائی صاحبہ کو ذرا دکھاؤ تو"؟

"آپ کو مال پسند آیا ہے نا؟ پھر بخوشی لے جایئے"

"مگر پیسے تھوڑے تھوڑے ادا کئے جائیں گے"

"کچھ ہرج نہیں"

"بالکل رقم ادا ہی نہ کریں گے" کہنے پر بھی، مسکراتے ہوئے کہتے ہیں، "آپ کو مال پسند ہے نا؟ پھر کوئی بات نہیں"

چہرے پر ذرا فکر کے آثار نمایاں ہونے نہیں دیتے، اور نڈر ہو کر کہتے ہیں "پیسے کون مانگتا ہے"

گاہک کو دکاندار کی باتوں پر یقین آجاتا ہے، اور وہ بے سوچے سمجھے مال لے جاتا ہے۔ ان کی یہ خوبی قابلِ داد ہے۔

گاہک رقم ادا کر دے گا۔ وہ اس قدر صبر و تحمل کیسے کرتے ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں تو کیا ہے؟ مگر یہ واقعہ ہے کہ کسی گاہک کو مال دینے کے بعد ایک دو ماہ کے اندر ہی دام وصول کر لیتے ہیں۔ یہ گُر وہ خوب جانتے ہیں!

ساڑی کا سودا ہو گیا۔ اب رومال خریدنے کی یاد دلانا غیر مناسب

نہ ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے کہا۔

"ہم رومال خریدنے آئے ہیں نا؟"

"اس سے تو ذرا ہلکا رنگ ہی خوب زیب دیتا ہے"! شکنتلا نے کہا، مگر یہ جواب دیتے وقت وہ بابو بھائی سے مخاطب تھی، مجھ سے نہیں۔

میں اسی طرح چپ سادھے کھڑا رہا۔ رام داس ایک ایک ساڑی کاؤنٹر پر ڈال رہا تھا اور بابو بھائی ہر ساڑی کی خوبیاں بیان کئے جا رہے تھے۔ شکنتلا ہر ساڑی کی برائیاں بیان کئے جا رہی تھی۔ ناگپوری، اِلکلی پوچی۔ نیلگوں، ہلکی آسمانی، بناوٹ، رنگ، ڈیزائن، زرّیں کنارے اور دامن، کویم توری، کھمبایتی وغیرہ وغیرہ۔ الغرض مجھے کئی قسم کے رنگوں، کئی شہروں اور میلوں کے نام یکے بعد دیگرے سنائی دے رہے تھے، اور کاؤنٹر پر ساڑیوں کا انبار لگ گیا تھا۔ میں نے شکنتلا کی طرف دیکھا۔ وہ سودا کرنے میں کھوئی ہوئی تھی۔ ارد گرد کی دنیا کی اسے مطلق خبر نہ تھی۔ وہ ایک سکون بخش بلند پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی تھی ——— میں اپنے رومالوں کی یاد دلا کر اس کی لطف آمیز باتوں میں رکاوٹ پیدا کرکے اپنی حماقت کا ثبوت دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے چپ کھڑا رہا۔ قریباً ہم دونوں دو گھنٹے کے بعد پلٹ کر آئے۔ ایک بنارسی شال، ایک کھمبایتی اور کوئمبتوری ساڑی اور ایک جارجٹ کا کپڑا اجمیر کے لئے۔ اس کے علاوہ گجانا میل کی دو ساڑیاں۔ لتنے کپڑوں کی گٹھڑی قلی نے لا کر میز پر رکھی۔ ہم دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

آج ہی یہ بنارسی شال خریدی ہے۔ بہت خوب ہوا۔ ورنہ کل تحصیلدارنی صاحبہ خرید لیتیں۔ مگر وہ موٹی تازی بھاری بدن کی عورت ہے۔ اس کو زیب ہی نہ دیتی۔ کیوں کہ جارجٹ کی یہ ساڑی تو قریباً آدھی قیمت ہی میں ملی ہے۔

شکنتلا نے جب دکان سے باہر قدم رکھ کر گھر آنے تک، اور گھر میں بھی اپنی خریداری کی خوبیاں بیان کئے جا رہی تھی۔ میں پسینے میں بہہ رہا تھا، سخت دھوپ تھی۔ بابو بھائی کے بل کے ہندسے کی گرمی نے تو میرے ہوش ہی اڑا دیئے۔ مگر اپنے بدن اور چہرے کا پسینہ صاف کرنے کے لئے رومال کہاں تھا؟ رومال کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھنے ہی پایا تھا کہ زکام کی وجہ سے ایک چھینک آئی اور میں نے گھبرا کر گٹھڑی کھول کر ایک بنارسی ساڑی کے دامن سے اپنی ناک صاف کی۔

"ایں، یہ کیا گت رگی؟" شکنتلا نے کہا: "قیمتی ساڑی سے کہیں ناک صاف کی جاتی ہے"؟

"ہاں" میں نے کہا "میں سمجھا کہ یہ رومال ہی ہے؟ کیوں کہ ہم دونوں رومال خریدنے کے لئے ہی بابو بھائی کی دکان پر گئے تھے"۔

"ارے ہاں" اپنے دِیدے پھاڑ کر شکنتلا نے حیرت سے کہا۔

"کیا آپ نے رومال نہیں خریدے؟ واقعی آپ بھی بڑے بے خیال آدمی ہیں۔ آپ کو ذرا بھی اس کا علم نہیں۔ دکان پر جا کر کپڑا کیسے خریدا جا سکتا ہے۔ بہت ہی اچھا ہوا کہ مجھ جیسی چالاک بیوی آپ کو ملی۔ ورنہ منسا رہی سنسار ——— ؟"

اور بھی ہیں

ہندی

بال کرشن راؤ :—

ایک تیری ہی نہیں سنسان راہیں اور بھی ہیں
کل صبح کی انتظاری میں نگاہیں اور بھی ہیں
اور بھی ہیں اوٹ جن پر وید نا مسکان بنتی
نین تیری ہی نہیں جو سپن کی پہچان بنتی
پُوجنا پتھر اکیلے ایک تجھ کو ہی نہ پڑتا
"واہ" بننے کے لئے مجبور آہیں اور بھی ہیں
ایک ننھا گھونسلا اڑتا نہ آندھی میں اکیلا
گر پڑی بجلی اگر تو ایک ٹہنی نے نہ جھیلا
سوچ تو کیا باڑھ آتی ہے اکیلے کو ڈبانے؟
ایک تنکا کھوجتی اسہائے باہیں اور بھی ہیں
تو اکیلا ہی نہیں ہے جو اکیلا چل رہا ہے
راستے پر اور بھی ہیں پاؤں جن کا جل رہا ہے
کیوں انھیں ہی مانتا ساتھی نظر کے سامنے جو؟
ایک ہی آگے رہے گی پر دشائیں اور بھی ہیں

---

[1] بغیر سہارے کے [2] اطراف

ڈال ڈال کے پات

گرامی

عبدالمجید سالک

مولانا گرامی جالندھر کے رہنے والے تھے۔ ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ انھیں مبدٔ فیاض سے فارسی شاعری میں وہ کمال حاصل ہوا کہ عرفی و نظیری کی یاد تازہ ہو گئی۔ میر محبوب علی خاں نظامِ دکن کی نظرِ انتخاب نے ان کو اپنے دربار کے لئے منتخب کر لیا۔ چنانچہ آپ شاعرِ دربار اور استادِ نظام کی حیثیت سے حیدرآباد دکن چلے گئے۔ پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ حیدرآبادی شیروانی اور اڑا پاجامہ پہنتے سر پر بڑی سی رنگین دستار باندھتے۔ بھری بھری داڑھی۔ موٹے موٹے خد و خال چمکتی آنکھیں۔ بے حد ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج۔ ڈاکٹر اقبال سے خصوصی دوستانہ تعلقات تھے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب اپنے فارسی کلام میں ان سے مشورہ بھی لیا کرتے تھے، اور ایک دن ڈاکٹر صاحب نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں گرامی کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا کہ اگر عرفی و نظیری کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو وہ گرامی ہے۔ آج گرامی کو سن لو۔ کل فخر کرو گے کہ تم نے گرامی کو سنا ہے —— اور مولانا گرامی کے دل میں بھی ڈاکٹر صاحب کی قدر و قیمت کم نہ تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال

پیغمبرِیے کرد و پیمبر نتواں گفت

گرامی کی طبیعت میں ایک خصوصیت ایسی تھی جو میں نے عمر بھر کسی شخص میں نہیں پائی۔ یعنی شعر میں ایسا انہماک تھا۔ کہ باقی تمام امور سے انقطاعِ کلی ہو گیا تھا۔ اگر جالندھر سے چل کر لاہور پہنچنا ہے تو کوئی ٹرین میں بٹھا دے۔ اور کوئی لاہور پہنچ کر اتار لے ورنہ انھیں بالکل احساس نہ ہو گا کہ کہاں اترنا ہے۔ وہ شعروں میں مستغرق پشاور پہنچ جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے کہ گرامی شعر میں تلمیذ روح الامین ہے۔ اور باقی تمام معاملات میں چغد ہے۔ جب کبھی حیدرآباد سے رخصت لے کر آتے تو ڈاکٹر صاحب علی بخش کو جالندھر بھیج دیتے۔ کہ جا کر مولانا گرامی کو لاہور لے آئے۔ علی بخش کسی نہ کسی طرح انھیں لے آتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ علی بخش گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی طرف سے سلام و پیام دے کر کہنے لگا مولانا آپ کل صبح میرے ساتھ چلیے کہنے لگے ہاں ہاں ضرور چلیں گے۔ کیوں نہ چلیں گے۔ ڈاکٹر (ڈاکٹر کی ٹ کو ہمیشہ ت میں بدل دیا کرتے تھے) ہمارا دوست ہے اپنے دوست کے ہاں کیوں نہ چلیں گے۔ دوسرا دن آیا صبح ہی بستر بندھوایا جانے کی تیاریاں ہونے لگیں پھر خدا جانے جی میں کیا آیا، بستر کھلوا دیا، ارادہ ملتوی کر دیا۔ اب علی بخش جز بز ہو رہا ہے۔ اس کو سمجھا رہے ہیں۔ کل چلیں گے تم فکر نہ کرو۔ تیسرا دن آیا بستر پھر بندھ گیا۔ تانگہ منگا لیا گیا، تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اندر گئے باہر آئے۔ اندر گئے بیگم سے باتیں کیں۔ کچھ ضروری چیزیں لے کر ٹرنک میں ٹھونس لیں۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد باہر نکلے۔ گرمی کا موسم تھا۔ تانگے کی نشست تپ گئی تھی۔ علی بخش اگلی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ مولانا پچھلی نشست پر بیٹھے ہی تھے۔ کہ بے چین ہو کر اٹھے۔ ارے تانگہ بہت گرم ہے، یہ کہا اور نیچے اتر گئے۔ علی بخش سے بولے تم چلے جاؤ ڈاکٹر سے کہہ دینا۔ تانگہ گرم ہو گیا تھا اب سردیوں میں آئیں گے۔

غرض مولانا کو جالندھر سے لانا بھی ایک شدید مرحلہ تھا۔ جسے علی بخش ہی طے کر سکتا تھا۔ دوسرے کے بس کا روگ نہ تھا۔ جب ایک دفعہ مولانا ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ تو پھر یہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتے۔ ڈیڑھ ڈیڑھ مہینہ پڑے رہتے۔ ساری رخصت یہیں بسر ہو گئی۔ بیگم گرامی (اقبال بیگم ترک تخلص اردو کی شاعرہ تھیں) پیغام پر پیغام بھیج رہی ہیں۔ لیکن یہاں کچھ اثر ہی نہیں۔

ایک دن جالندھر کے دو تین آدمی ڈاکٹر کے مکان پر مولانا سے ملنے آ گئے۔ بیگم نے ان کو سمجھا کے بھیجا تھا۔ کہ بلطائف الحیل مولانا کو وہاں سے جالندھر واپس آنے پر آمادہ کرنا۔ مولانا نے ان سے پوچھا۔ کیوں بھائی ہمارے گھر میں تو خیریت ہے؟ انھوں نے سوکھا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ حضرت خیریت

تو ہے مگر بیگم صاحبہ کو اسہال ہو رہے ہیں۔ یہ سن کر مولانا سخت مضطرب ہوئے ان کا خیال تھا۔ کہ جس شخص کو اسہال ہونے لگیں۔ وہ مشکل ہی سے بچتا ہے وہ آدمی چلے گئے لیکن مولانا کو رٹ سی لگ گئی بیگم کو اسہال آ رہے ہیں، میں بھی عجیب آدمی ہوں یہاں آ کر بیٹھ رہا کہیں کوئی نیکی بازی ہو گئی تو کیا کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب عدالت سے واپس آئے تو ان کے سر پر سوار ہو گئے۔ میں فوراً جالندھر جاؤں گا۔ اقبال بیگم کو اسہال ہو رہے ہیں۔ جلدی سے انتظام کرو۔ اب میں ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔ ڈاکٹر صاحب کو مولانا کی کمزوری معلوم تھی انھوں نے نہایت سکون سے سوٹ اتار کپڑے تبدیل کئے اور اس دوران میں ایک رباعی کے تین مصرعے کہہ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد کہا مولانا! خدا فضل کرے لیکن اسہال کوئی خطرناک مرض نہیں ہے۔ یوں آپ جس وقت چاہیں گے میں آپ کو جالندھر بھجوا دوں گا۔ لیکن ایک رباعی ذہن میں اڑ گئی ہے۔ تین مصرعے ہو سکے ہیں چوتھا نہیں ہوتا۔ اور آپ جانتے ہیں چوتھا مصرع۔ جانِ رباعی کہلاتا ہے اس کے بعد وہ تینوں مصرعے سنا دیئے اور کہا کہ ذرا فکر تو کیجیے شاید چوتھا مصرع ہو جائے۔

اب مولانا اس چوتھے مصرعے کی فکر میں مستغرق ہو گئے۔ اور بیگم کا خیال دھواں بن کر اڑ گیا۔ بیٹھے ہوئے گنگنا رہے ہیں۔ کھڑے ہوئے گنگنا رہے ہیں۔ حقہ پی رہے ہیں اور گنگنا رہے ہیں۔ ایک آدھ مصرع کہہ کر ڈاکٹر صاحب کو سنایا جو ڈاکٹر صاحب کو پسند نہ آیا، پھر دوبارہ فکر ہوئی لیکن کوئی مصرع ٹھیک نہ بیٹھا۔ ڈاکٹر صاحب اوپر کے کمرے میں جا کر سو گئے۔ اب مولانا اس مصرعے کی بھول بھلیاں میں چکر کاٹ رہے ہیں رات کے تین بجے نہایت چست و برجستہ مصرع ہو گیا۔ مولانا نے علی بخش کو جگا کر کہا۔ علی بخش جاؤ۔ ڈاکٹر کو بلا لاؤ اس نے کہا۔ حضرت کوئی تکلیف یا ضرورت ہو تو مجھے حکم دیجیے۔ ڈانٹ کر کہا۔ نہیں تجھ سے کام نہیں۔ ڈاکٹر سے کام ہے۔ وہ بے چارا اوپر گیا، دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈاکٹر صاحب جاگ اٹھے۔ علی بخش نے کہا۔ مولوی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ پوچھا خیر تو ہے بیمار تو نہیں ہو گئے؟ عرض کیا بظاہر تو بھلے چنگے ہیں۔ خیر ڈاکٹر صاحب سردی میں دھسہ اوڑھ کر نیچے اترے۔ حضرت خیر تو ہے؟ مولانا نے فرمایا اجی سنو مصرع ہو گیا، ڈاکٹر صاحب نے مصرع سن کر داد دی اور اجازت چاہی۔ اجی کہاں چلتے ہو اب تو صبح ہونے والی ہے۔ اس کے ساتھ ہی علی بخش سے کہا میاں اس وقت تو چائے کو جی چاہتا ہے۔ علی بخش نے جھٹ سٹوو جلایا چائے پکائی۔ جب چائے تیار ہو گئی تو مولانا کیا فرماتے ہیں آہا اس وقت اگر سنگترے ہوتے تو مزا آ جاتا۔ ڈاکٹر صاحب نے علی بخش سے کہا۔ جاؤ لوہاری دروازے کے کسی دوکاندار کو جگا کر سنگترے لے آؤ۔ بے چارہ علی بخش سوں سوں کرتا ہوا لوہاری دروازے گیا۔ دوکاندار کو جگا کر سنگترے لایا۔ مولانا نے بڑے مزے لے لے کر کھائے چائے پی اور پھر ڈاکٹر صاحب سے کہنے لگے اب تم جاؤ اور سو رہو۔ حالانکہ اس وقت سورج نکل رہا تھا۔

ایک دن کھانے پر بیٹھے۔ تو کہا۔ علی بخش آج کل گوبھی نہیں ملتی؟ عرض کیا۔ حضرت بہت ملتی ہے۔ حکم دیا کہ شام کو گوبھی ضرور پکوانا شام کے وقت جب گوبھی پک کر سامنے آئی تو پوچھنے لگے یہ کیا ہے؟ کہا گیا گوبھی بگڑ کر کہنے لگے۔ صبح گوبھی، شام گوبھی، دن گوبھی، رات گوبھی۔ بڈھے آدمی کو بادی سے مار ڈالو گے کیا؟ علی بخش نے کہا۔ آپ ہی نے حکم دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا، تم چپ رہو۔ صبح گوبھی کی فرمائش کرنے کے بعد مولوی صاحب اب تک اپنے تصور میں خدا جانے کتنی دفعہ گوبھی کھا چکے ہیں۔ تم بھی سچے ہو اور یہ بھی سچے ہیں۔

مولانا گرامی کی ذات دلچسپیوں کی پوٹ تھی بعض اوقات سردیوں کے موسم میں رات کے وقت انھیں محسوس ہوتا کہ سر کے نیچے تکیہ کافی اونچا نہیں ہے نیچے سے توشک نکال کر لپیٹتے۔ اور سرہانے رکھ لیتے۔ پھر بھی طبیعت مطمئن نہ ہوتی تو لحاف کو گاؤ تکیہ بنا کر رکھ لیتے۔ اور پھر صبح کے وقت شکایت کرتے کہ ساری رات جاڑے میں مر گیا۔ تم لوگ کافی بستر کیوں نہیں دیتے۔ علی بخش کہتا، مولوی صاحب بستر تو دیا تھا۔ لیکن آپ نے کوہ ہمالیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا اس پر اسے برا بھلا کہنے لگتے۔

ایک دفعہ میں نے نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی کے متعلق کہ ان کے لنگوٹیے یار تھے، دریافت کیا کہ ان کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جواب دیا خامی میں پختہ ہو گیا ہے میاں"۔ میں اس جامع و مانع رائے کو سن کر پھڑک گیا۔ مولانا کا ایک نوکر تھا۔ غلام محمد بہت نمازی اور پرہیزگار مکان کے پاس ہی مسجد تھی غلام محمد نماز مسجد میں جا کر پڑھتا تھا۔ ایک دفعہ مولانا نے آواز دی۔ غلام محمد کسی نے بتایا کہ ظہر کی نماز پڑھنے گیا ہے۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ پھر آواز دی۔ غلام محمد! پھر کسی نے بتایا کہ عصر کی نماز پڑھنے گیا

ہے۔ بہت بگڑے، کہنے لگے، جب دیکھو نماز پڑھنے گیا ہے۔ جب پوچھو نماز پڑھنے گیا ہے۔ نابکار، قرب مسجد کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے یہ ناجائز فائدہ بھی خوب رہا۔

مولانا کا نکاح ثانی۔

مولانا گرامی کے ہاں عمر بھر اولاد نہیں ہوئی۔ ایک دفعہ بعض عزیزوں نے کہا کہ آپ کی اس بیگم سے اولاد نہ ہوگی۔ آپ دوسرا نکاح کیجئے پہلے تو انکار کرتے رہے۔ آخر راضی ہوگئے اور ایک عورت سے نکاح کر لیا لیکن ابھی رخصتی عمل میں نہ آئی تھی۔ اقبال بیگم کو بے حد صدمہ ہوا۔ وہ لاہور آکر ڈاکٹر صاحب سے ملیں۔ اور کہا آپ اپنے دوست کو سمجھایئے۔ اس بڈھوتی کے زمانے میں اسے نکاح کی کیا سوجھی۔ بیگم بے چاری بہت روتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے علی بخش کو بھیج کر مولانا کو بلوایا۔ دریافت حال کیا اور کہا کہ آپ نے بُرا کیا۔ اگر اقبال بیگم کے خلاف آپ کو شکایت ہوتی تو ایک بات بھی تھی۔ خواہ مخواہ بلا قصور اس پر سوت لا بٹھائی یہ کہاں کی انسانیت ہے؟ لیکن مولانا ہیں کہ پچھے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتے نکاح میں کیا ہرج ہے؟ نکاح سنت رسول ہے۔ قدّت کے بڑے بڑے لوگوں نے تین تین، چار چار نکاح کئے ہیں، میرے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ میرے بعد میرا نام کون لے گا۔

ڈاکٹر صاحب اس بے زبان کی تر زبانی سے بہت پریشان ہوئے۔ لیکن آخر شاعر کو زیر کرنے کے لئے جذبات کے حربے سے کام لیا، اور کہا کہ اولاد ہی سے نام نہیں رہتا۔ آپ کا کلام مدّت دراز تک زندہ رہے گا۔ اور لوگ آپ کو یاد رکھیں گے۔ لیکن جب روزِ قیامت آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار لگے گا اور ساری اُمّت حضور کے قدموں میں جمع ہوگی۔ اور اقبال بیگم حضور کا دامن تھام کر فریاد کرے گی۔ کہ اے دو جہاں کے آقا میرا انصاف کر۔ عمر بھر میں نے اس بڈھے کی خدمت کی۔ لیکن اس نے بے قصور و بے گناہ مجھ پر سوکن لا بٹھائی اور میری زندگی کو تلخ کر دیا۔ اس وقت بڈھا گرامی کیا جواب دے گا؟ اے بوالہوس۔ کیا تو نے جواب سوچ لیا ہے؟ بس پھر کیا تھا۔ مولانا گرامی زار زار رونے لگے۔ یا رسول اللہ میں بھول گیا میرے آقا مجھ سے خطا ہو گئی خدا کے لئے مجھے معاف کر.... ڈاکٹر! بتاؤ اب میں کیا کروں"۔ ڈاکٹر صاحب نے مولانا کو تسلی دی۔ اور کہا کہ فوراً واپس جاکر اس عورت کو طلاق دے دو تاکہ حضور کے عتاب سے بچ جاؤ۔

مولانا نے جاکر اس عورت کو طلاق دے دی۔ اور آدھا مہر ادا کر دیا۔

مولانا بدحواس آدمی تو تھے ہی۔ ایک دن میر محبوب علی خاں نظام دکن کا دربار لگا ہوا تھا، حسب دستور تمام ارکان دربار اپنے اپنے منصب پر کھڑے تھے۔ مولانا بھی اپنے مقام پر استادہ تھے۔ لیکن ازار بند لٹک رہا تھا۔ حضور نظام کی نگاہ پڑ گئی۔ انھوں نے پیش کار حضوری سے کہا گرامی کو تو دیکھو ازار بند لٹک رہا ہے۔ اور کچھ ہوش نہیں۔ پیش کار پریشان ہوا کہ کہیں عتاب نہ ہو جائے، جھٹ بات بنائی اور کہا حضور والا گرامی پریشان رہتا ہے یہاں جو منصب ملتا ہے، وہ نوکر چاکر گھوڑا گاڑی میں خرچ ہو جاتا ہے۔ وطن میں اس کی ہمشیرہ کی شادی درپیش ہے (حالانکہ کوئی ہمشیرہ نہ تھی) یہ پنجاب کے لوگ لڑکیوں کو جہیز میں سونے کے ٹھوس زیور دیتے ہیں۔ اس لئے بے چارا فکرمند رہتا ہے۔ میر محبوب علی خاں میں پرانے بادشاہوں کی سی فیاضی تھی حکم دیا کہ گرامی کو پانچ سیر سونا دے دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی گرامی کو پانچ سیر سونا ملا۔ تو ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پیش کار سے پوچھا اس نے سارا قصہ سنایا۔

شام کے وقت مولانا اپنے مکان پر یاروں میں ڈوں کی لے رہے تھے۔ ابھی تو ازار بند لٹک ہی رہا تھا۔ کہ پانچ سیر سونا ملا اگر کہیں کھل جاتا تو دس سیر ملتا۔ ایک دن کا ذکر ہے حضور نظام نے سرِ دربار مولانا گرامی کو حکم دیا کہ اپنا کلام سناؤ۔ مولانا نے سات اشعار سنا کر تسلیمات پیش کیں (دستور دربار یہی تھا کہ سات شعر سنا کر تسلیم کرو اور ہٹ جاؤ۔ اگر حضور مزید فرمائش کریں تو اور سناؤ ورنہ نہیں) نظام نے کہا اور سناؤ، مولانا نے سات اشعار اور سنائے اور تسلیم کی۔ پھر حکم ہوا۔ اور سناؤ، اس پر مولانا نے ایک لمبا قصیدہ پڑھ کر ختم کیا اور تسلیم کی، حضور نظام نے پھر بھی یہی فرمایا کہ اور سناؤ۔ اس پر مولانا نے بے ساختہ پنجابی میں کہا" ہن چھڈ یار میں تھک گیاں۔ نظام خدا جانے کچھ سمجھے یا نہیں لیکن مولانا کا پیچھا چھوڑ دیا۔

یہ خود فراموشی کی نہایت دلچسپ مثال ہے، شعر سناتے سناتے آپ کو یاد ہی نہ رہا کہ کس کے سامنے شعر پڑھ رہا ہوں، اور جب تھک جانے کے بعد مزید فرمائش ہوئی تو یوں جواب دیا، گویا کوئی بے تکلف پنجابی دوست سامنے بیٹھا ہے۔ مولانا کے لطائف میں سے یہ چند تھے جو میں نے عرض کئے ہیں۔ ورنہ ان کی ذات سے تو دن بھر لطائف صادر ہوتے تھے۔ مثلاً صبح دس بجے علی بخش نے آکر کہا۔ مولوی صاحب کھانا کھا لیجئے فرمایا، واہ علی بخش تم بھی عجیب

آدمی ہو - ارے ابھی تو ناشتہ کیا ہے، اور ابھی کھانا کھالوں؟ کوئی ساڑھے دس بجے پھر علی بخش نے کہا - مولوی صاحب کھانا لاؤں؟ فرمایا "پھر تم نے وہی رٹ لگائی ارے میاں ابھی تو ناشتہ کیا ہے" - علی بخش جا کر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھ گیا -

ابھی پندرہ منٹ نہ گزرے تھے کہ مولانا خود برآمدے میں نکل آئے - اور چلانا شروع کیا "علی بخش - علی بخش" وہ بھاگا ہوا آیا "حکم مولوی صاحب" کہنے لگے - بڑے بے درد لوگ ہو تم - دوپہر ہونے کو آئی - بھوک سے جان نکلی جاتی ہے اور کھانا نہیں دیتے، جلدی سے کھانا لاؤ -

ان تمام بدحواسیوں کے باوجود محبت اور خلوص کے پتلے تھے - ڈاکٹر اقبال سے تو خیر پرانی راہ و رسم تھی، لیکن مجھ سے اور حفیظ جالندھری سے بھی بے حد محبت کرتے تھے - مرتے وقت بھی ہم تینوں ہی کو یاد کر رہے تھے -

(نمک دان)

آئن سٹائن ——— قومی آواز

یہ حقیقت ہے کہ سات آٹھ نسلیں جب گزر جائیں گی، سائنس اور ترقی کر جائے گی، ایٹمی طاقت سے نئی نئی ایجادیں ہو جائیں گی تب جا کر لوگوں کو معلوم ہوگا آئن سٹائن کتنا بڑا دماغ تھا اور اس نے انسانوں کو کیا کچھ دیا ہے -

آئن سٹائن نے کائنات کو سمجھنے کے لئے ایک نئی عینک دی ہے - ایسی عینک جس نے ہم کو ایٹمی طاقت تک پہنچا دیا اور جو آگے چل کر نہ جانے کائنات کے اور کیا کیا سربستہ رازوں کا انکشاف کرے گی - حقیقت یہ ہے کہ اس بڑے دماغ کی عظمت سے انسان آج نہیں اس وقت واقف ہوگا جب سو دو سو برس کے بعد ایٹمی طاقت پر پورا قبضہ ہو جائے گا اور دوسرے سیاروں سے بات چیت اور آمد و رفت کے راستے کھل جائیں گے - کیوں کہ ان سب ترقیوں کا دار و مدار آئن سٹائن ہی کا نظریہ ہوگا جو بنیاد بن چکا ہے فزکس کی ترقیوں کا -

پچاس برس ہوئے جب آئن سٹائن نے نظریہ اضافیت دنیا کے سامنے پیش کیا تھا - اسے سن کر سائنسداں ششدر رہ گئے - مگر آئن سٹائن کا استدلال اتنا زبردست تھا کہ اسے مسترد نہ کر سکے - پھر تھوڑے ہی زمانے میں سائنس کی دنیا میں وہ ایک مسلم حقیقت بن گیا - لیکن عام پڑھے لکھے لوگوں نے ۲۰-۲۵ برس تک اس کو ایک معمہ ہی سمجھا - حد یہ ہے کہ اس کی وضاحت کے لئے جو کتابیں لکھی گئیں انھوں نے اس کو اور زیادہ معمہ بنا دیا - مثلاً آئن سٹائن نے کہا تھا کہ کائنات کے کسی واقعہ کی پیمائش کے لئے ہم کو صرف طول و عرض اور عمق ہی کی ضرورت نہیں، بلکہ زمانے کے تعین کی بھی ضرورت ہے - اور اس کو اسی طرح استعمال کرنا چاہئے جیسے طول و عرض اور عمق کو جو کہ تین کے بعد کہے جاتے ہیں - یعنی زمانہ کو ایک چوتھا بعد سمجھنا چاہئے - اس سے لوگوں نے سمجھا کہ زمانہ بھی فاصلے کی طرح ایک چیز ہے اور اگر اس میں سفر کریں تو عجیب و غریب تبدیلیاں پیدا ہو سکتی ہیں چنانچہ اس بات کو پیش نظر رکھ کر ایسے، فسانے اور ناول لکھی گئیں جن میں دکھلایا گیا کہ ایک انسان بعد رابع میں جا کر کچھ سے کچھ بن جاتا ہے - ان باتوں سے آئن سٹائن کا نظریہ بالکل ہی معمہ بن گیا -

جس طرح نیوٹن کا نظریہ کشش ہے، کہ اگر اس کو عام سوجھ بوجھ سے سمجھنا چاہو تو وہ بہت آسان ہو جاتا ہے لیکن علمی نظر سے دیکھو تو بہت محنت سے پلے پڑتا ہے - اسی طرح آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت بھی ہے - نیوٹن نے اپنے باغ میں دیکھا کہ سیب اوپر سے نیچے گر رہا ہے اور اس پر نظریہ کشش بنا دیا - لوگ جب یہ سنتے ہیں تو اس کو کوئی بہت بڑی بات سمجھ کر خاموش ہو جاتے ہیں - لیکن اگر ان کو یہ بھی یاد دلا دو کہ دنیا گول ہے اور ساری دنیا میں پھل اوپر سے نیچے ہی کی طرف گرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ پھل چاروں طرف سے سمٹ کر زمین کی طرف آ جاتے ہیں تو ہر شخص محسوس کرے گا کہ نیوٹن کا کشش سے کیا مطلب تھا - اسی طرح اگر آئن سٹائن کا نظریہ دیکھا جائے تو وہ آسان ہو جاتا ہے -

اضافیت کہتے ہیں جب کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے مقابل میں متعین کیا جائے - مثلاً ٹھنڈا گرم - اس چیز کو ہم انسان اپنے جسم کی گرمی سے متعین کرتے ہیں - اگر کوئی چیز اس سے زیادہ گرم ہوتی تو ہم کہتے ہیں کہ گرم ہے اور اگر کم گرم ہوتی تو کہتے ہیں ٹھنڈی ہے - لیکن اگر مچھلی سے پوچھا جائے تو وہ بہت سی ان چیزوں کو جسے ہم ٹھنڈا کہتے ہیں گرم کہے گی - اور اگر ریگستانوں کے جانوروں سے پوچھا جائے تو وہ بالکل ہی دوسرا معیار قائم کریں گے - جانوروں کو چھوڑیے اگر انسانوں میں سائبیریا اور صحرائے اعظم افریقہ اور خط استوا کے باشندے اکھٹا کر لئے جائیں اور ان سے پوچھا جائے کہ ٹھنڈک کا معیار کیا ہے تو وہ سب مختلف باتیں کہیں گے - اس کا مطلب یہ ہے کہ گرمی اور سردی اضافی چیزیں ہیں -

یہی حال کائنات کی تبدیلیوں کا ہے - ہم اپنی دنیا سے ایک ستارے کو ٹوٹتا ہوا دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابھی ابھی ایک ستارہ ٹوٹا - لیکن اگر ہم کسی ہئیت داں سے پوچھیں تو وہ کہے گا کہ اس ستارے کو ٹوٹے ہوئے ۵۰ لاکھ برس ہو گئے - لیکن چونکہ وہ دنیا سے بہت فاصلے پر تھا اس لئے روشنی کی وہ کرنیں

جو اس تباہی کی تصویر کو لے کر چلی تھیں باوجود لاکھوں میل فی سکنڈ کی رفتار سے چلنے کے آج یہاں پہنچی ہیں - یہ خبر سن کر ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہاں پچاس لاکھ سال ہوئے اس ستارے کو ٹوٹے ہوئے -

لیکن اب سوال یہ ہے کہ یہ ۵۰ لاکھ تو ہوئے ہم دنیا والوں کی نظر سے لیکن کائنات میں جو اور اربوں کھربوں دنیائیں ہیں ان کی نظر سے کتنا زمانہ ہوا؟ دوسری دنیاؤں میں سے کچھ تو اس سیارے سے قریب ہوں گی اور کچھ کھربوں میل دور، کچھ اتنی دور کہ وہاں اس ستارے کے ٹوٹنے کا نظارہ پچاس لاکھ سال کے بعد کیا جائے گا -

پھر سوال یہ بھی ہے کہ پیمائش کا پیمانہ جو ہم نے بنایا ہے یعنی سال' وہ کیا چیز ہے؟ زمین ایک مقررہ وقت میں سورج کے گرد چکر کر لیتی ہے - لیکن خود نظام شمسی کے اور سیارے اتنے وقت میں سفر نہیں طے کرتے ہیں - بلکہ کچھ کم اور کچھ زیادہ وقت میں سفر کرتے ہیں - دوسری طرف ان کے دن اور رات بھی مختلف ہیں کیوں کہ جتنے عرصے میں دنیا اپنے گرد ایک چکر کر لیتی ہے - سب سیارے اتنی دیر میں چکر نہیں کرتے - کچھ زیادہ وقت لیتے ہیں اور کچھ کم - ہمارے نظام شمسی کے علاوہ کروڑوں نظام شمسی اور بھی ہیں اور ان سب کے ماہ و سال بے حد مختلف ہیں -

مذکورہ پچاس لاکھ سال کے تعین میں اس سے بھی زیادہ جو چیز الجھن پیدا کرتی ہے وہ ہے کرہ زمین کے انسانوں کا مزاج - ہم انسانوں کے حواس ایک خاص رفتار سے کام کرتے ہیں - مثلاً آنکھ اسی وقت دیکھتی ہے جب چیز ایک خاص وقت تک آنکھ کے سامنے رہے - اگر وہ اس سے پہلے ہٹائی جائے تو آنکھ کو اس کا آنا جانا نظر نہ آئے گا - اس تجربے اور نظریے پر چلتے پھرتے سنیما کی ایجاد ہوئی ہے اس میں ایک تصویر اتنی دیر ٹھہرتی ہے جتنی دیر میں آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے اور پھر اس کی جگہ دوسری تصویر اتنے کم وقت میں آ جاتی ہے کہ آنکھ اس آنے جانے کو نہیں دیکھ سکتی ہے -

لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جاندار اور کائنات کی ہر دنیا کے باشندوں کا مزاج اس رفتار سے حرکت کرتا ہے - اس دنیا کے جانداروں کا تجربہ کیا گیا تو ان کے مزاجوں میں بہت فرق پایا گیا ہے - مثلاً بعض مکھیاں آواز کی رفتار سے اڑ لیتی ہیں - اگر دوسری دنیا کے باشندوں سے ہمارا سابقہ پڑے تو ان کے مزاجوں کی رفتار میں ہم کو زمین آسمان کا فرق ملے گا -

اس فرق کا مطلب یہ ہو گا کہ ہمارے لئے جو ایک آن یا سکنڈ کا ساٹھواں حصہ ہے وہ بعض جانداروں اور دوسری دنیا کے انسانوں کے لیے ایک منٹ ہو سکتا ہے ہمارے لئے جو ۵ منٹ ہیں ان کے لئے ایک گھنٹہ ہو سکتے ہیں - یعنی ۵ منٹ کے عرصے میں وہ اتنا کام کر سکتے ہیں یا اتنی تفریح کر سکتے ہیں جتنا ہم ایک گھنٹے میں ظاہر ہے کہ ایسے جانداروں اور ایسے انسانوں کے ماہ و سال ہمارے سال سے مختلف ہوں گے - اور وہ لوگ پچاس لاکھ برس پہلے ٹوٹنے والے ستارے کو زمانے کے جس گز سے ناپیں گے وہ بالکل ہی دوسرا ہو گا -

یہ ہوا زمانے کا حال - ایسا ہی کچھ حال فاصلے کا ہے فاصلے کو حرکت سے ناپا جاتا ہے - اور حرکت کو اگر سمجھا جا سکتا ہے تو سکون کے مقابل میں - اسٹیشن سے جب ریل چلتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ چلی - ہماری دنیا میں سکون بھی ہے اور حرکت بھی - اسٹیشن اپنی جگہ پر رہتا ہے' لیکن ریل چلی جاتی ہے - اس طرح جب ہم چاہتے ہیں چلتے ہیں جب چاہتے ہیں بیٹھ جاتے ہیں - اور اپنی دنیا کی حالت دیکھ کر ہم کائنات کے ستاروں کی حرکت اور سکون کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں - لیکن حقیقت بالکل دوسری ہے - کائنات میں کوئی بھی چیز ساکن نہیں ہے - دنیا سورج کے گرد گھومتی ہے اور سورج خود متحرک ہے تمام ستارے کسی نہ کسی طرف حرکت کرتے ہیں - اور اگر اپنی دنیا کی حرکت کو ذہن میں رکھئے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کرہ زمین کی بھی ہر چیز متحرک ہے - یعنی اس کائنات میں سکون ناپید ہے - اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم حرکت جس چیز کو کہتے ہیں وہ اضافی شے ہے

جب زمانہ اور حرکت اضافی چیزیں ہو گئیں تو کائنات کی ناپ جوکھ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسانیت کے "قانون" نہ معلوم ہو جائیں آئنسٹائن نے اس قانون کو دریافت کیا -

آئنسٹائن نے مذکورہ نظریہ کو ریاضی اور فزکس یعنی طبیعات کی نظر سے دیکھا اور ثابت کیا - اس نظریے سے جب اس نے روشنی کی لہروں کو دیکھا تو وہ بالکل دوسری چیز نظر آئی - اور اس کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ روشنی کی رفتار کا کائنات کی پیمائش پر بھی اثر پڑتا ہے -

اضافیت ہی کے نظریہ کی پیداوار ایٹمی طاقت اور ایٹم بم ہے - اور نہیں سمجھا سکتا - آگے چل کر اور کیا کیا حیرت انگیز ایجادیں ہوں - حق تو یہ ہے کہ آئنسٹائن کی عجیب و غریب عملی شخصیت نے ریاضی اور طبیعات اور فلسفے پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے کہ وہ اس دور کی علمی دنیا کے لئے ایک یکتا نشان بن گیا جس کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا -

شہرِ نجوم میں ——— عبدالمجید عدم

باد صبا ابھی مرا پیغام لے کے جا
بیدار ہو رہی ہے حسین شام لے کے جا
بیٹھی ہیں میکدے میں نگاروں کی ٹولیاں
پھولوں کی شاہدوں کی ستاروں کی ٹولیاں
اور حسبِ قاعدہ غمِ دوراں علیل ہے
شیشہ طلوعِ صبحِ طرب کی دلیل ہے
سب پوچھتے ہیں مجھ سے کہ منٹو کہاں ہے آج
غائب کدھر وہ ساحرِ آتش بیاں ہے آج
کہنا صبا یہ میرے سعادت سرشت کو
آواز دے رہے ہیں مغنی بہشت کو
ضامن ہیں ہم اگر تو چلا آئے گا یہاں
ماحول رس میں ڈوبا ہوا پائے گا یہاں
یاں منچلے ہیں رند ہیں اور شہر یار ہیں
لیکن تمام تیرے لئے بے قرار ہیں
وہ اس لئے کہ ایک سلیم آدمی ہے تو
پتھر کی آب اور صدف کی نمی ہے تو
اے یار غیر کوئی نہیں اس ہجوم میں
جاری ہیں تذکرے ترے شہر نجوم میں
میں ہوں ضمیر جعفری ہے اور سراج[1] ہے
ان تین دوستوں کو تری احتیاج ہے
منٹو! تو دن کے وقت جہاں بھی مقیم ہو
رحمت خدا کی تیری رفیق و ندیم ہو
شب کو مگر تجھے مرے دیرینہ ہم سبو
آنا پڑے گا اپنے رفیقوں کے روبرو
گریہ کناں ہیں تیرے فسانے ترے بغیر
بے رنگ ہو رہے ہیں زمانے ترے بغیر
ماتم کہانیوں کا یہ دیکھا نہ جائے گا
راتوں کو تو ضرور یہاں اُڑ کے آئے گا

[1] سراج الدین ظفر

(ماہِ نو مارچ ۱۹۵۵ء)

آج کل دہلی

ذاکر صاحب ——— ڈاکٹر عابد حسین

...... ہم نے دیکھا کہ ذاکر صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں مگر ان میں مرکزی اور بنیادی حیثیت انسان دوستی کو حاصل ہے۔ انسان دوست شخصیت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مرشد و معلّم کی دوسرے مصلح و مجاہد کی۔ مرشد و معلم کی توجہ کا موضوع انسان بحیثیت فرد کے ہے۔ وہ ادعا و ہدایت تعلیم و تربیت کے ذریعے افراد کے اندر ان قدروں کو پیدا کرتا ہے۔ جو اسے انسانیت کے بلند منصب کے سزاوار بنائیں۔ مصلح و مجاہد کا کام انسانی جماعت یا سماج کا سدھار کرنا ہے۔ یعنی ان خرابیوں سے جو سماج میں پیدا ہو گئی ہیں لڑنا اور ان کو دور کرنا تاکہ انسانیت کی دبی ہوئی روندی ہوئی قدریں ابھر آئیں چمک اٹھیں دونوں قسم کے انسان دوستوں کی زندگی کا قانون محبت ہے۔ لیکن ایک کے ہاں محبت جمالی شان دکھاتی ہے دوسرے کے ہاں جلالی۔ کبھی کبھی یہ دونوں شانیں ایک ہی شخصیت میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ پیمبر یا مجدد کی شخصیت بن جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کی انسان دوستی اب تک مرشد و معلّم کی شان رکھتی ہے وہ انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اس کی روح سے محبت رکھتے ہیں۔ اور اسے تعلیم و ہدایت کے ذریعے سنوارنا چاہتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں اچھے مسلمان پیدا کرو، اچھی اسلامی جماعت پیدا ہو جائے گی۔ اچھے ہندوستانی بناؤ اچھا ہندوستان بن جائے گا۔ لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ معلم کا مدرسہ ہو یا مرشد کی خانقاہ دونوں کا اثر فرد کی تعلیم و ہدایت میں محدود ہے۔ دوسرے اجتماعی ادارے خاندان طبقہ قوم مذہب رسم و رواج اگر الگ نہیں تو مل کر انسانی شخصیت کی تشکیل میں کہیں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر ان اجتماعی سانچوں میں سے اکثر خراب ہو گئے ہوں اگر آدے کا آدا ہی بگڑا ہوا ہو تو معلم اور مرشد کی ساری سعی رائیگاں جاتی ہے جب تک کوئی مصلح اور مجاہد اجتماعی سانچوں کو نہ سدھارے یا ان کو توڑ کر نئے سانچے نہ بنائے اور جو ایک ہی شخص میں معلم اور مرشد کے ساتھ مصلح اور مجاہد یعنی مجموعی طور پر مجدد کی شان پیدا ہو جائے تو پھر کیا کہنا۔

شاید ذاکر صاحب جیسے صوفی منش کو یہ توڑ پھوڑ قانونِ وحدت اور آئینِ محبت کے خلاف نظر آئے لیکن اس مشکل کو اس مرد عارف نے حل کر دیا ہے جس نے کہا ہے

نقشِ حق را ہم بامرِ حق شکن   بر زجاجِ دوست سنگِ دوست زن

اور اس مرد عمل نے ثابت کر دیا کہ پرانے سانچے خواہ سنگ، خارا کے بنے ہوئے ہوں بے تیشہ و گرز محض تمسک "بالحق صرف" ستیہ گرہ سے توڑے جا سکتے ہیں۔

(نقوش)

جون ۱۹۵۵ء

پنج سالہ پلان

گزشتہ سے پیوستہ

نمبر ۸
گھریلو صنعتیں

س ۔ گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے کیا کیا جا رہا ہے ۔

ج ۔ گھریلو صنعتوں کی بڑی مشکلات جن اسباب سے پیدا ہوتی ہیں وہ ہیں بڑے پیمانے کے کارخانوں کا مقابلہ روپیہ کی کمی خام مال کی فراہمی اور طیار شدہ مال فروخت کرنے کے لئے تنظیم کی کمی اور گھریلو صنعتوں کے معیار کو بلند کرنے کے لئے جس منظم کوشش کی ضرورت ہے اس کی کمی ۔ پلان نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ گھریلو صنعتوں کی ملک کی اقتصادیات میں ایک بہت بڑی اہمیت ہے اور اس میں اتنی گنجائش ہونا چاہئے کہ دوسرے حلقوں سے فالتو محنت کو اپنے اندر جذب کر سکے ۔ نیز ان کاریگروں کو بھی زیادہ سے زیادہ کام دینا چاہیے جو اس وقت ان میں کام کر رہے ہیں ۔ گھریلو صنعتوں کی پوزیشن کو مضبوط بنانے اور ان میں توسیع و ترقی پیدا کرنے کے لئے مندرجہ اقدامات کی تجویز کی گئی ہے

(۱) گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لئے تحقیقی اداروں کا قیام ۔

(۲) کچے مال کی خرید اور طیار شدہ مال کی فروخت کے لئے گھریلو صنعت کاروں کی کوآپریٹو سوسائٹیوں میں تنظیم

(۳) بعض لائنوں میں پیداوار کے حلقوں کا تحفظ تاکہ بڑے پیمانے کے یونٹوں کے ساتھ مقابلہ نہ کرنا پڑے ۔

(۴) بڑے پیمانے کی صنعت پر ایک ٹیکس کا اطلاق تاکہ اس کے ساتھ مطابقت رکھنے والی گھریلو صنعت کو فائدہ پہنچ سکے ۔ اور

(۵) جہاں ممکن ہو گورنمنٹ محکموں کی طرف سے گھریلو صنعتوں کی پیداوار کے لئے ترجیح کی منظوری ۔

گورنمنٹ نے پہلے ہی تین بورڈ یعنی آل انڈیا کھادی اور دیہاتی صنعتی بورڈ آل انڈیا دستکاری بورڈ اور کھڈی بورڈ قائم کر رکھے ہیں ۔ ان بورڈوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے دائرے میں گھریلو صنعتوں کے لئے پروگرام مرتب کریں

نمبر ۹
ٹرانسپورٹ اور رسل و رسائل

س ۔ ٹرانسپورٹ اور رسل و رسائل کے پروگرام میں مجموعی اخراجات کا نصف سے بھی کچھ زیادہ ریلوے کے لئے وقف کر دیا گیا ہے ۔ اسے کس طرح سے حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے ۔

ج ۔ ریلوے کے نظام میں قابلیت کے بہت اونچے معیار کا قیام اور بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق اس کی توسیع زراعت اور صنعت دونوں کی توسیع و ترقی کے لئے ضروری ہے ۔ زیادہ تر جنگ کی وجہ سے کئی ایسی پرانی چیزیں جمع ہو گئی ہیں جنہیں تبدیل کرنا ضروری ہے ۔ اس وقت ان چیزوں کو تبدیل کرنا اور ساتھ ہی ساتھ بڑھتے ہوئے ٹریفک کے لئے انتظام کرنا اس بھاری خرچ کے بغیر ممکن نہیں جو پلان میں درج کیا گیا ہے ۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پلان میں ریلوے پروگرام کے لئے جو ۲۵۰ کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے (اس ۳۰ کروڑ روپے کے علاوہ جو ہر سال سامان تبدیل کرنے کے لئے درکار ہے) حقیقی ضروریات سے کم ہے اور بنیادی صنعتوں اور ٹرانسپورٹ کے لئے جو ۵۰ کروڑ روپے کی مجموعی رقم کی گنجائش رکھی گئی ہے ۔ اس میں سے کچھ روپیہ ریلوے پر خرچ کرنا پڑے گا ۔

س ۔ چترنجن لوکوموٹو اور ٹاٹا انجینیرنگ اینڈ لوکوموٹو کمپنی سے کس حد تک یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نئے انجنوں کے سلسلے میں ضروریات کو پورا کر سکیں گے ؟

ج ۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں ۱۰۵۰ انجن ایسے تھے جنہیں تبدیل کرنا ضروری تھا اور پلان کی مدت کے دوران میں توقع یہ ہے کہ ۱۰۴۲ مزید انجنوں کی تبدیلی کی ضرورت پیش آئے گی ۔ اس مدت میں توقع ہے کہ چترنجن لوکوموٹو ورکس اور ٹاٹا انجینیرنگ اینڈ لوکوموٹو کمپنی بالترتیب ۱۰۰ اور ۵۰ انجن سالانہ طیار کر رہے ہوں گے ۔ مگر پرانے انجنوں کی تبدیلی بقایا میں نہ بڑھتی جائے تو نارمل ضروریات کے مطابق ۱۹۰ انجن ہر سال تبدیل کرنے پڑیں گے ۔

س ۔ تیسرے درجے کے مسافروں کو سہولیات بہم پہنچانے کے لئے ایک زبردست مطالبہ کیا جا رہا ہے ۔ کیا پلان نے اسے بھی پیشِ نظر رکھا ہے ؟

ج ۔ جی ہاں ۔ مسافروں کو سہولیات بہم پہنچانے کے لئے پلان میں ۱۵ کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے ۔ اس روپے کا خاصہ حصہ تیسرے درجے کے مسافروں کی سہولتوں میں اضافہ کرنے کے لئے خرچ کیا جائے گا ۔

س ۔ کیا صنعتی توسیع و ترقی کے نتیجے کے طور پر مال اور مسافروں کے ٹریفک کی توسیع کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے ؟

ج ۔ صنعتی توسیع و ترقی کے نتیجے کے طور پر ٹریفک میں اضافے کے پیشِ نظر ریلوے پروگرام میں کچھ گنجائش رکھی گئی ہے ۔ اس بات کی اس سلسلے میں ایک خاص مثال ایک نئے صنعتی پراجیکٹ سندری فرٹیلائزر فیکٹری نے پیش کی ہے ۔ جس کے لئے ریل گاڑیاں ہر روز ایک ہزار ٹن کھریا مٹی بیکانیر کی پتھر کی کانوں سے لے کر جاتی ہیں ۔ اس کا مطلب ہے کہ پوری ریل گاڑی کا مال ۔ ٹریفک میں توسیع صرف ریلوے کے ڈبوں کی تعداد میں اضافہ کرنے ہی سے عمل میں نہیں آ سکتی بلکہ اس کے لئے کئی طرح سے ریل کی پٹڑیوں کی حالت کو بھی بہتر بنانا پڑتا ہے ۔ پرانی گاڑیوں کی تبدیلی کا بقایا کام اتنا زیادہ ہے کہ اگر اس تبدیلی کو پروگرام کے مطابق چلانا ہے تو ریل کے ڈبوں میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن یہ تجویز کیا گیا ہے کہ بنیادی صنعتوں اور ٹرانسپورٹ کے لئے ۵۰ کروڑ روپے کی ایک مجموعی رقم رکھی گئی ہے ۔ اس میں سے ریلوے کے لئے گنجائش نکالی جائے تاکہ بڑھتی ہوئی صنعتی ضروریات کو پورا کیا جا سکے ۔

س ۔ جہاں تک جہاز رانی کا تعلق ہے ۔ گورنمنٹ کے پالیسی کے دو مقاصد یہ ہیں ۔ (۱) ساحلی تجارت ہندوستانی جہازوں کے لئے وقف کر دی جائے ۔ (۲) ہندوستانی جہاز زیادہ سے زیادہ غیر ملکی تجارت میں حصہ لیتے ہیں ۔ پلان میں اس پالیسی پر عمل درآمد کرنے کے لئے کیا تجویز کیا گیا ہے ؟

ج ۔ جہاں تک ساحلی تجارت کو ہندوستانی جہازوں کے لئے وقف کر دینے کا تعلق ہے پالیسی پر کامیابی سے عمل درآمد کرنے کی خاطر ساحلی تجارت کے جہازوں کا وزن ۲ لاکھ ٹن سے تقریباً ۳ لاکھ ٹن بڑھانا پڑے گا جو ہندوستانی جہاز ران کمپنیاں ساحلی تجارت کا کام کر رہی ہیں انھیں ۶۵۰۰۰ جی ۔ آر ۔ ٹی کے حد تک وزن بڑھانے کے لئے پلان میں گنجائش رکھی گئی ہے ان کی مالی امداد کی جائے ۔ اس کے علاوہ وشاکھاپٹنم شپ یارڈ میں جو جہاز بنائے جا رہے ہیں ان میں سے ساحلی بیڑے کی طاقت کو بڑھانے اور پرانے جہازوں کو تبدیل کرنے کے لئے حاصل کئے جائیں گے ۔ ہندوستان شپ یارڈ لمیٹیڈ کے لئے جو حصہ مقرر کیا گیا ہے اس کے اندر پنج سالہ پلان میں جہازی کمپنیوں کو آسان شرائط پر قرض دینے کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ یارڈ میں جو جہاز بنیں انھیں خریدنے میں کمپنیوں کو آسانی رہے ۔

جہاں تک سمندر پار کی تجارت میں ہندوستانی جہازوں کی مؤثر شرکت کا تعلق ہے پلان میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ جہازی کمپنیوں کو ۱۱۰۰۰۰ جی ۔ آر ۔ ٹی کی خرید کے لئے قرض کے طور پر روپیہ دیا جائے ۔ ان مزید جہازوں سے ہندوستانی جہاز ران کمپنیاں اس قابل ہو سکیں گی کہ وہ زیادہ مؤثر طریقے سے سمندر پار کی تجارت میں حصہ لے سکیں ۔

س ۔ ہندوستان میں بندرگاہوں کی توسیع و ترقی کے ساتھ تقسیم ملک کا کیا تعلق ہے ؟

ج ۔ کراچی کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد جو راجستھان، مشرقی پنجاب اور ملحقہ علاقوں کے لئے برآمد کی بندرگاہ کا کام دیتی تھی ۔ بمبئی کی بندرگاہ پر مزید بوجھ آ پڑا ۔ اور کراچی کی بندرگاہ نے جو ٹریفک سنبھالا تھا اس کا کچھ حصہ بمبئی کی جانب منتقل کرنا پڑا ۔ کاندلا کو اب ایک بڑی بندرگاہ کے طور پر توسیع و ترقی دی جا رہی ہے تاکہ جو ٹریفک پہلے کراچی کے ذریعے سے ہوتا تھا وہ سارے کا سارا ایک قدرتی برآمد کی بندرگاہ کے طور پر سنبھال لے ۔ ۱۹۵۶ء تک یہ بندرگاہ تقریباً ۸۰۰۰۰ ٹن سالانہ سنبھالنے کے قابل ہو جائے گی ۔

س ۔ ہندوستان میں تیل صاف کرنے کے کارخانے قائم کئے جا رہے ہیں اس سلسلے میں بندرگاہوں کی آسانیوں میں بہتری کی صورت کا پلان نے کس حد تک خیال رکھا ہے ؟

ج ۔ نئے کارخانوں میں سے دو کے لئے جزیرہ ٹرامبے (بمبئی) میں بندرگاہ اور ٹرانسپورٹ کی آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے ۸ کروڑ روپے کا انتظام کیا گیا ہے تیسرے کارخانے کے لئے جو وشاکھاپٹنم میں کھولا جائے گا (جس کے لئے حال ہی میں معاہدے پر دستخط کئے گئے ہیں) ابھی تک کوئی خاص انتظام نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہاں بندرگاہ کی جو صنعتی سہولیات کی ضرورت ہوگی وہ اس ۵۰ کروڑ کی مجموعی رقم میں سے پوری کی جائے گی جو بنیادی صنعتوں اور ٹرانسپورٹ کے لئے رکھی گئی ہے ۔

س ۔ توسیع و ترقی کی وہ کون سی مدیں ہیں جو پلان کے زیر تحت بڑی بڑی

بندرگاہوں پر زیر عمل لائی جائیں گی ؟

ج - کلکتہ میں بڑی مدیں یہ ہیں - گارڈن ریچ جیٹی کا دوبارہ قیام - کوئلے کی دو گودیوں اور ایک کچے لوہے کی میکینیکل گودی کی تعمیر - ویگنوں، ریلوے انجنوں، بھاری مشینوں اور دریاؤں کی وادیوں کے پراجیکٹوں کے لئے درآمد شدہ سامان کو اٹھانے کے لئے ایک بھاری لفٹ کرین -

بمبئی میں زیادہ اہم مدیں یہ ہیں - پرنسز اور وکٹوریہ ڈاکس کی تجدید - ان ڈاکس کے ٹرنزٹ شیڈوں کی از سر نو تعمیر اور الیگزینڈرا ڈاکس پر بجلی کے کرینوں کا نصب کرنا -

مدراس کی بندرگاہ کے لئے جو پروگرام ہے اس میں ۲ء۷۹ کروڑ روپے کی لاگت کی ایک ڈاکس کی اور مٹی کے تیل کے لئے ہر موسم میں کام کرنے والی دو گودیاں شامل ہیں -

کوچین کے پروگرام میں عام جہازوں کے لئے نئی گودیوں کی تعمیر کا انتظام کیا گیا ہے -

س - پلان میں یہ تجویز کیوں کیا گیا ہے کہ سول ہوائی کمپنیوں کو ملا کر ایک یونٹ میں تبدیل کر دیا جائے - کیا موجودہ کمپنیوں کو معاوضہ دیا جائے گا ؟

ج - تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ موجودہ حالات میں کام کی زیادتی اور ٹریفک کے باعث موجودہ ہوائی آمد و رفت کی کمپنیاں اقتصادی بنیادوں پر کام نہیں کر سکتیں اور چونکہ ایر ٹرانسپورٹ انکوائری کمیٹی کی سفارشات کے مطابق ہوائی آمد و رفت کی کمپنیوں کی رضاکارانہ از سر نو تنظیم عمل میں نہیں آ سکی - اس لئے کمیشن نے یہ سفارش کی ہے کہ موجودہ کمپنیوں کو ایک واحد کارپوریشن کی صورت میں ملا دیا جائے - کیونکہ اس اقدام سے ہوائی جہازوں کی تعداد ضرورت کے مطابق کم ہو جائے گی اور اخراجات میں کمی واقع ہو جائے گی -

نئی کارپوریشن ان ہوائی کمپنیوں کو ان کے سامان کے بدلے میں مناسب روپیہ ادا کرے گی - اگر یہ کمپنیاں چاہیں گی تو اپنے سامان کے بدلے میں انھیں اس نئی کارپوریشن کے حصے خریدنے کی اجازت دے دی جائے گی -

س - خاص حد تک دیہاتی پسماندگی کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیہات میں سڑکیں قریباً نہ ہونے کے برابر ہیں - کیا پلان میں مشترکہ کوششوں کی بنا پر سڑکیں بنانے کے لئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے ؟

ج - رضاکارانہ کوششوں سے سڑکوں کی تعمیر کو کمیونٹی ڈیولپمنٹ پراجیکٹوں میں ایک اہم جگہ دی گئی ہے اور سردست یہ تخمینہ کیا گیا ہے کہ پلان کی مدت کے دوران میں ان پراجیکٹوں کے علاقوں میں ۱۶ ہزار سے ۱۷ ہزار میل لمبی سڑکیں بنا دی جائیں گی - اور جگہوں پر بھی امید ہے کہ سڑکوں کی تعمیر کے لئے رضاکارانہ کوششیں میدان میں آئیں گی - اور پلان میں "لوکل ورکس" کے لئے ۵ کروڑ روپیہ کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ گورنمنٹ کی طرف سے روپیہ کی صورت میں گرانٹ دے کر ان کوششوں میں جان ڈالی جائے -

س - دیہاتی سڑکوں کے علاوہ قومی شاہراہوں اور سرکاری سڑکوں کی توسیع و ترقی کے لئے کیا پروگرام وضع کیا گیا ہے ؟

ج - جہاں تک قومی شاہراہوں کا تعلق ہے - پنج سالہ پلان میں ۲۲۰ میل نئی سڑکوں اور ۱۸ بڑے پلوں کی جن پر کام پہلے ہی شروع ہو چکا ہے - اور ۵۰۰ میل نئی سڑکوں اور ۴۳ بڑے پلوں کی گنجائش رکھی گئی ہے - اس کے علاوہ ۲۲۰۰ میل قومی شاہراہوں کی حالت بہتر بنانے کا کام ہاتھ میں لیا جائے گا - جن کا دو تہائی امید ہے پلان کی مدت کے دوران میں مکمل ہو جائے گا -

جہاں تک سرکاری سڑکوں کا تعلق ہے پلان میں یہ انتظام کیا گیا ہے کہ ۵۶-۱۹۵۵ء تک پارٹ اے ریاستوں میں پختہ سڑکیں ۱۰۰۰ میل سے تقریباً ۱۲۴۵۳ میل تک اور پارٹ بی ریاستوں میں ۵۸۸ میل سے ۸۱۲۹ میل تک بڑھا دی جائیں - پارٹ سی ریاستوں میں بھی نئی سڑکوں کی خاصی معقول تعمیر ہوگی تاکہ ان علاقوں تک بھی راستے کھل جائیں جہاں اس وقت تک رسائی نہیں ہو رہی ہے -

---

نئی کتابیں اور رسالے

بزمِ مملوکیہ

مصنف سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے۔ ملنے کا پتہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ضخامت بڑی تقطیع کے ۳۵۰ صفحے۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ قیمت فی جلد پانچ روپئے آٹھ آنے۔

اس کتاب میں خاندان غلاماں کے سلاطین۔ امراء اور شہزادوں کی عرفان دوستی، علم نوازی اور معارف پروری کے حالات اور ان کے دربار سے متوسّل علماء و فضلاء اور ادباء و شعراء کے کمالات پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ قطب الدین ایبک، ناصر الدین قباچہ، شمس الدین التمش، رکن الدین فیروز شاہ، رضیہ، معز الدین بہرام شاہ، علاء الدین مسعود شاہ، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن کے عہد کے حالات شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں تاریخی اور ادبی اعتبار سے یہ کتاب ایک نادر اضافہ ہے۔ اس موضوع پر اتنی جامع کتاب کسی دوسری زبان میں بھی موجود نہیں۔ فاضل مرتب کی جانفشانی اور محنت ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔

اس کتاب کے ذریعے بعض فارسی شعراء کا تعارف اردو میں پہلی دفعہ کیا گیا ہے۔ امیر خسرو سے متعلق بعض نئی معلومات بھی ہیں۔

ذکرِ غالب۔

مالک رام صاحب کی اس نادر تصنیف کا تیسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی نے شائع کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ (انڈکس) شامل ہونے سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ سائز کے ۲۸۴ صفحوں پر مشتمل یہ کتاب بڑے سلیقے سے چھپی ہے۔ کتابت، طباعت، جلد اور جلد پوش عمدہ۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

غالب کی سیرت پر اس سے قبل دو اچھی کتابیں شائع ہوئی تھیں، غالب نامہ از محمد اکرام اور غالب از غلام رسول مہر۔ یہ کتاب جا بجا علمی نکتوں اور دلچسپ واقعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ قامت کہتر ہونے کے باوجود بہ قیمت بہتر ہی نہیں بہترین ہے۔ سیرت غالب ہی نہیں اس عہد کی ثقافتی اور علمی تاریخ بھی ہے

گئو دان

منشی پریم چند کا یہ مشہور ناول بھی مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت ۶ روپے۔ اردو میں پریم چند کے اس ناول کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ یہ ناول تنقید و تبصرہ کا محتاج نہیں۔ بہت کچھ اس کے باب میں لکھا جا چکا ہے۔ کتاب حسین و جمیل ہے اور قریب قریب چھ سو صفحوں پر مشتمل ہے۔

کفِ گل فروش

پبلشر ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، قیمت تین روپے۔ گل فروش فرقت کاکوروی ہیں۔ یوں تو آپ صحافی بھی رہے ہیں، مدرس بھی اور ایک مزاح نگار بھی لیکن اب معلوم ہوا کہ گل فروشی بھی آپ کرتے ہیں۔ سید علی عباس حسینی کے دیباچے کو اگر شامل کر لیں تو ستر دلچسپ مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ ان میں سے دو تین آج کل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ فرقت صاحب کی مزاح نگاری میں ہر چند افسانویت کی چاشنی ہے لیکن یہ بجائے خود ایک واقعہ بن چکی ہے۔ دلّی اور لکھنؤ کے بھانڈوں اور بانکوں کا ذکر آپ نے کیا تو ان میں سے ہر ایک پکار اُٹھا کہ ؏

با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

"ترقی پسند خواتین کا مشاعرہ" اور "میں پیروڈیز کیوں کر لکھتا ہوں" دلچسپ مضامین ہیں۔ فرقت ٹھیٹھ زبان لکھنے پر بڑی قدرت رکھتے ہیں۔ چونکہ پڑھے لکھے ہیں اس لئے محض ٹھیٹھ زبان ہی نہیں لکھتے۔ خدا انھیں اور لکھنے کی توفیق دے لیکن اتنی نہیں کہ ان کے اپنے ہی پکار اٹھیں۔ ؏ من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم

حیات ز۔خ۔ش

ہندوستان کی مایہ ناز شاعرہ زاہدہ خاتون شروانیہ کے سوانح حیات محترمہ انیسہ ہاشمی بیگم شروانیہ نے تالیف کئے ہیں۔ قیمت تین روپے ملنے کا پتہ:۔ مہتمم مطبوعات، مسعود منزل، حمایت نگر حیدر آباد دکن۔ بڑی تقطیع۔ ضخامت ۲۲۶ صفحات، کتابت، طباعت عمدہ

انیسہ ہارون بیگم شروانیہ نے اپنی حقیقی ماموں زاد بہن کی یہ سوانح عمری لکھ کر اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ مرحومہ ز۔ خ۔ ش نے صرف ستائیس سال کی عمر پائی لیکن علم و فضل اور شعر و سخن میں وہ مہارت حاصل کی جو سالہا سال خواندگی کے بعد بھی کم ملتی ہے۔ قوم و ملک کی فلاح اور رسم و روایت کی اصلاح میں آپ کے قلم نے جولانیاں دکھائیں۔ نواب سر مزمل اللہ خاں کی یہ نامور صاحبزادی شروانی خاندان کی روایاتِ علمی کی علم بردار تھی۔ یہاں کلام کا زیادہ اقتباس پیش نہیں کیا جاسکتا۔ صرف ایک فارسی قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ قصیدہ نعتیہ ہے اور قاآنی کے تتبع میں۔

بہ چرخ و ارض و بر و بحر غیر ذکر اللہ ہو
ہمہ لغو، ہمہ فتنو، ہمہ افسوس ہمہ جادو
لبان عاجز، دہان قاصر، زبان الکن، بیان کوتہ
ز وصفِ رب، ز مدح شہ، ز حمد این، ز نعت او
زعشقِ تو، ز رعبِ تو، ز غیرِ تو، ز جودِ تو
سرم جوشان، لبم ساکت، دلم خالی، کفم مملو
کنار و بستر و بالین و دامانم ز اشکِ غم
یکی قلزم، یکے عمان، یکی جیحون، یکی آمو
قرار و راحت و آرام و آسائش نمی بینم
نہ بر بستر نہ بر بالش نہ این پہلو نہ آن پہلو

انیسیات

انیسہ ہارون شروانیہ کا مجموعۂ کلام۔ قیمت عـہ۔ ملنے کا پتہ
مہتمم مطبوعات مسعود منزل حمایت نگر، حیدر آباد دکن

شروانی خاندان علم و فضل کا علم بردار رہا ہے۔ اسی خاندان کی ایک نیک خاتون اس کتاب کی مصنف ہیں۔ آپ علم دوست بھی ہیں اور علم پرور بھی۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے۔ شعر میں پاکیزگی اور صفائی بیان بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بیشتر نظمیں ارادت و خلوص کی آئینہ دار ہیں۔

حیدر آباد میں ہندو مسلم تعلقات

۷۰ صفحات پر مشتمل کتابچہ از نرہندر ام۔ ایل۔ اے۔ مصنف نے بڑے خلوص سے مسئلہ ہندو مسلم اتحاد کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ملنے کا پتہ۔ آریہ پرتی ندھی سبھا سلطان بازار حیدر آباد دکن

ہماری بُت پرستیاں

مصنف نواب ہوش یار جنگ بہادر حیدر آباد دکن۔ قیمت ایک روپیہ ضخامت ۴۸ صفحات رسالہ نگار بابت اپریل ۱۹۳۷ء میں عزاداری کے باب میں ان کے خیالات پر مشتمل ایک مقالہ جناب ہوش بلگرامی کے قلم سے شائع ہوا تھا۔ اس پر سید اختر علی تلہری اور سید اولاد حیدر فوق بلگرامی نے الواعظ میں گراں قدر نقد و تبصرہ فرمایا تھا۔ ہوش صاحب نے پھر مزید مطالعہ کے بعد جواب الجواب لکھا۔ اب یہ سب مضامین اس کتابچے میں شائع کر دیے گئے ہیں۔ ہوش صاحب کے اپنے ہی ایک فقرے میں ان کا نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ "مروجہ طریقۂ عزاداری یا تو ہمارے تھکے ہوئے دماغوں کی پیداوار ہے یا ملکی ماحول کا نتیجہ ہے۔" ہوش صاحب ہمارے ملک کے نہایت ذہین طباع اور دیانت دار ادیبوں میں سے ہیں۔ آپ کی یہ تصنیف اس قابل ہے کہ اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔

آشا دیپ بُجھے نا

ست پرکاش سنگر کے ایک درجن افسانوں کا مجموعہ۔ تعارف اپنے دلچسپ انداز میں کنہیا لال کپور نے لکھا ہے۔ سنگر ہمارے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ اردو، ہندی اور انگریزی میں بیک وقت اور بغیر جھجک کے لکھتے ہیں۔ اتنا لکھتے ہیں کہ لکھنے سے باز نہیں آتے۔ ہندی میں چھ ناول چھپ چکے ہیں۔ اردو میں ایک ناول زیرِ طبع ہے۔ کپور نے تعارف میں جو چاہے لکھا ہو لیکن آخر میں اپنے دل کی بات کہہ دی ہے۔

مجھے یقین ہے اگرچہ وہ چھوٹی آنکھوں کا مالک ہونے کی وجہ سے فلم ایکٹر نہ بن سکا۔ تاہم سن اور تجربے کی کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد وہ ہماری زبان کا ایک قابلِ رشک اور لائق قدر افسانہ نگار ثابت ہوگا۔

ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ کردار بھوپال قیمت دو روپے

اب اور تب

ہنسراج رہبر کی گیارہ کہانیوں کا مجموعہ۔ ناشر نیا دور پبلشرز اردو بازار دہلی۔ قیمت دو روپے ۴ آنے۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات

رہبر دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ذہانت اور خلوص وہ جوہر ہے کہ آپ کبھی کبھی 'منہ پھٹ' کی حدوں تک پہنچ جاتے ہیں لیکن افسانہ نگاری میں عمر کے ساتھ ساتھ اب آپ سنجیدگی اور متانت اختیار کر رہے

جانے والے مسلمانوں کی ناجائز ہجرت کی روک تھام کے لئے بھارت سرکار حکومت پاکستان سے پورا تعاون کرے گی۔ آپ نے سفر کی سہولیات بہم پہنچانے کا بھی وعدہ کیا اور تفصیل سے بیان کیا کہ بھارت اور پاکستان کے مابین لوگوں کی آمد و رفت کو جاری کرنے کے لئے کون کون سی ٹرینیں چلائی جا رہی ہیں۔

کرنل ناصر اور سردار نعیم خان کا اظہار تشکر

دہلی میں لاکھوں اشخاص کے پرخلوص سواگت کا جواب دیتے ہوئے مصر کے وزیر اعظم کرنل ناصر نے بھارت کی پرانی تہذیب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ بھارتیوں اور مصریوں کی دوستی بہت پرانی ہے۔ مصر کے لوگوں نے ہمیشہ گاندھی جی کے بتائے ہوئے اصولوں اور فلاسفی کی تعریف کی ہے۔ آپ نے کہا کہ بھارت ہمیشہ پس ماندہ ممالک کی آزادی کا حامی اور ہر وقت اُن کی امداد کے لئے پیش پیش رہا ہے۔ اس موقعہ پر افغانستان کے نائب وزیر اعظم سردار نعیم خاں نے بھی بھارت کے لوگوں کو افغانوں کی طرف سے ہدیہ تہنیت پیش کیا۔ آپ نے کہا کہ ہم بھارت سے اپنی دوستی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ افغان بھارت کی خوش حالی کے خواہاں ہیں۔ آپ نے اپنی تقریر جے ہند کہہ کر ختم کی۔

بھارت اور پاکستانی پبلک کے دوستانہ مظاہر پر راجہ غضنفر علی کی تقریر

پاکستان کے ہائی کمشنر راجہ غضنفر علی خان نے لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ امرتسر اور جالندھر میں پاکستانیوں کا جو شاندار استقبال ہوا ہے وہ ہر دو ممالک کے مابین بڑھتے ہوئے دوستانہ اور برادرانہ شفقت کے جذبات کا ایک اور روشن ثبوت ہے اور یہ اس امر کی علامت ہے کہ اب دونوں ملکوں کی جنتا پُرامن پڑوسیوں کی طرح رہنے کی خواہاں ہے۔

روس کا برطانیہ اور فرانس کے ساتھ دوستانہ معاہدہ ختم

روس نے دوسری بڑی جنگ کے دوران میں برطانیہ اور فرانس کے ساتھ قائم شدہ دوستانہ معاہدے کو ختم کر دیا ہے۔ اس معاہدے کو ختم کرنے کی وجہ فرانس اور برطانیہ کی طرف سے معاہدہ پیرس کی تصدیق ہے جس کے ذریعے جرمنی کو از سر نو مسلح کیا جائے گا۔ حکومت روس کا خیال ہے کہ پیرس کے معاہدے کی تصدیق کے بعد بیس سالہ دوستی کے معاہدے کی حیثیت قایم نہیں رہ سکتی۔ فرانس کے دفتر خارجہ کے ترجمان نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ روس نے مشترکہ امداد اور دوستی کے معاہدے کو توڑا ہے۔ حالانکہ اس معاہدے سے دونوں ملکوں کو کافی فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

شری شام لال صراف کی تقریر

پٹھان کوٹ کے ایک عظیم الشان جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ریاست جموں اور کشمیر کے توسیع اور ترقی کے وزیر شری شام لال صراف نے اعلان کیا کہ کشمیر بھارت کا ایک اٹوٹ انگ ہے اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں بھارت سے الگ نہیں کر سکتی۔ آپ نے کہا کہ بخشی غلام محمد کی زیر رہنمائی ریاست ہر لحاظ سے ترقی کر رہی ہے اور ہر شخص بچشم خود کشمیر کی اس ترقی کو دیکھ سکتا ہے۔ وزیر ترقیات نے عوام کو متنبہ کیا کہ وہ فرقہ پرستوں کے ہتھکنڈوں سے بچیں جو دیش کی ترقی کی راہ میں روڑا اٹکا رہے ہیں۔ آخر میں آپ نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ دیش کی ترقی کے لئے امن کے دیوتا شری جواہر لال نہرو کے ہاتھ مضبوط کریں۔

چھوت چھات کے خلاف بل منظور

بھارت کی لوک سبھا نے چھوت چھات کو روکنے کے متعلق ایک قانون پاس کیا ہے جس کے مطابق کسی سے چھوت کرنے والا شخص ضابطہ فوجداری کے تحت سزا کا مستوجب ہوگا۔ اس قانون کے پاس ہونے پر لوک سبھا میں تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا گیا اور اُسے سماجک سُدھار کے باب میں ایک اہم قدم قرار دیا گیا۔

کلکتہ سے آسام تک ریل گاڑیوں کی آمد و رفت

پانچ سال کے بعد ۲۹ اپریل سے کلکتہ سے ایک گاڑی براہ پاکستان آسام روانہ ہو گئی۔ اس گاڑی میں ۶۰ ڈبے ہیں اور ۱۳۰۰ ٹن چینی، چاول اور کھاد اس سے بھیجی گئی ہے۔ اس گاڑی کے چلنے سے مشرقی پاکستان سے ہو کر مال گاڑیوں کی آمد و رفت شروع ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں مسافر گاڑیاں چلانے کے لئے بھی انتظامات کئے جا رہے ہیں۔

گندم کے نرخ کی روک تھام کے لئے اقدام

بھارت سرکار نے گندم کے بھاؤ کو غیر اقتصادی سطح تک گرنے سے روکنے کی غرض سے صوبائی حکومتوں کو تیرہ کروڑ روپیہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ جن صوبوں میں گندم کی بہتات سے نرخوں کے گرنے کا خدشہ ہو وہاں کی حکومتیں نرخوں کو مناسب سطح پر روکنے کے لئے خود گندم خرید سکیں۔

بچوں کا آج کل



امرت لال عشرت

ہمارا پپّو





کیا کروں میں بیان پپّو کا — آج ہے کُل جہان پپّو کا
گھر سے اسکول اور اس کے بعد — نہیں ملتا نشان پپّو کا
کھانے پینے کا کچھ حساب نہیں — پیٹ ہے مرتبان پپّو کا
آنکھ پُستک پہ اور رہتا ہے — بند ڈبّوں میں دھیان پپّو کا
ماسٹر کو سلام ہوتا ہے — آ گیا امتحان پپّو کا
ٹافی والوں کا دھیان پپّو کو — ٹافی والوں میں دھیان پپّو کا
کان پکڑے ہیں ماسٹر جی نے — کون پکڑے گا کان پپّو کا

وقت کالج کا ہو گیا عشرت
ختم کر اب بیان پپّو کا

رعنا ثریا کاکوروی

گھوڑے کی خریداری



اب سے کئی سو برس کی بات ہے جب ملک عرب میں ایک بادشاہ تھا۔ اُس کا نام ابنِ ممبوق تھا۔ ابنِ ممبوق کو گھوڑوں کا بڑا شوق تھا۔ اُس کے اصطبل میں ہر ملک اور ہر نسل کے بڑے خوبصورت خوبصورت گھوڑے تھے۔ تازی، ترکی، عرب اور نہ جانے کتنے۔ اُن میں ایک گھوڑا جو سب سے زیادہ تندرست، خوب صورت اور خوش رنگ تھا، اُس کو نزلہ ہوگیا۔ بادشاہ نے اُس کے نزلے کا بہت علاج کرایا، مگر گھوڑا اچھا نہ ہوا۔ اُس کو منٹ منٹ پر چھینکیں آنے لگیں، ناک سے نزلہ اس طرح بہتا جیسے ببے کی ٹوٹی سے پانی — کسی وقت رُکتا ہی نہ تھا۔ بادشاہ کے طبیبِ خاص نے گھوڑے کے نتھنوں میں ڈھاٹیں لگوادیں۔ یہ ڈھاٹیں سوختے کی بنی ہوئی تھیں جس سے گھوڑے کا نزلہ اُن ڈھاٹوں میں جذب ہو جاتا۔ مگر جب نتھنوں سے نزلے کو نکلنے کا موقع نہ ملا تو اُس نے آنکھوں کا رُخ اختیار کیا، اور اُس کی آنکھوں سے اس قدر نزلہ بہا کہ گھوڑا اندھا ہوگیا۔ اُس کی آنکھوں کے دیدے بہہ گئے۔ اُس کی پلکیں جھڑ گئیں، اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا۔ اُس زمانے میں آنکھوں کے ڈاکٹر تو تھے نہیں جو کسی دوسرے گھوڑے یا انسان کی آنکھیں اُس کے لگا دیتے، جیسا کہ آج کل امریکہ میں آپریشن چلا ہے جس میں دوسرے کی آنکھ کی پُتلی نکال کر ڈاکٹر لوگ اندھوں کے لگا دیتے ہیں، اور اُن کی آنکھوں میں روشنی آجاتی ہے۔ اندھے ہونے پر گھوڑے نے دانا اور گھانس چھوڑ دی۔ وہ دُبلا ہوتا چلا گیا۔ اُس نے ہنہنانا بھی بند کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ بادشاہ کو گھوڑے کے مرنے کا بڑا صدمہ ہوا۔ اُس کے مرنے کے بعد سے بادشاہ ہر وقت نڈھال نڈھال رہنے لگا۔

بادشاہ کے درباریوں نے جب بادشاہ کا یہ حال دیکھا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ اُنھوں نے بادشاہ کا غم دُور کرنے کے لئے ویسے ہی گھوڑے کی تلاش شروع کر دی۔ دوسری طرف بادشاہ نے اعلان کیا کہ اگر سلطنت کا کوئی شخص مرحوم گھوڑے کی طرح کا گھوڑا لا دے گا یا صرف اُس گھوڑے جیسے گھوڑے کا پتہ ہی بتا دے گا بادشاہ اُس کو پانچ ہزار سونے کی اشرفیاں نقد انعام دے گا۔ درباریوں نے یہ سن کر اور زیادہ دوڑ دُھوپ شروع کر دی۔

آخر ایک دن بادشاہ کے درباریوں میں سے ایک درباری نے آکر بادشاہ سے عرض کی کہ ظلِ اللہ! مبارک ہو، بالکل مرحوم گھوڑے جیسا گھوڑا مل گیا، اور میں اُسے ابھی دیکھے چلا آرہا ہوں۔

گھوڑا بہت کچھ رنگ رُوپ اور صورت شکل میں بالکل مرے ہوئے گھوڑے جیسا ہے۔ اس پر بادشاہ نے درباری سے جرح شروع کی۔

بادشاہ۔ (درباری سے) ہاں تو وہ گھوڑا کس وضع قطع کا ہے؟

درباری۔ ظلِ اللہ۔ بڑے اشراف والدین کا بیٹا ہے۔ حضور کی جان و مال کی سلامتی رہے۔ مرحوم گھوڑے کا بالکل ہم شکل ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضور کا مرحوم گھوڑا پھر سے پیدا ہو گیا ہے۔

بادشاہ۔ (خوش ہوکر) اور چلنے میں کیسا ہے؟

درباری۔ صبا رفتار۔ اگر ہوا بھی اُس کا پیچھا کرے تو اُس کی گرد کو نہ پہنچے۔

بادشاہ۔ شاباش۔ اور اُس کے ہاتھ پیر اور جسمانی ساخت کیسی ہے؟

درباری۔ ہاتھ پاؤں میں رستم اور سہراب اُس کے سامنے مات ـــ یہ بڑا کلا ـــ اِتنے بڑے بڑے نتھنے ـــ یہ سر۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں۔ پیٹھ اِتنی چوڑی کہ اچھا بھلا تخت بچھا لیجیے ـــ دُلکی، پویا، سرپٹ میں کیا کوئی گھوڑا اُس کے مقابلے کی تاب لائے گا۔ اب تک جتنے گھوڑے اُس کے مقابلے میں آئے خون تھوک کر واپس گئے۔ ہزاروں گھوڑوں کو تیز رفتاری میں نیچا دکھا چکا ہے، اور کتنوں کو اب بھی ہرانے پر آمادہ ہے۔ ہنہنا ہنہنا کر اب بھی دعوتِ مقابلہ دے سکتا ہے۔

بادشاہ۔ وہ کس ملک کا ہے؟

درباری۔ سرکار! خاص الخاص عربی النسل۔ نجیب الطرفین، رنگ رُوپ میں مخمل جیسی کھال، ٹاپیں ایسی چوڑی کہ اگر ہاتھی پر بھرپور پڑ جائیں تو ہاتھی دانت نکال دے۔ ہنہناہٹ میں وہ گرج تڑپ کہ بادل اُس کے سامنے پانی بھریں۔ رانیں اتنی موٹی اور سڈول کہ بڑے سے بڑا پہلوان رشک کرے۔ دانت ایسے گویا منہ میں موتی جڑے ہوئے۔ گردن کے بال ایسے کہ ایک ایک بال سے دشمن کے سیکڑوں سر قلم ہوں۔

بادشاہ۔ (خوش ہوکر) اچھا! دیکھو تم نے اُس کی جو کچھ تعریف کی ہے اُس میں ذرّہ برابر فرق نہ ہونا چاہیے۔ خوب سوچ سمجھ لو، ورنہ پھر تمھاری خیر نہیں۔

درباری۔ حضور، چاند میں داغ نکل سکتے ہیں، مگر گھوڑے کو حضور بالکل بے داغ پائیں گے۔

بادشاہ۔ پھر سوچ لو۔ اگر گھوڑے میں کوئی خرابی نکلی تو اُس کا خمیازہ تمھیں کو بھگتنا ہوگا۔

درباری۔ اللہ کی ذات سے مجھے پُوری اُمید ہے کہ حضور کے حسبِ منشا رہوگا۔

بادشاہ۔ ایک بار پھر سوچ سمجھ لو کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ ایک بادشاہ کے روبرو کہہ رہے ہو۔ اگر اس میں بال برابر بھی فرق ہوا تو اس کی سزا سزائے موت ہوگی۔

درباری۔ ظلِ اللہ! یوں بے عیب ذات تو خدا کی ہے۔ بظاہر مجھے تو کوئی عیب یا بُرائی نظر نہیں آئی۔ اب چاہے حضور اِسے عیب کہہ لیں یا تھوڑی بہت خرابی ـــ گھوڑا موٹا ہے، عربی نسل کا ہے۔ صبا رفتار اور خوب صورت ہے۔ البتہ ذرا مرا ہوا ہے۔

یہ سُن کر بادشاہ اور درباری بہت ہنسے، اور بادشاہ نے اُس کی بے وقوفی پر اُس کو معاف کر دیا۔

ن۔ ن۔ بجی

گڑیاں گڑے

آؤ بچو! آج سُنائیں تم کو ایک کہانی
اِک دُوجے کی جان تھے نینا اور ونیو دو بچے
اِک دُوجے کا مان ہمیشہ دل سے کرتے آئے
صُبح سویرے ونیو اُٹھ کر نینا کے گھر آتا
دونوں یہ معصوم فرشتے اک سنسار بناتے
گھاس پھُوس کی ایک عمارت یہ معمار بناتے
دیکھو ونیو میری گڑیا کتنی بی بی رانی
کہہ تو ونیو تیرے گڑے کا ہار بنا کے لاؤں
اسی طرح وہ خوش ہو ہو کر اپنا سماں بتاتے
ایسا ہوتا اکثر جب ونیو کی ممی آتی
توڑ تاڑ کے غصے میں سب اُن کا تانا بانا
ہڈی پسلی توڑ کے پہلے تیری جان نکالوں
ایسے ہی پھر ننیا کو وہ جھاڑ جھپٹ گنواتی
دھکے دے کر کہتی اُس کو دوبہو رانڈ کی جائی
روتی دھوتی نینا جا کے ماں کو حال سُناتی
تھپک تھپک کے پیار سے اپنی نینا کو سمجھاتی
مت جایا کر ونیو کے گھر اُس کا کھیل ہٹانے
بچوں میں یہ بھید بھاؤ نا کہو تو کیسے آئے

کتنی سُندر رات بنی ہے چندا کی مہرانیٹ
دونوں پریم کے پُتلے بچو، من کے دونوں سچے
ایسے رہتے جیسے ہوں وہ ایک ہی ماں کے جائے
اُسے دیکھ کر نینا کا ننھا سا من کھِل جاتا
گڑیاں گڑے نکال کے اپنے، اپنا کھیل رچاتے
بھانت بھانت کے تنکوں سے پھر اُس کو خوب سجاتے
سارے جگ کی گڑیوں سے یہ گڑیا بڑی سیانی
باندھ بُوندھ کے سہرا اس کو دُولھا خوب بناؤں
دِن میں سو سو بار گڑے کو دولھا روز بناتے
مار مار کے ننیا کی وہ دُرگت خوب بناتی
کہتی ونیو اِس ڈائن کے گھر اب پھر تم جانا
اِس کمبخت سے ٹھہر ذرا میں تجھ کو کھیل کھِلالوں
سَو سَو بے سُر کی صلواتیں اُسے سُناتی جاتی
میرے گھر میں "موہو ٹھگنی" تو کیا لینے آئی
ماں بیٹی کو گلے لگا کر خشک آنسو برساتی
دھن والوں کی آنکھ میں بٹیا، دُنیا نہیں سماتی
دھن والوں کے دل ہیں پتھر تو کیا بیٹی جانے
ایک ساتھ جو کھیلیں کُودیں کیسے بنیں پرائے؟

ٹ مہارانی







ننیا ونیو دونوں بچے پھر بھی آتے جاتے
گڑیاں گڑے نکال کے اپنے نت وہ کھیل رچاتے

دیکھو ننیا میں نے اب کے گڑے کا ہار بنایا
موتی لعل، جواہر، ہیروں سے ہے خوب سجایا

تو چاہے تو گڑیا سے میں شادی اس کی کر دوں
دنیا بھر کی دولت سے میں اس کا دامن بھر دوں

ننیا بولی پیارے ونیو پہلے کرو سگائی
تم مجھ کو، میں تجھ کو، دوں گی دل سے آج ودھائی



نینا آؤ ہم بھی اپنی آج سگائی کر لیں
اک دوجے کو سچ مچ ہم بھی آج ہی دونوں بر لیں

پیارے ونیو ماں کہتی ہے تم دھنوان بڑے ہو
جگ والوں کی نظروں میں بھی تم انسان بڑے ہو

نردھن کا اس جگ میں ونیو، کوئی مان نہیں ہے
نردھن تو اک ڈھانچہ ہے وہ جس میں جان نہیں ہے

ہم نردھن ہیں اپنی گڑیا کیسے تم کو لا دیں
جگ والوں کی نظروں میں ہم کیسے ڈھول اڑا دیں

دھن والوں کو میں کیا سمجھوں ننیا مری پیاری
گڑیا کی شادی کی جا کر جلد کرو تیاری

میں بھی جا کے کچھ نہ کچھ پربندھ کروں گا رانی
ٹھیک تو ہے اس کاج کو ننیا آج کی رات سہانی



اب میں جا کے سب سجنوں کو آج یہ دعوت دوں گا
باجے گاجے، بینڈ، تماشے کا پربندھ کروں گا

اتنے میں ونیو کے ڈیڈی کی آواز جو آئی
ونیو سہم گیا یہ سن کر ننیا بھی گھبرائی

مارے ڈر کے دونوں بچے جان بچانے دوڑے
اپنے گھر بے پیار کی دونوں آن بچانے دوڑے

قسمت نے رستے میں لیکن ان کو آن دبوچا
ظالم ڈیڈی نے پھر دل میں جانے کیا کیا سوچا

مکے، ٹھڈے، گھونسے، تھپڑ یوں ان پر برسائے
جیسے جگ جگ کے ہوں بیری آج ہی قابو آئے

سن کر ایسا شور شرابا جتنا تھا سب آیا
کسی نے جا کر ننیا کی بی بی کو حال سنایا



دوڑی دوڑی آئی دکھیا رک رک کر پھر بولی
ہے بھگوان مری بٹیا کی کیسی درگت ہو لی

دیکھ کے اپنی ماں کو ننیا جھپٹ گئی تھرا کے
کسی نے بھی اس بدقسمت کی بات نہ پوچھی آ کے

آدھی رات کو ننیا کے گھر ہوا ذرا سا کھٹکا
چونک اٹھی ننھی سی ننیا دیا کسی نے جھٹکا

ونیو چپکے چپکے بولا ننیا جلدی آؤ
گڑیا اور گڑے کا آدھی رات میں بیاہ رچاؤ

ٹھیک رہے گی کاج کی خاطر آج کی رات سہانی
کتنی سندر رات بنی ہے چندا کی مہرانی

پتّھر کی مُورتی

بھارت دیہات میں بسا ہوا ہے۔ اِن دیہات میں ایسے لاتعداد واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کا علم ہمیں تا قیامت نہیں لگ سکتا۔ نہ معلوم اِس واقعے کا علم لوگوں کو کیسے ہوا۔

کسی چھوٹے سے گاؤں میں ایک گوالا رہتا تھا۔ وہ جنگل میں روزانہ گائیں چرانے کے لئے جایا کرتا، اور راستے میں چوراہے پر بنی ہوئی پتّھر کی ایک مورتی کے پاس دم لینے کے لئے بیٹھتا تھا، ایک دن پتّھر کی مورتی میں بولنے کی قوّت پیدا ہوگئی۔ مورتی نے گوالے سے کہا "مانگ کیا مانگتا ہے۔ میں تمھاری ہر خواہش پوری کروں گی۔" پہلے تو گوالے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ لیکن جب اُس نے اصرار کیا تو گوالے نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "مجھے جانوروں کی بولی سمجھ میں آنی چاہیئے۔" پتھر کی مورتی نے حیران ہو کر پوچھا "دھن دولت کیوں نہیں مانگتے۔" "نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں" گوالے نے کہا۔ تب پتھر کی مورتی نے جانوروں کی بولی سمجھنے کا راز اُسے بتا دیا۔ ساتھ ہی اُسے تاکید کردی کہ اگر یہ راز کسی اور کو بتاؤ گے تو پتّھر بن جاؤ گے۔

جنگل میں گائیں چراتے ہوئے ایک دن گوالے نے سُنا کہ ایک گائے درخت کے نیچے کھڑی بچھڑے سے کہہ رہی ہے کہ یہاں زمین کے اندر چھ برتن سونے چاندی اور روپوں سے بھرے ہوئے دفن ہیں، شام ہوئی تو گوالے نے اُس زمین کی کھُدائی شروع کردی۔ زمین کے اندر سونا چاندی روپوں کے برتن دیکھ کر اُس کی باچھیں کھِل گئیں،



اس نے اوپر سے مٹّی ڈال کر ساری دولت کو وہیں چھپا دیا۔

شام کو جب وہ گھر واپس لوٹا تو گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیوی نے وجہ پوچھی۔ گوالے نے بتانے سے انکار کر دیا، لیکن عورت کب پیچھا چھوڑنے والی تھی۔ کافی دیر کے بعد گوالے نے کہا "آج ہماری ریاست کے مہاراجہ شکار کھیلنے کے لئے جنگل میں آئے تھے۔ شکار کھیلتے کھیلتے وہ بہت دُور چلے گئے۔ شام کے وقت میں نے ایک لاش کو دریا میں بہتے دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لاش مہاراجہ کی ہے اور انھیں کسی نے قتل کر دیا ہے۔ چونکہ جنگل میں صرف میں اکیلا تھا۔ اس لئے میں نے تمھارے بغیر کسی سے نہیں کہا۔ نہیں تو پولس شک کی بنا پر مجھے گرفتار کرے گی، اور میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جاؤں گا۔

گوالے کی بیوی نے ساری کہانی غور سے سُنی اور بہت پریشان ہوئی۔ دوسرے دن صبح جب وہ کنوئیں پر پانی لینے کے لئے اپنی سہیلی کے ساتھ گئی تو اُس نے ساری کہانی اُسے سنا دی۔ اُس کی سہیلی نے یہ کہانی حرف بہ حرف گھر آکر اپنے خاوند کو سنا دی۔ اس کا خاوند راج محل کا خاص چوکیدار تھا۔ اُس نے فوراً جا کر راجہ کو سارا قصہ سُنا دیا۔ راجہ یہ من گھڑت افسانہ سُن کر آگ بگولا ہو گیا۔ گوالے

کو فوراً بلایا گیا اور سارا قصہ بیان کرنے کا حکم دے دیا۔ گوالے نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "مہاراج مجھے یقین ہی تھا کہ میری بیوی زیادہ دیر راز کی بات چھپا کر نہ رکھ سکے گی۔ اس لئے میں نے اُسے راز کی بات نہ بتانے کی غرض سے من گھڑت واقعہ بنا دیا تھا۔ راجہ نے گوالے کو برسرِ اجلاس پھانسی کی سزا کا حکم دیا۔ جان بخشی کرانے کے لئے گوالے نے اُس خزانے کا پتہ بتا دیا جو جنگل میں زمین کے اندر چھپا رکھا تھا۔

راجہ نے گوالے سے پوچھا "تم نے اس خزانے کا پتہ کیسے لگایا؟"

گوالے نے نہایت انکسار کے ساتھ عرض کی "مجھے اس سوال کا جواب دینے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اگر میں یہ راز بیان کروں گا تو میں پتھر بن جاؤں گا۔" لیکن راجہ کہاں ماننے والا تھا۔ مجبوراً گوالے کو ساری داستان بیان کرنا پڑی۔ جوں جوں وہ واقعہ بیان کرتا گیا، وہ پتھر بنتا گیا۔ جب وہ سینے تک پتھر بن گیا تو اُس نے مہاراجہ سے التجا کی "اب مزید واقعہ سنانے کے لئے مجبور نہ کیا جائے تاکہ گردن سے اوپر کا حصہ پتھر نہ بن جائے۔" لیکن راجہ نہ مانا اور گوالا کہانی کے اختتام پر سارے کا سارا پتھر بن گیا۔



راجہ اُسی وقت ہاتھی گھوڑے لے کر جنگل کو چلا گیا، اور وہاں سے سونا چاندی نکال لایا۔

راج محل میں اس سارے قصے سے سنسنی پھیل گئی۔ مہارانی کے کان میں بھی بھنک پڑی۔ شام کو رانی نے راجہ سے سارا قصہ بیان کرنے کے لئے کہا۔ راجہ نے ٹال مٹول کرنے کی کوشش کی لیکن رانی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا، اور زہر کھانے کی دھمکیاں دیں۔ آخر راجہ نے تنگ آ کر کہا: "ایک آدمی کے گھر میں نیولا تھا۔ ایک دن سانپ نے اُس آدمی کے بچے کو کاٹ لیا۔ سانپ چونکہ زہریلا تھا، اس لئے بچہ فوراً مر گیا۔ نیولے نے سانپ کو مارا اور خود جنگل میں جنگلی بوٹی تلاش کرنے کے لئے دوڑا۔ باپ جب واپس لوٹا اور بیٹے کو مرا ہوا دیکھا تو وہ بہت رویا۔ اتنے میں نیولا جنگل سے واپس آ گیا۔ آدمی کو نیولے پر شک گذرا۔ اُس نے نیولے کو اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ نیولا مر گیا۔ اُس کے منہ سے جنگلی بوٹی زمین پر گر پڑی۔ لڑکے کے باپ نے جنگلی بوٹی کو دیکھتے ہی مرے ہوئے سانپ کو بھی دیکھا۔ اس آدمی نے فوراً جنگلی بوٹی مردہ بیٹے کے منہ میں رکھ دی اور وہ زندہ ہو گیا۔ لیکن نیولے کے مر جانے پر وہ بہت پچھتایا لیکن بے کار۔ ایسے ہی تم بھی پچھتاؤ گے جب میں پتھر بن جاؤں گا۔"

لیکن رانی بڑی ضدی تھی وہ ایک نہ مانی، اور زہر کھانے کی پھر دھمکی دی۔ رانی کا دل بہلانے کے لئے راجہ اُسے راج محل کے باغیچے میں لے گیا۔ باغ کے عین وسط میں ایک خوبصورت چشمہ تھا۔ اس چشمے کے کنارے پر ایک بکری اور ایک بکرا باتیں کر رہے تھے۔ راجہ اُن کی باتیں غور سے سننے لگا۔ چشمے کا پانی گہرا تھا۔ اس میں گھاس اُگ آئی تھی۔ بکری چشمے کا گھاس چرنا چاہتی تھی لیکن گہرائی کی وجہ سے اُس میں ڈوب جانے کا خطرہ تھا۔ بکری نے اپنے خاوند (بکرے) کو چشمے سے گھاس نکالنے کے لئے کہا۔ بکرے نے ناراض ہو کر کہا "خود کیوں نہیں نکالتی ہو؟" "اس میں ڈوب جانے کا خطرہ ہے۔" بکری نے جواب دیا۔ بکرا اپنی بیوی بکری کی عیاری سمجھ گیا۔ "اگر میں مر جاؤں گا تو تم دوسری شادی کر لو گی لیکن میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں۔" بکرے نے ناراض ہو کر کہا۔ —— جب راجہ نے بکری اور بکرے کی ساری گفتگو سنی تو اُس نے رانی سے کہا: "اگر تم ایک چھوڑ ہزار بار بھی زہر کھاؤ گی میں کبھی تمہیں یہ راز نہیں بتاؤں گا۔ اور اگر تم نے مزید تنگ کرنا شروع کیا تو میں دوسری شادی کر لوں گا۔" یہ کہہ کر راجہ محل میں چلا گیا، اور رانی اس کے پیچھے چلی گئی۔ آج تک رانی نے راجہ کو وہ کہانی سنانے کے لئے مجبور نہیں کیا۔

یوگ راج تھانی

دوستی کا رُوپ

کسی شہر میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ اُس کے بہت سے دوست تھے، اور اُسے اُن پر بہت فخر تھا۔ لڑکے کا نام گیان تھا۔ گیان کے والد نے اُسے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی کہ زیادہ دوست اچھے نہیں رہتے اور زیادہ دوست بنانے میں کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن گیان نے اپنے والد کی نصیحت پر قطعاً دھیان نہ دیا، اور اِس کا جواب اُس نے یہ دیا کہ میرے بہت سے دوست ہیں جو میری تمام مشکلات کو حل کر سکتے ہیں۔

ایک دن اُس کے والد نے گیان کو سمجھانے کے لئے ایک ترکیب نکالی۔ اُنھوں نے گیان سے کہا، بیٹا! مجھے پانچ سو روپوں کی ضرورت ہے۔ اگر کہیں سے ہو سکے تو پانچ سو روپوں کا انتظام کر دو!" یہ تمام روپے میں ایک مہینے میں واپس کر دوں گا۔"

گیان نے ہنس کر جواب دیا۔" اباجان! یہ بھی کوئی کام ہے اُس سے کوئی مشکل کام بتلائیے۔ پانچ سو روپے تو میں آدھ گھنٹے میں حاضر کر سکتا ہوں۔ اتنا کہہ کر وہ ایک دوست کے ہاں گیا اور اُس سے کہنے لگا" مجھے پانچ سو روپیوں کی ضرورت ہے، کہیں سے انتظام کر دیں تو میں آپ کا شکرگذار ہوں گا۔" اُس کے دوست نے کہا،" اگر آپ تھوڑی دیر پہلے آتے تو میں آپ کو ایک ہزار روپے دے دیتا۔ ابھی ابھی میرا ایک رشتہ دار آیا تھا میں نے اُسے دے دیئے ہیں۔ اِس وقت تو گھر میں ایک پائی بھی نہیں۔"

یہاں سے ناکام ہو کر وہ دوسرے دوست کے پاس گیا، اور اُس سے بھی یہی سوال دُہرایا۔ اُس نے بھی کہا کہ" ہمارے گھر میں تو اس وقت روپے ختم ہو چکے ہیں۔ پھر کبھی آنے کی زحمت کیجیے۔"

ایک ایک کر کے گیان اپنے تمام دوستوں کے پاس گیا، اور سب نے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اُسے ٹال دیا۔ سارا دن گھومتے گھومتے اُسے رات ہو گئی، اور وہ مغموم صورت بنائے خالی ہاتھ گھر کی جانب لوٹا۔ اُس کے والد اُس کے انتظار میں تھے۔ اُنھیں دیکھتے ہی کہنے لگا:

" والد محترم! معاف کیجیے۔ میں روپوں کا انتظام کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔" اُس کے والد صاحب نے کہا، میرا بھی ایک دوست ہے، چلو اُس کے یہاں بھی جا کر دیکھ لیں۔ ممکن ہے کام بن جائے۔ اُس وقت باپ اپنے بیٹے گیان کو ساتھ لے کر اپنے ایک دوست شیام کے یہاں پہنچا۔ اُس وقت رات کے دس بجے تھے۔ دروازے کو دستک دی تھوڑی ہی دیر میں باپ اور بیٹا دونوں کیا دیکھتے ہیں کہ شیام ایک ہاتھ میں گٹھڑی اور دوسرے میں تلوار لئے گھر سے باہر نکلا۔ پیچھے اُن کی بیوی ہاتھ میں تھالی لئے چلی آ رہی تھی۔ شیام نے آتے ہی کہا۔ دوست! اس وقت اتنی رات گئے یہاں تشریف لانے کا سبب؟ اگر آپ کو کسی نے تنگ کیا ہو، یا کسی سے لڑائی ہو گئی ہے تو یہ میری تلوار حاضر ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں، اور اپنی قربانی دے کر بھی تمہاری حفاظت کروں گا۔ اگر تمھیں روپوں کی ضرورت ہو تو یہ رہا میرے گھر کا سارا اثاثہ۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کچھ نہیں۔ جو میں دوست کے قدموں پر نچھاور کر سکوں۔ اگر تم پر خدانخواستہ کوئی مصیبت نہیں آ پڑی یا تمہیں روپوں کی ضرورت نہیں تو ٹھہریئے۔ میری دھرم پتنی تمھیں تلک لگائے گی۔ کیوں کہ تم بہت دنوں کے بعد مجھ سے ملنے آئے ہو۔

اب باپ نے بیٹے سے کہا۔ بیٹا! دوست ایک ہی اچھا ہوتا ہے، اگر تمھارے دوست تمھیں ایک ایک روپیہ بھی دیتے تو تم پانچ سو روپے اکھٹے کر سکتے تھے۔ لیکن تمھارے پانچ سو دوستوں نے جو کام نہیں کیا وہ میرے ایک ہی دوست نے کر دکھایا۔

اس واقعے کو دیکھ کر گیان بہت شرمندہ ہوا، اور اُس نے اپنے باپ سے معافی مانگی۔

ہماری کتابیں

پہلا پنج سالہ پلان
جنتا ایڈیشن

اس ایڈیشن میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ہر قسم کی تفصیلات درج ہیں۔ زبان سادہ و دل کش ہے۔ قیمت ۲/-

مستقبل کی تعمیر

ہماری آج کی کوشش سے ایک نیا مستقبل عالم وجود میں آرہا ہے۔ اس تابناک مستقبل کی جھلک اس مختصر سے کتابچے میں دیکھئے قیمت ۴/-

آسان پنج سالہ پلان

یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ زبان نہایت آسان ہے۔ تصویروں اور خاکوں سے اس کی دل کشی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ۸/-

سماجی بہبود

پنج سالہ پلان کے تحت ہم سماجی بہبود کے میدان میں کیا کر رہے ہیں اس کی جھلک اس پمفلٹ میں ملاحظہ فرمائیے ۴/-

ہمارا پلان

پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا کر رہے ہیں اور ہماری منزلِ مقصود کیا ہے اس کتابچے میں جامع اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت ۴/-

ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان

پنج سالہ پلان کے تحت آمد و رفت اور رسل و رسائل میں جو بہتریاں ہمارے پیش نظر ہیں اس کا مفصل نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے ۴/-

اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—509